خاطرات

(آپ بیتی)

مؤلف

ظفر حسن آیبک (مرحوم)

مرتّب

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

(استانبول یونیورسٹی ادبیات فیکلٹی)

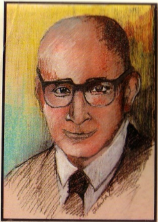
خاطرات

(آپ بیتی)

مئولف: ظفر حسن ایبک

(مرحوم)

مرتب : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار



ظفر حسن آیبک نے نہایت سادگی اور راست گوئی سے جو کچھ ان کے حافظے میں محفوظ تھا، اس میں بیان کر دیا ہے۔ کسی حقیقت کو چھپانے یا اس پر ملمع چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی رہبری میں (کہ وہ ہر جگہ انہیں اپنا استاد کہتے اور قبلہ و مولانا کہہ کر ان کا ذکر کرتے ہیں) انھوں نے کابل میں کانگرس کمیٹی قائم کی اور پھر ترکیہ پہنچ کر ۱۹۲۵ء میں اس کمیٹی کے عہدیدار کی حیثیت سے سرواجیہ کا دستور پہلے اردو میں شائع کر کے برصغیر میں بھیجا۔ جب یہ وہاں ضبط ہو گیا اور اس کا داخلہ ممنوع ہو گیا تو پھر اسی پروگرام کو کچھ بدل کر انگریزی میں چھپوایا اور اسے بھیجنے کی سعی کی۔ اس طرح مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے معتمد ظفر حسن نے وطن سے دور رہ کر بھی استخلاص وطن

کی جدوجہد میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور جنگ آزادی کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ سربکف رکھا۔ لیکن جیسا کہ قدرتی امر ہے وہ ملک سے باہر تھے اور ملک کے اندر کی سیاسی فضا جس سرعت سے تبدیل ہو رہی تھی اس سے پوری طرح باخبر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۳۹ء میں جب وطن واپس آئے تو ان کا سیاسی پروگرام رفتار حالات سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے یہ تاثرات بڑے معنی خیز اور دلچسپ ہیں۔

بہرکیف، ظفر حسن کی یہ آپ بیتی ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک حصہ اور اس سلسلے کے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

۱۹۹۰ء

نیاز احمد نے
رفاعی پرنٹرز۔ لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۲۱۰/۰۰ روپے

فہرست مندرجات

نواں باب: جنگ استقلال افغانستان

جنگ کی تیاریاں، جنگ استقلال کے مختلف محاذ، ٹھل پر سپہ سالار نادر خان کا حملہ، ٹھل کے معرکے میں میری شرکت،

دسواں باب: امیر کابل امان اللہ خان کی انگریزوں سے جنگ بندی کا معاہدہ، ہمارے وفد کی کابل روانگی، خوست میں ہمارے قیام کے آخری ایام، سپہ سالار نادر خان کی کابل واپسی

گیارہواں باب: صلح کے بعد کے حالات، برصغیر سے مسلمانوں کی ہجرت، جمال پاشا کی کابل میں آمد، انور پاشا کی بخارا میں آمد اور شہادت، امیر امان اللہ خان کے دربار میں بڑھتا ہوا انگریزی اثر، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء کی کابل سے روس روانگی، دشوار گزار راستے کا تقرر

بارہواں باب: مولانا عبیداللہ سندھی کے ہمراہ ماسکو میں

تیرہواں باب: ماسکو یونیورسٹی میں میرا داخلہ

کتاب کیپٹل Capital اور لامذہبیت کی تعلیم، کمیونسٹ اور مذہب، بعض ساتھیوں کے حالات، میرا لینن گراڈ کا سفر

چودھواں باب: مولانا عبیداللہ سندھی کی روسی وزیر خارجہ چچرن سے ملاقاتیں

مولانا اور چچرن کی ملاقات کے لئے میری کوشش، جون ۱۹۲۳ء میں پہلی ملاقات، مولانا صاحب کا چچرن سے سمجھوتا، مولانا کی ترکی کو روانگی

پندرہواں باب: قبلہ مولانا صاحب کے بعد میرا روس میں قیام اور پھر ترکیہ روانگی،

میرا یونیورسٹی میں مقالہ، فوجی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش، بمبئی کرانیکل میں میری مقالہ نگاری، مولانا سے خط و کتابت، روسی لیڈروں میں نفاق، میرا ترکی پہنچنا، ہندوستانی خانقاہ آقسرائے، عبدالرحمن ریاض بابر، استانبول میں قبلہ مولانا کی رہائش

سولہواں باب: استانبول کے قیام کے دوران ہماری سیاسی سرگرمیاں

لاجپت رائے کی استانبول میں آمد، عبدالرحمن صدیقی کی استانبول میں آمد، ڈاکٹر انصاری کی استنبول میں آمد، عبدالرحمن پشاوری، ترکی ارباب قلم سے میرا تعارف، تنجا

سنگھ آزاد اکالی کے حالات، قبلہ مولانا کا مرتب کردہ سیاسی پروگرام، سروراجیہ پارٹی، برصغیر میں ہمارے پروگرام کی ضبطی، اخبار "مسلمان" کلکتہ کی نامہ نگاری، قبلہ مولانا کی اسعد فواد بک سے ملاقات

سترہواں باب: قبلہ مولانا عبیداللہ سندھی کی حجاز کو روانگی

قبلہ مولانا کے بعد استانبول میں میری سرگرمیاں، رابندر ناتھ ٹیگور کی استانبول میں آمد، میری ملازمت، مولانا شبلی مرحوم کی کتابوں کا ترجمہ، حج کے لئے مکہ مکرمہ روانگی اور والدہ محترمہ سے ملاقات، حجاز سے واپسی کے بعد میری سرگرمیاں، سیرت النبی کا ترجمہ

اٹھارہواں باب: ترکی میں اصلاحات اور کمالی انقلاب

ترکی رسم الخط بدلنے کی وجوہ، ترکی کے حالات، کردوں کی بغاوت، میرا ترکی رعایا بننا۔

انیسواں باب: ترکی فوج میں میرا داخلہ

قلعہ سلیمیہ، ترکی کیڈٹ کالج میں تعلیم، برسہ کی مصنوعی لڑائیاں، اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کا فرمان، میرا فوجی کمیشن

بیسواں باب: آرٹلری (توپخانہ) اختصاص کالج میں میرا داخلہ

مکتب عالی انداخت توپخانہ، فال، میری منگنی اور شادی، قونیہ میں میرا تقرر، فرضی لڑائیاں، میرے لئے افغانستان جانے کی اجازت

اکیسواں باب: افغانستان کو ہماری روانگی

میری روس کے راستے کابل کو روانگی، خانم کی ہندوستان کے راستے کابل آمد، اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شہادت، میری کابل میں آمد

بائیسواں باب: افغانی کیڈٹ کالج میں میری معلمی

افغانی فوج کی تعلیم و تربیت میں افراتفری، کابل میں ہماری سوشل زندگی، افغانستان میں ترکی فوجی مشن

تئیسواں باب: نئی افغانی توپوں کی خریداری کے لئے یورپ روانگی

ضمیمے

پیش کش

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے (غالب)

میں جب سنہ ۱۹۳۹ء میں ۳۴ سال کی جلاوطنی کے بعد لاہور گیا تو میرے محترم استاد مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے بعض مخلصوں نے مجھے کہا کہ میں ان چند سالوں کے حالات قلم بند کروں جن میں مجھے ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل رہا تھا۔ میں نے بعض سیاسی ملاحظوں اور خیالوں کی وجہ سے لکھنے سے انکار کیا تھا۔ لیکن ان صاحبوں میں چند احباب کو میں نے کچھ حالات سنائے تھے، اور ان سے درخواست کی تھی کہ ان باتوں کو میری زندگی میں شائع نہ کریں۔ میرے ترکی واپس آنے پر بعض اور صاحبوں نے بھی اس پر زور دیا کہ میں اپنی سوانح عمری لکھوں۔ میں ایک حد تک اس کے لئے راضی ہو گیا اور اپنے عزیز و محترم بھائی صاحب میاں محمود الحسن مرحوم ریٹائرڈ ڈپٹی۔ ای۔ ایس سے جو مجھ پر ہمیشہ پدر مرحوم کی طرح شفقت کرتے رہے ہیں، بعض ضروری کاغذات و اطلاعات مانگیں۔ تاکہ ان سے بعض تاریخوں اور واقعات کا حال ٹھیک طرح پر معلوم کر سکوں۔ لیکن پھر، بعض واقعات کے ذکر کے ڈر سے، میں اس اقدام سے باز رہا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان کے پریس اٹیچی شریف الحسن صاحب میرے ہاں چائے پر تشریف لائے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے میرے اپنے حالات قلم بند کرنے کا مسئلہ چھڑ گیا۔ انہوں نے اس پر بہت اصرار کیا کہ میں کم از کم تاریخ کی خدمت کرنے کی غرض سے ضرور ان واقعات کو لکھ ڈالوں۔ لیکن ان کی اشاعت کو اپنی رحلت تک ملتوی رکھوں۔ ان

کی باتوں کا مجھ پر اثر ہوا، اور میں اپنے حالات زندگی لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ اگر ان سے میرے پرانے ہم وطن پاکستانی کچھ فائدہ اٹھا سکیں، یا ان حالات کی تحریر سے اس جدوجہد پر کچھ روشنی پڑ جائے جو انقلاب پسند مسلمانوں نے برِصغیر ہند کی آزادی کے لئے کی تھی، تو میرے لئے اطمینان کا باعث ہو گا۔

ظفر حسن ایبک

شکریہ

میں اپنے مرحوم والدین، ہمشیرہ اور بھائی کا ممنون ہوں جنہوں نے میری تربیت اور تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ میں اپنے محترم استاد مولانا عبیداللہ سندھی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے مذہبی اور سیاسی تعلیم دی تھی۔ میں سردار محمد نادر خان سپہ سالار افغانستان کا بھی شکر گزار ہوں جو بچہ سقا کو شکست دے کر افغانی قومی جرگہ کے فیصلے کے مطابق افغانستان کے بادشاہ بنے تھے۔ سردار موصوف نے میری والدہ مرحومہ سے حجاز میں میری آخری ملاقات کے لئے اور میرے حج کرنے کے لئے مجھے استنبول سے مکہ معظمہ تک آنے جانے کا خرچ دیا تھا۔

میں اپنی اس کتاب کو اپنی رفیقہ حیات امینہ مکرم آیبک خانم کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کا سلیقہ کار، حسن اخلاق اور ترکی کے سنجیدہ مزاج تعلیم یافتہ طبقہ سے خاندانی تعلق میرے لئے ترکی میں کامیاب اور باعزت زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بنا۔

ظفر حسن ایبک

۲/اکتوبر ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تو عثمانی ترکیہ جرمنی کے حلیف کے طور پر اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس، اطالیہ وغیرہ) کے خلاف جنگ میں شریک ہوئی۔ خلیفۃ المسلمین نے جہاد کا اعلان کیا۔ جہاد کے اس اعلان پر لبیک کہتے ہوئے لاہور کے کالجوں میں زیر تعلیم کچھ سرفروش طلباء نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ ۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو آدھی رات کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر وہ دریائے راوی کی منجدھار میں پہنچے اور وہاں بڑی رازداری کے ساتھ جہاد میں عملاً شرکت کے لئے قرآن پاک پر حلف اٹھایا۔ یہ حلف اٹھا کر انہوں نے ایک ماہ کے دوران چپکے چپکے تیاری کی اور ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو جمعۃ المبارک کے روز ریل گاڑی کے ذریعہ ہری پور ہزارہ پہنچے۔ وہاں سے ریاست امب گئے اور دریائے سندھ عبور کر کے آزاد قبائلی علاقے میں داخل ہو کر آزادی کی فضا میں سانس لی اور اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ قبائلی علاقے سے افغانستان پہنچے اور کابل میں نظر بند کر دیئے گئے۔ بعد میں مولانا عبیداللہ سندھی بھی کوئٹہ کے راستے ویران راہوں سے گزرتے ہوئے قندھار آئے اور وہاں سے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے اور طلباء کے اس مختصر گروہ کے رہنما ہوئے۔ اس طرح مجاہد طلباء کا یہ مختصر جیش اپنی تعلیم کے سلسلے کو ادھورا چھوڑ کر، مستقبل سے بے نیاز، اپنے اعزہ واقارب سے دائمی طور پر جدا ہو کر، وطن عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے اور اتحادیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے لئے ہزاروں صعوبتیں سہنے اور راہ حق پر ثابت قدم رہ کر غلامی کی شب تاریک اور استعماری استبداد کے طوفان بلاخیز میں آزادی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ لے کر آگے بڑھتا گیا۔ آپ بیتی کے مولف ظفر حسن اس جیش کے ایک مجاہد تھے۔

اس قافلہ حریت میں مندرجہ ذیل طلباء شامل تھے:۔

۱۔ میاں عبدالباری (گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے طالب علم) بعد میں مسلم لیگ اور جناح عوامی مسلم لیگ کے رہنما رہے۔

۲۔ شیخ عبدالقادر (گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے طالب علم)

۳۔ عبدالمجید خان (گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم)

۴۔ اللہ نواز خان (گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم)

۵۔ شیخ عبداللہ (گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم)

۶۔ عبدالرشید (گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم)

۷۔ ظفر حسن (گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم، مئولف آپ بیتی)

۸۔ محمد حسن (اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم)

۹۔ خوشی محمد (کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور، سیکنڈ ایئر کے طالب علم)

۱۰۔ عبدالحمید (کے۔ ای میڈیکل کالج لاہور، دوسرے سال کے طالب علم)

۱۱۔ رحمت علی (کے۔ ای میڈیکل کالج لاہور، دوسرے سال کے طالب علم) آزادی کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں چند سال فرانسیسی کے استاد رہے۔

۱۲۔ شیخ شجاع اللہ (کے۔ ای میڈیکل کالج لاہور، سال دوم کے طالب علم)

گورنمنٹ کالج کے غلام حسین اور چیفس کالج کے عبدالخالق نے بھی حلف اٹھایا تھا مگر بوجوہ قافلے کے ساتھ نہ جا سکے۔

اس قافلہ حریت اور جیش مجاہدین کے سب افراد اپنے اپنے وقت پر خالق حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔ صرف ظفر حسن ایبک ان پُر عزم لوگوں کی داستان سنانے کے لئے اس وقت عالم اسلام کے تاریخی مرکز استانبول میں زندہ و سلامت موجود ہیں۔ اپنی تنہائی اور ضعیفی کے باوجود جب وہ اس داستان پارینہ کا کوئی ورق الٹتے ہیں تو جوش و جذبے کی ایک لہران کی ضعیف رگوں میں دوڑنے لگتی ہے۔

ظفر حسن ایبک کی یہ آپ بیتی جو در حقیقت جہاد حریت کی ایک روح پرور داستان بھی ہے اور محکومی سے آزادی تک ہمارے ملی سفر کی تاریخ کے بعض اہم اور گمشدہ اوراق کی بازیافت بھی، پہلی بار تین حصوں میں علی الترتیب ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۳ء میں طبع و شائع

ہوئی۔ اس کی اشاعت کا قومی اخباروں نے خیر مقدم کیا اور اس پر تبصرے ہوئے اور مضمون لکھے گئے۔ یہ آپ بیتی حوالے کی ایک کتاب بن گئی۔ مگر اس اہم کتاب کی طباعت اتنی ناقص اور اغلاط سے پُر تھی کہ تبصرہ نگاروں نے موضوع کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس امر کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھا کہ اتنی قیمتی دستاویزی تاریخ اور اس کا یہ حلیہ!

۱۹۸۵ء میں جب میں استانبول آنے لگا تو میرے محترم دوست ڈاکٹر میاں عبدالشکور احسن پروفیسر امریطس نے مجھے کہا کہ استانبول میں ششلی کے قریب ایک بزرگ ہستی ظفر حسن ایبک رہتے ہیں۔ اگر وہ موجود ہوں تو ان سے ضرور ملنا۔ وہ ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ (میاں صاحب ۱۹۷۷ء میں ان سے مل چکے تھے) ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو میں استانبول پہنچا۔ اپنی نئی ذمے داری سنبھالی اور دو ماہ تک قونصل خانہ پاکستان سمیت مختلف ذرائع سے ظفر حسن صاحب کا پتہ دریافت کرتا رہا۔ مگر کوئی بتانے کو تیار نہ تھا۔ پاکستانی قونصل خانے کا عدم تعاون تو میرے لئے خاص طور سے موجب حیرت بنا رہا۔ جس کی ایک الگ داستان ہے۔ ایک روز اتفاق سے قونصل خانے کی ایک گاڑی میرے پاس تھی اور قونصل خانے کے ایک افسر اور شوفر میرے ساتھ تھے۔ میں نے حبیب بنک سے نکلتے ہوئے شوفر سے کہا کہ مجھے ششلی میں ظفر حسن ایبک کے گھر لے چلو۔ چند منٹ میں ہم ہلٹن کے سامنے جمہوریہ جادہ سی پر واقع "ہوا پیلس" میں پہنچ گئے۔ دوسری منزل پر ظفر حسن کا فلیٹ تھا۔ اس طرح استنبول پہنچنے کے دو ماہ بعد میری ظفر حسن ایبک سے پہلی بار ملاقات ہو سکی اور اس تعارفی ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے کہ جیسے ہم ایک ہی خاندان کے دو فرد ہوں۔ گزشتہ تین سال کے دوران ظفر حسن مجھ پر انتہائی شفقت فرماتے رہے اور محبت و شفقت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ پہلی ملاقات کے جلد بعد ہی مجھے ان کی آپ بیتی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ یہ ظفر حسن ایبک کی سوانح حیات ہی نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ بھی ہے۔ مگر ناقص طباعت اور اغلاط نے اس کا حلیہ بگاڑا ہوا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی میں میری زیر نگرانی ایک طالبہ نے اردو آپ بیتیوں پر تحقیقی کام کیا تھا۔ ظفر حسن کی یہ آپ بیتی اس وقت منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ اب جو اس آپ بیتی کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ حقیقت پسندی اور حقائق نگاری میں ظفر حسن کی آپ بیتی اردو ادب میں بے مثال ہے۔ ظفر حسن ادیب یا شاعر نہیں مگر علم و ادب سے انہیں گہرا شغف ہے۔ وہ بڑے راست گو اور

راست باز ہیں۔ آپ بیتی میں بھی انہوں نے راست گوئی کے دامن کو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جو بات ان کے علم اور مشاہدے میں آئی ہے اسے بیان کیا ہے۔ خیال آرائی سے در گزر کیا ہے۔ ادبی آرائش بیان سے بھی انہوں نے اجتناب کیا ہے۔ واقعات و حقائق کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ناقص طباعت کے علاوہ بعض جگہ تکرار کا بھی احساس ہوا۔ اردو جملوں اور لفظوں کے ساتھ اکثر انگریزی جملوں اور لفظوں کی تکرار آپ بیتی کے بیانیہ اسلوب میں کھٹکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ تین حصوں پر مشتمل اس آپ بیتی کو اگر غیر ضروری حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک جلد میں سمیٹ دیا جائے تو کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل یہ ایک اچھی کتاب بن جائے گی۔ تصاویر اور دستاویزات کے عکس بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ دینا بھی مناسب ہو گا۔ میں نے اپنے اس خیال سے ایک روز ظفر حسن صاحب کو آگاہ کیا اور وہ آپ بیتی کی تدوین نو پر آمادہ ہو گئے۔ انہی دنوں ترکیہ میں پاکستان کے سابق سفیر جناب الطاف اے شیخ بھی ایک روز ظفر حسن ایبک کے گھر آئے ہوئے تھے۔ یہ تجویز ان کو بتائی گئی تو انہوں نے بھی اس کی تائید کی اور مجھے اس کام کو سرانجام دینے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں نے فرصت کے اوقات میں آپ بیتی کی ترتیب نو کو پیش نظر رکھا۔ واقعات میں کسی قسم کی قطع برید کئے بغیر آپ بیتی کے اسلوب کو جتنا صاف، واضح اور سلیس بنایا جا سکتا تھا، اس پر توجہ مرکوز کی۔ جہاں کسی لفظ یا جملے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی وہاں ظفر حسن صاحب سے تبادلہ خیال کر کے ان سے اجازت حاصل کی۔ اس طرح آپ بیتی کا جو ترمیم شدہ نیا مسودہ تیار ہوا، اس میں مؤلف پوری طرح مرتب کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ اس اشتراک کے بغیر نئے ایڈیشن میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا ممکن نہیں تھا۔

نو ترمیم ایڈیشن میں ایک یہ تبدیلی بھی کی گئی ہے کہ پہلی اشاعت کے تین حصوں کو ختم کرنے کے ساتھ بعض ابواب کو بھی کم کر کے انہیں دوسرے ابواب میں ضم کر دیا گیا ہے۔ تینوں حصوں کے ابواب نئی اشاعت میں ایک تسلسل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ موجودہ اشاعت کل اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ذیلی سرخیاں البتہ قائم رکھی گئی ہیں۔ تصاویر کے سلسلے میں یہ وضاحت کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ طباعت کے جدید طریقے (نستعلیق کمپیوٹر) میں تصاویر کو متن کے ساتھ ساتھ دینا مشکل تھا، اس لئے تصاویر اور دستاویزات کتاب کے آخر میں یکجا دے دی گئی ہیں۔ البتہ متن میں جس جگہ سے متعلق کوئی تصویر ہے وہاں اس کا حوالہ نمبر دیا گیا ہے، اور یہی نمبر آخر میں تصاویر اور دستاویزات کے ساتھ دیا گیا ہے۔ صرف ایک تصویر

کتاب کے سرورق کے ساتھ اندر دی گئی ہے اور وہ مؤلف آپ بیتی ظفر حسن ایبک اور ان کی ترک اہلیہ امینہ مکرم خانم کی ہے۔

پہلی اشاعت کے حصہ اول میں شریف الحسن پریس اتاشی سفارت پاکستان کا مقدمہ علیٰ حالہ موجودہ اشاعت میں شامل کیا گیا ہے۔ موصوف کی یہ خدمت قابل قدر ہے کہ انہوں نے ظفر حسن ایبک کو یہ آپ بیتی لکھنے پر آمادہ کیا۔

اس مرحلے پر آپ بیتی کے تعارف یا اس پر تبصرے کی گنجائش نہیں۔ قارئین مطالعے کے بعد خود اس سے محظوظ ہو سکتے اور نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ظفر حسن نے نہایت سادگی اور راست گوئی سے جو کچھ ان کے حافظے میں محفوظ تھا، اس میں بیان کر دیا ہے۔ کسی حقیقت کو چھپانے یا اس پر ملمع چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی رہبری میں (کہ وہ ہر جگہ انہیں اپنا استاد کہتے اور قبلہ مولانا کہہ کر ان کا ذکر کرتے ہیں) انہوں نے کابل میں کانگرس کمیٹی قائم کی اور پھر ترکیہ پہنچ کر ١٩٢٥ء میں اس کمیٹی کے عہدیدار کی حیثیت سے سوراجیہ کا دستور پہلے اردو میں شائع کر کے برصغیر میں بھیجا۔ جب یہ وہاں ضبط ہو گیا اور اس کا داخلہ وہاں ممنوع ہو گیا تو پھر اسی پروگرام کو کچھ بدل کر انگریزی میں چھپوایا اور اسے بھیجنے کی سعی کی۔ اس طرح مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے معتمد ظفر حسن نے وطن سے دور رہ کر بھی استخلاص وطن کی جدوجہد میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور جنگ آزادی کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ سربکف رکھا۔ لیکن جیسا کہ قدرتی امر ہے وہ ملک سے باہر تھے اور ملک کے اندر کی سیاسی فضا جس سرعت سے تبدیل ہو رہی تھی اس سے پوری طرح باخبر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی ١٩٣٩ء میں جب وطن واپس آئے تو ان کا سیاسی پروگرام رفتار حالات سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے یہ تاثرات بڑے معنی خیز اور دلچسپ ہیں۔

بہر کیف، ظفر حسن کی یہ آپ بیتی ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک اہم حصہ اور اس سلسلے کے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

(ڈاکٹر) غلام حسین ذوالفقار
استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی
(٢٩ اکتوبر ١٩٨٨ء)

مندرجہ بالا تحریر جب مطبع کو بھیجی گئی تھی تو ظفر حسن ایبک ہم میں موجود تھے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ آپ بیتی کی طباعت جدید دیدہ زیب ہوگی۔ مگر افسوس کہ انہیں یہ دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ ۵۔ جنوری ۱۹۸۹ء کو سحر کے وقت ان کی پاک روح قفس عنصری سے آزاد ہو گئی اور وہ اس جہان فانی سے رحلت فرما کر عالم جاودانی کو اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

غلام حسین ذوالفقار

(۱۳، مارچ ۱۹۸۹ء)

مقدمہ

شریف الحسن

مسلمان جو ایک زمانہ میں فن تاریخ نویسی میں گوئے سبقت لے گئے تھے، افسوس ہے کہ وہ اب اس میدان میں بہتوں سے پیچھے ہیں، اس بو قلموں دنیا میں گوناگوں تاریخی حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں، متمدن اقوام کے ہوشمند آئندہ نسلوں کے لئے انہیں قید تحریر میں لاتے اور اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے تفسیر و تاویل، تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں، مگر عالم اسلام میں یہ ذوق ابھی طفولت ثانیہ کے دور سے گزر کر شباب پر نہیں پہنچا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں ممالک اسلامیہ میں بہت سے سریع مگر دیرپا و دور رس انقلاب آئے مگر ہم نہ ان کی پوست کندہ حقیقت سے آگاہ ہیں نہ ان کے اسباب و علل پر مطلع، مغرب میں اصحاب سیف عملی زندگی ختم کر کے اہل قلم بن جاتے اور تاریخ کی خدمت بجالاتے ہیں، مگر ہمارے بزرگ جو میدان سیاست میں سرگرم عمل رہے ان پر کوتاہ قلمی، بے محل انکسار یا شہرت ناپسندی کا بالعموم ایسا غلبہ رہا کہ انہوں نے ہمیں بہت سے تاریخی حقائق سے محروم رکھا اور اغیار کی غلط بیانیوں بلکہ دروغ بافیوں کی بھی تردید نہ کی، ہمارے نزدیک یہ تساہل و تسامح ناقابل عفو ہے، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ بعض حالات میں حقیقت کا پردہ چاک کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ نشرو اشاعت پر قدغن ہوتا ہے، نامساعد ماحول میں مولف یا اس کے متعلقین بلکہ پس ماندگان تک کو گزند پہنچنے کا خوف ہوتا ہے یا پھر پرانے رفقائے کار کے ملال خاطر نیز مخالفوں کی دل آزاری کا اندیشہ دامن گیر ہوتا ہے، اس کا سہل تدارک یہ ہے کہ پہلے صحیح واقعات بلا خوف لومۃ لائم لکھ کر محفوظ کر لئے جائیں، پھر حسب مصلحت مولف کی وفات کے بعد بلکہ اس پر ربع یا نصف صدی گزرنے کے بعد اشاعت کی وصیت کر دی جائے،

میں خوش ہوں کہ میری اس نہج کی تقریر سے متاثر ہو کر ظفر حسن ایبک صاحب نے اپنی سوانح حیات لکھنے کا تہیہ کر لیا، جب آب و دانہ کی کشش مجھے استانبول لائی تو پہلے ہی چند دنوں میں آپ جیسے محب پاکستان اور "ترک پاکستان جمعیت،، کے سرگرم کارکن سے شرف نیاز حاصل کرنا مجھ پر واجب تھا، پہلی ہی ملاقات میں میں صاحب موصوف کے حسن اخلاق، خلوص و محبت، سادہ مزاجی اور کسر نفسی کا گرویدہ ہو گیا تھا اور جب رفتہ رفتہ کرید کرید کر پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کی دھن میں آپ نے ۱۹۱۵ء میں بی اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر والدین اور بھائی بہن کو خیرباد کہا اور افغانستان، روس اور ترکی میں جلاوطنی کی صعوبتیں گوارا کیں تو میری گرویدگی عقیدت و ارادت میں بدل گئی، آج آزادی کی جس نعمت سے ہم مالا مال ہیں اسے بروئے کار لانے میں ظفر حسن صاحب جیسے سرفروش و جانباز مجاہدوں اور سرپھرے فدائیان حریت کا بھی ہاتھ ہے۔

چونکہ ان کی اس "آپ بیتی،، کا جو جگ بیتی بھی ہے یہ ہیچ میرز محرک ہوا تھا موصوف نے اس کا مقدمہ لکھنے کی خدمت مجھے تفویض کی جو میرے لئے موجب افتخار بھی ہے اور باعث امتنان بھی، جب میں نے اس آپ بیتی کا حصہ اول جو ہدیہ ناظرین ہے از اول تا آخر پڑھا تو میری نگاہوں میں ظفر صاحب کی قدر و منزلت دوبالا ہو گئی،

آپ نے اپنی سرگزشت بدون کسی عبارت آرائی کے نہایت سادگی سے قلم برداشتہ لکھی ہے مگر اس سے صداقت اور خلوص ٹپکتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ابتدائے عمر کے حالات بھی اس دور کی عمرانی و سماجی تاریخ کے لئے کارآمد ثابت ہوں گے، ہندوستان کو آزاد اور پاکستان کو وجود میں لانے والا ہمارا متوسط طبقہ ہی تھا جس کی جڑیں بفحوائے

کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ
(سورۃ ابراہیم، آیت ۲۴)

سرزمین وطن سے پیوستہ تھیں، بھلا اب کون یقین کرے گا کہ نصف صدی قبل تین روپے ماہوار میں تعلیم کا خرچ چل جاتا تھا، گھروں میں تیل کا چراغ جلتا تھا۔ مستورات چرخہ کاتتی اور چکی پیستی تھیں، طلبہ کھڑے ہو کر راتوں کو پڑھتے تھے کہ نیند کے جھونکے نہ آئیں، کم سن بچے صبح شام کوسوں پیدل چل کر بلکہ دریا پیر کر مکتب آتے جاتے تھے،

پیش نظر کتاب بیشتر مولف کے قیام افغانستان سے متعلق ہے، یہاں پڑھنے والوں کے

لئے بہت سے محل استعجاب ہیں۔ اب ہمارے ہم جوار افغان بھائی شاہ راہ ترقی پر گامزن ہیں آج سے پچاس سال پہلے افغانستان کی زبوں حالی، بدنظمی، جور و تعدی، جہالت کا جو نقشہ ظفر صاحب نے دلخراش الفاظ میں کھینچا ہے وہ اب قصہ پارینہ معلوم ہوتا ہے،

کتاب کا حقیقت افروز حصہ ٹھل کے محاربہ کا چشم دید بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھل پر نادر خان کے حملہ کی نوعیت چھاپہ سے زیادہ نہ تھی، افغانستان سپاہ میں نہ شوق غزا تھا نہ ذوق شہادت، نہ توپ و تفنگ اور اسلحہ جنگ وافر مقدار میں موجود تھے نہ گولہ بارود ہی بقدر ضرورت فراہم تھا بہرحال خدا تعالیٰ کو افغانوں کی سرخ روئی منظور تھی، انگریزوں کی سراسیمگی اور نادر خاں کے تدبر اور ان کی فوجی قابلیت نے شکست کو فتح میں مبدل کر دیا اور انگریزوں نے افغانستان کے مکمل استقلال کو تسلیم کر لیا۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ (سورۃ فاطر آیت ۱۷)

حیرت در حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے زعماء اور علماء اس عہد کے افغانستان سے دور از کار حسن ظن اور لاطائل امیدیں رکھتے تھے۔ "آپ بیتی،، اس طول امل کی صبر آزما و زہرہ گداز روئیداد ہے، بھلا جس ملک کی آبادی اس وقت ۸۰ لاکھ بھی بمشکل ہو، سواد اعظم جاہل و مفلس ہو، فوج غیر منظم بلکہ بے سری اور سرکش ہو، سرواران فوج حتی کہ ان کے سپہ سالار ایک کے سوا سب کے سب بھی فوجی تربیت سے عاری اور علم سوق الجیش سے نابلد ہوں، خزینہ تہی ہو اور توپ و تفنگ و جدید اسلحہ جنگ نیز گولہ بارود قریب قریب مفقود ہو — وہ کس طرح تقریباً بیس کروڑ نفوس پر مشتمل ہندوستان جیسے وسیع برصغیر کو برطانیہ جیسی جہاں گیر و جہاں دار قوت کے چنگل سے چھڑا سکتا تھا؟ چڑیا کا پھندا تو تھا نہیں جو کوئی ایسا سکھی کوئی ویسا سکھی چھڑا دیتا!

تحریک ہجرت کا سانحہ ہائلہ الگ سخت عبرت انگیز و المناک ہے اور ہندی مسلمانوں کی سادہ لوحی و خود فریبی کی آپ مثال ہے، محل استعجاب ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ اور نام نہاد قائدین ملت اور زعماء امت بین المِلَل سیاست سے کس درجہ ناآشنا اور ممالک اسلامیہ کے حق میں کس قدر خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔

وَإِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِي فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ
وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جرمن چاہتے تھے کہ انگریزوں کے پہلو میں کانٹا چبھوئیں تاکہ ان کی توجہ اصل میدان کار زار سے ہٹے اور ہندوستان و افغانستان کی سرحد کی طرف بٹے، یہ فرصت و مہلت غنیمت جان کر جرمن لاکھوں کروڑوں بھی بے دریغ صرف کرتے تو مہنگا نہ تھا، انہیں اس بہانہ افغانوں اور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو ابلہ فریبی سے محض آلہ کار بنانا مقصود تھا ورنہ یہ فروعی محاذ ہندوستان کے درد کا مداوا نہ تھا۔ جرمنوں اور افغانوں کے برتے پر ہندوستانی خصوصاً ہندی مسلمان ناکام بغاوت کے مرتکب ہوتے تو انگریزوں کی آتش انتقام کا شکار ہوتے، مگر کارکنان قضاوقدر کو تیس سال بعد دولت خداداد پاکستان کو کتم عدم سے منصہ شہود پر لانا مطلوب تھا،

آپ بیتی کا پہلا حصہ جو قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہے دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، ظفر حسن صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی صحبت میں گیارہ سال افغانستان روس اور ترکی میں بسر کئے ہیں،

مولانا مرحوم سے سیاسی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ تفسیر قرآن شریف اور شاہ ولی اللہ کی حکمت وفلسفہ کا درس بھی لیا ہے جس کی جھلکیاں دوسرے اور تیسرے حصوں میں نظر آئیں گی۔ مولانا مرحوم نے افغانستان سے متعلق اپنی مطبوعہ ذاتی ڈائری میں بتقاضائے مصلحت بعض امور کی پردہ پوشی کی تھی کیونکہ اس وقت انگریز ہندوستان پر ہنوز حکمران تھے، ظفر صاحب نے حصہ اول میں بعض ایسے حقائق کی نقاب کشائی کی ہے جن سے اب تک خواص بھی باخبر نہیں تھے۔ حصہ دوم میں مولانا سندھی مرحوم کی روس اور ترکی کی سرگرمیوں کا ذکر ہوگا جن سے دنیائے علم تاحال ناواقف ہے، حصہ سوم ایک صاحب کے ترکیہ میں توطن اختیار کرنے کے بعد کے احوال پر محتوی ہوگا،

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ہیچمداں شریف الحسن

درسعادت استانبول، غرہ جمادی الثانی ۱۳۸۴ ہجری

پہلا باب

آغاز داستان

پیدائش دہلی سے ۷۶ میل اور پانی پت کے مشہور میدان جنگ سے تقریباً ۲۵ میل شمال میں شہر کرنال واقع ہے اس کے محلہ قاضیاں میں ایک چھوٹے سے زمیندار کا سہ منزلہ پختہ مکان تھا۔ آس پاس ان کے دوسرے ارائیں رشتہ داروں کے ایک منزلے، دو منزلے اور بعض بعض تین منزلے گھر تھے۔ یہ مکان میرے والد صاحب مرحوم حافظ عظیم الدین صاحب کا آبائی گھر تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں میں نسبتاً زیادہ اچھی حیثیت رکھتے تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مثلاً ہمارے محلے کی مسجد میں، باوجود مسجد کا امام اور حافظ موجود ہونے کے، جب کبھی والد صاحب مرحوم اپنی نوکری کے دورے سے فارغ ہو کر کرنال واپس آتے اور شام کی نماز کے لئے مسجد کو جاتے تو لوگ امامت کے لئے انہی کو آگے بڑھا دیا کرتے تھے اور جمعہ کے دن انہی سے خطبہ پڑھنے اور نماز پڑھانے کی درخواست کیا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم اپنے والد کی زندگی میں کھیتی باڑی کا کام چھوڑ کر بغرض تعلیم بلا اطلاع دیوبند چلے گئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آکر پھر بلا اطلاع بھوپال چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں ریل وغیرہ تو زیادہ نہ تھی، اس لئے ان کو اس سفر میں کافی تکلیفیں پہنچیں۔ وہاں انہوں نے قرآن شریف حفظ کیا اور اس زمانے میں مسلمانوں میں جتنی تعلیم کا رواج تھا اس کو حاصل کیا اور وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ وہاں اتنی مدت رہے کہ ان کے والدین ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ان کی والدہ کی بینائی ان کے فراق میں روتے روتے کم ہو گئی تھی۔ وہ جب واپس آئے تو ان کی والدہ نے ان کو دیکھ کر (میری والدہ صاحبہ کی روایت کے مطابق)، یہ کہا "بیٹا! خدا کرے تم بھی اپنی اولاد کی وجہ سے اسی طرح بلکتے رہو جس طرح

میں تمہارے لئے تڑپتی رہی ہوں،، خدا کی شان کہ آگے چل کر والد صاحب مرحوم کو میری جدائی کا داغ لگا اور وہ مجھے دوبارہ دیکھے بغیر میری یاد میں تڑپتے تڑپتے فوت ہوگئے۔

والد صاحب نے بھوپال سے واپس آکر کھیتی باڑی چھوڑ دی اور اپنی زمین کاشت پر دے کر خود سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق مرحوم کو بھی ملازمت دلوا دی تھی اور وہ قانونگو بن گئے تھے۔

میں ۲۶ ستمبر ۱۸۹۵ء کی رات کو پیدا ہوا۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اس رات سخت بارش ہو رہی تھی۔ ان کے قول کے مطابق میں پیدائش کے وقت بہت ہی کمزور تھا یہاں تک کہ میری زبان سوکھی ہوئی اور تالو کو چمٹی ہوئی تھی۔ دایہ کو پہلے تو یہ خیال آیا کہ میری زبان ہی نہیں ہے لیکن بعد میں جب تالو سے چمٹی ہوئی دیکھی تو اسے چھوارے کے شربت سے نرم کر کے تالو سے جدا کیا۔ کہتے ہیں کہ میں اتنا کمزور تھا کہ کبھی میں روتا تو میری آواز ساتھ والے کمرے میں بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ غالباً اس پیدائشی کمزوری کی وجہ سے میں ساری عمر نہیں پنپا اور اپنے ہم عمر لڑکوں کی نسبت میرا جسم ذرا چھوٹا تھا۔

میرے والدین کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے میری بڑی بہن نعمت بی بی اور بڑے بھائی محمود حسن اور میں زندہ رہے۔ بھائی صاحب والدین کی پہلی اولاد نرینہ ہونے کی وجہ سے والد صاحب کے بڑے لاڈلے تھے۔ میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ کا پیارا تھا۔

تعلیم

ہمارے اس وقت کے دستور کے مطابق، میں جب چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہوا تو مجھے ارائیوں کے محلے کی مسجد میں قرآن شریف کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ مجھے مسجد لے گئیں اور حافظ جی کے سپرد کر آئیں لیکن میں وہاں سے دو گھنٹے کے بعد ہی بغیر کسی سے اجازت لئے نکل کر گھر آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل وہاں تنگ آیا اور میں سبق سے بھاگ نکلا تھا۔ لیکن تعلیم سے یہ میرا ساری عمر میں پہلا اور سب سے آخری فرار تھا۔ دوسرے دن پھر مجھے ہمشیرہ صاحبہ مسجد لے گئیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل ایسا لگا اور حافظ جی مجھے ایسے پیار سے پڑھانے لگے کہ میں ان کا معتمد بھی بن گیا۔ ان کو محلے کے گھروں سے جو کھانا آیا کرتا تھا اس کی نگرانی انہوں نے میرے ذمے لگا دی تھی۔ میں نے پہلا قاعدہ اور عم کا سپارہ اسی مسجد میں ختم کیا۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم نے مجھے ایک نجی مدرسہ

میں جو حفظ قرآن کے لئے تھا داخل کرا دیا۔ وہاں میں نے چند سپارے حفظ کئے لیکن ایک روز جب حافظ جی نے مجھ سے دور لیا تو میں زبانی قرآن شریف نہ سنا سکا جس پر مجھے کان پکڑوائے گئے اور وہی سپارے پھر دوبارہ حفظ کرنے کو کہے گئے۔ میں نے چند دنوں میں دو سپارے حفظ کئے لیکن جب تیسرے سپارے کے حفظ کرنے کی نوبت آئی اور استاد نے پچھلے سبق سنے تو پھر زبانی نہ سنا سکا۔ والد صاحب کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ میرا حافظہ قرآن شریف حفظ کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے مجھے دینی درسگاہ سے اٹھا کر ایک مدرسہ میں جس کو ایک انجمن نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا ہوا تھا داخل کرا دیا۔ تعجب ہے کہ والد صاحب مرحوم اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں کا حافظہ تو اتنا اچھا تھا کہ وہ سب کے سب حافظ قرآن تھے لیکن نہ میں اور نہ مجھ سے پہلے میرے بھائی محمود حسن صاحب قرآن شریف حفظ کر سکے۔ میں اس نئے مدرسے میں کوئی ایک سال پڑھتا رہا اور یہاں سے پہلی جماعت پاس کی۔ لیکن چونکہ اساتذہ کچھ قابل نہ تھے والد صاحب مرحوم نے مجھے سرکاری ابتدائی سکول میں جو ذرا دور اور ہندوؤں کے محلے میں ایک بنئے کی حویلی میں تھا بھیج دیا۔ یہاں سے دوسری جماعت میں، جس میں ہندو اور مسلمان طلبہ ملے جلے پڑھتے تھے لیکن استاد مسلمان تھے میں اچھے نمبر لینے لگا اور جماعت کا مانیٹر مقرر ہو گیا۔ لیکن سالانہ امتحان میں مجھے حساب کے سوال حل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی حالانکہ میں اس مضمون میں اپنے ہم جماعتوں سے آگے تھا اور شام کو سبق کے بعد جماعت کو اکٹھا کر کے ان کو پہاڑے کہلایا کرتا تھا۔ اس ناکامی سے مجھے بہت رنج ہوا لیکن تیسری جماعت میں، میں نے اس کی تلافی کر لی اور وہاں سے پاس ہو کر کرنال ہائی سکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں مسلمان کاشت کاروں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مفت ملتی تھی مگر دوسرے لڑکے فیس دیا کرتے تھے، اس کے باوجود بھی ہماری برادری میں سے صرف پانچ چھ بچے سکول جایا کرتے تھے۔ ان کے سوا کسی اور نے نہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق ظاہر کیا اور نہ ان کے والدین نے کوئی ایسی آرزو دکھلائی! اس میں، میں ان لوگوں کو قدرے معذور بھی سمجھتا ہوں کیونکہ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کھیت میں لے جاتے اور وہاں ان سے کام لیا کرتے تھے جماعت میں ہندو لڑکے کثرت سے تھے۔ مسلمان جن کو رسول اللہ صلعم نے حکم دیا تھا کہ

(عربی)

الطلبو العلم من المهد الی اللحد

(گھوارے سے لے کر قبر میں جانے تک علم کے حاصل کرنے میں لگے رہو)۔ اس زمانے میں بھی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ چوتھی جماعت میں میں سب مضامین میں اچھا تھا لیکن سالانہ امتحان میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ جب انگریزی خوش خطی کی کاپی مجھ سے مانگی گئی اور کہا گیا کہ ,,سب سے اچھا لکھا ہوا صفحہ دکھلاؤ،، تو میں نے کسی عبارت والے صفحے کی بجائے اس آخری صفحے کو دکھلایا جس پر صرف عدد لکھے ہوئے تھے اس پر انسپکٹر نے میرے انگریزی کے نمبر کاٹ دیئے اور میں چوتھی جماعت سے پانچویں جماعت میں پاس ہو کر چڑھنے کی بجائے تین ماہ کی ترقی پر پانچویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس پر مجھے بہت شرم آئی۔ بھائی صاحب نے مجھے انگریزی پڑھانا شروع کیا اور اس پر خاص زور ڈالا۔ رات کو دوسرے روز کے سبق کے سارے نئے مشکل الفاظ ڈکشنری سے تلاش کرا کے کاپی میں نوٹ کرانے اور چھٹی کے دنوں میں سارے الفاظ کو مجھے زبانی یاد کرانے لگے۔ دوسرے سبقوں میں تو میں تھا ہی اچھا، اس لئے پانچویں جماعت کے سالانہ امتحان میں دوم نمبر پر آیا اور اس طرح پر مجھے تین سال کے لئے تین روپے ماہوار وظیفہ مل گیا، جس سے تین سال کے لئے میری تعلیم کا خرچ نکل آیا اور میں اپنے والدین پر تعلیم کے خرچ کے لحاظ سے بار نہیں بنا۔

ہمارے زمانے میں ابتدائی سکول کی چوتھی اور پانچویں جماعتوں میں فارسی زبان لازمی تھی لیکن ہم نے جو کچھ فارسی، سکول کی کتابوں سے پڑھی اور سیکھی وہ (آب زر = سونے کا پانی) اور (نان گرم = گرم روٹی) جیسے آسان فقروں سے زیادہ آگے نہ گئی اور فارسی بولنے کی ہم میں، کبھی بھی ہندوستان میں رہتے ہوئے قابلیت پیدا نہ ہوئی۔ جب مجھے آگے چل کر کابل جانا پڑا تو وہاں فارسی زبان میں گفتگو کے لحاظ سے بالکل جاہل ہی نکلا تھا۔ ہم نے پانچویں جماعت میں فارسی کی صرف و نحو اور گلستان و بوستان سے بعض انتخابات پڑھے۔ سعدی کی حکمت آمیز کہانیوں اور نصیحتوں سے فائدہ اٹھایا مثلاً ان کا یہ شعر۔ (نیم نانے گر خورد مرد خدا۔ بذل درویشان کند نیم دیگر) (مرد خدا وہی ہے جو اگر آدھی روٹی خود کھائے تو باقی آدھی روٹی فقیر کو دیدے) آگے چل کر میری ساری زندگی کا دستور العمل سا بنا رہا۔ نیز ان کا ایک قول ہے:

”از حکیمے پرسیدند ادب از کجا آموختی؟ گفت از بے ادبان! گفتند چہ طور؟ گفت ہرچہ آنہا کردند من از آں حذر نمودم“

یعنی ایک عقل مند سے پوچھا گیا کہ آپ نے ادب کہاں سے سیکھا؟ تو اس نے جواب دیا کہ ,,بے ادبوں سے،، کہا گیا ,,یہ کیسے؟،، تو اس نے جواب دیا: ,,بے ادبوں نے جو کچھ کیا میں نے اس سے پہلوتہی برتی اور اس سے اپنے کو بچایا۔،،

یہ حکمت آمیز قول بھی میری زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا اور میں ہمیشہ ناکارہ لوگوں کی صحبت سے دور رہا۔ مڈل سکول میں عربی اور فارسی زبانوں میں سے ایک زبان انتخاب کرنا پڑتی تھی۔ میں نے عربی لے لی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اردو زبان میں جو عربی الفاظ ہیں ان کو سمجھنا آسان ہو گیا اور جب کابل پہنچ کر استاد مرحوم مولانا عبید اللہ سندھی صاحب سے تفسیر قرآن شریف پڑھی تو کلام الٰہی کے سمجھنے میں اس سے مدد ملی۔ عربی کتابوں میں جو ضرب الامثال اور نصیحت آمیز فقرے پڑھے ان کا بھی میرے کیرکٹر اور عادتوں پر بہت اثر پڑا۔ مثلاً ایک نصیحت آمیز فقرے کا ترجمہ تھا: ,,انسان کے لئے زیادہ کھانا کھانے کی وجہ سے بیمار ہو جانا بڑی شرم کی بات ہے۔،،

اسی ذیل میں والد مرحوم نے مجھے یہ بتلایا کہ آنحضرت صلعم اپنی ضرورت سے چند ایک لقمے کم کھا کر دستر خوان سے اٹھ جایا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کا میری طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ کبھی بھی میں نے زیادہ کھانا نہ کھایا اور اس وجہ سے مجھے بدہضمی کی شکایت کبھی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہی موٹے پن سے جو بیماریاں پیدا ہوا کرتی ہیں، کبھی ان کا منہ دیکھا۔ اس سے میرا بدن ہمیشہ دبلا تو ضرور رہا لیکن چستی اور مستعدی میں اور مشکلیں جھیلنے میں، میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

والد صاحب مرحوم تہجد کی نماز کے بعد قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ صبح کی نماز کے لئے مجھے بھی جگاتے اور اپنے ساتھ مسجد میں لے جایا کرتے تھے اور واپسی پر ہر روز آدھا سپارہ تلاوت کرا دیتے تھے۔ اس طرح پر میں نے سارا قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا تھا۔ والدہ مرحومہ بھی نماز اور روزے کی بہت پابند تھیں۔ یہاں تک کہ اگر بیماری یا تھکن کی وجہ سے کھڑی ہو کر نماز نہ ادا کر سکتیں تو بیٹھ کر ضرور پڑھ لیتی تھیں۔ گھر میں مذہبی اصولوں کی پابندی کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کرنال سکول کے بورڈنگ ہاؤس کے پاس جو مسلمان معلموں نے نماز کے لئے ایک چبوترہ بنا رکھا تھا وہاں ظہر اور عصر کی نماز کے لئے ضرور جایا کرتا تھا۔ چند ایک اور مسلمان طالب علم بھی باقاعدہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں ہم نے یہ چبوترہ پختہ بنا لیا تھا۔ اس پر آریہ سماجی ہندو طالب علموں

نے بھی اس کے پاس ہی ایک چبوترہ بنا کر پوجا شروع کر دی تھی۔ ہندو اور مسلمان لڑکوں میں اس بارے میں ایک رقابت سی تھی مگر اس سے کبھی تفرقہ یا جھگڑے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

میری چھٹی جماعت کے بعد ہمارے گھرانے کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ بھائی صاحب انٹرنس کے بعد مہندرا کالج پٹیالہ میں داخل ہو گئے تھے اور ان کی فیس اور پڑھائی کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ والد صاحب مرحوم اس زمانے میں سن رسیدگی کی وجہ سے سرکاری نوکری سے جدا ہو چکے تھے۔ اس دور میں پنشن کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کو نئی ملازمت کی تلاش میں دقتیں پیش آئیں۔ آخر کار نواب دوجانہ کے ہاں اہل کار بن گئے۔ لیکن اس ملازمت کی تنخواہ سے بہ مشکل بھائی صاحب کی تعلیم کا خرچ ہی پورا ہوا کرتا تھا۔ بھائی صاحب کی چار سالہ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے میں مجھے پالنے کے لئے میرے والدین، خاص کر والدہ صاحبہ مرحومہ نے جو قربانیاں کیں ان کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی قلق رہا کہ میں جوانی میں ہندوستان سے جدا ہو جانے کی وجہ سے ان کی کوئی خدمت نہ کر سکا اور بھائی صاحب کے سر پر چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ والدہ صاحبہ خود روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کرتیں لیکن میرے لئے دودھ اور بالائی ضرور مہیا کرتی رہیں۔ بنئے کی دکان سے خرید و فروخت کو گھٹانے کے لئے گھر میں خود ہی آٹا پیس لیا کرتی تھیں۔ صبح کے کام سے فارغ ہو کر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ دوپہر کے بعد اوڑھنی پر کشیدہ نکالنا، سوزن کاری کا کام کرنا اور اس طرح ضروری کپڑوں کو گھر میں خود ہی تیار کرنا ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

رات کو مطالعہ کرنے کے لئے ہم میں لیمپ جلانے کی مالی طاقت نہ تھی اور میں سرسوں کے تیل کے چراغ کے سامنے بیٹھ کر سبق یاد کیا کرتا تھا۔ اس سے میری بینائی کو چھوٹی عمر ہی میں کچھ نقصان پہنچ گیا۔

والد صاحب مرحوم نے دو سال تک تو بھائی صاحب کی تعلیم کا خرچ پورا کیا لیکن آخر کار دیکھا کہ وہ اپنی تنخواہ سے یہ کام سرانجام نہ دے سکیں گے۔ اس پر انہوں نے ہمارے رشتہ داروں میں سے وکیل خان بہادر مولوی عبدالغنی صاحب سے قرض مانگا۔ انہوں نے قرض کی بجائے اس شرط پر بھائی صاحب کی تعلیم اپنے ذمہ لے لی کہ تعلیم کے بعد جب بھائی صاحب نوکری حاصل کر لیں تو وہ اپنی برادری کے نوجوانوں کو اپنے خرچ پر تعلیم دلایا کریں۔ والد صاحب مرحوم نے یہ شرط منظور کی اور بھائی صاحب نے بھی اس شرط کو پورا کرنے کا ذمہ لیا۔ چنانچہ وہ نوکر ہونے

کے بعد ہمیشہ کئی مسلمان جوانوں کی تعلیم کا خرچ دیتے رہے۔ ساتویں جماعت میں مجھے سردی لگی اور سخت بخار آنے لگا۔ سالانہ امتحان میں مجھے اپنی جماعت میں اول نمبر آنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے بخار کی حالت میں بھی امتحان کے لئے سکول جاتا رہا۔ لیکن اردو کے امتحان کے دن بخار اتنا زیادہ چڑھا کہ اس روز سکول جانے کے باوجود بھی بخار کی وجہ سے امتحان نہ دے سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دو نمبروں کی کمی کی وجہ سے جماعت میں دوم رہا۔ اگرچہ اس سے میرے وظیفہ پر کوئی اثر نہ پڑا لیکن مجھے دوم ہونے پر افسوس ضرور ہوا۔ میں آٹھویں جماعت کے امتحان میں پھر اول نمبر نکل کر، دو سال کے لئے اور وظیفہ لینے میں کامیاب ہو گیا جس سے انٹرنس میں پڑھنا میرے لئے ممکن ہوا اور خاندان پر میری فیس کا بوجھ نہ پڑا۔

میں دسویں جماعت میں تھا کہ بھائی صاحب بی۔ اے پاس کر کے کرنال آئے اور وہاں ہائی سکول میں انگریزی کے ٹیچر بن گئے۔ اس کے بعد خدا کے فضل سے ہماری مالی مشکلات حل ہو گئیں، انہوں نے انٹرنس کے امتحان کی تیاری میں میری مدد کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرا جگر اور زہرہ (پتا) کچھ خراب ہو گیا تھا جس سے مجھے یرقان کا مرض لاحق ہوا اور میرا سارا بدن زرد ہو گیا۔ یہی بیماری ایک زمانے میں بھائی صاحب کو بھی لگی تھی اس لئے ان کو جلد ہی میرے علاج کرانے کا خیال آ گیا اور میں سالانہ امتحان سے پہلے ہی شفایاب ہو گیا۔ کرنال ہائی سکول کے لڑکے انٹرنس کے امتحان کے لئے انبالہ سنٹر میں جانے پر مجبور تھے۔ اس لئے میں بھی انبالہ گیا مگر بھائی صاحب میرے ساتھ گئے۔ خدا کے فضل سے میں نے امتحان اچھی طرح دیا اور ۱۹۱۱ء میں جب نتیجہ سنایا گیا تو میں اپنی جماعت میں اول نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد یونیورسٹی سے خبر آئی کہ مجھے کالج میں دو سال پڑھنے کے لئے سکالرشپ دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک بڑی خوش خبری تھی۔ بھائی صاحب مجھے لاہور لے گئے اور اسی سال گورنمنٹ کالج میں داخل کرا دیا۔

گورنمنٹ کالج میں میرا داخلہ

کالج میں وظیفہ خوار طالب علموں کو کواڈرینگل بورڈنگ ہاؤس میں علیحدہ علیحدہ کمرے جن کو کیوبی کل کہا جاتا تھا، دیئے گئے۔ باقی لڑکے ڈارمیٹری میں رہتے تھے۔ اس سے مجھے تندہی اور توجہ سے

سبق یاد کرنے اور مطالعہ میں مصروف ہونے کا موقع ملا ۔ فرسٹ ایئر کے مسلمان بورڈروں میں میرے ہم جماعت شیخ خوشی محمد بھی کیوبی کل میں رہا کرتے تھے ۔

ہم دونوں سائنس فیکلٹی میں تھے اور دوست بھی بن گئے تھے ۔ میرے متعلق والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحب کا فیصلہ یہی تھا کہ ایف ایس سی پاس کر کے میڈیکل کالج میں داخل ہوں ۔

گورنمنٹ کالج میں مجھے ہمیشہ یہی تمنا تھی کہ جماعت میں اول رہوں اس لئے رات کو دیر تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا ۔ لیمپ کو کھڑکی میں اونچی جگہ رکھ کر کھڑا ہو کر سبق یاد کیا کرتا تھا تاکہ نیند نہ آئے ۔ اس کو کالج میں کچھ لوگ تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے ۔ دوسرے طالب علم، خاص کر ہندو جن سے رقابت تھی، اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ۔ بڑی جماعتوں کے مسلمان طلباء دور سے سیر کیا کرتے تھے لیکن کسی کو جرات نہ ہوتی تھی کہ مجھ پر نکتہ چینی کرے یا مجھے کہے کہ اس طرح پر میری صحت خراب ہو جائے گی ۔ اس خیال سے کہ رات کو مجھے نیند جلد نہ آئے میں شام کو کھانا بہت ہی کم کھایا کرتا تھا لیکن اتوار کی رات کو بہت سویرے سو جایا کرتا تھا اور اتوار کے دن صبح کو دیر سے اٹھتا تھا تاکہ بے خوابی کی ذرا تلافی ہو جائے ۔ میں صبح کو ورزش کرنے اور فٹ بال گراؤنڈ میں دوڑ کر چکر لگانے کا عادی تھا ۔ شام کو ہاکی بھی کھیلا کرتا تھا ۔ میرے ہندو رقیب اس قسم کی ورزشوں اور کھیلوں کے شوقین نہ تھے ۔ ایف ایس سی میں میری صحت اچھی رہی مگر چند ایک دفعہ لاہوری پھوڑا نکلا جو خون کی خرابی سے تھا ایف ایس سی کے امتحان یونیورسٹی اور بعد میں آرگینگ کیمسٹری ۔ ا کے امتحان میں جو میڈیکل کالج کے داخلے کے لئے ضروری تھا میں اول نکلا ۔ اس سے مجھے دو سال کے لئے پھر وظیفہ مل گیا ۔ مگر یہ وظیفہ میڈیکل کالج کے لئے نہیں تھا، اس لئے میں ڈاکٹر بننے کے خیال سے در گزر کرنے پر مجبور ہوا ۔ اس پر میرے گھرانے نے فیصلہ کیا کہ میں بی اے میں Mathematicsاے وبی کورس لیکر انجینئرنگ کالج کی تیاری کروں ۔ ۲۔

قومی جذبات کی نشوونما

مجھے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ طرابلس شروع ہو گئی ۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان ہوئی ۔ مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیلی ۔ ترکوں کی حمایت میں عام جلسے ہونے لگے ۔ چندے جمع کئے جانے لگے تاکہ جنگ بلقان کے ترکی زخمیوں کی تیمار

داری کے لئے ہلال احمر کا ایک وفد ترکی بھیجا جائے ۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے ۔ میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا ۔ طرابلس کے شہیدوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس نظم کا جس کا عنوان ,, حضور رسالت مآب میں ،، ہے ، ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا ۔

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاض ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں ،،

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اشعار کی ، میرے زمانے کے مسلمان طالب علموں کے خیالات کو قومی اور اسلامی نہج پر لانے میں ، بہت تاثیر ہوئی ۔ کالج کے باغ کے کمپاؤنڈ میں مسلمان طالب علموں نے نماز کے لئے ایک چبوترہ بنا لیا تھا اسی کے نزدیک کسی بزرگ کی قبر تھی جس کا ایک متولی تھا ۔ ہم صبح کی نماز اکثر جماعت سے پڑھا کرتے تھے ۔ میں نماز فجر کے بعد اپنے ہم جماعت عبدالمجید خان مرحوم سے مسلمانوں کی عام حالت اور ترکوں کے بارے میں باتیں کرتا کرتا کواڈرینگل میں واپس آیا کرتا تھا ۔ ظہر کی نماز میں ، شہر میں رہنے والے مسلمان طالب علموں میں سے عبدالرشید مرحوم سے بھی اس قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں ۔ خوشی محمد کا بھی ہم سے علیحدہ ، اسی قسم کا ایک حلقہ احباب تھا جس میں ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں سے عبدالحمید ، عبداللہ ، شجاع اللہ اور غلام حسین شریک تھے ۔ اس حلقے کے ساتھ عبدالمجید خاں اور عبدالرشید کی نسبت ، میرا زیادہ تعلق تھا ۔ جنگ بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتی تھیں اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے ۔ ہمارے اس زمانے کے قومی اور مذہبی خیالات کی نشوونما میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور مولانا ابوالکلام مرحوم کے ہفتہ وار "الہلال" اور "البلاغ" کا بہت اثر ہوا ۔ انہی اخبارات کے مقالوں نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنا دیا ۔ انگریزوں کے بر خلاف بھی ہمیں انہی تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی انہی جریدوں نے پیدا کئے ۔

بلقان کی جنگ کے دنوں میں ایک دن بھائی صاحب جو اس وقت لاہور ٹریننگ کالج میں پڑھ رہے تھے مجھ سے ملنے کے لئے گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس کواڈرینگل میں آئے۔ دوپہر کی گرمی کی وجہ سے انہوں نے پانی پینا چاہا۔ میری صراحی میں اس وقت پانی نہ تھا۔ میں خوشی محمد کے کمرے میں پانی لینے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی صراحی توڑ ڈالی ہے اور ماتم میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ بلغاریوں نے شہر اڈریانوپل Adrianople پر جس کو ترک ادرنہ (Edrine) کہتے ہیں اور جہاں ترکی کی سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت مسجد سلیمیہ واقع ہے قبضہ کر لیا ہے اور اس پر اظہار غم کے لئے انہوں نے اپنی صراحی توڑ ڈالی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں واپس آکر بھائی صاحب کو یہ بات سنائی تو وہ کہنے لگے کہ ”ایسی حرکت بالکل بے وقوفی کے مترادف ہے۔ کیونکہ صراحی توڑنے سے ترکوں کو تو کوئی مدد نہیں مل سکتی صرف اپنا ہی نقصان ہے۔ اگر ان کی مدد کرنا ہے تو ضرور ہے کہ کچھ اور کام کیا جائے۔“

گورنمنٹ کالج میں آگ لگانے کا واقعہ

کچھ دن بعد ترکوں نے اڈریانوپل پھر فتح کر لیا اور جنگ بلقان ختم ہو گئی۔ لیکن یورپ کی حکومتوں نے اور خاص کر انگریزوں نے صلح کی شرطوں میں، مغلوب شدہ بلقانی قوموں کی ترکوں کے مقابلے میں طرف داری کی اور ان کی حمایت پر ڈٹ گئے۔ اس سے انگریزوں کے بر خلاف مسلمان نوجوان طالب علموں میں اور بھی جذبات بھڑک اٹھے۔ خوشی محمد اور ان کے چند دوستوں نے جن میں ہمارا ہم جماعت شجاع اللہ بھی شریک تھا یہ سوچا کہ گورنمنٹ کالج کو آگ لگا کر انگریزوں سے انتقام لیں۔ مجھے ان کے اس منصوبہ کا اس وقت علم نہ تھا۔ شجاع اللہ نے ایک رات کو کالج کے کلرک کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ مکا مار کر توڑا اور ان کے ساتھیوں نے کچھ مٹی کا تیل کمرے میں چھڑک کر مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے چیتھڑوں کو اندر پھینکا اور کمرے کو جلانے کی کوشش کی لیکن آگ زیادہ نہ جلی اور کمرے کے کاغذات وغیرہ کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ کمرے کے شیشہ کو مکا مار کر توڑنے سے شجاع اللہ کا ہاتھ زخمی ہوا۔ اس نے ہاتھ کا خون صاف کرنے کے لئے دیوار پر ہاتھ لگا دیا جس سے اس کا پنجہ دیوار پر اتر آیا۔ اگلے دن تحقیقات شروع ہوئی۔ کالج کے اساتذہ کو شبہ ہوا کہ یہ آگ لگانے کا واقعہ اس مزار کے

متولی کا کام ہے جہاں ہم کالج کے کمپونڈ میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ بد قسمتی سے انہی دنوں اس بے چارے کے ہاتھ میں، مزار کے ارد گرد کی جھاڑیاں صاف کرتے ہوئے کہیں ایک کانٹا لگا تھا جب پولیس نے اس کو پکڑا اور اس کے ہاتھ میں زخم دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا کہ کالج کو آگ لگانے کی کوشش اس نے کی تھی اس لئے بے چارہ قید میں ڈال دیا گیا گرچہ وہ اپنے کو بے گناہ ہی کہتا رہا۔

ہم مسلمان طالب علم جنہوں نے ایف ایس سی میں بوٹنی اور زوالوجی لی ہوئی تھی اکثر شام کو بوٹینکل گارڈنز جو لارنس گارڈن (اب باغ جناح) کے پرے تھے جایا کرتے تھے تاکہ وہاں سے مختلف قسم کے پودوں اور پھولوں کو دیکھیں اور نظری پڑھے ہوئے سبقوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ ایک شام کو خوشی محمد نے جس کو میرے قومی جذبات کا علم تھا اس باغ سے واپسی کے وقت مجھے راز داری کا حلف لے کر کالج کی آگ کا واقعہ سنایا اور اعتراف کیا کہ آگ لگانے کی شجاع اللہ اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی تھی۔

کالج کے ذمہ دار جب متولی کو مجرم ثابت نہ کر سکے تو چند دن بعد ان کو کالج کے طالب علموں پر شبہ ہوا اور ان کے ہاتھوں کا معائنہ کرنا چاہا۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک روز پہلے ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ شجاع اللہ کو گھر خبر بھیجی جائے کہ وہ اگلے روز کالج نہ آئے اور میں جو جماعت کا مانیٹر تھا اور جس پر پروفیسروں کا اعتماد تھا اور جماعت میں اگلی بینچ پر بیٹھا کرتا تھا دوسرے روز حاضری کے وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر آخری بینچ پر بیٹھ جاؤں اور جب حاضری لی جائے تو اپنے نام پر اور جب شجاع اللہ کی باری آئے، تو اس کے نام پر بھی (Yes Sir) کہہ کر جواب دوں تاکہ شجاع اللہ کی جماعت میں موجودگی کا ثبوت مل جائے۔ چنانچہ میں نے اسی طرح کیا، اور شجاع اللہ کو اس روز کالج میں حاضر مانا گیا۔

اس کے بعد ہمارے ہاتھوں کا معائنہ ہوا مگر کسی کے ہاتھ میں زخم نہ ملا۔ اگلے روز شجاع اللہ کالج آگیا اور باقاعدہ جماعت میں شریک ہو کر پڑھنے لگا۔ اس طرح آگ کا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کچھ مدت بعد متولی کو بھی رہائی مل گئی اور وہ پھر اسی مزار پر آگیا۔ اگرچہ جنگ بلقان ختم ہو گئی تھی لیکن ہم مسلمان طالب علموں میں انگریزوں کے خلاف جو جذبات پیدا ہو گئے تھے، وہ نہ صرف موجود تھے بلکہ بڑھ گئے تھے اور ہماری ہمیشہ یہی آرزو رہتی تھی کہ انگریزوں کے بر خلاف کوئی کارروائی کریں۔ اس زمانے میں بنگال میں تقسیم بنگال کے بر خلاف ایجی ٹیشن تھا اور بنگالی

انگریزوں کے بر خلاف بمباری کیا کرتے تھے اس لئے ہم لوگوں کو بھی خیال آیا کہ بنگالی ہندوؤں کی طرح بم سازی کریں یا بم کہیں سے حاصل کریں۔ یہ خیال ایک طفلانہ آرزو پر مبنی تھا۔ کیونکہ بنگالی ہندو جو تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کی وجہ سے اس تقسیم کے بر خلاف تھے بھلاوہ کیسے ہم کو اپنا ہم راز بنا کر ہم کو بم سازی سکھاتے یا ہم کو بم فراہم کرتے۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے جو اس وقت کلکتہ میں ,,الہلال،، نکالا کرتے تھے مل کر ان کے ذریعے سے بم حاصل کریں۔ اس غرض سے ہم نے شیخ عبداللہ کو کلکتہ بھیجا لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا کیونکہ مولانا آزاد مرحوم کی ایسی سیڈیشن کی کارروائیوں سے اور قتل وغارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

جنگ بلقان ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۳ء ہم نے ایف ایس سی کا امتحان دیا۔ خوشی محمد، شجاع اللہ اور عبدالحمید میڈیکل کالج چلے گئے۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں وظیفہ لے کر بی اے میں داخل ہو گیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ بی اے کے بعد انجینئرنگ کالج رڑکی میں داخلہ دلائیں۔ مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ بی اے میں پیور میتھمیٹکس اے کورس اور فزیکس لینے کا فیصلہ کرنے کے لئے بھائی صاحب نے مجھے استخارہ کرنے کو کہا۔ میں نے عشاء کی نماز کے بعد استخارہ کی دعا پڑھی اور سو گیا۔ میں نے رات کو جو خواب دیکھا اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ مجھے پیور میتھمیٹکس لیکر انجینئرنگ کالج کی تیاری کرنا چاہئے۔ اس پر میں نے میتھمیٹکس اے اور بی کورس لئے۔ میرے ساتھ بہت سے مسلمان طالب علموں نے بھی یہی کورس لئے حالانکہ اس سے پہلے مسلمان اکثر ریاضی سے جھجک کر تاریخ، فلسفہ وغیرہ جیسے آسان مضامین لیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں تھرڈ ائیر کے طالب علم (شیش محل) نام ہوسٹل میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے ہم کو کواڈرینگل سے شیش محل جانا پڑا۔ وہاں بھی مجھے علیحدہ کمرہ ملا اور میں بدستور سابق اپنی پڑھائی میں تن دہی سے مشغول اور مصروف رہا۔ ورزش باقاعدہ کیا کرتا تھا۔ صبح لارنس گارڈنز تک دوڑ لگایا کرتا تھا۔ شیش محل میں میرا کمرہ باغ کے احاطہ میں تھا۔

ایک شام کو میں جب کمرے سے نکلا تو باغ سے ایک سانپ کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دبے پاؤں اپنے کمرے کو واپس آکر وہاں سے ہاکی کی اسٹک لی اور اس سانپ کو مار ڈالا۔ جب میرے دوسرے ہم جماعتوں کو اس کا علم ہوا تو وہ میرے بڑے مشکور ہوئے اور میری جرات کو سراہنے لگے۔ اس سال چونکہ ہم اپنے میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے دوستوں سے دور

تھے اور ان سے ہماری چنداں ملاقات نہ ہوتی تھی اس لئے ہمارے قومی جذبات ذرا سو سے گئے تھے۔ فورتھ ائیر میں ہم پھر کواڈرینگل آ گئے تھے۔ یہاں ہر سال کیوبیکلوں کی تقسیم ہوتے وقت، سب سے پہلے تھرڈ ائیر میں اول نمبر پر پاس ہونے والے طالب علم کو سب سے اچھا کیوبیکل چھانٹنے کا حق دیا جاتا تھا۔ یہ حق اس دفعہ مجھے ملا۔ اس پر میرے دوست سردار محمد صاحب نے جو مجھ سے ایک سال آگے تھے کہا کہ بڑے گیٹ کے پہلو کا کمرہ جس کو رواج کے مطابق اول نمبر آنے والا طالب علم لیا کرتا تھا، میں نہ لوں کیونکہ شام کو فٹ بال فیلڈ کو جانے کے لئے ہر کوئی وہاں سے گزرتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں ہمیشہ بہت شور ہوا کرتا ہے اور مطالعہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اوپر کی منزل میں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کے نزدیک ایک کمرہ پسند کرنا میرے لئے بہتر ہو گا۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کر کے اوپر کی منزل میں کمرہ لے لیا۔ پڑھنے کے لئے بے شک یہ کمرہ بہت اچھا ثابت ہوا لیکن اوپر کی منزل پر ہونے کی وجہ سے گرمی میں آرام دہ نہ تھا۔

۱۹۱۴ء میں فورتھ ائیر کے مسلمان طالب علموں میں اسلامی جذبات بہت بڑھ گئے تھے۔ ہم سب مل کر مسلمان ملکوں کے ادبار کا چرچا کیا کرتے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس سے ہم سب جرمنوں کی کامیابی کی تمنا کرنے لگے کہ اب ہندوستان ضرور آزاد ہو جائے گا۔ ان دنوں انگریز فوجی بھرتی پر زور دے رہے تھے اور مسلمان طالب علموں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک روز ہمارے انگریزی کے پروفیسر مسٹر وادن نے مجھے کہا کہ ,,آپ فوج میں بھرتی ہو جائیں،، میں نے جواب دیا کہ ,,اگر فوجی کمیشن دو تو میں بھرتی ہونے پر تیار ہوں،، اس زمانے میں انگریز ہندوستانیوں کو فوج میں افسر نہیں بنایا کرتے تھے بلکہ زیادہ سے زیادہ نائک، حوالدار یا صوبہ دار یعنی Non Commissioned, افسر بنایا کرتے تھے۔

اس پر پروفیسر وادن نے کہا ,,تمہیں اپنے ملک اور اپنی حکومت کے لئے لڑائی پر جانا چاہئے،، میں نے اس کے جواب میں کہا۔ ,,یہ ملک میرا ملک نہیں ہے کیونکہ اس کی حکومت ہماری حکومت نہیں ہے۔،، اس جواب پر پروفیسر وادن بڑا چیں بہ جبیں ہوا لیکن خاموش رہا۔

کچھ ماہ بعد ترکی نے جرمنی کے ساتھ شریک ہو کر انگریزوں کے بر خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جہاد کا فتویٰ دیدیا۔ ہم نے اس فتوے کے متعلق ایک فوٹو گراف انگریزی جریدہ (گرافک) میں دیکھا جس میں ایک تصویر سلطان ترکی کی تھی جو ایک عام جلسہ میں جہاد کا

فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ The Sultan Proclaiming Jehad (HolyWar). Turkey Pronouncingher own death sentance. (یعنی سلطان جہاد مقدس کا اعلان کر رہے ہیں۔ ترکی اپنی موت کا فتویٰ خود ہی دے رہی ہے) اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی دو جماعتیں جو مدتوں سے انگریزوں کے خلاف خفیہ کام کر رہی تھیں ہمارے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان میں سے سب سے اہم مجاہدین کی جماعت تھی جس کا مرکز اسمس (Asmas) کے گاؤں علاقہ بنیر Buner میں ہے۔ اس جماعت کی بنیاد ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور ان کے بھائی مولوی عنایت علی کی طرف سے جو حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید کے شاگردوں میں سے تھے ڈالی گئی تھی۔
سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں سید احمد بریلوی کی قیادت میں مولانا شاہ اسماعیل صاحب برادر زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب پسر شاہ ولی اللہ صاحب نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سندھ کے راستہ افغانستان آکر سرحد میں ایک مرکز قائم کیا تھا۔ ان کا مقصد افغانستان سے تعلق پیدا کرنا اور سکھوں کی سلطنت کو پنجاب سے ختم کر کے پھر سلطنت دہلی اور وسط ایشیا کے درمیان جہاں سے مختلف زمانوں میں نئے نئے مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان پر یلغار کر کے یہاں کی اسلامی حکومتوں میں تازہ اسلامی خون ڈالنے کی بارہا کوششیں کی تھیں، پھر ایک دفعہ رشتہ اور رابطہ پیدا کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ (ضلع ہزارہ) کی لڑائی میں جو سکھوں کے برخلاف ہوئی تھی افغانی سرداران پشاور نے جنگ کے بڑے نازک موقع پر شاہ اسماعیل شہید اور ان کے کمانڈر سید احمد شہید کا ساتھ چھوڑ دیا جس سے ان کی فوج کو شکست ہوئی تھی اور وہ خود جام شہادت نوش کر گئے تھے۔
اس طرح مسلمانوں کی یہ کوشش آزادی بھی خاک میں مل گئی تھی۔ اس پر مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولوی عنایت علی نے شاہ اسماعیل صاحب کے باقی ماندہ پیروؤں کو جمع کر کے جماعت مجاہدین کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہونے کے بعد بھی یہ جماعت چندہ جمع کرنے اور نئے ممبر بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ چنانچہ اس ذیل میں ہمارے رشتہ دار مولوی محمد جعفر صاحب جو تھانیسر ضلع کرنال کے رہنے والے تھے، اس جماعت کے لئے خفیہ چندہ جمع کر کے سرحدی علاقہ کو بھیجا کرتے تھے، ایک نوکر

کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھ پڑے اور انگریزوں نے ان کو کالے پانی (یعنی جزیرہ انڈمان) بھیج دیا تھا۔ بعد میں ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کی ساٹھویں سالگرہ پر ان کو معافی ملی اور وہ کرنال آگئے تھے۔ میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا، دیکھا تھا اور ان کو (چچا جی) کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

فٹ نوٹ

۱۔ ۱۹۱۷ء سے قبل ایف ایس سی کے طلبہ میڈیکل و نان میڈیکل میں تقسیم نہیں ہوتے تھے بلکہ سب لوگ ایک ہی کورس پڑھتے تھے F.SC میں کامیابی کے بعد جو طلبہ میڈیکل کالج میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ ان کو Organic Chemistry کے پرچہ کی پرائیویٹ طور پر تیاری کرنا پڑتی تھی جس کا امتحان میڈیکل کالج والے لیتے تھے۔ پھر F.SC کے نمبروں اور گینک کیمسٹری کے پرچہ کے نمبروں پر میڈیکل کالج میں داخلہ کا انحصار ہوتا تھا۔

۲۔ اس زمانہ میں پنجاب میں کوئی انجینئرنگ کالج نہیں ہوتا تھا۔ وہ طلباء جو انجینئرنگ کالج میں شامل ہونا چاہتے تھے ان کو رڑکی انجینئرنگ کالج کے داخلہ کے مقابلہ کا امتحان دینا پڑتا تھا۔ عموماً B.A میں Mathematices A and B Courses پڑھنے والے اس امتحان میں شریک ہوتے تھے۔ رڑکی کالج اب بھارت میں واقع ہے۔

دوسرا باب

پنجاب سے ہجرت کے لئے ہماری تیاری اور سرحد کو روانگی

میرے کالج کے زمانے میں اس جماعت کے نمائندے، پنجاب میں وزیر آبادی مولوی فضل الٰہی تھے اور ان کا رابطہ لاہور میں مولوی عبدالرحیم المعروف بہ مولوی بشیر سے تھا۔ گورنمنٹ کالج کے مسلمان طالب علموں میں سے شیخ عبداللہ کا ان صاحبان سے تعارف ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کے ذریعہ دوسرے مسلمان طلباء کے خیالات کا پتہ لگایا۔ جب ان کو اطمینان ہو گیا تو انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ہمارے پاس بھیج دی۔ اس سے ہم سب میں، ترکوں کی صفوں میں شریک ہو کر انگریزوں کے بر خلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے خیالات کو قوی تر بنانے کے لئے انہوں نے ہمیں سپارہ (۱۰) سورۃ توبہ رکوع (۳) کی اس آیت کو

(عربی)

(قُل ان کان آباؤکم وَ ابناءکم وَ اخوانکم وازواجکم
وعشیرتکم و اموالِ ن اقترفتموھا وتجارۃٌ تخشون کسادھا
ومساکن ترضونھا احبّ الیکم من اللہ وَ رسولہٖ جہاد فی
سبیلہٖ افتربصوا حتیٰ یاتی اللہ بہ امرہ واللہ لا یہدی
قوم الفاسقین)

ترجمہ: تو کہہ دے اگر تمہارے باپ، بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ راستہ نہیں دکھاتا نافرمان لوگوں کو۔

پڑھنے، اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کی اور کہا کہ جہاد کے لئے اس دارالکفر سے نکل کر ہمیں ایک دارالاسلام میں چلے جانا چاہئے اور وہاں سے ترکی فوج میں داخل ہونے کے لئے ترکی پہنچنا چاہئے۔ ہم سب اس پر راضی تو ہو گئے لیکن میں نے استخارہ کئے بغیر اس طرح کا فیصلہ کرنا نہ چاہا۔ استخارے کے بعد میں نے رات کو خواب دیکھا کہ ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں ہوں۔ میں نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ مجھے بھی ہندوستان چھوڑ کر سرحد کے پہاڑی علاقے میں چلا جانا چاہئے۔ اس طرح پر میں نے بھی ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سے اپنے دوستوں کو اطلاع دی۔ رازداری کے لئے ہم سب نے قرآن شریف پر قسم کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے ہم سب ہم خیال طلباء نے یعنی گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے کے طالب علم میاں عبدالباری اور شیخ عبدالقادر بی۔ اے کے طالب علم: عبدالمجید خان، اللہ نواز خان، شیخ عبداللہ، عبدالرشید عبدالرحمٰن، غلام حسین اور میں۔ چیف کالج سے بی۔ اے کا طالب علم عبدالخالق اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کا طالب علم محمد حسن۔ میڈیکل کالج سے سیکنڈ ایئر کے طالب علم، خوشی محمد، عبدالحمید، رحمت علی اور شجاع اللہ ۶ جنوری ۱۹۱۵ء اتوار کے روز کشتی پر دریائے راوی میں گئے اور وہاں منجھ دھار میں قرآن شریف پر رازداری اور جہاد میں شریک ہونے کا حلف اٹھایا۔

بعد میں ہماری اس ٹولی میں اللہ نواز کا بھائی شاہ نواز خاں جس کی تعلیم بہت کم تھی اور اللہ نواز خان کے خاندان کا پروردہ عبدالحق نام ایک ان پڑھ سانو مسلم بھی شریک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مولوی فضل الٰہی اور مولوی بشیر سے مل کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کو سرحد پار چلا جانا چاہئے۔ اس سفر کے سارے انتظامات گورنمنٹ کالج کے طلباء کے لئے عبداللہ نے اور دوسرے کالجوں کے طالب علموں کے لئے خوشی محمد نے ان مولوی صاحبان سے مل کر کئے اور ۵ فروری ۱۹۱۵ء جمعہ کا دن ہماری روانگی کے لئے مقرر ہو گیا۔

رازداری کی قسم کھانے اور سفر کے دن کے درمیان تیس دن میں، میں اپنے والدین کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے چھٹی پر کرنال گیا۔ والدین کرنال میں نہ تھے۔ وہ بھائی صاحب کے پاس جو ان دنوں انبالہ ڈویژن میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز لگے ہوئے تھے، رہتے تھے۔ کرنال میں صرف ہمشیرہ صاحبہ تھیں۔ انہوں نے مجھے پڑھائی کی وجہ سے ذرا دبلا پایا اور میری

صحت کو قدرے مضمحل دیکھا۔ اس پر انہوں نے مجھے دو دن گھر رکھا اور میری صحت کی درستی کے لئے ہر طرح پر آرام پہنچانے کی بہت کوشش کی۔

میں کرنال میں مولوی عبداللہ شاہ صاحب مرحوم کا، جو حکیم بھی تھے اور عالم بھی تھے اور جن کا کرنال میں مطب تھا، مرید بن چکا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ جو وعظ کیا کرتے تھے ان سے میں نے کرنال میں رہتے ہوئے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ اس لئے میرے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ان کو اپنے ارادے سے مطلع کروں۔ اس لئے میں نے ان سے جہاد کے فتوٰی کا ذکر کیا اور پوچھا ,,کیا ہمیں اب دارالکفر سے نکل جانا چاہئے؟،، انہوں نے فرمایا کہ ,,ضرور نکل جانا چاہئے لیکن بی۔ اے کا آخری امتحان جو ایک ماہ بعد ہونے والا ہے، دے کر جاؤ۔،،

میرے لئے ایک ماہ کا انتظار تو ناممکن تھا کیونکہ ہم سب نے مل کر تاریخ روانگی مقرر کر لی تھی اور اس پر قسم کھا چکے تھے، اس لئے میں نے ان کو اس بارے میں کوئی جواب ہی نہ دیا۔ مگر ان سے پوچھا: ,,آپ کیوں اس دارالکفر سے نہیں نکلتے؟،، تو انہوں نے فرمایا کہ: ,,میں اس عمر میں یہاں رہ کر زیادہ اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں۔،،

اگر میرے لئے کسی طرح بی اے کا آخری امتحان دینا ممکن ہوتا تو یہ میری آئندہ کی زندگی میں بہت مفید ثابت ہوتا، مجھے امتحان میں پاس ہونے کا یقین تھا۔ اور مجھے اس کا بھی اطمینان تھا کہ بی اے کی ڈگری امتحان کے بعد ضرور مل جائے گی۔ جس کی مجھے ہندوستان سے باہر جانے کے بعد کئی دفعہ ضرورت پیش آئی، لیکن ان حالات میں میرے لئے ناممکن تھا کہ میں امتحان دینے کے لئے ایک ماہ اور ہندوستان میں ٹھہروں اور اپنے دوستوں سے پیچھے رہوں۔ آخر دو دن کرنال میں رہ کر ہمشیرہ صاحبہ سے یہ کہہ کر جدا ہوا کہ ,,اگر خدا کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے ورنہ یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے،، وہ اس پر بہت حیران ہوئیں کہ میں ایسی باتیں کیوں کر رہا ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے تفصیلات نہیں پوچھیں۔

کالج واپس آیا تو سب نے میری صحت میں نمایاں بہتری دیکھی حالانکہ اس سے پہلے میں امتحان کی تیاری پر دن رات سبق پڑھنے کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا۔ کرنال سے واپس آکر میں پہلے کی طرح تن دہی سے سبق نہیں پڑھتا تھا۔ اس سے کالج میں سب لوگ حیران تھے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ امتحان کے دن اتنے نزدیک ہیں اور یہ زیادہ محنت نہیں کرتا پھر امتحان میں اول

نمبر کیسے آئے گا۔ میرے مسلمان دوستوں اور ہم جماعتوں کو امید تھی کہ میں بی۔ اے میں اول رہوں گا۔ میں اگرچہ بہت ذکی نہ تھا اور نہ ہی میرا حافظہ (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) بہت قوی تھا لیکن باقاعدہ سبق پڑھنے اور محنت سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے کالج کی جماعت میں ہمیشہ اول ہی رہتا تھا اور بہت سے انعامات حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے اب بی۔ اے میں بھی مجھ سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ میں اسٹیٹ سکولر شپ لے کر ولایت جا سکوں گا۔ چودھری ظفر اللہ صاحب پہلے مسلمان تھے جن کو یہ وظیفہ ملا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک کسی مسلمان کو یہ وظیفہ نہ مل سکا۔ اب سب مسلمانوں کی امیدیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ وظیفہ پھر ایک مسلمان طالب علم کو ملے گا۔ لیکن ۔ تدبیر کنند بندہ ۔ تقدیر کند خندہ ۔ میری قسمت میں کچھ اور ہی لکھا ہوا تھا اور آب و دانہ مجھے دوسرے ملکوں کی طرف کھینچ رہا تھا۔ ۴ فروری ۱۹۱۵ء کی شام کو گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علموں نے ایک ڈرامہ کیا جس میں عبدالباری کا بھی پارٹ تھا۔ اس ڈرامے میں عبدالباری صاحب، پاؤں میں بیڑیوں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے ساتھ سٹیج پر نمودار ہوئے وہ اپنی بے کسی کی حالت پر یہ شعر پڑھ رہے تھے

خدایا تو ہی مورا، بھروسہ ہے مجھے تورا ہی تورا

ہم لوگوں نے، جنہوں نے اگلے دن ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو بھاگنے کا ارادہ کیا ہوا تھا جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو ذرا خوف زدہ ہو گئے کہ کہیں خدا نخواستہ اگلے روز عبدالباری اور ہم سب لوگ اسی طرح ہتھکڑیاں لگے ہوئے اپنے کالج سے قید خانے میں نہ لے جائے جائیں۔

سرحد کو ہماری روانگی

۵ فروری ۱۹۱۵ء کو جمعہ کی نماز کے بعد پہلا قافلہ جس میں خوشی محمد، عبداللہ، عبدالباری، عبدالمجید خان، اللہ نواز خان اور شیخ عبدالقادر شامل تھے ہری پور ہزارہ کو روانہ ہو گیا۔ دوسرا قافلہ جس میں عبدالرشید، عبدالحمید، محمد حسن، رحمت علی، شاہ نواز خاں، عبدالحق اور میں شریک تھے رات کی گاڑی سے چلا۔ ہم سب علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں بیٹھے تھے تاکہ ہمارے اکٹھے سفر کرنے کی وجہ سے لوگ ہم کو شبہ کی نظر سے نہ دیکھیں اور ہماری گرفتاری کا سبب نہ بنیں۔ ہمارے ساتھیوں

میں سے عبدالخالق وقت پر سٹیشن نہ پہنچنے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا اور ہجرت نہ کر سکا۔ شیخ غلام حسین کی صحت چونکہ خراب تھی اس نے ہجرت کا ارادہ ہی نہ کیا تھا، اس لئے وہ بھی پیچھے رہ گیا۔

ہم ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو صبح کے قریب ہری پور ہزارے پہنچے۔ وہاں، پہلے قافلے کے ساتھ ہری پور پہنچ کر ہمارے استقبال کے لئے ہمارا ایک ساتھی سٹیشن پر ہمیں ملا اور ہم کو عبدالرحمٰن آذر جو اب ریٹائرڈ چیف انجینئر جنرل منیجر ہیں کے والد محمد الٰہی صاحب کے گھر لے گیا۔ وہ مولوی فضل الٰہی کے بڑے بھائی اور ریلوے انسپکٹر تھے یہاں ہم سب پھر اکٹھے ہونے کی وجہ سے بہت خوش ہوئے۔ دن بھر اس گھر میں چھپے رہے اور کوئی شخص بھی یہاں سے باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت ہم نے سرحدی لوگوں جیسے کپڑے اور پاؤں میں بوٹوں کی بجائے چپلیاں پہنیں اور سفر کے لئے تیار ہو گئے، آخری وقت میں، ہم میں سے ہر ایک کو ایک مستعار نام دیا گیا تاکہ راستے میں لوگوں کو ہمارے اصلی نام کے سننے سے، ہمارے بھاگنے کے راستے کا کھوج نہ مل جائے (میرا نام الیاس رکھا گیا تھا) قافلہ سالار عبدالمجید خان جو گورنمنٹ کالج کی ٹگ اوف وار ٹیل کے کیپٹن اور خوب توانا آدمی تھے، مقرر کر دیا گئے۔ سب کے پاس جتنا روپیہ تھا اس کو ایک جگہ جمع کر کے مساوی طور پر تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح پر کسی کو دوسرے ساتھی پر تفوق اور برتری نہ رہی۔ سب ایک ہی درجے پر آ گئے تاکہ رئیس قافلے کی نظر میں سب برابر ہی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پاس میرے سیونگز اکاؤنٹ کا روپیہ اور بی۔ اے کے آخری امتحان کی فیس داخلہ کو ملا کر (۵۲) روپے تھے۔ چند ایک دوستوں کے پاس اس سے کچھ زیادہ رقم تھی لیکن اکثروں کے ہاتھ میں اس سے کم روپیہ تھا۔

ہماری رہنمائی کرنے والا اور ہم کو سرحدی علاقے سے گزر کر جماعت مجاہدین کے مرکز اسمس واقع بینر کو لے جانے والا سرحدی شخص بھی ہری پور ہزارہ پہنچ گیا تھا اس کو صرف ہمارے مستعار نام بتائے گئے۔

شام کو اندھیرا ہونے پر ہمارا قافلہ سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ نئی چپلیوں کی وجہ سے جلد ہی ہمارے پاؤں میں چھالے پڑنے لگے۔ ہم لوگوں کو پیدل چلنے کی بھی مشق نہ تھی۔ اس لئے کچھ گھنٹے کے بعد ہمارے لئے پیدل چلنا دشوار ہو گیا۔ سب سے زیادہ تکلیف عبدالباری کو ہوئی اور وہ چلنے سے بالکل عاجز ہو گیا۔ اس کو وہاں راستہ میں چھوڑ کر ہمارا آگے چلے جانا ناممکن تھا۔ اس لئے اس کو دو ساتھی باری باری کندھا دے کر

ساری رات چلاتے رہے ۔ جب ہم تھک جاتے تو رہنما کی اجازت سے چند ایک منٹ آرام کرتے تھے ۔ اس وقفے میں اکثر دوست تکان کی وجہ سے ایک دو لحظہ سونا غنیمت جانتے تھے ۔ اس لئے فوراً زمین پر لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے ۔ سرحد تک کا فاصلہ کوئی بیس میل کا تھا جس کو اسی رات طے کرنا اور ریاست امب (Amb) میں داخل ہونا ہمارے لئے ضروری تھا ورنہ اگلے دن پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

اس زمانے میں ریاست امب کے نواب کے اختیارات اتنے تھے کہ انگریز ان سے کسی ہندوستانی پناہ گزین کی واپسی کا مطالبہ نہ کر سکتے تھے ۔ ہم ریاست امب کی طرف اس طرح تھکے ماندے بڑھ رہے تھے کہ آرام کے وقفوں میں سے ایک کے درمیان خوشی محمد زمین پر سو گیا اور جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے ، تو وہ ، باوجود ہمارے جگانے کے ، نیند کی زیادتی کی وجہ سے بیدار نہ ہوا کچھ دور چلے جانے کے بعد جب ہم نے اپنے ساتھیوں کو گنا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کم ہے۔ واپس لوٹ کر اس کو ڈھونڈنا تو ہمارے لئے ناممکن تھا اس لئے اس کو اس کی قسمت پر چھوڑ کر آگے بڑھے ۔ چونکہ سرحد کے پاس ایک انگریزی چوکی تھی اور ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم رات کے اندھیرے میں اس چوکی کے پاس سے گزر کر سرحد پار کر جائیں ۔ خدا کی شان کہ آدھی رات کے کچھ گھنٹے بعد بارش شروع ہو گئی اور اس رات کو فوجی چوکی سے کوئی پٹرول دورہ لگانے نہ نکلا۔ اس لئے ہم سب بخیر اس چوکی کے پاس سے گزر گئے اور دریائے سندھ کے پاس ریاست امب کی ایک مسجد میں ۷ فروری ۱۹۱۵ء کو تقریباً دن کے دس بجے پہنچ گئے ۔ مسجد کی چھت رات کی بارش کی وجہ سے ٹپکنے لگی تھی ۔ ہم تکان سے اتنے چور تھے کہ کسی میں ہاتھ اٹھانے کی بھی سکت نہ تھی ۔ رحمت علی خاص کر اتنا تھک گیا تھا کہ مسجد میں جس جگہ وہ لیٹا وہاں چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی سے بھی اپنے کو بچانے کے لئے حرکت نہ کر سکا۔ چھت سے ٹپکتا ہوا پانی قطرہ ، قطرہ اس کے منہ پر گر رہا تھا لیکن اس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اس سے بچنے کے لئے اپنے سر کو ذرا ہلا کر پرے کر لے ۔ دوپہر کو نواب امب کے وزیر نے جو جماعت مجاہدین کی خفیہ طور پر حمایت کیا کرتا تھا ، ہمیں پلاؤ کی دعوت دی ۔ جس سے ہمارے جسم میں پھر طاقت آ گئی ۔ وزیر صاحب کے ہمدردانہ الفاظ سے ہماری ہمتیں بھی بڑھ گئیں ۔ دوپہر کے بعد ایک چھوٹی سی ناؤ پر ہم کو دریائے سندھ پار کرا دیا گیا۔ یہاں دریا کا پاٹ بہت کم تھا اس وجہ سے اس کی گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ پانی کی رو بالکل معلوم ہی نہ ہوتی تھی ۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتر کر ہم

نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ خیریت سے سلامتی کی جگہ پر پہنچ گئے ۔ کیونکہ اس زمانے میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے اس جگہ پر ، علاقہ آزاد شروع ہوتا تھا میرا Career جس کے لئے والدین نے اور بھائی صاحب نے مجھے اتنی قربانیاں کر کے تیار کیا تھا ، یہاں ختم ہو گیا ، رشتہ داروں کی ان ساری امیدوں پر جو مجھ سے وابستہ تھیں پانی پھر گیا۔ اب میں ایسی سرزمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا جہاں نہ کوئی میرا واقف تھا اور نہ وہاں کی زبان میں جانتا تھا ۔ اس سرزمین میں کیسے گزارا کروں گا ۔ وہاں کوئی مفید کام کر سکوں گا یا نہیں ؟ یہ سب کچھ مجہول اور نامعلوم تھا ۔ اگر تسلی تھی تو صرف یہ تھی کہ اسلامی احکام کی پابندی کے لئے سب قربانیاں کر رہا ہوں ۔

دریائے سندھ کو اس طرح پار کرنے کے بعد ہم نے وہ رات نواب امب کے علاقے میں گزاری ۔ وزیر صاحب نے ہماری خوب خاطر تواضع کی جس سے ہماری تھکان بالکل رفع ہو گئی اور ہم اگلے روز اپنے کٹھن سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے ۔ جب ۸ فروری ۱۹۱۵ء کو ہم علی الصباح چلنے لگے تو دیکھا کہ ایک روز پہلے کی بارش نے نالوں کو ندیاں اور ندیوں کو دریا بنا دیا تھا اس لئے ہمیں راستے میں کافی تکلیف ہوئی اور ہماری رفتار بہت کم رہی ۔ بعض جگہوں پر نالوں کے کنارے راستہ نہ ملا اور ہمیں ٹیلوں اور پہاڑیوں پر چڑھنا پڑا ۔ چند ایک جگہ تو پہاڑیوں پر چڑھنا اتنا مشکل ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر اوپر کھینچا۔ چونکہ بارش کی وجہ سے پاؤں پھسلتے تھے اور پودوں اور گھاس کو پکڑ کر ان کے سہارے سے اوپر چڑھنا ناممکن تھا۔

دوپہر کی روٹی ، جو کچھ ہمارے پاس تھی ، اس کو ایک نالے کے درمیان کے جزیرہ جیسی ایک خشک جگہ پر کھایا۔ یہ آرام کا وقفہ ہمارے لئے بہت پر لطف گزرا۔ انگریزوں کا ڈر اب دل میں باقی نہ رہا تھا تکان بھی زیادہ نہ تھی ۔ بارش بند ہو چکی تھی ۔ ہمیں ہر طرح کا اطمینان میسر تھا۔ چاروں طرف سر بہ فلک پہاڑ کھڑے ہوئے تھے ۔ زمین ہر طرف سرسبز تھی ، نالے ٹھاٹھا کر کے بہہ رہے تھے ۔ یہ سب کچھ ایسا دل افزا نظارہ تھا کہ اس سے ہم سب بہت محظوظ ہوئے ۔ اپنے والدین اور اقربا کے آنسوؤں سے بے پروا اور آنے والی زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر تھے۔ ہم اس نظارے سے کچھ ایسے بہرہ اندوز ہوئے کہ بے اختیار Romance Romance کہنے لگے ۔ عبدالباری اور شیخ عبدالقادر جو ذرا شاعر مزاج تھے اس منظر کا کافی مزہ اٹھا رہے تھے ۔

تیسرا باب

جماعت مجاہدین کے مرکز سے ہماری کابل روانگی

ہم ۸ فروری ۱۹۱۵ء کو شام کے قریب جماعت مجاہدین کے مرکز (اسمس) واقع علاقہ بنیر میں پہنچ گئے۔ اسمس اصل میں ایک سرحدی گاؤں کا نام ہے جس کے نزدیک مجاہدین کی بستی ہے۔ اس گاؤں کے نام پر اس بستی کو مرکز اسمس کہا جاتا ہے۔ اس مرکز میں رہنے والے مجاہدین کی تعداد بمع اہل و عیال کوئی سو کے قریب تھی۔ شادی شدہ لوگوں سے کنوارے مجاہد زیادہ تھے۔ اس زمانے میں جماعت مجاہدین کے رئیس مولوی عبدالکریم صاحب تھے۔ مگر وہ ہمارے اسمس میں پہنچنے سے پہلے ہی صاحب فراش ہو چکے تھے اور ہمارے آنے کے تین دن بعد یعنی ۱۱فروری کو فوت ہو گئے۔ ان کے جانشین ان کے بھتیجے نعمت اللہ ہوئے جو نوجوان تھے اور جن کو ذرا دنیا کے حالات سے دلچسپی تھی۔

اسمس پہنچنے پر ہمیں ایک کوٹھڑی میں جو دوسرے مجاہدین کے گھروں سے جدا تھی، جگہ دی گئی۔ اس کوٹھڑی میں صرف ایک کھڑکی اور اس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی میں شیشہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سردی میں یہاں فرش پر آگ جلائی جاتی تھی جس کا دھواں باہر نکلنے کے لئے چمنی lChimneyl کی بجائے اس کی چھت میں ایک سوراخ (مورچہ) تھا۔ کوٹھڑی کو رات کے وقت روشن کرنے کے لئے ایک مٹی کا دیا جلایا جایا کرتا تھا۔ شہروں کی زندگی جس کو ہم سب اب پیچھے چھوڑ آئے تھے، اور یہاں کے حالات کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ کھانے کے لئے دال روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں کے قیام کے دوران ہم نے صرف ایک دفعہ پلاؤ کھایا لیکن سب دوستوں کے ارادے اتنے پختہ اور ایمان اتنے محکم تھے کہ کسی کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔

مرحوم عبدالکریم کی وفات کے تین روز بعد نئے رئیس جماعت مجاہدین مولوی نعمت اللہ نے ہمیں باریابی دی اور دنیا کا ایک نقشہ نکال کر اس پر مختلف جنگی میدانوں کے متعلق ہم سے معلومات حاصل کیں اور جنگ کے بارے میں اپنے خیالات بتائے۔ ہمیں اس کی امید نہ تھی کہ ایسے پہاڑی علاقے کے رہنے والے ایک شخص کو جو تقریباً انگریزوں کے محاصرے کے اندر رہنے پر مجبور ہے اور جس کو مہذب دنیا سے تعلق رکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے، یہاں تک کہ اپنی ضروریات زندگی بھی ہندوستان سے بہ صد مشکل حاصل کرتا ہے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی خفیہ طور پر وہاں سے لاتا ہے، دنیا کے حالات سے اتنی واقفیت ہو۔ اس ملاقات کے بعد ہمارے دلوں میں ان کا وقار بہت بڑھ گیا۔ جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لئے بنائی گئی تھی، اس کے ارکان بہت مخلص اور جانثار تھے۔ سراپا تحمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کو تیار تھے۔ ان کو نہ مال و دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیوی جاہ و عزت کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے، اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے، جہاد کرنے اور میدان جنگ میں جام شہادت پینے کا موقع ملے گا، وہ اپنی ساری زندگی کو ایسی ہی مشکلات میں گزارنے اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنے پر تیار تھے۔

لیکن افسوس ہے کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم و تربیت دینے والا اور ان کو نئی فوجی قواعد سکھلانے والا نہ تھا۔ ان میں سے بہت سے بالکل ان پڑھ تھے۔ نہ ان کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی خاص ذریعہ موجود تھا اور نہ کسی دینوی تربیت کا سامان تھا۔ آتشیں ہتھیاروں اور بارود کی ایجاد کے بعد تلوار اور ڈھال سے لڑائی کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بیچارے ابھی تک تلوار سے حملہ کرنے کے قاعدے سیکھا کرتے تھے۔ ان کے باپ دادا کے متعلق جنہوں نے سکھ اور انگریزی فوجوں سے لڑائی کی تھی اور اپنی بہادری کی وجہ سے ان کے دلوں پر رعب ڈالا تھا، انگریزی مصنف لکھتے ہیں کہ "وہ بے دریغ تلوار بہ کف مشین گنوں پر ہلہ بول دیا کرتے ہیں اور اس طرح پر اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں یا دشمن کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔" لیکن تلوار، نیزے اور برچھے سے لڑنے کا زمانہ تو مدتوں سے ختم ہو چکا تھا۔

جماعت مجاہدین کے گھر ایک ٹیلے پر واقع تھے جس کے ارد گرد (برندد) نالہ پیچ و خم کھاتا

ہوا بہتا تھا۔ اس ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں مجاہدین میں سے چند لوگ ہر روز دوپہر کے بعد ڈھال تلوار کے استعمال کی مشق کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس نئی بندوقیں صرف چند ایک تھیں۔ ہم نے ان کو بندوق سے نشانہ بازی کرتے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ ان کے پاس بندوق کی گولیاں کم ہونے کی وجہ سے وہ فیر بھی کبھی نہ کیا کرتے تھے۔ یہ بندوقیں رئیس مجاہدین کے ہاتھ میں تھیں۔ باقی لوگوں کے پاس چقماقی یا فتیلی بندوقیں تھیں جن کا استعمال اب دنیا میں شائد کہیں بھی نہ رہا تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ جماعت مجاہدین جس کو اس کے قابل احترام بانیوں نے ہندوستان کی غیر مسلم حکومت سے آزاد کرانے کے لئے ایک جنگی تنظیم کے طور پر بنایا تھا وہ دنیا کی ترقیات اور زمانے کی رفتار سے بالکل بے خبر رہ کر ایک طفیلی اور مسکین سی ٹولی بن گئی تھی جو اپنے گزارے کے لئے یا ہندوستانی مسلمانوں کے چندے یا حکومت افغانستان کے وظیفہ پر تکیہ لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے پاس کھیت بھی نہ تھے کہ کچھ بو کاٹ کر اپنا گزارا کریں کیونکہ اس علاقہ میں قابل زراعت زمینیں بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ مقامی لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ ان کی اس ناگفتہ بہ حالت سے چند روز میں واقفیت پیدا کرنے سے ہم پر بہت بُرا اثر ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے کچھ کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں کابل جانا چاہیے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کریں۔ اگر کہیں کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوجوں میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اس لئے کابل کو مجاہدین کا ایک وفد بھیجا گیا تاکہ ہمارے کابل جانے کا راستہ صاف کیا جائے اور افغانی حکومت سے ہمارے لئے کابل جانے کی اجازت لی جائے۔

ہمارے اسمس پہنچنے کے دو روز بعد خوشی محمد ایک دوسرے رہنما کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا۔ اس نے رات کو ہم سے جدا ہونے اور الٹے پاؤں ہری پور پہنچنے کا اور پھر ایک رہنما کے ساتھ ہم تک آنے کا قصہ سنایا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ جب بیدار ہوا تو اس کا منہ ہمارے قافلے کی طرف مڑنے کی بجائے الٹی طرف مڑ گیا اور اس خیال سے کہ قافلے کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے، راستہ چلتا رہا حالانکہ وہ ہر آن ہم سے جُدا اور دور ہوتا جاتا تھا۔

آخر جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور اس نے ہری پور کی عمارتیں دیکھیں تو اس کو یقین ہو گیا کہ وہ راستہ گم کر کے قافلے سے جدا ہو گیا ہے۔ اس پر وہ ریلوے انسپکٹر صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہ

اس کی واپسی پر قدرے سہمے لیکن جب اس نے اپنے حالات بتائے توان کو اطمینان ہو گیااور انہوں نے اس کوایک دوسرے رہنما کے ساتھ ہمارے پاس بھیج دیا۔ اس کے آنے پر ہمیں بہت مسرت ہوئی کیونکہ وہ ہماری تحریک کے بانیوں میں سے تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ عبدالخالق بھی ہم سے ایک روز بعد ہری پور آیا تھالیکن اس وقت کوئی رہنماموجود نہ تھاجواس کو ہمارے پاس لاسکتا، اس لئے اس کوانسپکٹر صاحب نے واپس کر دیا تھا۔

ابھی ہمیں امس میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک سرحدی نے ایک جوتا (بوٹ) ہمیں لاکر دیااور کہاکہ "یہ بوٹ مجھے ایک نالے کے کنارے پر ملاہے۔ شائد آپ کے لوگوں میں سے کسی کاہو گا"۔

ہم نے جب یہ بوٹ دیکھا تو عبداللہ نے اس کو فوراً پہچان لیا اور کہا کہ "بوٹ اس کے بھائی عبدالرحمٰن کاہے"۔ ہمیں اس کی بات کاچنداں یقین نہ آیا کیونکہ ہم نے کبھی بھی اس کاگمان نہ کیاتھاکہ عبدالرحمٰن وہاں آئے گا۔ لیکن عبداللہ نے اصرار کیااور کہاکہ "میں ضرور اس نالے کی طرف جاکر اپنے بھائی کو تلاش کروں گا"۔ اس پر مجبوراً خوشی محمد اور عبدالحمید اس کے ساتھ گئےاور جب انہوں نے عبدالرحمٰن کو بے تاب وتوانا ایک پہاڑی پر دیکھاتو ان کی حیرت کی انتہانہ رہی۔ وہ اس کو اپنے ساتھ امس لائے اور اس نے اپنی کہانی یوں سنائی۔

"جب آپ لوگ لاہور میں میرے بھائی عبداللہ کے کمرے میں خفیہ باتیں کیاکرتے تھے اور ہندوستان سے ہجرت کے منصوبے بنایا کرتے تھے تو میں سونے کابہانہ کر کے اپنے بھائی کی چارپائی پر لیٹارہتااور آپ کی ساری باتیں سناکرتاتھایہاں تک کہ آپ نے ہجرت کافیصلہ کر لیااور ہری پور ہزارے کے راستے جانامقرر کیا۔ مجھے خوب معلوم تھاکہ میرابھائی عبداللہ مجھے ساتھ نہیں لے جائے گااس لئے میں نے اس سے توکچھ نہ کہالیکن جب آپ روانہ ہو گئے تو میں نے تین دن صبر کیااور آپ کے پیچھے جو کچھ بورڈنگ ہاؤس میں ہوتارہااس کو دیکھتارہا۔ پولیس نے آپ سب کے کمروں کی تلاشی لی کہ شائد آپ کی اس سازش کاکچھ کھوج مل جائے لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ صرف ظفر حسن کے کمرے سے اس کاایک فوٹو پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعداس کے والد بھی لاہور آئےاور اس کاسامان لے کر واپس چلے گئے۔ مسٹر چاولہ ایک ہندوپروفیسر ریاضی ظفر حسن کے چلے جانے سے اتناافسوس کیاکرتے تھے کہ ان کواس کے ہندوستان سے بھاگ

جانے کایقین ہی نہیں آتاتھااور کہتے تھے کہ ایسامحنتی طالب علم اپنی پڑھائی کوچھوڑ کر کبھی ایسا اقدام نہیں کر سکتا۔ اس لئے انہوں نے دودن تک لکچر نہ دیاتاکہ ظفراپنے سبقوں میں اپنے ہم جماعتوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ جب پولیس کی بھاگ دوڑ ختم ہو گئی اور معاملہ ٹھنڈا پڑاتو میں نے بھی ہری پور ہزارہ جانے کافیصلہ کیا۔ وہاں پہنچ کر ریلوے انسپکٹر سے ملا۔ لیکن چونکہ کوئی رہنماموجود نہ تھاانہوں نے مجھے واپس جانے کو کہامگر میں نے ان کی بات نہ مانی۔ ان سے میں نے راستہ پوچھا۔ انہوں نے مجھے کچھ معلومات دیں اور میں انہی معلومات کی بناء پر روانہ ہو گیا اور بڑی مشکلات کے ساتھ یہاں پہنچا۔ راستہ میں ایک پہاڑی پر چڑھتے ہوئے میراپاؤں پھسلا۔ اس سے میراایک بوٹ پاؤں سے نکل کر نالے میں گر پڑا۔ مجھے اتنی جرات نہ ہوئی کہ پہاڑی سے اتر کر جوتالے لوں۔ بہت کم امید تھی کہ صحیح سالم آپ کو مل سکوں گا"۔

عبداللہ اپنے بھائی کے آنے سے چنداں خوش نہ ہوا۔ ہم بھی مطمئن نہ تھے لیکن اس کو واپس بھیج دیناخطرناک اور مشکل تھا۔ اس لئے اس مہمان ناخواندہ کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا۔ لیکن جیساکہ آگے چل کر بیان ہو گااس کاہمارے ساتھ آنا، ہماری مشکلات میں اضافہ کرنے کے سوااور کسی کام نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ توافغانستان میں ہمارے لئے اس کی وجہ سے نہ صرف جیل کابلکہ پھانسی کامنہ دیکھنے کابھی خطرہ پیداہو گیاتھا۔ اس کاذکر آگے چل کر واقعات کے سلسلے کے مطابق موزوں جگہ پر کیاجائے گا۔

جماعت مجاہدین میں ہماری زندگی بالکل بے کاری میں گزرتی تھی جس سے ہمارے دل تنگ ہونے لگے تھے۔ کبھی کبھی چھپ چھپاکر مجاہدین کے لوگ ہری پور سے اخبارات لے آیا کرتے تھے۔ اس سے جنگ کی رفتار اور لڑائی کے واقعات کاہم کوکچھ پتہ چل جاتاتھا۔ اس دل تنگی کے باوجود بھی ہم میں اتحاد اور اتفاق موجود تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا گزارہ کرنا ہماراشعار تھا۔ اگرچہ اکثرایسے دنوں میں جب کبھی کوئی بدنی اور دماغی مصروفیت نہ ہوتوانسانوں کی ایک دوسرے سے مشکل ہی نباہ کرتی ہے۔ سردی کے دن تھے، ہم دن دھوپ میں بیٹھ کر کاٹاکرتے اور رات کو کوٹھڑی میں چولھے کے اردگرد جمع ہو کر مجاہدین کے اس وفد کے واپس آنے کے دنوں کو، جو ہمارے لئے اجازت لینے کی خاطر کابل گیاہواتھا، گناکرتے تھے۔ مارچ کا مہینہ شروع ہواتوہندوستان سے آئے ہوئے اخبارات سے معلوم ہواکہ اتحادیوں نے درہ دانیال پر حملے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے ہلہ بول کر اور درہ دانیال

کے ترکی مورچوں کو گولہ باری سے خراب کر کے بحیرہ مرمرا Marmara Sea کی طرف پیش قدمی کرنا چاہی تاکہ دارالخلافہ استنبول (قسطنطنیہ) کو فتح کر کے ترکوں کو جداگانہ صلح پر مجبور کر دیں۔

کابل کو روانگی

یہ جان گداز خبریں پہنچ ہی رہی تھیں کہ مجاہدین کا وفد ہمارے لئے کابل جانے کی اجازت لے کر واپس اسمس پہنچا اور ہمارے کابل جانے کا انتظام ہو گیا۔ اس کے لئے ہم کو ایک سرحدی رہنما دیا گیا۔ یہ شخص سرحدی علاقہ کے راستوں سے واقف تھا اس کا نام (حقیقی یا نام مستعار) عبدالرحمٰن تھا۔ ہم اس کو ملا یا کبھی کبھی عزت کے لئے مولوی کہا کرتے تھے۔ اس کی مذہبی تعلیم تو صفر تھی، لیکن جیسا کہ اس زمانے میں سرحد میں اور افغانستان میں دستور تھا جس کسی نے (کنزو منیہ) پڑھ لیں وہی ملا، مولوی اور امام بن جاتا تھا اور ہر کوئی اس کا احترام کرتا اور اس کا ہاتھ چوم کر اظہار عقیدت کیا کرتا تھا۔ ہمارے رہنما کو کچھ اردو بھی آتی تھی اس لئے راستے میں اس سے بات چیت کرنے میں ہمیں چنداں مشکل نہ ہوئی۔

ہم ۱۹ مارچ ۱۹۱۵ء کو اسمس سے روانہ ہوئے۔ یہاں ہمیں ۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء کے اخبارات مل گئے تھے جس سے معلوم ہوا تھا کہ اتحادی جنگی بیڑوں نے جن میں انگریزی زرہ پوش (کوئین الزبتھ) اور فرانسیسی جنگی جہاز گولیوس (Gaulios) جیسے بڑے بڑے سفائن حرب شامل تھے، درہ دانیال میں متحداً گھسنے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب کو اس خبر سے انتہا درجہ پریشانی ہوئی کیونکہ ان کی کامیابی کی صورت میں دارالخلافہ قسطنطنیہ (استانبول) پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جانا یقینی بات تھی۔ لیکن ہم ترکوں کے لئے اس وقت دعا کے سوا ان کی اور کیا مدد کر سکتے تھے؟ ہم بنیر اور سوات کے علاقوں سے گزر کر ۲۲ مارچ ۱۹۱۵ کو باجوڑ کے سب سے بڑے گاؤں میں جس کو کلی کہتے تھے، پہنچے۔ وہاں جاتے ہی ہم نے یک اخبار تلاش کیا۔ اس اخبار سے معلوم ہوا کہ انگریزی اور فرانسیسی بیڑوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۱۵ کو درہ دانیال میں سخت شکست کھائی اور فرانسیسیوں کے گولیوس اور بودے (Bouvet) جیسے مشہور جنگی جہاز اور انگریزوں کے اررزسٹیبل اور انڈی فیٹی ایبل (Irresistibleandindefatigable) جیسے زرہ پوش جہاز

ترکی توپوں کی گولہ باری سے اور بحری سرنگوں سے ٹکرا کر ڈوب گئے، اور آخر کار اتحادیوں کے جنگی جہاز درہ دانیال کی مہم سے دست بردار ہو کر واپس ہو گئے۔ اس خبر سے ہمیں جو خوشی ہوئی اس کا بیان یہاں کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ ہم نے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر ادا کیا اور تین دن کی بے چینی سے نجات پائی۔

سرحدی علاقے سے گزر کر، افغانستان پہنچنے کے لئے جو راستہ ہم نے، انگریزی چوکیوں سے بچنے کے لئے اختیار کیا تھا وہ کافی دشوار گزار تھا۔ ہم شاہ راہوں سے دور رہنے پر مجبور تھے، اس لئے ایسے پہاڑی راستوں سے چلتے تھے جو صرف پیدل چلنے کے لئے ہی موزوں تھے۔ ایسے راستوں سے بکری کے سوا اور کوئی جانور بھی نہ گزر سکتا تھا، گھوڑے اور خچر کے چلنے کا توذکر ہی کیا ہے۔ مگر ہم کو ایک جگہ مجبوراً اس سڑک پر چلنا پڑا جو دیر کے علاقے سے گزر کر ملا کنڈ وغیرہ کو جاتی ہے۔ یہاں انگریزوں کے پٹرولوں اور سنتریوں سے ٹکرا جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن خدا کی شان کہ اس روز بارش ہو گئی اور ہم نے کوئی انگریزی سپاہی نہ دیکھا۔ انہی دنوں میں نواب دیر اور خان باجوڑ کے درمیان باہمی اختلافات بڑھ جانے کی وجہ سے جنگ ہو چکی تھی۔ طرفین کے بہت سے لوگ اس لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ جب ہم باجوڑ کے علاقے سے گزر کر دیر میں داخل ہوئے تو ہم نے ان مُردوں کو دیکھا جو بغیر کفن اور دفن کے میدان میں اور راستے کے کنارے پڑے ہوئے تھے۔ چونکہ ہم نے اپنی ساری عمر میں کبھی اس سے پہلے ایسا خوفناک نظارہ نہ دیکھا تھا اس لئے ہم سب کا دل خراب ہوا اور جی متلانے سے قے سی آنے لگی، لیکن زیادہ طبیعت بگڑنے سے پہلے ہی ہم اس علاقے سے نکل گئے۔

ہمارا سرحدی علاقے کا سفر دس دن رہا۔ رات کو ہم مسجدوں میں سویا کرتے تھے اور گاؤں والوں کے مہمان بنا کرتے تھے۔ اکثر مکئی کی روٹی یا دلیا کھانے کو ملتا تھا۔ لیکن گاؤں والوں کے لئے دفعتہً ۱۴ یا ۱۵ آدمیوں کو مہمان بنانا کوئی آسان کام نہ تھا، یہ سرحدی مسلمانوں کی مہمان نوازی ہی تھی، جو اس کا بار برداشت کر سکتی تھی۔

مسجدوں کا فرش اکثر دھان کے پھوس یا پرالی کا ہوتا تھا مگر بعض مسجدوں میں اس پر ایک بوریا بھی بچھا ہوا دیکھا گیا، لیکن اس میں اتنے پسو ہوتے تھے کہ رات کو باوجود دن بھر کی تکان کے یہاں سونا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ایک رات تو مجھے یاد ہے کہ جب ہم مہمند کے علاقے میں ملا صاحب (بابڑہ) کی مسجد میں اترے تو آدھی رات کو ایک شخص کی رونے جیسی آواز میرے کان میں

آئی۔ آنکھ کھول کر دیکھا کہ بے چارہ عبدالرشید پسوؤں کے کاٹنے کی وجہ سے جاگ اٹھا تھا۔ بدن کھجلاتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔

سرحدوں کے علاقے کے لوگوں کی مہمان نوازی کا ثبوت تو ہم دیکھ چکے تھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لئے گھر سے نکلے ہیں تو وہ ہمارا تہہ دل سے خیر مقدم کرنے لگے اور جہاد کے شوقین ہونے کا ثبوت دینے لگے۔ ہماری ایسی بڑی ٹولی کو دیکھ کر وہاں ہر شخص تجسس کرتا اور پوچھتا تھا کہ یہ کون ہیں؟ جب ہمارا رہنما ان کو کہتا "غزاوہ پارہ راغلو" (یعنی ہم لوگ جہاد کے لئے آئے ہیں) تو سب کے چہرے بشاش ہو جاتے اور وہ سب ہم سے گلے ملنے لگتے تھے۔

راستے پر ہم نے جتنے لوگ دیکھے وہ سب ہتھیار بند تھے۔ ان کے کندھے پر ضرور ایک بندوق ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ بہت جنگ جو ہیں اور ہتھیاروں کے دلدادہ ہیں۔ اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی کاشت کی زمینیں بہت کم ہیں اور عام طور پر لوگ غریب ہیں۔ ایک دوسرے کے مال کو لینے کے لئے اکثر دھاڑا بازی کرتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے قبیلوں میں باہمی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو لوگ ان لڑائیوں میں مر جاتے ہیں ان کا انتقام لینا ان کے پس ماندگان کا فرض خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی باہمی خانہ جنگیاں اکثر چلتی رہتی ہیں اور ان میں دشمنی کا باہمی جذبہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ لیکن اگر ان باہمی لڑائیوں اور جھگڑوں کے باوجود ان کا دشمن ان کے گھر میں پناہ مانگ کر آ جائے تو وہ مہمان مانا جاتا ہے اور اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرتا اور نہ ہی کسی اور شخص کو اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اس کو کچھ نقصان پہنچائے۔ سرحد کے یہ سیدھے سادے لیکن پکے مسلمان اپنے اس قومی دستور پر ایسی پابندی سے عمل کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ لیکن جب ایسا مہمان ان کے گھر سے چلا جائے، تو پھر پرانی دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ملک میں اس وقت انگریزی حکومت کا تو اثر ہی نہ تھا۔ ان کو انگریزی حکومت سے اتنی دشمنی تھی کہ اس سے لڑنا ثواب سمجھتے تھے۔ ملک میں جب کوئی حکومت نہ ہو تو ہر کوئی خود اپنی حفاظت کا سامان بہم پہنچانے پر مجبور ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ہتھیار بند رہیں اور نشانہ بازی سیکھیں۔ ہم نے راستے میں اس کے متعلق ایک دلچسپ قصہ سنا۔

کہتے ہیں کہ ایک قبیلہ کے ملک (یعنی سردار) نے اپنے بیٹے کو نشانہ بازی سکھانے کے لئے ایک استاد رکھا۔ جب اس نے لڑکے کو سب ہنر سکھائے تو ملک کے سامنے امتحان کی تیاری کی گئی۔ لڑکے کو جس کی عمر سات آٹھ سال کی تھی، نشانہ لگانے کو کہا گیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے استاد پر بندوق سیدھی کر لی۔ استاد نے پریشان ہو کر ملک صاحب سے کہا کہ لڑکے کو منع کرو۔ لیکن ملک صاحب نے جواب دیا "نہیں میں اس کو منع نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس کا پہلا نشانہ ہے۔ اگر خطا گیا تو اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور وہ پھر کبھی ہدف کو نہ مار سکے گا"

پاکستان بننے کے بعد تو یہ حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اب نہ کوئی غیر یا کافر حکومت ان پر قابض ہے اور نہ ان کے علاقے میں بدامنی ہے۔ وہاں کی آبادی کی تعلیم اور ان کے گزارے کے لئے انتظامات ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ لوگ تعلیم پانے کے بعد خود بخود ہتھیار بندی کو ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ دنیا کے دیگر قبائل نے ترک کر دیا ہے۔ یہ لوگ بڑے ایماندار مگر سادہ لوح ہیں اور صدیوں سے علم سے بے بہرہ ہیں۔ ان کا اسلامی جذبہ جس کی وجہ سے وہ سالہا سال انگریزوں کی دست برد سے اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکے ہیں، قابل قدر ہے۔ میں ان کی سادہ لوحی کا ایک واقعہ یہاں ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"ہم نے افغانستان جاتے ہوئے ایک روز، دن بھر کی کٹھن منزل کے بعد عصر کے وقت ایک مسجد میں جا کر قیام کیا اور ہم میں سے ہر کوئی اپنی حمائل شریف کو نکال کر تلاوت کلام اللہ میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی مسجد میں آیا اور اس نے ہمیں "استرہ ماشہ" (پشاور اور کوہاٹ کے لوگوں کی زبان کے مطابق "تھکے نہ تھیتوین" کہا۔ ہم نے اس کا جواب جیسا کہ ہم کو سکھلایا گیا تھا "خوار ماشہ" (آپ ذلیل نہ ہوں) کہہ کر دیا۔ اس پر وہ آدمی ہم سے پشتو میں گفتگو کرنے لگا۔ لیکن جب اس کو کسی نے بھی جواب نہ دیا تو وہ بہت برہم ہوا اور ہماری خاموشی کو اپنی بے عزتی سمجھ کر ہم سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ اس پر ہمارے رہنما نے اس کو بتایا کہ "یہ لوگ پشتو نہیں سمجھتے۔ اس لئے آپ کے سوالات کا جواب نہیں دیتے" تو اس نے بڑے تعجب سے پوچھا "اگر یہ لوگ پشتو نہیں جانتے تو قرآن شریف کیسے پڑھ رہے ہیں؟" یہ بے چارہ سیدھا سادہ مسلمان یہی خیال کرتا تھا کہ قرآن شریف پشتو زبان میں ہے اور جو کوئی قرآن شریف پڑھ سکتا ہے وہ پشتو بھی ضرور بول لیتا ہے۔ یہ صرف ایک شخص ہی کا قصہ نہیں ہے بلکہ جب ہم اس طرح راستے میں سرحدی راہ گزروں سے ملتے تھے اور ان کو ان کے رواج کے

مطابق " السلام علیکم " کی بجائے " استرہ ماشہ " کہتے تھے یا وہ خود ہم کو اس طرح پر خطاب کرتے تھے اور وہ ہمارے جواب میں یا ہم ان کے جواب میں " خوار ماشہ " بولتے تھے تو اس پر وہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ ہماری پشتو تو یہاں ختم ہو جاتی تھی۔ اس پر وہ تعجب کرنے لگتے تھے کہ ہم ان کو جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ایسی حالت میں بعض اوقات چیں بہ جبیں ہو جاتے تھے اور جب ان کو بتلایا جاتا کہ ہم لوگ پشتو نہیں جانتے تو وہ کہتے کہ " استرہ ماشہ " اور " خوار ماشہ " کیسے جانتے ہیں؟

سرحدی لوگوں کا گزارہ زیادہ تر کھیتی باڑی پر ہے لیکن اتنی قابل کاشت زمینیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ ملک بالکل پہاڑی ہے مگر وہ لوگ بہت محنت کش ہیں۔ اگر ان کو پہاڑ کے دامن میں یا کسی پہاڑ کے پہلو پر یا کسی ٹیلے کی چوٹی پر چھوٹا سا قابل کاشت زمین کا ٹکڑا مل جائے تو وہ اس کی آبیاری کے لئے بہت دور دور سے ندیوں اور نالوں کے پانی کو پہاڑوں کے کنارے کنارے جوئے یعنی نالی کھود کر اپنے کھیت تک لے آتے ہیں۔ پہاڑی علاقے میں کنواں کھودنا تو محال ہی ہے۔ اس لئے دریاؤں اور نالوں کے پانی سے جتنا زیادہ ممکن ہو سکتا ہے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب آبیاری کے لئے بنائی ہوئی ان نالیوں کے پانی کو وادی کے ایک طرف سے دوسری طرف لے جانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ جفاکش لوگ درختوں کے لمبے لمبے تنے کاٹ کر ان کو بیچ میں سے دو حصوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آرے کے ساتھ کاٹ لیتے ہیں اور ان دو حصوں میں اپنے ابتدائی بڑھئی کے اوزاروں کے ذریعہ نالی بنا لیتے ہیں۔

اور ان تنوں کو وادی کی ایک طرف سے دوسری طرف تک بچھا کر یا لکڑی کے ستون کے سہارے پر وادی کی دوسری طرف بھی پہاڑیوں کے کنارے کنارے نالیاں کھود کر پانی اپنے کھیتوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس میں تعجب یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود ان پڑھ ہونے کے، انجینئروں کے مانند نالیوں کو ایسی اچھی طرح پر ڈھلوان بناتے ہیں کہ پانی نہ کہیں رکتا ہے اور نہ کہیں زیادہ تیزی سے بہتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نالیوں کو کسی اوور سیر یا انجینئر نے اپنے لیول (Level) سے ماپ ماپ کر بنایا ہے۔ اگر ان لوگوں کو تعلیم دی جائے جیسا کہ اب پاکستانی حکومت کر رہی ہے، اور افغانستان اور سرحدی گاندھی اپنے " پشتونستان " کے ڈھکوسلے سے باز آ کر ان قبائل میں فتنہ انگیزی کرنا چھوڑ دیں تو ان ایمان کے پکے مسلمانوں کے لئے کتنا اچھا ہو۔ افغانی

حکومت کا یہ دعویٰ کہ چونکہ ان لوگوں کی زبان پشتو ہے اس لئے ان کو افغانستان کے ساتھ ملا دینا چاہئے اور ان کا افغانی حکومت کے ماتحت رہنا ضروری ہے، بالکل بودا اور بے معنی ہے۔ اگر اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے تو افغانی ترکستان کو جہاں ترکمان قیر غیز اور ترک آباد ہیں اور جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے حکومت ترکی کے ماتحت ہونا چاہئے یا اگر روسی اس کا دعویٰ کریں کہ چونکہ روسی ترکستان میں افغانی ترکستان سے زیادہ ترکمان آباد ہیں اس لئے افغانستانی ترکستان کو روسی ترکستان سے ملا دینا چاہئے تو کیا روسیوں کی دلدادہ موجودہ افغانی حکومت اس سے خوش ہو گی؟ حکومت افغانستان اپنے آپ کو پشتو کی حامی بتاتی ہے لیکن افغانی ارباب حکومت میں سے کتنے وزیر، مدیر یا مامور ہیں جو پشتو بول سکتے ہیں؟ اگر موجودہ افغانی ارباب حکومت اپنے اسلاف کے مانند دور اندیش ہوں تو وہ بہ آسانی اس کے قائل ہو سکتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ان کا ایک فیڈریشن بنا لینا ان کے مفاد کے لئے زیادہ اچھا ہو گا۔

جن سرحدی علاقوں سے ہم گزرے، ان میں سے اکثر سرسبز تھے۔ ان میں سے سوات کا علاقہ سب سے زیادہ زرخیز معلوم ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کے پاس کاشت کاری کے لئے کافی زمینیں تھیں چونکہ وادیاں چوڑی اور ندیاں بڑی بڑی تھیں۔ اگر ان علاقوں میں اچھی سڑکیں بن جائیں تو یہاں سیاحوں کے لئے کافی جاں افزا اور دل افروز منظر موجود ہیں۔ (میں نے بعض پاکستانی رسالوں میں سوات میں نئی بنی ہوئی سڑکوں کے فوٹو دیکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان دور افتادہ اور محنت کش مسلمانوں کو بھی تہذیب کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا ہے۔) سات دن کے سفر کے بعد ہم چمر کنڈ کے گاؤں میں پہنچے جو افغانی سرحد کے نزدیک ایک چھوٹی سی جگہ ہے (یہاں کچھ سال بعد مولوی عبدالرحیم معروف بہ مولوی بشیر شہید) نے جماعت مجاہدین میں پہنچ کر مجاہدین کی ایک ٹولی کو آباد کیا تھا اور اس کو مجاہدین کا مرکز ثانی بنایا تھا۔

اس سفر میں ہمیں کافی مشکلات کا سامنا ہوا۔ دن بھر کی تکان کے بعد جو گاؤں کی مسجد میں رات گزرتی اس سے پچھلے دن کی درماندگی چنداں دور نہ ہوتی تھی کہ اگلے دن پھر روانہ ہونا پڑتا تھا۔ شکر ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی راستے میں بیمار نہ ہوا اور نہ کسی کے پاؤں میں چھالے پڑے۔ شجاع اللہ جس کا جسم بھاری بھر کم تھا، راستہ میں قافلے میں سب سے پیچھے رہ جایا کرتا تھا اور بمشکل دن کے سفر کو پورا کیا کرتا تھا۔ ہم میں ہر ایک کے پاس ایک کمبل اور دو تین

ہوئے کپڑوں کے تھے۔ میرا سامان دوسرے ساتھیوں کے سامان سے ذرا زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں شجاع اللہ سے آگے ہی رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے سارے دوست شجاع اللہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اب ہم افغانی سرحد کے قریب پہنچ گئے تھے اور اگلے روز افغانی علاقے میں داخل ہونے والے تھے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قارئین کے سامنے اس زمانے کے افغانستان کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کا مختصر سا خاکہ کھینچا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ ہم نے کیسی حالت میں وہاں کام کیا اور ہمارے چند دنوں بعد، ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر کابل پہنچ کر میرے بزرگ اور استاد مرحوم مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے کیسے نامساعد ماحول میں اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کی۔

چوتھا باب

افغانستان کے جغرافیائی حالات

اس زمانے میں افغانستان کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ یہ ملک، روس اور سلطنت برطانیہ ہند کے درمیان ایک مفارق حکومت (Buffer State) کے طور پر واقع تھا جو ان دو بڑی طاقتوں کی مٹھ بھیڑ اور باہمی ٹکر کو روکنے کا کام دیتا تھا۔ اس وقت اگرچہ زار روس کے زمانے میں پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے روس اور برطانیہ میں دوستی اور اتحاد تھا لیکن روس کی نگاہ طمع ہمیشہ ہندوستان پر لگی رہتی تھی۔ آج اگرچہ نہ تو روس میں زار کی حکومت ہے اور نہ ہی ہندوستان میں انگریزی راج باقی ہے لیکن روس کے موجودہ ارباب حکومت اس برصغیر میں اپنے ملک کی طرح ایک کمیونسٹ نظام قائم کرنے اور اس کو مشرقی یورپ کے ملکوں کی طرح اپنا غلام بنانے اور ایک عالم گیر اشتراکی حکومت کی داغ بیل ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ افغانستان کی موجودہ حکومت[1] میں دور اندیشی نہیں ہے اور آج بعض موقت فوائد کے لئے اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈال کر پاکستان کی بجائے روس کی دوستی کا دم بھر رہی ہے اور اپنے ملک میں روسی اثر کے دن بدن بڑھنے پر چشم پوشی کر رہی ہے۔ حالانکہ اس کو بخارا، رومانیا اور بلغاریہ کے بادشاہوں کی عاقبت کو پیش نظر رکھنا اور ان کے حالات سے درس عبرت لینا چاہئے۔ اگر روسی باوجود عہد وپیمان کے ان ملکوں میں بادشاہت کو ختم کر چکے ہیں تو کیا افغانستان کے خاندان شاہی کا ایک دن خاتمہ نہ کر دیں گے؟

---

[1] جس وقت یہ تحریر لکھی گئی اس وقت محمد ظاہر شاہ کی حکومت تھی۔ انقلاب کے بعد اب افغانستان روس کی آہنی گرفت میں ہے اور وہاں مجاہدین اپنی آزادی اور بقا کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔

اس وقت ہم کو اور ہماری طرح ہندوستانی مسلمان لیڈروں کو یہ خیال تھا کہ افغانستان ایک قوی اسلامی ملک ہے اور اگر وہ لڑائی میں شریک ہو کر ہندوستان پر حملہ کرے تو وہ انگریزوں کو ضرور ہندوستان سے نکال سکے گا۔ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا افغانستان آنا اسی غرض سے تھا کہ افغانستان کو جنگ میں شامل ہونے پر اور ہندوستان پر چڑھائی کرنے پر آمادہ کریں۔

افغانستان کی آبادی اور اس کا رقبہ

افغانستان کا رقبہ ۲۴۵،۰۰۰ مربع میل ہے یعنی جنگ سے پہلے کی جرمنی کے رقبے سے زیادہ ہے۔ لیکن 1915 میں اس کی آبادی (۸۰) لاکھ تھی (اگرچہ کوئی باقاعدہ مردم شماری تو وہاں کبھی بھی نہیں ہوئی) ملک میں ہندوکش جیسے بلند پہاڑوں کے ساتھ ترکستان اور چخنسور (Chakhansur) جیسے ہموار اور ریتیلے علاقے اور دشت بقوا (Baqwa) جیسے صحرا بھی موجود ہیں۔ دریا کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی چنداں بڑے نہیں ہیں۔ ان میں دریائے کابل شہر کابل کے درمیان سے گزرتا ہے اور جلال آباد کے نزدیک دریائے کنڑ سے مل کر صوبہ سرحد میں دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ دریائے ہلمند اور دریائے ہری رود Hari Rod ہرات کے علاقے کی آبیاری کرتے ہیں اور آخر میں سیستان (ایران) کے ریگستان میں ختم ہو جاتے ہیں۔ دریائے آمو (Amu Darya) روس اور افغانستان کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور پامیر Pamir کے برفانی علاقوں میں سے نکل کر جھیل آرال (Aral) میں گرتا ہے۔

مشرق میں کوہ سیاہ اور کوہ سلیمان افغانی علاقے کو پاکستان سے جدا کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں درہ خیبر، درہ ٹوچی، درہ گومل اور درہ بولان واقع ہیں جہاں سے تاریخ کے پرانے زمانے میں مختلف فاتحین گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور جہاں سے اب تجارتی قافلے اور کارواں گزر کر کاروبار کے لئے برصغیر میں آتے رہتے ہیں۔

آب و ہوا

ملک کے بعض حصوں میں (مثلاً کابل، غزنی، سمت شمالی ہزارہ جات وغیرہ میں) جاڑے میں سخت سردی اور برف باری ہوتی ہے۔ مگر بعض جگہوں میں (مثلاً

قندھار، جلال آباد، خوست، چخنسور اور مزار شریف میں) گرمی کے موسم میں انتہا درجہ کی گرمی پڑتی ہے۔ ہرات کی آب و ہوا میں یہ خصوصیت ہے کہ اگر دو ماہ گرمی میں روسی ترکستان کے ریگستانی علاقوں سے گرم ہوائیں وقت پر نہ چلیں تو ہرات کے اندر جتنے تالاب اور حوض ہیں ان کے پانی میں سخت بدبو اور تعفن پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

لوگوں کا پیشہ

لوگ عام طور پر کاشتکار ہیں یا چرواہے جو موٹی چربی والی دم دار بھیڑوں کے گلے رکھتے ہیں۔ ان بھیڑوں کی اون سے گرم کپڑے بنے جاتے ہیں لیکن ان کی اون کشمیری اون کی طرح باریک نہیں ہے اور نہ اس کے ریشے لمبے ہوتے ہیں۔ ملک میں عام طور پر سال بھر میں ایک فصل ہوتی ہے۔ بعض گرم علاقوں میں دو فصلیں بھی ہو جاتی ہیں۔ گیہوں، مکئی، اور جو کی کاشت زیادہ ہے۔

خوراک

عام طور پر لوگ گیہوں اور مکئی کی روٹی کھاتے ہیں لیکن امرا کے ہاں اور شہروں کے مال دار گھروں میں چاول زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ کابل میں پلاؤ بہت لذیذ اور کئی قسم کا پکتا ہے۔ اعلیٰ چاول پشاور سے آتے ہیں۔ کنڑ Kunar کے علاقے میں بھی اچھے چاول پیدا ہوتے ہیں۔

آب پاشی

زمینیں اکثر بارانی ہیں۔ نہری زمینیں بہت کم ہیں۔ جیسا کہ سرحدی علاقوں میں دیکھا گیا تھا افغانستان میں بھی لوگ ندیوں اور نالوں سے چھوٹی چھوٹی نالیاں کاٹ کر پانی اپنے کھیتوں اور باغوں تک لاتے ہیں۔ لیکن دریاؤں سے بڑی بڑی نہریں نہیں بنائی گئی ہیں۔ ان نالیوں کے سوا آبیاری کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو ہم نے افغانستان کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا (کہتے ہیں کہ ایران اور بلوچستان میں بھی یہ طریقہ موجود ہے) اس اصول آبیاری میں دور دراز کے پہاڑی چشموں یا ندیوں کا پانی زیر زمین ایک سرنگ کے مانند نالی کھود کر کھیتوں تک لایا جاتا ہے۔ شروع میں اس نالی کی تہ زمین سے دو تین گز نیچے ہوتی ہے۔ اس کو اس ہشیاری سے ڈھلواں بنایا

جاتا ہے کہ جب اس کا پانی ہموار زمین پر پھیلے ہوئے کھیتوں میں پہنچے تو بالکل سطح زمین پر نکل آئے۔ ایسی زیر زمین نالیوں کو کہریز Kahrez کہتے ہیں۔ کہریز کی چھت اس کی تہ سے تقریباً ڈیڑھ گز اونچی ہوتی ہے اور اس کی چھت میں ہر ایک میل پر ایک سوراخ ہوتا ہے، جہاں سے مسافر ڈول ڈال کر کہریز سے پانی نکال کر پی سکتا ہے۔ اگر کہریز کی چھت گر جائے اور اس مٹی سے پانی کا بہنا بند ہو جائے تو اس گری ہوئی مٹی کو صاف کرنے کے لئے مزدور اس سوراخ کے کہریز کے اندر اتر کر اس مٹی کو صاف کر دیتے ہیں اور پھر پانی کے آزادی سے بہنے کا انتظام ہو جاتا ہے۔

پیداوار

ملک میں ہر قسم کا میوہ پیدا ہوتا ہے انگور، شفتالو (یعنی آڑو) خربوزہ، تربوز، سیب، ناشپاتی، انار، شہتوت وغیرہ بہت اچھے اور لذیذ ہوتے ہیں۔ آم یہاں نہیں پیدا ہو سکتا۔ آڑو، خربوزے، اور تربوز برصغیر کی نسبت زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔ خربوزہ دو قسم کا ہوتا ہے جن کو (سردہ) اور (گرمہ) کہتے ہیں۔ یہ دو قسمیں بے حد میٹھی ہوتی ہیں۔ خشک میوہ برصغیر کو برآمد کیا جاتا ہے اور افغانی تجارت برآمد کا ایک معتدبہ حصہ شمار ہوتا ہے۔ اس میں اخروٹ، پستہ، کشمش، بادام وغیرہ مشہور ہیں۔ اس کے سسو اقرہ قولی (استرغان) (Astarghan) کی کھالیں، غالیچہ اور قالین بھی برآمد ہوتے ہیں۔ تازہ میوہ، ڈبیوں کے اندر روئی میں چنے ہوئے سبز انگور اور سیبوں میں عبارت ہے اور لاہور تک پہنچتا ہے۔

افغانستان کی اقوام اور ان کی زبانیں

افغانستان کے لوگ نہ ایک نسل سے ہیں اور نہ ایک مشترک زبان بولتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کچھ نامناسب اور بے جا نہ ہو گا کہ افغانستان میں ایک متحدہ قوم آباد نہیں ہے بلکہ یہاں صرف مختلف قبیلے بستے ہیں جن میں سے

(۱) افغانی (پشتو) بولنے والے لوگ جو قندھار، غزنی، سمت مشرقی (یعنی جلال آباد کا علاقہ) اور سمت جنوبی میں (یعنی خوست کا صوبہ جس کی سرحد وزیرستان اور کوہاٹ سے ملتی ہے) رہتے ہیں، یہ لوگ کل آبادی کا ۵۳ فیصد حصہ ہیں۔

(۲) فارسی بولنے والے یعنی تاجک، ہرات اور کابل کے شمالی علاقہ میں آباد ہیں۔ یہ لوگ ساری آبادی کا ۳٦ فیصد حصہ ہیں۔

(۳) ترکی بولنے والے ترکستانی لوگ افغانی ترکستان میں جس کا مرکز شہر مزار شریف ہے، رہائش رکھتے ہیں۔ یہ تقریباً ٦ فیصد ہیں۔ (یہ اعداد و شمار این سائیکلو پیڈیا آف اسلام کے لئے گئے ہیں)

(۴) فارسی بولنے والے ہزارے جو علاقہ ہزاراجات واقع وسط افغانستان میں رہتے ہیں مغلوں کی اولاد مانے جاتے ہیں اور شیعہ مذہب ہیں۔

ہرات میں کچھ یہودی آباد ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ہندو صراف اور بنئے بھی پائے جاتے ہیں جو زیادہ تر تجارت اور روپے کا لین دین کرتے ہیں۔ ان کی پہچان کے لئے، ان کو افغانی قانون کے مطابق زرد پگڑی پہننی پڑتی تھی (اس وقت یہ قانون جاری تھا اب ہٹا دیا گیا ہے)

صوبہ جلال آباد کے شمال اور صوبہ خانہ آباد کے جنوب میں ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کو پہلے کافرستان کہتے تھے اور جو امیر عبد الرحمٰن ضیاء الملت والدین کی فتوحات اور وہاں کے لوگوں کے مسلمان ہو جانے پر نورستان کہلانے لگا ہے۔ یہاں کے لوگ نسل اور زبان کے لحاظ سے دوسرے لوگوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ اسکندر اعظم کی فوج کے ساتھ یہاں آئے اور جب یونانی حکومت بلخ (باختر) سے مٹ گئی تو یہ لوگ یہاں ہی آباد ہو کر رہ گئے۔

افغانی حکومت کی سرکاری زبان فارسی ہے۔ اس زمانے میں پشتو کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش نہ کی جاتی تھی (لیکن آج کل ایسی کوششیں ہو رہی ہیں)۔ پشتو زبان میں اگرچہ موڈرن لٹریچر موجود نہیں ہے لیکن پرانے زمانے سے اس میں نظم اور نثر کا کافی خزانہ موجود ہے۔

نسلی رشتہ

افغانوں کے نسلی رشتے کے بارے میں دو نظریئے موجود ہیں۔

(۱) یہ کہ افغان بنی اسرائیل کے گم شدہ قبیلے کی اولاد سے ہیں۔ یہ روایت جس کو Encyclopaedia of Islam نے بھی لکھا ہے یوں ہے کہ اسرائیلی بادشاہ طالوت کے ایک پوتے کا نام افغانہ تھا اور اس کا قبیلہ بخت نصر کی طرف سے ملک بدر کر دیا گیا تھا اور وہ موجودہ افغانستان میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک شخص قیس نامی حضرت خالدؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور اس نے اپنے سارے لوگوں کو مسلمان بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب لوگوں کا اس وقت مسلمان ہونا درست نہیں۔ کیونکہ الپت گین نے جب کابل پر قبضہ کیا تو وہاں کے لوگ مسلمان نہ تھے۔ اسی طرح ترکی بادشاہ کے بعد جب ترکی سلطان سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۳ میں ہرات کا علاقہ فتح کیا تو وہاں کے لوگوں کو بھی مسلمان بنایا۔ افغان سرحدی پٹھانوں کو بھی اپنا ہم نسل بتاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ قیس کے تین لڑکے تھے Sarbannri (ساربانڑی) جس کی اولاد سے موجودہ سدوزائی اچکزائی بارکزائی شنورائی وغیرہ ہیں۔ Bitan (Batri) جس کی ذریت میں غلشرائی لودھی اور سوری ہیں۔

غورغشت (Ghurghust)۔ جس سے مندوخیل، کاکرا، صافی، موسیٰ خیل کے قبیلے پیدا ہوئے ہیں۔ ان قبائل میں سرحدی پٹھان اور خاص کر ان کے آفریدی، مہمند، وزیری، اور گزائی، خٹک، محسود، بنگش جیسے مشہور قبیلے موجود نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے سرحدی پٹھان اور خاص کر ان کے آفریدی، وزیر، محسود، خٹک اور گزائی اور مہمند جیسے قبیلے افغانوں کی طرح بنی اسرائیل کی اولاد سے نہیں ہیں۔ لیکن افغان ان کو بھی اپنے میں ملانے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ غورغشت کا ایک اور لڑکا برہان نامی تھا جس کی اولاد سے کرلانڑی Karalanri ہوا اور اس کی نسل سے سرحد کے مشہور پٹھان قبیلے پیدا ہوئے۔ اس کے سوا وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سرحدی پٹھانوں اور افغانوں کی زبان مشترک ہے اور دونو پشتو بولتے ہیں۔ دو قوموں کا ایک مشترک زبان بولنا ان کے ہم نسل ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً روسی اور بلغاری قومیں سلاوی (Slav) زبانیں بولتیں ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ حالانکہ بلغاری قوم ترکی الاصل ہے اور روسی آرین ہیں۔ روسی حکومت آج کل کوشش کر رہی ہے کہ وسط ایشیا میں رہنے والی ترکی قوموں میں مثلاً

ترکستانی ترکمن، قرغیز، قزاق اور قفقازی لوگوں میں روسی کو اتنا رواج دیں کہ وہ لوگ اپنی زبان بھول جائیں اور صرف روسی زبان بولیں۔ اگر کبھی روسی اس میں کامیاب ہو گئے (غالباً وہ نیم صدی کے بعد اس میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے اگر روس میں بولشویکی نظام اس وقت تک قائم رہا) تو کیا وسط ایشیا کی ترکی اقوام کو بھی ہم روسی نسل میں شامل کر دیں گے؟

(۲) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ افغان ہند — آریائی نسل سے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ افغان قبیلوں کے ہم نام قبیلے ابھی تک برصغیر کے مغربی حصوں میں آباد ہیں جو ابھی بھی ہندو مذہب کے پیرو ہیں۔ حالانکہ ان کے ہم نام قبیلے افغانستان میں مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں وسط ایشیا سے بہت سی اقوام جن میں ترک بھی شامل ہیں. ہجرت کر کے آئے اور یہاں آباد ہو گئے اور ان قبائل سے جو وہاں آباد تھے مختلف اوقات میں شمال کی طرف سے وہاں آئے تھے مل گئے اور ایک مخلوط آبادی بن گئی۔

مذہب

افغانوں کی بہت بڑی اکثریت سنی اور حنفی ہے۔ شیعہ ہزارہ جات میں اور وادی کرم کے شمالی علاقے میں رہتے ہیں جہاں ان کو طوری کہا جاتا ہے۔ ان کے سوا کابل میں قزلباش کے نام سے کچھ شیعہ آباد ہیں جن کا محلّہ کابل میں چنداول (Chindawal) کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزوں نے جب کبھی افغانستان پر حملہ کیا تو ان شیعہ قبیلوں سے بہت کام لیا۔ امیر افغانستان نے شیعہ افغانوں کو سنی افغانوں سے ملانے اور ان میں اخوت کا بیج بونے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود بھی. اہل ہزاراجات کو دوسرے لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

افغانوں کی خصلت اور ان کا کیریکٹر

افغانستان میں جو تاجک. ہزارے اور ترکمان موجود ہیں ان کے کیریکٹر پر تو یہاں بحث نہیں کی جاسکتی کیونکہ حکمران طبقہ ان کو اپنے سے ادنیٰ سمجھتا ہے اور ان کو مفتوح اقوام میں سے شمار

کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ قبیلے اپنی فطری خوبیوں میں سے بہت سی خوبیوں کو کھو بیٹھے ہیں۔ یہ غریب تو حکمران طبقہ کے لئے ہر طرح کی خدمت بجالانے پر مجبور ہیں۔

افغان لوگ جفاکش، محنتی، جانباز، اور جنگ جو ہیں۔ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے ہیں—— گھوڑی پر سوار ہونے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ جنگ میں حملے کے وقت جان فشانی سے کام لیتے ہیں۔ بہت ڈٹ کر اپنے مورچے کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں ان کو شکست ہو جائے تو بہت جلد بد دل ہو جاتے ہیں۔ لوگ آزاد منش ہیں اور اپنی افغانیت پر ناز کرتے ہیں۔ مگر مال اور دھن کے لالچی ہیں۔ جب کسی سے کچھ فائدہ کی امید ہو تو اس کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں لیکن اگر یہ امید بر نہ آئے تو ہر طرح کی خرابی پر تل جاتے ہیں۔ انسان کے خون کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ اس لئے ان کے قبیلوں میں خاص کر ان قبیلوں میں جو مشرقی سرحد کے نزدیک رہتے ہیں باہمی جھگڑے اور لڑائیاں ختم نہیں ہوتیں۔ ایک ہی قبیلے کے افراد میں بھی باہمی عداوتیں چلی جاتی ہیں اور ایک قتل کا بدلہ لینے کے لئے سالہا سال انتظار کرتے اور موقع دیکھتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی خانہ جنگی ختم ہی نہیں ہوتی۔

افغانوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ شام کو اگر کوئی مسافر گھر میں آجائے تو عام طور پر اس کی خاطر تواضع خوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ان کا دشمن بھی ان سے پناہ لینے کے لئے گھر آجائے تو وہ پرانے خونی خاندانی جھگڑے بھول جاتے ہیں۔ افغانوں کی یہ خصلت ان کے اس قانون برداری کا نتیجہ ہے جس کو وہ پختون والی کہتے ہیں اور جس کو ہر چھوٹا بڑا افغان مانتا ہے۔ اگرچہ یہ قانون کسی کتاب میں نہیں لکھا ہے۔ افغان اپنے اس قانون کی وجہ سے اپنے افغان بھائیوں کو غیر افغانوں پر (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں) ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس قانون کی وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے ملک کے قوانین اور مذہبی احکام کو بھی پس پشت ڈال دیا کرتے ہیں۔

تعلیم

اس زمانے میں افغانستان تعلیم میں بہت پس ماندہ تھا۔ شاید کل آبادی میں سے صرف ایک فیصد یا زیادہ سے زیادہ دو فی صد لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور وہ بھی صرف پرانے مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے۔ پرانے بادشاہ غالباً اپنی رعایا کو تعلیم دینے سے ڈرتے تھے کہ

کہیں ان کی آنکھیں نہ کھل جائیں اور وہ ان کی مطلق العنانی کے بر خلاف بغاوت نہ کر دیں۔

امیر حبیب اللہ خان (سراج الملتہ الدین) کے زمانے میں سارے ملک میں ایک سول مکتب (مکتب حبیبیہ کے نام سے) اور ایک فوجی سکول (مکتب حربیہ کے نام سے) موجود تھا ان سکولوں کے بارے میں تفصیلات آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ لیکن یہاں اتنا لکھنا ضروری ہے کہ افغانستان میں نئی تعلیم اور موجودہ ترقی کی داغ بیل امیر حبیب اللہ خان ہی کے زمانے میں ڈالی گئی اور اگر وہ امیر عبد الرحمن خان (ضیا الملت والدین) کے بعد افغانستان کے بادشاہ نہ ہوتے تو شاید اس ملک میں کوئی نئی تہذیب اور طریقہ تعلیم کا نام بھی نہ جانتا۔

تجارت، صنعت و حرفت

اس بارے میں ٹھیک اعداد و شمار موجود نہیں ہیں صرف بعض کتابوں سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں در آمد شدہ مال کی قیمت (۵۸۰۰۰۰) پونڈ تھی جس میں سوتی کپڑا، کھانڈ اور چائے وغیرہ شامل ہے۔ مال بر آمد کی قیمت (۳۶۰۰۰۰) پونڈ تھی۔

بر آمد کا معتدبہ حصہ خشک میوہ، اون، بھیڑ بکری کی کھالیں تھیں۔ افغانستان کی تجارت کا بڑا حصہ ہند پاکستان بر صغیر کے ساتھ تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے پیشتر روس کے ساتھ بھی کافی لین دین ہوا کرتا تھا۔ چائے اور کھانڈ وغیرہ زیادہ تر روس سے آتی تھی۔ ہندوستان سے سوتی کپڑا، لباس، جوتے اور دیگر مصنوعات آیا کرتی تھیں جو جلال آباد، کابل، غزنی اور قندھار کے بازاروں میں بکتی تھیں۔

کابل میں اس زمانے میں ایک بوٹ فیکٹری تھی جو زیادہ تر فوجی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ اہالی کے لئے اس میں بوٹ بہت کم بنتے تھے۔ عام طور پر کابل کے بازاروں میں ہندوستان اور انگلستان کے ساخت کے جوتے ملتے تھے۔ ہاتھ سے کر گاہوں میں بنا ہوا سوتی کپڑا اور اونی کپڑا بھی گاؤں میں زیادہ استعمال ہوا کرتا تھا۔ ہرات میں اونٹ کی اون سے اچھا پشمینہ بنتا تھا۔ قالین بافی کافی زیادہ تھی۔ افغانی قالین جن کے ڈیزائن کو فیل پایہ کہتے ہیں بر آمد کئے جاتے تھے۔

مالیات:

اس زمانے میں افغانستان میں کوئی باقاعدہ بجٹ نہیں بنایا جاتا تھا۔ (کم از کم اس بارے میں اعداد و شمار تو کبھی کسی کتاب میں نہیں دیکھے گئے) ملک کی آمدنی ان دنوں میں گورنمنٹ کے

اخراجات کو پورا نہیں کرتی تھی اس لئے ہندوستان کی انگریزی حکومت امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے سے درباری اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اور افغانستان کو روس سے علیحدہ رکھ کر اپنا دوست بنانے کے لئے افغانستان کو سالانہ ایک معتدبہ رقم (ایک لاکھ روپیہ) بطور وظیفہ کے دیا کرتی تھی۔ امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں یہ رقم کچھ اور بڑھا دی گئی تھی (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ یہ رقم سالانہ (۱۸۰۰۰۰) ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ تھی) افغان عام طور پر اس رقم کو وظیفہ کی بجائے خراج کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انگریزی حکومت ان سے ڈرنے کی وجہ سے ان کو خوش رکھنا چاہتی ہے اس لئے ان کو خراج دیتی ہے۔ اس روپے کا ایک بڑا حصہ امیر کی اور اس کے رشتہ داروں کی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ مثلاً قبیلہ محمد زائی کے افراد کو جس سے خاندان شاہی منسوب ہے۔ اس رقم میں سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔

ذرائع آمدورفت

افغانستان میں نہ اس وقت اور نہ اب ریل کی پٹڑی ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں، سڑکیں بھی کم اور کچی تھیں۔ پختہ سڑکیں کابل شہر کے اندر اور گردو پیش اور کابل، جلال آباد، ڈکہ، کابل پغمان، کابل جبل السراج کا برقی کارخانہ، جلال آباد ـــــ پغمان کا شتائیہ یعنی (سردیوں میں درباریوں کی سیر و شکار کی جگہ) کے درمیان تھیں۔ ان سڑکوں پر جو پل تھے وہ بھی چنداں مضبوط نہ تھے اور بارش کے دنوں میں سیلاب سے خراب ہو جایا کرتے تھے۔ کابل، قندھار، ہرات، مزار شریف اور گردیز، غزنی جیسے شہروں اور قصبوں کے درمیان جو سڑکیں تھیں وہ بالکل خراب حالت میں تھیں۔ اگر کبھی کسی بڑے شہزادے یا گورنر کو اس طرف دورہ کرنے کا اتفاق ہوتا تو ان کی ذرا مرمت کر دی جاتی تھی۔ نہیں تو خیر سواری، اور بار برداری کے لئے عام طور پر گھوڑے، خچر، ٹٹو اور اونٹ کام میں لائے جاتے تھے۔ گاڑی اور تانگے کا رواج صرف کابل یا جلال آباد میں تھا۔ موٹر کاریں تو صرف حبیب اللہ خان کی سواری کے لئے تھیں۔ دوسرے امرا اور وزرا عام طور پر گھوڑے کی سواری کرتے تھے اس لئے ان کے اصطبلوں میں

اچھے اچھے گھوڑے موجود تھے۔

ڈاک کا انتظام بہت ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ تر مرکزی حکومت کے احکام کو گورنروں اور احکام ضلعی تک پہنچانے کے لئے تھا۔ لوگ عام طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے خط پتر لے جاتے تھے اور اس بارے میں ڈاک صیغے سے چنداں فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔ ہندوستان سے ڈاک عام طور پر ہفتہ میں دو مرتبہ اور بعض اوقات، خاص کر سردی میں صرف ایک دفعہ آتی تھی جس میں اخبارات بھی آیا کرتے تھے۔ کابل اور جلال آباد کے درمیان ایک ٹیلیفون لائن بھی تھی جو صرف امیر صاحب کے سردیوں میں جلال آباد جانے پر ذرا اچھی طرح کام دیتی تھی ورنہ سرکاری خبر رسانی کے سوا اس سے کوئی نج کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ محکمہ تار تو بالکل موجود ہی نہ تھا۔

فوج:

افغانستان میں باقاعدہ فوج کی داغ بیل امیر عبدالرحمٰن خان نے ڈالی تھی۔ اس سے پہلے مختلف قبیلوں کے سردار اور رئیس جنگ کے وقت ایک مقررہ تعداد میں اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر امیر کے لشکر میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ امیر حبیب اللہ کے زمانے میں ترکی افسر بلائے گئے اور مکتب حربیہ کے نام سے ایک فوجی سکول کی بنیاد ڈالی گئی تھی، لیکن اس میں فوجی تعلیم بہت ابتدائی تھی اور مکتب کا نصاب تعلیم مڈل سکول سے زیادہ نہ تھا کیونکہ معلموں کی کمی تھی۔ شروع میں مکتب کا ہیڈ ماسٹر خیری بیگ نام ایک ترکی کیپٹن تھا۔ فوج کے افسر اسی مکتب کے پاس شدہ طالب علم ہوا کرتے تھے جن کو جنگی فنون سے کم واقفیت ہوتی تھی۔ فوج کے سپہ سالار جنرل محمد نادر خان ولد سردار محمد یوسف خان مصاحب خاص حضور امیر صاحب تھے۔ شاہی رسالے کے بڑے افسران کے دوسرے بھائی مثلاً سردار ہاشم خاں، سردار محمد علی، سردار شاہ ولی خان اور سردار شاہ محمود خان تھے۔ ان سب صاحبان کی عمر کا بڑا حصہ ڈیرہ دون میں گزرا تھا کیونکہ ان کا خاندان شاہ شجاع اور امیر دوست محمد خان کے زمانے میں بادشاہ گردی کی وجہ سے افغانستان سے ہندوستان میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ افغانستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسی خاندان میں سے تھے۔ انکی کوئی باقاعدہ فوجی تعلیم تو نہ تھی لیکن آہستہ آہستہ عملی طور پر فوجی اصولوں اور ڈسپلن (Discipline) سے واقف ہو چکے تھے۔

امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ سلطنت کے شروع میں، سمت جنوبی افغانستان میں رہنے والے قبیلہ منگل نے جب بغاوت کی تو اس کو فرو کرنے کا سہرا سپہ سالار محمد نادر خان کے ہی سر رہا تھا۔ اس کامیابی میں انکی فوجی مہارت کے سوا ان کی فراست، ان کی مردم شناسی اور امور دولت سے واقفیت کا بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خان ہندوستانی مسلمانوں کے خاص کر حامی اور طرفدار تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا انہوں نے ہمارے محترم مرشد قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اور ہماری حمایت میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اگر سردار محمود بیگ طرزی کو جن کا مفصل ذکر آگے کیا جائے گا، ترکی معاشرت کا دلدادہ کہا جائے تو سردار محمد نادر خان کا خاندان مرحوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا مرید تھا۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم میرے تو خاص طور پر محسن تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ان کے ہمیشہ ممنون رہے، اور ان سے ہر وقت اظہار ممنونیت کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں افغانی فوج کے ہتھیار بہت ابتدائی تھے۔ صرف کابل کے فوجی دستوں کے ہاتھ میں نئی قسم کی بندوقیں تھیں جن سے کچھ مانہرManher ساخت جرمنی تھیں ان کو افغان (قونگ جاغور دار) کہا کرتے تھے، اور کچھ انگریزی مارٹنی (Martini) بندوقیں تھیں۔ چند ایک مشین گنیں اور دو جرمن سریع آتش یعنی (Quick firing) پہاڑی ہوسٹرز توپیں موجود تھیں۔ باقی توپیں پرانی اور فتیلی تھیں جن کا دنیا میں غالباً کسی جگہ بھی رواج باقی نہ رہا تھا۔ فوجی سپاہیوں کو سرکاری طور پر کمسریٹ سے کھانا نہیں ملتا تھا بلکہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی جو ان کے بال بچوں کے گزارے کے لئے بہ مشکل کافی ہوتی تھی۔ وہ خود آٹا مول لے کر روٹی پکاتے تھے اور اپنا سالن بھی خود ہی تیار کیا کرتے تھے۔ چولھے کے لئے لکڑی بھی وہ خود ہی ادھر ادھر سے اور پاس کے درختوں سے جمع کر کے لاتے اور جلاتے تھے۔ اس سے ان کا وقت فوجی پریڈ کے لئے بہت کم رہ جاتا تھا۔ اس لئے ان میں نہ چنداں فوجی ڈسپلن موجود تھا اور نہ وہ خود کچھ توانا نظر آتے تھے۔

فوجی بھرتی مجبوری خدمت (Compulsory Service,) کے اصول پر نہ تھی جیساکہ ترکی میں ہے۔ اس اصول کی بجائے اس وقت افغانستان میں آٹھ نوجوانوں میں سے ایک نوجوان قرعہ (لاٹری) سے دو سال کے لئے فوج میں لیا جاتا تھا۔ اس اصول کو افغانستان میں (اصول ہشت نفری) کہتے ہیں۔ اس طرح پر بعض سپاہی دو سالہ خدمت کے بعد روپیہ لے کر دوبارہ کسی دوسرے شخص کی بجائے فوج میں چلے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو (عوض) کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ بوڑھے ہونے تک اسی طرح دوسرے اشخاص کی

بجائے فوج میں کام کرتے تھے اور سپاہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا کرتے تھے۔ شاہی خاندان کا قبیلہ محمد زائی اور منگل، جدران، اسدوزائی جیسے قبیلے اس اصول (ہشت نفری) سے معاف تھے وہ کبھی سپاہی کے طور پر فوج میں نہیں لئے جا سکتے تھے۔

کابل میں مشین خانہ کے نام سے ایک کارخانہ ہے۔ جس میں مختلف سامان اور چیزوں کے سوا اس زمانے میں سفید بارود اور کچھ تعداد میں ایک فیری بندوقیں Single Firing rifies بھی بنائی جاتی تھیں۔

سفید بارود ایک ترکی انجینئر رضا بیگ کی نگرانی میں بنتی تھی اور بندوقیں ہندوستانی مسلمان کاریگروں کی مہارت کا نتیجہ تھیں، لیکن فولاد یورپ سے آتا تھا، اس لئے یہاں بندوقیں بڑی تعداد میں نہیں بنتی تھیں۔ اس کارخانے کو امیر عبد الرحمٰن خان نے قائم کیا تھا۔ اس وقت اس میں پتھر کے کوئلے کی بجائے لکڑی جلائی جاتی تھی، کیونکہ بجلی کا کارخانہ بھی نہ تھا، اس وجہ سے افغانستان کے جنگلات بالکل تباہ ہوتے جا رہے تھے۔ لکڑی کم ہو جانے کی وجہ سے کارخانہ میں کام چنداں باقاعدہ نہیں چلتا تھا۔ یہاں ایک مطبع بھی تھا جس میں برکت اللہ نام ایک پنجابی مسلمان اور بعض مصری کاریگر کام کیا کرتے تھے۔ اس مطبع میں افغانستان کا واحد اخبار سراج الاخبار چھپا کرتا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ روزانہ نکلنے والا کوئی اخبار ملک میں موجود نہ تھا۔ جبل السراج میں بجلی کا کارخانہ کسی امریکائی نے قائم کیا تھا لیکن وہ پانی کی قلت کا بہانہ کر کے اس کو ادھورا ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس لئے اس زمانے میں مشین خانہ میں بجلی کی طاقت سے فائدہ نہ اٹھایا جاتا تھا۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے زمانے میں ایک ہندوستانی مسلمان انجینئر نے اس بجلی کے کارخانے کو چالو کیا جس سے مشین خانہ میں اور شہر میں بھی بجلی کی طاقت اور بجلی کی روشنی سے کام لیا جانے لگا۔

ملکی تقسیمات

ملک داخلی انتظام اور ادارۂ امور کے لحاظ سے بدخشاں، مزار شریف، ہرات، قندھار کے چار بڑے صوبوں میں جن کے سولین افسر اعلیٰ کو نائب الحکومہ کہا جاتا ہے منقسم ہے۔ نائب الحکومہ برصغیر کے گورنر کے مترادف ہے۔ سردی کے موسم میں امیر افغانستان حبیب اللہ خان کے جلال آباد جانے پر، ولایت کابل کا انتظام تیسرے شہزادے امان اللہ خان عین الدولہ کے سپرد ہوتا تھا یا ان کی عدم موجودگی میں کسی افسر اعلیٰ کو جس کو والئ کابل کہا جاتا تھا، دیا جاتا تھا۔ امان اللہ خان کی والدہ علیا حضرت ایک بہت بارسوخ خاتون تھیں۔ انہی کی خاطر امان اللہ خان کو یہ

پوسٹ دی جاتی تھی۔

ان بڑے صوبوں کے سوا جلال آباد (سمت مشرقی) خوست (سمت جنوبی) غزنی چخنسور، پنجشیر، کوہدامن ہزارہ جات، میمنہ جیسی کچھ کمشنریاں تھیں جن کے افسروں کو حاکم اعلیٰ (چیف کمشنر) کہا جاتا تھا۔ نائب الحکومہ اور حاکم اعلیٰ کا سب امور انتظامیہ میں دخل ہوتا تھا۔ وہ اپنے اپنے علاقے میں مختار کل مانے جاتے تھے۔ نائب الحکومہ کے ساتھ عدالتی کاموں کے لئے ایک قاضی بھی ہوتا تھا لیکن وہ نائب الحکومہ کے ماتحت ہی سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ محکموں میں مقدموں کو شرعی اصول پر فیصلے کا حق رکھتا تھا۔

ملک میں امیر حبیب اللہ خان کی مطلق العنان حکومت تھی۔ اس کا ہر لفظ قانون کے مترادف تھا۔ لیجسلیٹو (قانون سازی) ایگزیکٹو (اجرائی) اور جوڈیشل (عدالتی) ہر قسم کے اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ مقدمہ کا فیصلہ وہ خود کیا کرتا تھا۔ قیدیوں کو سزائیں اور ان کے لئے موت کا حکم دینا اس کے اختیار میں تھا۔ ملک میں نہ کوئی پارلیمنٹ تھی اور نہ کوئی کیبنٹ تھی جو انتظام امور کے لئے احکام جاری کرے۔ دربار میں مصاحب خاص کے نام سے سردار محمد آصف خان اور ان کے بھائی سردار محمد یوسف خان جو سردار محمد نادر خان سپہ سالار کے والد تھے امیر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ گویا امیر ان سے صلاح و مشورہ کر کے کام کرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو ملکی انتظامات میں کوئی دخل نہ تھا۔ پرانے وزیر اعظم اعتماد الدولہ سردار عبدالقدوس خان جو مصاحبان خاص کے چچا تھے، اپنے عہدے سے علیحدہ ہو کر نسبتاً عزلت میں زندگی بسر کرتے تھے ہندوستان کے وائسرائے سے جو کچھ سیاسی تعلقات تھے وہ سردار محمد عزیز خان پسر سردار محمد یوسف خان کے ہاتھ میں تھے۔ ہندوستانی برٹش گورنمنٹ سے جو خط و کتابت ہوتی تھی وہ انہی کے ذریعہ سرانجام پاتی تھی۔ اس زمانے میں افغانستان کے امور خارجہ سب کے سب انگریزوں کے ہاتھ میں تھے اور افغانستان ایک آزاد ملک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سردار محمد عزیز خان گویا وزیر خارجہ کا کام کیا کرتے تھے۔ انگریزی حکومت نے افغانستان میں اس زمانے میں سفیر کی بجائے صرف ایک قونصل مقرر کیا ہوا تھا جو وائسرائے ہند کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ شخص عام طور پر ایک پنجابی مسلمان ہوتا تھا۔ افغان ایک انگریز کے اس عہدے پر مقرر ہونے کے خلاف تھے۔ افغانی حکومت اس زمانے میں براہ راست لندن سے خط و کتابت نہیں کر سکتی تھی۔ خارجی مسائل کے بارے میں ساری خط و کتابت وائسرائے ہند کے

ساتھ کی جاتی تھی۔ صوبوں کے گورنروں (نائب الحکومہ) کی تقرری صرف امیر صاحب کے اختیار میں تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خان جو نائب السلطنۃ کے لقب سے وزیر داخلہ کا کام کرتے تھے حاکم اعلیٰ اور حاکم مقرر کرنے کے اختیارات رکھتے تھے۔ بڑے شہزادے اور ولی عہد کا لقب معین السلطنۃ تھا۔ ان کا زیادہ تر فوجی امور اور تعلیمی محکمہ سے تعلق تھا۔ مکتب حربیہ اور مکتب حبیبیہ انہی کے ماتحت تھا۔ محکمہ مالیات کا انتظام محمد حسین خان کرتا تھا جس کو مستوفی الممالک کا عہدہ ملا ہوا تھا۔ ملک میں جس طرح کہ خارجیہ، داخلیہ، حربیہ اور معارف وغیرہ کے نام سے علیحدہ علیحدہ وزارتیں موجود نہ تھیں اسی طرح محکمہ صحت، محکمہ امور خارجہ، Public Works Deptt, محکمہ رسل و رسائل کے لئے بھی کوئی وزیر مقرر نہ تھا۔ سارے ملک میں صرف کابل میں ایک سول اور ایک ملٹری ہسپتال موجود تھا۔ سول ہسپتال کے ہیڈ سرجن ترکی ڈاکٹر منیر بیگ اور امراض داخلیہ کے ماہر ڈاکٹر فخیمہ بیگ تھے۔ یہاں ہندوستانی کپونڈر کام کرتے تھے۔ فوجی ہسپتال کے انچارج لاہور کے ڈاکٹر اللہ جوایا تھے جو ہمارے ساتھیوں میں سے شجاع اللہ کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ اس زمانے کے افغانستان کے حالات کا مختصر سا خاکہ مندرجہ بالا الفاظ میں کھینچنے کے بعد اب میں پھر اپنے سفر کا ذکر شروع کرتا ہوں۔

پانچواں باب

افغانستان میں ہمارا داخلہ، کابل کے اس زمانے کے حالات

چمر کنڈ کے بعد ہم افغانی سرحد کی طرف بڑھے۔ اس سرحدی علاقے میں جنگلات کافی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن اور چوٹیاں سرسبز ہیں۔ درخت اتنے زیادہ ہیں کہ سورج کی روشنی بمشکل زمین پر پڑتی ہے۔ مگر چمر کنڈ سے لے کر افغانی سرحد تک، اور سرحدی پہاڑوں کو گزرنے کے بعد بھی دور تک کسی گاؤں کا نام ونشان نہ تھا۔ اس سنسان پن کے باوجود بھی پہاڑوں کا منظر درختوں کی وجہ سے بہت دلفریب تھا۔ اس روز کچھ تھوڑی سی بارش بھی ہو گئی تھی۔ راستہ میں ہمیں کوئی افغان نہیں ملا۔

آخر کار ہم دریائے کنڑ کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں معلوم ہوا کہ جلال آباد جانے کے لئے جو افغانستان کے "سمت مشرقی" نام صوبے کا سب سے بڑا شہر اور مرکز ہے اور جہاں سردی میں حکومت کے اراکین کے ساتھ آکر امیر افغانستان رہا کرتا ہے اور جو پشاور سے کوئی (۶۰) میل کے فاصلے پر ہے، نہ کوئی اچھی سڑک ہے اور نہ ہی کسی قسم کی بار برداری کا وہاں سے انتظام ہو سکتا ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے صرف یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ مشکوں کو پھلا کر اور ان کو لکڑی کے ایک چوکھٹے کے نیچے باندھ کر ایک بھدی سی ناؤ بنائی جائے جس کو افغان جالا کہتے ہیں۔ اس جالے کے نہ چپو ہوتے ہیں نہ Rudder اس لئے پانی کی رو اس کو جس

طرف لے جائے اس کی سواریاں بھی اس طرف جانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ صرف جالے والے کے ہاتھ میں ایک موٹا اور لمبا سا لٹھ ہوتا ہے جس سے وہ جالے کو کنارے سے دھکیل کر منجھ دار میں لانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

دریائے کنٹر کا پانی بارشوں اور برفوں کے پگھل جانے کی وجہ سے اپنے معمولی حجم سے کہیں زیادہ ہو چکا تھا۔ دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہم خدا پر بھروسہ کر کے اس جالے پر سوار ہوئے اور اپنے کو دریا کی رو کے حوالے کر دیا۔ جالا جب منجھدھار میں آتا تھا تو بہت تیزی سے بہتا تھا۔ اگر کہیں پانی کے زور سے کنارے پر لگا یا ریگ اور کیچڑ میں دھنسا تو اس کو پھر وہاں سے نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک جگہ تو پانی کے بہت تیزی سے پتھریلی زمین پر بہنے کی وجہ سے ایک گرداب میں آ کر اس کے الٹنے کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس سے ہم میں سے اکثر کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جالے کا توازن زیادہ نہ بگڑا، ورنہ ہم سب دریائے کنٹر کی نذر ہو جاتے۔ ہم میں سے تیرنا تو صرف انہیں کو آتا تھا جو کالج کی کشتی رانی Boat race میں شریک ہوا کرتے تھے اور ان کی تعداد صرف دو یا تین تھی۔ دوپہر کے بعد ہمارا جالا جلال آباد سے چند میل کے فاصلے پر کنارے لگا اور ہم وہاں سے اتر کر پیدل جلال آباد کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمارا جلال آباد میں ورود

شام کو جلال آباد پہنچ کر شہر کی کارواں سرائے میں جس کو افغان رباط کہتے ہیں اور جو شہر کی چاردیواری کے باہر واقع ہے، قیام کیا۔ افغانستان میں پرانے زمانے سے ہر منزل پر ایسی سرائیں (رباطین) موجود ہیں۔ یہ مٹی کی عمارتیں ہیں جن کے چاروں کونوں پر ایک ایک برج اور چھت کے کنارے کی دیواروں میں جھروکے بنے ہوتے ہیں۔ افغانستان میں ڈاکہ زنی کے خطرے کی وجہ سے یہ عمارتیں ایک قلعہ کی طرح بنی ہوئی ہیں۔ قافلہ جب رباط میں آ کر اترتا ہے تو اپنے گھوڑے، گاڑیاں اور سامان کو اندر لے جا کر رات کو اس کا بھاری بھرکم دروازہ بند کر دیتا ہے۔ عمارت کے اندر ایک بڑا سا صحن ہوتا ہے اور اس صحن کے دو کناروں پر مسافروں کے سونے کے لئے چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں ہوتی ہیں جن میں نہ کوئی کھڑکی اور نہ دروازے کے سوا روشنی آنے کا انتظام ہوتا ہے۔ صحن کے باقی دو کناروں پر اصطبل ہوتے ہیں جن میں قافلہ اپنے

گھوڑے اور خچروں کو باندھ دیتا ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک چبوترہ اور اس کے آخر میں ایک چھتی ہوئی جگہ ہوتی ہے جو نماز پڑھنے کے لئے مسجد کا کام دیتی ہے۔ رباط کا دربان دروازے کے پاس والے کمرے میں رہتا ہے۔ اسی کے قریب ایک جو اور گھاس بیچنے والی کی، ایک چائے فروش کی دوکان ہوتی ہے، جو سبز چائے، خشک میوہ، پنیر اور خمیری روٹی بیچتا ہے۔ قافلے والے یا تو یہاں سے کچھ کھانے کی چیزیں لے لیتے ہیں یا خود اپنی روٹی اور سالن پکا کر کھا لیتے ہیں اور اندھیری کوٹھڑیوں میں رات کو سو رہتے ہیں۔ پانی صحن میں کھدے ہوئے ایک کنویں سے لیا جاتا ہے۔ اگر اس کا پانی نمکین ہو تو پاس کی کسی ندی سے لیا جاتا ہے مگر یہ پانی مضر صحت ہوتا ہے۔ اس لئے افغانستان کے شہروں میں پانی کی بجائے چائے کا بہت رواج ہے کیونکہ چائے بنانے کے لئے یہ پانی ابال لیا جاتا ہے اور اس طرح جراثیم سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ رباط میں صبح سے شام تک سماوار (بڑی چائے دانی) میں پانی ابلتا رہتا ہے اور جب کوئی مسافر پہنچے تو فوراً چائے فروش چائے کی پتیاں چھوٹی چائے دانی میں ڈال کر ان میں ابلتا ہوا پانی بھر دیتا ہے اور دم ہونے کے لئے اس چائے دانی کو یا سماوار کے اوپر یا آگ کے نزدیک رکھ دیتا ہے۔ جب پانی کا رنگ زرد ہو جائے تو چائے پیالی میں ڈال کر ایک دفعہ تو میٹھی پی جاتی ہے اور اس کے بعد کی سب پیالیاں پھیکی پی جاتی ہیں۔ افغانی گھروں میں جب مہمان کو چائے دی جاتی ہے تو اسی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قند (شکر) کی کفایت شعاری اور بچت کے لئے اس طرح کیا جاتا ہے۔ ایک میٹھی پیالی کے بعد سب پیالیاں بغیر قند کے دی جاتی ہیں، اور جب تک مہمان پیالی الٹی نہ کرے یا اس پر اپنا چمچہ نہ رکھ دے، صاحب خانہ اس کی پیالی میں چائے ڈالتا چلا جاتا ہے۔ ہمیں چونکہ شروع میں اس قاعدہ کی خبر نہ تھی اس لئے ایک دو دفعہ چار و ناچار چند ایک پھیکی پیالیاں پینی پڑیں تھیں۔

رباطیں عام طور پر بہت میلی اور گندی ہوتی ہیں جن میں صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنی کوٹھڑی کو خود صاف کرتا ہے اور وہاں رات گزار کر اس کو میلی کچیلی چھوڑ کر اگلے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نیا قافلہ آ کر ان کوٹھڑیوں میں جھاڑو وغیرہ دیتا ہے۔ افغانستان میں بھنگی نہیں ہوتے۔ اس لئے پاخانوں کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہر گھر میں پاخانہ چھت پر ہوتا ہے اور گندگی ایک سوراخ دار نالی سے نیچے کی منزل میں گرتی ہے اور کنویں کے مانند ایک جگہ جس کی ایک کھڑکی ہوتی ہے جمع رہتی ہے۔ شہروں میں خرکار (گدھے لادنے

والے) آکر اس کھڑکی سے کبھی کبھار گندگی نکال کر لے جاتے ہیں۔ اس لئے شہروں میں بدبو اور تعفن بہت ہے۔ گلیاں تنگ و تاریک ہونے کی وجہ سے یہ بدبو اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ہم نے جلال آباد میں رات رباط میں گزاری اور صبح کو جلال آباد شہر کے اندر جاکر اخبار تلاش کیا لیکن یہاں کوئی شخص بھی اخبار کا شوقین نہ ملا۔ اس وقت افغانستان میں صرف ایک ہفتہ وار فارسی اخبار نکلتا تھا جو ٹائپ سے چھپتا تھا اور باتصویر تھا۔ اس اخبار کا نام سراج الاخبار تھا۔ سرکاری ملازمین اس اخبار کو خریدنے پر مجبور تھے۔ اس کا چندہ انکی تنخواہوں سے کاٹ لیا جاتا تھا۔ جلال آبادی اکثران پڑھ ہونے کی وجہ سے اور لوگ عام طور پر پشتو گو ہونے کے سبب سے سراج الاخبار کو کوئی زیادہ نہیں پڑھتا تھا اور بازار میں اخبار نہ بکتا تھا۔ اس لئے ہم جنگ کے متعلق کوئی تازہ خبر حاصل نہ کر سکے۔ ہم جب لوگوں سے پوچھتے کہ جنگ کے بارے میں تازہ خبریں کیا ہیں تو وہ جواب دیتے تھے "بلے! مقدمہ ہست" (یعنی جنگ جاری ہے) ہم اپنے خیال میں افغانستان کو ایک مہذب ملک تصور کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے اس قسم کے جواب سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی! ہم نے امیدیں باندھ رکھیں تھیں کہ افغانستان ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آکر دیکھا کہ کسی کو جنگ عظیم کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں، لوگ بالکل دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لئے کاغذ اور لفافے تلاش کیے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دوکان پر بکتے ہیں مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں ہے۔

ہمارے جلال آباد پہنچنے کے دوسرے دن ہمارے سردار عبدالمجید خان، ہمارے بھاری سامان کو جو پشاور کے راستہ خفیہ طور پر افغانستان کے سرحدی قصبے (ڈکہ) کو جماعت مجاہدین کے ذریعہ بھیجا گیا تھا، جلال آباد لانے کے لئے (ڈکہ) گئے۔ جلال آباد اور ڈکہ کے درمیان سڑک چنداں اچھی نہیں۔ علاقہ غیر آباد ہے اور بے درخت ٹیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ گرمی سخت پڑتی ہے۔ پانی ندیوں اور نالوں کا پیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں اس پانی کے جراثیم سے ان کو ٹائیفائیڈ ہوا اور جب وہ چار دن کے بعد واپس جلال آباد آئے تو ان کو سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔

ان کے ڈکہ کی روانگی کی شام کو ہم اکٹھے ہو کر ذرا رباط سے باہر شہر کی طرف ہوا خوری کو گئے، تو راستہ میں ہم نے ایک اچھے گھوڑے پر ایک شخص کو سوار دیکھا جس کے ساتھ چند ایک رسالہ

کے سوار اردلی کے طور پر تھے۔ اس نے ہمیں پاس بلا کر ہمارے حالات دریافت کرنا شروع کیے۔

یہ شخص شاہ آغاسی علی احمد خان جو بعد میں شاہ امان اللہ خان کا بہنوئی بنا اور ۱۹۲۹ء میں بچہ سقا کی بغاوت کے زمانے میں قندھار کا گورنر تھا، اس نے امیر امان اللہ خان کی حمائت کی اور بچہ سقا کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بچہ سقا کے ہاتھ قیدی بنا اور اس کے حکم سے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ شاہ آغاسی امیر دوست محمد خان یا شاہ شجاع کے ساتھ، امیر وقت کے ڈر سے کابل سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوا تھا اس لئے اردو بول سکتا تھا۔ اس نے ہم سے اردو میں گفتگو کی اور جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم جہاد کے لئے افغانستان میں ہجرت کر کے آئے ہیں تو اس نے ہماری بہت دلداری کی۔ ہم اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس نے جو باتیں ہمارے منہ پر کہی تھیں وہ اس کے بعد کے طرز عمل کے بالکل برخلاف نکلیں اور وہ بھی اکثر افغانی افسروں کی طرح ریاکار ثابت ہوا۔

ہم رات کو رباط آکر سو رہے لیکن صبح کے قریب جب رحمت علی اور عبدالرشید وضو کے لئے رباط سے باہر نکلنے لگے تو ان کو ایک سپاہی نے جس کی بندوق پر سنگین (برچھی) لگی ہوئی تھی، روکا اور سنگین کو ان کی طرف پھیر کر بہت غصے سے کہا۔

"موقوف است۔ بیرون بر آمدہ نمی توانی" (یعنی تمہارے لئے باہر جانا منع ہے)

یہ بے چارے ڈر کر پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ جب دن نکلا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب کے سب نظر بند ہیں اور ہم پر ہتھیار بند سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ ایشیک آقاسی (شاہ آغاسی) نے جس نے ہندوستانی اخباروں سے ہمارے ہندوستان سے نکلنے کی خبریں بھی پڑھ لی تھیں اور ہمارے متعلق لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے یہ الفاظ بھی دیکھ لئے تھے جس سے اس نے موت کا فتویٰ دے دیا تھا۔ If any one of them is caught, he shall be hanged by the first tree on the borders of india (یعنی اگر ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو اس کو ہندوستان کی سرحد

ا۔ اصل میں یہ لفظ (ایشیک آقاسی) کے ترکی الفاظ سے بگڑا ہوا ہے جس کے معنی (سردربان) کے ہیں۔ افغانستان میں یہ لقب بادشاہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کو دیا جاتا ہے۔

پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی۔)

اس کے باوجود بھی غالباً شاہ آغاسی نے ہمیں انگریزوں کا جاسوس سمجھا اور ہمیں سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے ہماری وہ نظر بندی شروع ہوئی جو چار سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان کے قتل تک جاری رہی اور جس کی وجہ سے ہم میں سے بعض دوستوں نے (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا) افغانی سپاہیوں سے مکہ بازی بھی کی اور اس وجہ سے قید میں پڑے۔

اس نظر بندی کے زمانے میں ہم نہ کسی سے راستہ میں بات کر سکتے تھے اور نہ کسی کے ہاں جا سکتے تھے اور نہ ہی کوئی ہمارے ہاں آ سکتا تھا۔ اگر ایک دوست بازار میں خرید و فروخت کے لئے جاتے تو ایک سپاہی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اگر وہ راستہ میں کبھی کسی سے بات کرتے تو سپاہی فوراً دخل دے کر "موقوف است" (یعنی منع ہے) کہہ کر ان کو روک دیتا تھا۔ خلاصہ کلام، چار سال تک افغانی سپاہی ہمارے ساتھ سایہ کی طرح موجود رہے۔ اگر شاہ آغاسی ہمارے متعلق حکام بالا کو کوئی اچھی رپورٹ دیتا تو شائد ہمارے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ ہوتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں افغانی گورنمنٹ میں انگریز پرستی اتنی زیادہ تھی کہ ہمارے لئے کوئی بھی شفاعت کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کابل چل کر بھی ہمیں آزادی نہ ملی۔ اگر بادشاہ یا امراء در حقیقت ہمارے ہمدرد ہوتے اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے ہم پر پابندیاں نہ لگاتے تو شاید شاہ آغاسی کی رپورٹ کے باوجود بھی ہم کو کابل میں آزادی مل جاتی۔

لیکن اس چار سالہ نظر بندی کے زمانے میں کبھی افغانوں نے ہمارے منہ پر یہ نہ کہا کہ "آپ قید یا نظر بند ہیں" بلکہ وہ ہمیشہ ہم کو "شما مہمان شاہی ہستید" (آپ بادشاہ کے مہمان ہیں) کہا کرتے تھے، اور اس طرح اپنی ریاکاری کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

عبدالمجید خان کے ڈکہ سے واپس آنے کے ایک روز بعد، ہم کو شاہ آقاسی کے حکم سے سپاہیوں کی نگرانی میں کابل بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لئے ہر شخص کو اپنا سامان لادنے اور سامان کے اوپر چڑھ بیٹھنے کے لئے ایک ٹٹو یا خچر دیا گیا۔ ان ٹٹوؤں اور خچروں پر زین کی بجائے پالان لگا ہوا تھا۔ جس پر کوئی اپنا اپنا سامان لاد کر، اس سامان کے اوپر خود بھی سوار ہونے پر مجبور تھا۔ اس طرح پر ہمارے جیسے پڑھے لکھے یونیورسٹی کے طالب علم اور "مہمان شاہی" اس

ہیئت کذائی میں ٹٹوؤں اور خچروں پر سوار ہو کر کابل روانہ ہوئے۔ کابل تک سات پڑاؤ تھے۔ عبدالمجید خان کی طبیعت بخار کی وجہ سے روز بروز خراب اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن راستہ میں ٹھہرنے اور رہنے کا امکان نہ تھا، کیونکہ راستہ میں پڑاؤ پر نہ کوئی ڈاکٹر موجود تھا اور نہ کوئی دوائی مل سکتی تھی۔ اس لئے ہم چار و ناچار سفر کرنے پر مجبور تھے تاکہ جلد کابل پہنچ کر کسی ڈاکٹر سے ان کا معالجہ کرائیں۔

کابل سے ایک منزل پہلے (بت خاک) کے پڑاؤ پر معلوم ہوا کہ کابل میں کوئی مرض پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے قرنطینہ لگا ہوا ہے اور کابل آنے جانے والوں کی سخت پڑتال کی جاتی ہے اور اگر کوئی مریض نظر آئے تو اس کو کابل میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس سے ہمیں بہت تشویش ہوئی۔ ہم نے بے چارے عبدالمجید خان کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ خود بھی تو بہت بلند ہمت تھے۔ قرنطینہ میں سے وہ بہت متبسم ہو کر ایسی جرات سے گزرے جیسے ان کو کبھی بخار نہ آیا تھا۔

ہمارا کابل پہنچنا

خدا خدا کر کے ہم بغیر روک ٹوک کے کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں ہم کو کوتوال شہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کوتوال بھی اردو بولتا تھا۔ بعض کابلیوں کی عادت کے موافق اس نے بھی ہمارے منہ پر ہماری بڑی دلداری کی اور ہم کو اپنے دفتر کے متصل ایک گھر میں جس کا صحن ذرا بڑا تھا اور جس میں تین کمرے، باورچی خانہ اور سپاہیوں کے لئے دو کوٹھڑیاں تھیں "مہمان شاہی" کے طور پر رکھا اور ہمارے گزارے کے لئے روزانہ فی آدمی ایک افغانی روپیہ (جو اس زمانے میں تقریباً ۱۲ آنے کے برابر تھا) مقرر کیا۔ لیکن ہم کو باہر جانے کی چنداں اجازت نہ تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی باہر نکلے یہاں تک کہ باہر کی جوئے (یعنی پانی کی نالی) پر وضو کو جائے تو ضرور ایک سپاہی نگرانی کے لئے اس کے ساتھ جاتا تھا۔ روٹی تو ہم بازار سے خرید لیتے تھے کیونکہ کابل میں کوئی بھی توے پر روٹی نہیں پکاتا اور سب لوگ تندور کی خمیری روٹی کھاتے ہیں، لیکن سالن ہم خود بنایا کرتے تھے۔ عبدالحمید کو ذرا ہنڈیا پکانا آتی تھی اس لئے کھانا تیار کرنا اس کے ذمہ تھا۔ برتن دھونے کے لئے نمبر مقرر تھا اور ہر کوئی اپنے نمبر پر اپنی نوبت کے دن برتن دھو دیا کرتا تھا۔

چند دن بعد، عبدالمجید خان کے معالجے اور شجاع اللہ کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر اللہ جوایا ہمارے ہاں آیا۔ وہ ہمارے ہندوستان چھوڑنے پر بہت چیں بہ جبیں تھا۔ اس نے عبدالمجید خان کو جس کی حالت اس وقت بہت خراب ہو چکی تھی، کچھ دوائی دی اور ایک دو روز بعد پھر آنے کا وعدہ کیا۔ دو روز بعد جب وہ آیا تو بے چارے عبدالمجید خان بستر مرگ پر تھے۔ ان کو دیکھ کر اس نے کہا کہ "بیمار کے بچنے کی امید نہیں ہے وہ تو اب صرف چند ایک گھنٹوں کا مہمان ہے"۔ اس کے بعد وہ فوراً چلا گیا۔ عبدالمجید خان مرحوم ۱۹ اپریل ۱۹۱۵ء کو فوت ہو گئے۔ ہم نے خیال کیا کہ شائد تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے گیا ہے، لیکن جب کئی گھنٹے تک بھی اس سے کوئی خبر نہ آئی تو آخر کار ہم نے کوتوال کو خبر دی جس نے ان کا جنازہ اٹھوایا۔ ان کی موت سے ہم کو جتنا صدمہ ہوا اس کا ذکر یہاں میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ اب ہم بالکل بے سر ہو گئے تھے۔ اور اپنے کو اس پرائے ملک میں اور غیر لوگوں کے درمیان بالکل بے حامی محسوس کرنے لگے تھے۔

اس زمانے کا شہر کابل۔

اس زمانے میں شہر کابل جس کی آبادی ۷۵ ہزار اور مضافات کے ساتھ مل کر کوئی سوا لاکھ بتائی جاتی تھی، شمال میں باغ بالا سے لے کو جو امیر عبدالرحمٰن خان کا بنایا ہوا ایک پر فضا باغ تھا، جنوب میں مشہور قلعہ (بالا حصار تک) جہاں انگریزوں اور افغانوں کے درمیان پرانے زمانے میں لڑائیاں ہوئی تھیں اور جہاں اعلیٰ حضرت محمد نادر خان شہید نے اپنے زمانے (۱۹۳۱ء) میں افغانی ملٹری کالج کی بنیاد رکھی تھی، پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں قلعہ بالا حصار خراب حالت میں تھا اور افغانی حکومت اس کو تعمیر نہیں کرتی تھی کیونکہ انگریزوں سے جو معاہدہ کسی پرانے زمانے میں انگریزی فوجوں کے کابل سے جانے پر ہوا تھا اس میں یہ شرط بھی تھی کہ اس قلعہ کو تعمیر نہ کیا جائے۔ شہر کے مغرب میں خواجہ رواش اور کوہ آسمائی کی پہاڑیاں واقع ہیں۔ مشرق میں چمن حضوری تھا جو امیر حبیب اللہ خان کا گولف Golf کا میدان تھا۔ دریائے کابل شہر کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ سیلاب کے وقت شہر کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کے دونوں کناروں پر تین تین گز اونچی پتھر کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ دریائے کابل کے شمال میں جو شہر کا حصہ تھا اس

میں شاہی محلات کے سوا، امیروں اور سرداروں کے مکانات اور کوٹھیاں تھیں۔ اس حصہ شہر میں سے (محلہ دہ افغاناں) (محلہ شہر آرا) پایۂ تخت کے خوب صورت ترین محلے مانے جاتے تھے۔ یہاں سڑکیں پختہ اور عمارتیں خوبصورت تھیں لیکن سب کی سب اونچی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھیں اس لئے ان کی خوبصورتی باہر سے نظر نہ آتی تھی۔ بازار (ارگ) جو کوتوالی کے دروازے سے لے کر بازار (میوہ فروشی) تک اور وہاں سے پھر دریائے کابل کے کنارے پہنچتا ہے اچھے مال دار تاجروں کی بڑی بڑی دوکانوں سے آراستہ تھا۔ اس حصہ شہر میں دریائے کابل سے کاٹ کر لائی ہوئی کچی جوئے یعنی چھوٹی چھوٹی نہریں بہتی تھیں۔ شاہی محلات، ارگ (یعنی قلعہ) کے احاطہ میں تھے۔ ان میں سے امیر حبیب اللہ خان کا محل اندرون ارگ میں تھا۔ ارگ کی دیواریں بلند اور جھروکے دار تھیں اور اس کے ارد گرد ایک بہت چوڑی خندق موجود تھی۔ قصر دلکشا، کوٹھی اسٹور اور سلام خانہ جیسی شاہی عمارات ارگ کے بیرونی احاطہ میں واقع تھیں۔ شہزادوں کے محلات مثلاً زین العمارہ جس میں امیر حبیب اللہ خان کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خان نائب السلطنۃ رہتے تھے اور عین العمارہ جس میں شہزادہ امان اللہ خان عین الدولہ کی رہائش تھی، شہر کے اسی حصہ میں مختلف جگہوں پر واقع تھے۔

شہر کا وہ حصہ جو دریائے کابل کے جنوب میں تھا پرانے طرز پر بنا ہوا تھا جس کی گلیاں عام طور پر تنگ تھیں۔ اس کے بازار بھی چنداں چوڑے نہ تھے اور اکثر اوپر سے چھتے ہوئے تھے۔ مثلاً بازار (پل چشتی)، بزازہ، بازار پوستین دوزان اور شور بازار چھتے ہوئے بازاروں میں سے تھے۔ یہ چھتیں دوکانداروں کو گرمی میں دھوپ سے اور سردی میں برف اور باران سے محفوظ رکھتی تھیں۔ لیکن شہر کا چوک اور اناج منڈی اوپر سے کھلی ہوئی تھی۔ چوک میں ہندو صرافوں کی دکانیں تھیں جو زیور وغیرہ رہن لے کر لوگوں کو قرض پر روپیہ دیا کرتے تھے اور سونے کے سکے جس میں بخارا اور افغانستان کی اشرفیاں اور انگریزی اور روسی پونڈ جیسے طلائی سکے شامل تھے، بھنا دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک انگریزی پونڈ ۱۶ کابلی روپے کے برابر تھا۔ ان ہندوؤں کی پہچان کے لئے افغان حکومت نے (جیسا کہ اوپر بھی لکھا جا چکا ہے) زرد پگڑی باندھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ تاکہ لوگ کہیں غلطی سے ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں۔ افغانستان میں، سرحدی علاقے کی طرح، ہندو دوکانداروں اور صرافوں کی بہت حفاظت کی جاتی تھی۔ بزازے کے بازار میں پنجابی کپڑا فروشوں کی دکانیں تھیں۔ بازار پوستین دوزاں میں بھیڑ کی

کھالوں سے سردی کے لئے گرم کوٹ اور پوستین بنائی جاتی تھیں۔

شہر کا یہ جنوبی حصہ چنداں صاف ستھرا نہ تھا۔ اس میں نہ گندگی کے اٹھانے کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی گھروں اور حماموں کے گندے پانی کے بہنے کے لئے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسا پانی یا شہر کے اندر بڑے بڑے گڑھوں میں جمع ہو جاتا تھا یا دریائے کابل کے کنارے کے گھروں سے دریا کے پانی میں مل جاتا تھا۔ کابل کا سب سے تاریک محلّہ (چنداول) کا محلّہ تھا جہاں گلیاں نہایت تنگ اور اوپر سے چھتی ہونے کی وجہ سے بالکل تاریک تھیں اور بعض جگہ تو گھروں کے نیچے سے سرنگوں کی طرح گزرتی تھیں۔ شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان رفت و آمد کے لئے دریائے کابل پر شہر کے اندر مختلف جگہوں پر سات پل تھے جن میں سے مشہور یہ ہیں۔

باغ بابر اور قصر چہل ستون سے مہتاب قلعہ کو جانے والی سڑک کا پل۔ پل شاد شمشیران جو مستوفی الممالک (وزیر مالیہ) محمد حسین کے گھر کے نزدیک تھا۔ یہ گھر بعد میں اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے زمانہ میں روسی سفارت خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اس پل کے نزدیک علیا حضرت صاحبہ ملکہ اول امیر حبیب اللہ خان اور والدہ امیر امان اللہ خان نے ایک خوبصورت مسجد بنوائی تھی جو استانبول کی مسجد (اورتہ کوے) سے بہت مشابہ ہے۔

پل خشتی جس کے نزدیک کابل کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے، اور جو کابل کے مشہور بازار سرپل میں ہے۔

پل عید گاہ جو موجودہ وزارت حربیہ اور سول ہسپتال (جس کو شفاخانہ ملکی کہتے تھے) کے قریب ہے اور جہاں سے گزر کر لوگ سیر و تفریح کے لئے چمن حضوری (امیر حبیب اللہ خان کا گولف کا میدان) کی طرف جاتے ہیں۔ اس زمانے میں شہر میں عام سواری کا انتظام بہت کم تھا۔ امیروں کے اصطبل میں تو اچھے اچھے گھوڑے موجود تھے اور وہ اکثر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہواخوری کو نکلا کرتے تھے۔ خاندان شاہی کے افراد یا گھوڑوں پر اور بگھیوں میں آتے جاتے تھے۔ خود امیر حبیب اللہ خان مرحوم اکثر بگھی میں ہواخوری کو نکل جاتے تھے۔ ان کی خواتین بھی بگھیوں میں سوار ہوتی تھیں۔ ان کے منہ پر بہت باریک کپڑے کا برقعہ ہوتا تھا۔ جس کو وہ تنہا سڑکوں پر منہ سے بالکل اٹھا دیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ کے سوار پہرہ دار کسی راہ رو کو اگر انکی سیر و تفریح کی سڑکوں پر پھرتا دیکھیں تو اس کو للکار کر "کور شو" (یعنی آنکھیں بند کر لو) کہا کرتے تھے۔ امیر حبیب اللہ خان کبھی کبھی موٹر پر بھی نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کو جب سواری کی

ضرورت ہوتی تھی تو کرایہ پر تانگہ لے لیا کرتے تھے۔ لیکن شہر کی اندرونی سڑکیں اتنی تنگ تھیں کہ وہاں عام طور پر گاڑی چلانا ناممکن تھا۔ شہر کے باہر کی سڑکوں کے دونوں طرف پانی کی نالیاں بہتی تھیں جن کے پانی کو سقے صبح اور شام سڑکوں پر چھڑکا کرتے تھے جس سے ذرا خاک اور گرد کم ہو جاتی تھی۔

کابل میں اس زمانے میں ہوٹل تو کوئی نہ تھا۔ بازار میں روٹی اور سالن بیچنے والوں کی چند ایک دو کانیں تھیں۔ متوسط طبقے کے لوگ دوپہر کے کھانے کے لئے عام طور پر چائے فروش کی دوکانوں پر جاتے تھے اور وہاں چائے کے ساتھ تنوری روٹی، پنیر اور کشمش کھا لیا کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں میں دوپہر کا کھانا اس زمانے میں بڑے افسروں کے لئے شاہی باورچی خانہ سے دیا جاتا تھا۔ چھوٹے کلرک Clerk اور ملازمین چائے، پنیر اور کشمش پر گزارہ کرتے تھے۔ شام کا کھانا غریب لوگوں کے سوا ہر کوئی پر تکلف کھاتا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگوں اور امیروں کے دسترخوان پر رات کو عام طور پر پلاؤ، گوشت، سبزی کا سالن کھٹائی اور مربہ ضرور ہوتا تھا۔ امیر لوگوں کے دسترخوان پر کئی قسم کے پلاؤ کے خوانچے ہوتے تھے۔ افغانستان میں علاقہ کنٹر کے چاول جو جلال آباد کے صوبہ میں ہے، بہت مشہور تھے۔ یہ چاول پشاور، ڈیرہ دون اور کرنال کے چاولوں کے مانند تھے۔ ان سے مختلف قسم کے پلاؤ پکائے جاتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ہر شخص سبز چائے پیتا تھا۔ جس کی آخری پیالی پھیکی یعنی بغیر قند کے ہوتی تھی۔

کابل میں سخت سردی پڑتی ہے۔ عام طور پر بہت زیادہ برف باری ہوتی ہے جو کھیتوں اور فصلوں کے لئے بہت مفید ہے۔ یہاں تک کہ کابل کے لوگوں میں یہ ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ "کابل بے زر باشد بے برف نباشد" (یعنی اگر کابل میں سونا نہ ہو تو کوئی ڈر نہیں لیکن شہر برف سے محروم نہ رہے) گھروں کی چھتوں پر کھپریل نہ تھے بلکہ چھتیں ہموار اور مٹی کی تھیں۔ برف باری کے فوراً بعد ان کو برف سے صاف کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ برف چھتوں سے گلی کوچوں میں گرائی جاتی تھی جس سے راستوں میں برف کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ برف کے یہ تودے موسم سرما میں اسی طرح گلیوں میں پڑے رہتے تھے اور ان کے اٹھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آخر گرمی آنے پر برف پگل پگل کر خود ہی غائب ہو جاتی تھی۔ لیکن برف کے اس طرح پر پگھلنے کی وجہ سے سڑکوں اور کوچوں میں ہر طرف کیچڑ ہو جایا کرتا تھا۔

اس زمانے میں کابل میں گھروں کو سردی کے موسم میں گرم رکھنے کا انتظام مختلف تھا۔

امیر لوگ تو بخاری لگایا کرتے تھے۔ بخاری لوہے کی چادر سے بنے ہوئے ایک ڈھول کے مانند استوانہ کی شکل رکھتی تھی جس کے نچلے حصے میں سامنے کی طرف، لکڑی ڈالنے کے لئے ایک چھوٹی سی کھڑکی ہوتی تھی اور اوپر کے حصے میں پیچھے کی طرف ایک بڑا سا سوراخ دھویں کے نکلنے کے لئے ہوتا تھا۔ اس سوراخ پر لوہے کی چادر کا بنا ہوا نل لگا کر دھواں دیوار میں بنی ہوئی چمنی کے ذریعہ باہر نکال دیا جاتا تھا۔ بخاری میں آگ جلنے سے کمرے کی ہوا گرم ہو جاتی تھی اور انسان سردی کے مہینے میں کمرے میں آرام سے بیٹھ کر کام کاج کر سکتا تھا۔ کابل میں اس زمانے میں پتھر کا کوئلہ نہ ملتا تھا اس لئے نہ پتھر کا کوئلہ جلانے والی سٹوو استعمال ہوتی تھی اور نہ سنٹرل ہیٹنگ کا انتظام تھا۔ باقی لوگ اوسط درجہ کے ہوں یا غریب ہوں (صندلی) لگایا کرتے تھے جو صرف ہاتھ پاؤں کو گرم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ (صندلی) ایک پست سی چار کونی میز کو کہتے ہیں۔ اس میز کے نیچے لکڑی کا کوئلہ ایک انگیٹھی میں سلگا کر اور راکھ سے ڈھانک کر رکھ دیا جاتا ہے اور صندلی کے اوپر ایک بڑا سا لحاف ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ سب اہل خانہ فرش پر، جس پر امیروں کے ہاں اعلیٰ قسم کے قالین اور غریبوں کے ہاں اونی دریاں جن کو (گلیم) کہا جاتا ہے بچھی ہوتی تھیں، بیٹھ جاتے تھے اور ٹانگیں اس لحاف کے نیچے دراز کر کے اپنے پاؤں کو گرم کر لیتے تھے۔ اگر ہاتھ بھی ٹھنڈے ہوں تو ان کو بھی اسی لحاف کے نیچے گھسیڑ کر گرم کر لیا کرتے تھے۔ بدن کے دوسرے حصے سرد رہتے تھے۔ اس لئے عام طور پر کندھوں پر پوستین یا ایک اوور کوٹ ڈال لیا کرتے تھے۔ دن کو بستر کو لپیٹ کر پیٹھ کے پیچھے گاؤ تکیہ کے طور پر سہارے کے لئے رکھ لیتے تھے۔

برف باری کے زمانے میں لوگ عام طور پر اسی طرح بیکاری اور سستی میں وقت گزارتے تھے۔ رات کو یہ گاؤ تکیہ کھول کر بستر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کنبہ کے سارے لوگ صندلی کے لحاف کے نیچے رات بسر کرتے تھے۔ ماں، باپ، بچے، بہو، لڑکے، لڑکیاں سب ایک ہی جگہ سو جایا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے افراد خانہ اور اگر گھر میں کوئی مہمان بھی ہو تو سب مل کر صندلی کے ارد گرد بیٹھ جاتے تھے اور شب چر یعنی پستہ، بادام، کشمش وغیرہ خشک میوہ کھاتے رہتے تھے اور مختلف قسم کی باتیں کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف سے سبز چائے کا دور چلتا تھا اور دوسری طرف سے ادھر ادھر کی گپ بازی ہوتی رہتی تھی۔ کابل کی فارسی میں (گپ) کے لفظ کے معنی (بات چیت) کے ہیں اور ایرانی فارسی میں استعمال ہونے والے "سخن" کے لفظ کی بجائے بولا جاتا ہے۔ جب ہم نے شروع میں کابل میں دیکھا کہ لوگ ہم کو "گپ بزنید" کہتے

ہیں تو ہمیں بڑا تعجب ہوا تھا کہ یہ لوگ ہم سے مبالغہ آمیز باتوں کی کیوں خواہش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اردو میں (گپ) کے معنی تو مبالغہ آمیز بات کے ہیں۔ لیکن آخر کار معلوم ہوا کہ کابل میں اس لفظ کے معنی "بات چیت" کے ہیں اور یہ لفظ فارسی، ایران کے لفظ "سخن" کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور ان کا "گپ بزنید" کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہم کو "ذرا بات کرو" کہنا چاہتے ہیں۔

اس طرح پر رات کے نو بجے تک جب تک کہ Curfew نہ لگے یعنی رات کو باہر نکلنے کی ممانعت کی توپ چلا کر منادی نہ ہو، یہ صحبتیں جاری رہتی تھیں۔ کابل میں اس زمانے میں عجیب دستور تھا کہ سردی میں رات کے نو بجے اور گرمی میں رات کے دس بجے توپ کی آواز سے Curfew کا اعلان کیا جاتا تھا۔ جس کے بعد کوئی فرد واحد بھی گلی میں نہیں نکل سکتا تھا۔ صرف پہرہ دار، اور ایسے لوگ جن کو (نام شب) یعنی Password جو ہر رات فوجی حکام کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا، معلوم ہو، توپ چلنے کے بعد گلی کوچوں میں پھر سکتے تھے۔ یہ قاعدہ غالباً اس زمانے میں بدامنی کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا۔

کابل میں گرمی زیادہ نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود بھی سار دربار شاہی پغمان کے صحت افزا مقام کو جو کابل کے شمال میں کوئی بیس میل کے فاصلے پر دامن کوہ میں واقع ہے اور جہاں امراء کے خوبصورت بنگلے، باغات اور کوٹھیاں ہیں چلا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں امیر حبیب اللہ خان جلال آباد جایا کرتے تھے اور وہاں پغمان کے علاقے میں جہاں آخر کار ان کو قتل کیا گیا، شکار اور تفریح میں مصروف رہتے تھے۔

افغانستان میں اس زمانے میں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) چنداں تعلیم کا رواج نہ تھا۔ کابل کے سوا کسی اور شہر میں نئے اصول کے مدرسے موجود نہ تھے۔ لوگ پرانے اصولوں پر مسجدوں میں قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیتے تھے۔ دفتروں میں کام کرنے والے کلرک جن کو افغانستان میں مرزا کہا جاتا ہے پرائیویٹ طور پر تعلیم یافتہ تھے۔ جن کی عمومی معلومات جنرل نالج بہت محدود تھیں۔ نئی طرز کی تعلیم امیر حبیب اللہ خان کی سیاحت ہندوستان کے بعد جو انہوں نے سنہ ۱۹۰۵ میں کی تھی، شروع ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے مولوی عبدالغنی اور ان کے بھائی چراغ دین اور مولوی محمد حسین خان علیگ جیسے معلمین کو کابل بلا کر (مکتب حبیبیہ) قائم کیا تھا۔ بعد میں ان صاحبوں پر اور بعض

افغانوں پر، افغانستان میں جمہوری حکومت Constitutional - Government قائم کرنے اور امیر حبیب اللہ خان کو تخت سے اتارنے کی سازش کا الزام لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی سازشیوں میں سے بعض کو موت کی سزا دی گئی اور ان کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ بعض کو عمر قید کی سزا ملی۔ انہی میں سے ایک شخص وزیرستان کا باشندہ (پادشاہ میر خان) نامی تھا جو امیر عبدالرحمٰن خان کا غلام بچہ تھا اور بعد میں جنگ استقلال افغانستان میں (۱۹۱۹ء میں) مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خان کی فوج میں انگریزوں سے لڑا اور امیر امان اللہ خان کے زمانے میں ایک کمشنری کا کمشنر (حاکم اعلیٰ) بنا تھا۔ جب ہم کابل پہنچے تو مکتب حبیبیہ کے ہیڈ ماسٹر حافظ احمد دین تھے جو غالباً سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم جو بمبئی کالج سے اقتصادیات کے بی اے آنرز تھے اور جن کو قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم نے خاص طور پر افغانستان بھیجا تھا، جغرافیہ پڑھاتے تھے اور مولوی محمد علی قصوری ایم۔ اے کینٹب ریاضی کا سبق دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے امیر حبیب اللہ خاں نے ایک ملٹری سکول بھی قائم کیا تھا جس کا ہیڈ ماسٹر خیری بیگ نام ایک ترکی کیپٹن تھا۔ اس کے ساتھ دو تین اور ترکی افسر بھی تھے جو بغداد سے یہاں آئے تھے اور نسلی لحاظ سے عرب تھے اور عربی ملت پروری کے نمائندے مانے جاتے تھے۔ اس لئے ان کی خیری بیگ سے کچھ بنتی نہ تھی۔ ان عرب افسروں میں سے محمود سامی امیر حبیب اللہ خان اور ولی عہد شہزادہ عنائت اللہ معین السلطنۃ کے عتاب کا نشانہ بننے کے درجہ تک بد اخلاق تھا۔ وہ ہمارے کابل پہنچنے کے دنوں میں مکتب حربیہ سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ لیکن بعد میں امیر امان اللہ خان کے زمانے میں مکتب حربیہ کا مدیر بن گیا تھا۔

کابل میں اس زمانے میں علمی اور ثقافتی کارروائیوں کا مرکز سردار محمود بیگ طرزی پسر سردار غلام محمد خان طرزی تھے جو اس زمانے میں افغانستان کا واحد اخبار سراج الاخبار نکالا کرتے تھے۔ سردار محمود بیگ طرزی اپنے والد مرحوم سردار غلام محمد خان طرزی جو افغانستان کے ایک مشہور شاعر تھے اور امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے میں افغانستان چھوڑ کر ترکی چلے گئے تھے، کے ساتھ استانبول میں رہے، بعد میں دمشق چلے گئے۔ اس لئے ان کے نام کے ساتھ (بیگ) کا لقب لگایا جاتا تھا۔ انہوں نے دمشق ہی میں شادی کی۔ ان کے گھر میں عربی اور ترکی بھی بولی جاتی تھی۔ ان کی ایک صاحب زادی کی شادی ولی عہد سردار عنائت اللہ خان نائب السلطنۃ سے

ہوئی تھی اور دوسری صاحب زادی ثریا کی جو بعد میں ملکہ بنیں، سردار امان اللہ خان عین الدولہ سے ہو چکی تھی۔ سراج الاخبار کے نکالنے میں سردار محمود بیگ طرزی کے ساتھ ان کے شاگرد عبدالهادی خان جو بعد میں امیر امان اللہ خان کے زمانے میں لندن اور قاہرہ میں افغانی سفیر بنا اور عبدالرحمٰن خان کام کیا کرتے تھے۔ اخبار ہفتہ وار اور باتصویر تھا اور ٹیپو گراف Typograph چھپتا تھا۔

امیر کابل کی درباری زندگی

امیر حبیب اللہ خان اپنے آخری زمانے میں یعنی ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک ایسے عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے کہ ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ولی عہد سردار عنایت اللہ خان معین السلطنۃ ایک ضعیف کیریکٹر کا آدمی تھا۔ اپنے باپ کی طرح انگریزوں کا طرف دار تھا اور افغانستان کو انگریزوں کے بر خلاف استعمال کئے جانے کا مخالف تھا۔ امیر صاحب کا چھوٹا بھائی سردار نصر اللہ خان نائب السلطنہ ولی عہد کا رقیب سمجھا جاتا تھا تھا امیر صاحب کو جب کبھی کسی مسئلہ میں انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ نائب السلطنۃ اور حاجی عبدالرزاق خان کے ذریعہ جو دیو بند کے تعلیم یافتہ اور کابل کے قاضی القضاۃ تھے، ریشہ دوانی کرایا کرتے تھے۔ سردار نصر اللہ خان ایک قدامت پسند آدمی تھا۔ امیر صاحب کے تیسرے فرزند سردار امان اللہ خان عین الدولہ اپنی بارسوخ والدہ ملکہ علیا حضرت کی وجہ سے لوگوں میں ہر دلعزیز تھے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے جب امیر صاحب سردیوں میں جلال آباد جاتے تو سردار امان اللہ خان عین الدولہ کابل کی گورنری کے فرائض ادا کرتے تھے۔

ملک کے بعض روشن خیال نوجوان ایک دستوری حکومت قائم کرنے اور افغانستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے خواہاں تھے۔ ان لوگوں کے لیڈر ایک طرف تو سردار محمود بیگ طرزی اور دوسری طرف سردار محمد نادر خان مانے جاتے تھے۔ یہ روشن خیال نوجوان زیادہ تر سردار امان اللہ خان کو پسند کرتے تھے اور اسی کے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح ملک میں تین سیاسی زمرے (گروپ) موجود تھے۔ ایک امیر حبیب اللہ خان اور ولی عہد سردار عنائت اللہ

خان کا گروپ، دوسرا سردار نصر اللہ خان معین السلطنتہ کا حزب، تیسرا سردار امان اللہ خان عین الدولہ کا زمرہ۔ امیر صاحب کی عیش و عشرت کی وجہ سے لوگوں میں ان کے بر خلاف ناخوشی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان کو قتل کرنے کے لئے دو مرتبہ کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کے کابل پہنچنے پر (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) ملک کے بیرونی تعلقات میں اگرچہ ذرا چہل پہل پیدا ہو گئی تھی لیکن امور داخلہ بالکل طاق نسیان میں پڑے ہوئے تھے۔ امیر صاحب ایک غیر ذمہ دار بادشاہ ہونے کی وجہ سے، امور سلطنت کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق چلایا کرتے تھے۔ مہینوں دربار نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ قیدیوں کے مقدمے خود ان کی طرف سے حل و فصل ہوتے تھے۔ بیچارے قیدی خواہ مجرم ہوں یا کسی گمان کی وجہ سے قید میں ڈال دیئے گئے ہوں مہینوں قید خانوں میں پڑے رہتے۔ امیر صاحب کی چار منکوحہ بیگمات کے سوا، روائت کے مطابق ۱۰۰ کنیزیں (باندیاں) بے نکاح ان کے حرم سرائے میں رہتی تھیں۔ ہر سال مختلف قبیلوں سے خوبصورت نوجوان لڑکیاں چنی جاتی تھیں اور امیر کے محل میں بھیجی جایا کرتی تھیں۔ ان رنگ رلیوں کی وجہ سے امیر صاحب کو سرکاری امور پر توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔ وہ محل سے جب نکلتے تھے تو کسی پر فضا مقام پر کابل کے نزدیک خیمے لگا کر سارے درباریوں کے ساتھ کھانا پکانے، اور سرود و نغمہ سے لطف اندوز ہونے میں سارا دن گزار دیتے تھے۔ ان کی ان سیر و تفریح کی مجلسوں کو دیگچہ پزانی ہنڈیا پکانے کی محفل کہا جاتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ اتنے عصبی ہو گئے تھے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اور اپنے متعلقین کی ذرا سی غلطیوں پر، نوکروں کو سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ شجاع الدولہ نام غلام بچے کو خیمہ ٹھیک نہ لگانے کی وجہ سے اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ اس کی پیٹھ کی کھال اکھڑ گئی اور خون بہنے لگا تھا۔

امیر صاحب کی بیگمات میں سے علیا حضرت کا رسوخ اگرچہ کافی تھا لیکن وہ خوبصورت باندیوں کی وجہ سے ذرا نظر سے گر گئی تھیں۔ وہ امیر صاحب کے شہوانی افعال کی وجہ سے اور ان کی بعض شریف خاندان کی لڑکیوں اور بہوؤں کی آبرو پر دست درازی کی وجہ سے ان سے بالکل دل برداشتہ ہو چکی تھیں۔

جن حالات اور جس ماحول میں ہم نے کابل میں زندگی شروع کی اس کا ایک مختصر سا خاکہ

اوپر کھینچ دیا گیا ہے۔ تاکہ قارئین کرام کو کچھ اندازہ ہو سکے کہ ہمیں افغانستان میں اس زمانے میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کابل کے لوگ ہم سے کتراتے تھے اور ہم سے بولنے کی جرات نہ کرتے تھے۔ کیونکہ افغانی پہرہ دار سپاہی ہمیشہ سایہ کی طرح ہمارے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اگر کوئی ہم سے بات کرنا چاہتا تو وہ "موقوف است" (یعنی منع ہے) کہہ کر بولنے والے کو جھڑک دیتا تھا۔ ہم جنگ اور دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ کیونکہ کابل میں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) سراج الاخبار کے سوا کوئی اور اخبار نہ نکلتا تھا۔ اس اخبار میں اندرونی خبروں، امیر اور شہزادوں کی تعریف کے سوا اور کوئی ایسا مضمون نہ ہوتا تھا جس میں ہمیں دلچسپی ہو، رفتہ رفتہ ہمیں معلوم ہوا کہ سول ہسپتال میں ڈاکٹر منیر بیگ ہندوستان سے ایک دو روزانہ اخبار منگایا کرتے ہیں جس کا ترجمہ ان کو ہندوستانی کمپونڈر سنایا کرتے ہیں۔ ہم بیماری کے بہانے سے ہسپتال جانے لگے اور اس طرح پر ڈاکٹر منیر بیگ سے رابطہ بڑھا لیا۔ وہ ہمارے ساتھ آنے والے سپاہی کو ہسپتال کے دروازے پر رکوا دیتے تھے جس سے ہم شفاخانہ کے اندر بہت آزادی سے چل پھر سکتے تھے اور ہندوستانی کمپونڈروں سے کھل کر باتیں کر لیا کرتے تھے۔ یہاں اخبار پڑھ کر اکثر میں اور خوشی محمد واپسی پر خبروں کا خلاصہ اپنے دوستوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ ہسپتال میں ہفتے میں ایک دو دفعہ جانے سے نظر بندی کا بار قدرے ہمارے دلوں سے اٹھ جاتا تھا۔

ہم کابل میں اس امید پر دن گزار رہے تھے کہ کسی روز ہم کو امیر صاحب اپنے حضور میں طلب کریں گے اور ہم کو ترکی جانے اور وہاں جا کر جہاد میں شریک ہونے کا موقع دیں گے۔ جب کابل میں رہتے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تو ہم نے کوتوال شہر سے درخواست کی کہ بادشاہ کے حضور میں ہمیں پیش کر دے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ ہم کو کھلم کھلا کچھ کہے وہ ہمیں جھوٹے وعدے دیتا رہا اور ہمیشہ لیت و لعل کرتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارا مہمان دار یا اپنی طرف سے بات بنا کر یا کوتوال کے اشارے سے ہم کو کہہ دیتا تھا کہ "عنقریب دربار ہو گا اور آپ لوگوں کو امیر صاحب کے حضور میں پیش کیا جائے گا" ہم اپنی سادہ لوحی کے سبب سے ان وعدوں پر یقین کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر شخص ایک جوڑا صاف اور دھلے ہوئے کپڑوں کا ہمیشہ تیار رکھا کرتا تھا کہ اگر کہیں دفعتہً اس قسم کی پیشی ہو جائے تو حیثیت قائم رہے۔ لیکن یہ تو کابلی افسروں کا وعدہ تھا جو

ے وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا ــــ کا مصداق تھا

جب ہم انتظار کرتے کرتے بہت تنگ آ گئے تو شیخ عبد القادر نے تجویز کی کہ وہ ایک قصیدہ ولی عہد سردار عنائت اللہ خان معین السلطنۃ کی تعریف میں لکھ کر اس کو کوتوال شہر کے ذریعہ ان کی خدمت میں پیش کرے اور اس طرح پر اپنے ساتھیوں کی ناگفتہ بہ حالت ان کو بتائے۔ چنانچہ شیخ عبد القادر نے فارسی میں ایک اچھا خاصا اور لمبا قصیدہ لکھا اور اس کو کوتوال کو دیا تاکہ وہ معین السلطنۃ صاحب کی خدمت میں پیش کرے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کوتوال صاحب ایک بار سوخ آدمی ہیں جو ہماری عرض اور اس قصیدے کو شہزادے کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ ہم نے مدت تک اس کا انتظار کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ہم سمجھ گئے کہ کوتوال صاحب میں اتنی جرات ہی نہیں ہے کہ وہ معین السلطنۃ صاحب کے دربار میں بغیر بلاوے کے اور خود بخود جا کر ہمارے لئے چند ایک سفارشی کلمے کہہ سکیں۔

کوہاٹی مہاجر

ہم کو کابل پہنچے ہوئے کوئی دو ماہ ہوئے تھے کہ کوہاٹ سے چار طالب علم جنہوں نے کہیں سے یہ غلط خبر سن لی تھی کہ کابل میں ہماری بہت عزت اور خاطر داری ہو رہی ہے، افغانستان میں داخل ہو گئے اور سرحد سے کابل لائے گئے۔ ان کو بھی ہمارے ساتھ کوتوالی میں اسی گھر میں جہاں ہم رہتے تھے ایک کوٹھڑی میں جگہ دے دی گئی۔ ان میں سے عبد اللطیف اور حافظ عبد المجید مڈل پاس تھے اور فقیر شاہ اور پیر بخش پرائمری پاس تھے۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت ناقص اور کم ہونے کی وجہ سے، ہم ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود بھی ان سے چنداں نہیں ملتے تھے اور ان سے ذرا الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔

ابھی ہم کوتوالی ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ کابل میں سخت ہیضہ پھیلا۔ ہر روز بہت سی موتوں کی خبریں ہم تک آتی تھیں۔ ہم نے کھانے پینے میں احتیاط تو بہت برتی لیکن اس کے باوجود خوشی محمد کو ہیضہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوئی کا پانی وضو کے لئے استعمال کئے جانے کی وجہ سے جراثیم اس کے پیٹ میں چلے گئے جس سے اس کو قے اور دست لگ گئے۔ رفتہ رفتہ قے اور دستوں کی وجہ سے کمزوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ چارپائی سے بھی اُٹھنے کے قابل نہ رہا۔

میرے سوا دوسرے دوستوں نے اس کی تیمار داری سے ذرا پہلو تہی برتی۔ ابلے ہوئے پانی کے سوا اس کو اور کچھ نہ دیا جاتا تھا۔ حالانکہ قے اور پیاس کی وجہ سے اس کا حلق خشک تھا اور ابلا ہوا

پانی اس کو بد مزا معلوم ہوتا تھا۔ وہ تازہ اور ٹھنڈا پانی مانگتا تھا۔ میں اس کو Potassium Permanganate- ٹھنڈے پانی میں گھول کر کلی کرنے کے لئے دیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے یہ پانی کلی کرنے کی بجائے چھپا کر پی لیا۔ خدا کی شان اس سے اسے معلوم ہوتا ہے کہ بجائے نقصان کے کچھ فائدہ ہوا اور اس کی قے بند ہو گئی اور بعد میں دست بھی تھم گئے۔ اس کو آدھی رات کے قریب ذرا نیند آ گئی جس سے اس کی جان بچ گئی۔

کچھ دنوں بعد عبد الحمید کی پلک پر ایک پھنسی نکلی۔ بے احتیاطی کی وجہ سے یہ پھنسی بڑھ گئی اور اس کی آنکھ کی اوپر کی پلکیں بالکل گر گئیں۔ آنکھ کا اوپر کا پردہ زخم کی وجہ سے اتنا خراب ہو گیا کہ سوتے ہوئے بھی اس کی آنکھ کھلی نظر آتی تھی۔ آخر ڈاکٹر منیر بیگ کو کہا گیا۔ اس نے اس کی ران سے کھال لے کر آنکھ کے اوپر کے پردہ پر پیوند لگایا، جس کی وجہ سے عبد الحمید چند روز ہسپتال میں رہا۔ یہ پیوند صرف ایک حد تک کھال سے جڑا اس لئے اس کی آنکھ پوری طرح بند نہ ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپریشن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ جب عبد الحمید ہسپتال میں تھا تو ایک روز اس سے ایک کابلی کمپونڈر نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ "شما از کجا آمدید؟" (آپ کہاں سے آئے ہیں؟) اس نے جواب دیا "ما از لاہور آمدیم" (ہم لاہور سے آئے ہیں) اس پر وہ کمپونڈر کہنے لگا شما از لور کلاں آمدید، یا از پنڈی؟" "آپ بڑے لاہور سے آئے ہیں یا لاہور پنڈی سے؟" معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے یہ لوگ راولپنڈی کو (لور پنڈی) اور خود لاہور کو (لور کلاں) کہا کرتے تھے۔ یعنی ان کو راولپنڈی کا صحیح تلفظ بھی نہ آتا تھا۔

اس کے بعد وہ کمپونڈر کہنے لگا "ما لیر[1] خوب نہ داریم لاکن سر کہائے خوب داریم۔ شما در ہندوستان سرک دارید؟" (یعنی ہمارے ملک میں ریل تو نہیں ہے لیکن اچھی اچھی سڑکیں موجود ہیں۔ کیا ہندوستان میں بھی سڑکیں ہیں؟)

قارئین خیال فرمائیں کہ کابل کے اس زمانے کے لکھے پڑھے کمپونڈر جیسے لوگوں کی معلومات ہندوستان کے بارے میں کتنی کم اور ناقص تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس زمانے میں ہندوستان کو افغانستان سے بھی زیادہ پسماندہ اور کم ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔

اس زمانے کے کابلی تاجروں کے رویہ اور کاروباری قابلیت کے متعلق بھی میں یہاں

---

(۱) افغان اور کابلی (ریل) کو (لیر) کہا کرتے ہیں۔

ایک مثال لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم ایک روز اللہ نواز کے لئے ایک بوٹ کا جوڑا خریدنے کو کابل کے مشہور بازار سرپل چشتی گئے۔ ہم نے ایک سوداگر سے ۷ نمبر کا بوٹ مانگا۔ اس نے جواب دیا "غالباً سات نمبر کا جوتا تو میرے پاس نہیں لیکن آٹھ نمبر کا موجود ہے اور میں ابھی اس کو سات نمبر کا بنائے دیتا ہوں۔" ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا۔ کیونکہ ایک چھوٹے اور تنگ بوٹ کو تابوت پر چڑھا کر کچھ کھول دینا اور ڈھیلا کرنا تو ممکن ہوتا ہے لیکن بڑے نمبر کے جوتے کو چھوٹا اور تنگ بنانا کیسے ممکن ہے، یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے ہم اس سوداگر صاحب کے، بڑے نمبر کے جوتے کو چھوٹے نمبر کا بوٹ بنانے والے ہنر کے دیکھنے کے منتظر رہے۔ اس نے کچھ چیتھڑے اور روئی لے کر بوٹ کے اندر بوٹ کی نوک کی طرف ٹھونس دیئے اور بڑے فخر سے کہنے لگا۔ "اینہ صاحب ہفت نمبر شد" (یہ لیجئے! جناب یہ بوٹ سات نمبر کا ہو گیا ہے")

جون کا مہینہ ختم ہو چکا تھا کہ ہم کو کوتوالی کے گھر سے نکال کر ایک دوسری جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوتوال صاحب کو گھر کسی اور کام کے لئے درکار تھا، اس لئے ہم کو یہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ ہمارے لئے سرکاری عمارتوں میں سے ایک چھوٹا سا دو منزلہ گھر جس میں ایک بڑا کمرہ اور اس کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی اور جو "محلہ خواجہ رواش" میں پہاڑ کے دامن میں واقع تھا چنا گیا۔ اس زمانے کی افغانی حکومت ہم جیسے "مہمانان شاہی" کے لئے کرایہ پر مکان لے کر ان کو اس میں ٹھہرانے کی زحمت تو اختیار نہ کیا کرتی تھی، بلکہ ان گھروں میں سے جن کو عتاب شاہی کی وجہ سے ان کے مالکوں سے چھین لیا گیا تھا، ایک گھر "مہمان شاہی" کی حیثیت کے مطابق اس کی رہائش کے لئے مقرر کر دیتی تھی۔ ان دنوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حیثیت حکومت کی نظروں میں بالکل گری ہوئی تھی کہ ہم کو یہ گھر دیا گیا جس کی دیواروں پر سفیدی کی بجائے مٹی کا لپاؤ تھا۔ کھڑکیوں میں ایک چھوٹا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے کمرے میں روشنی بہت کم آتی تھی۔ زینہ کہنہ اور فرسودہ تھا۔ اس کی نیچے کی منزل میں ہمارے افغانی پہرے دار رہتے تھے اور اوپر کی منزل میں ہم رات کو فرش پر لیٹ جایا کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قدر بڑھ گئی تھی، اور ہم کو چار ماہ بعد ایک بہت اچھے گھر میں جگہ دی گئی۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کابل میں اس زمانے میں ایک آدمی کی قدر اور قیمت اس کی قابلیت کے متناسب

نہیں بلکہ کسی بڑے آدمی کی سفارش یا ارباب حکومت کی مرضی پر منحصر تھی۔

جب ہم نے کوتوال کو اس گھر کی خرابی کے بارے میں کہا تو اس نے پڑتال کے لئے دو مرزا (کلرک) بھیجے۔ ہم نے ان کو گھر کے سب نقائص بتلائے مگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی۔ لیکن جب وہ پڑتال کے بعد سیڑھیوں سے اترنے لگے تو ٹوٹی ہوئی سیڑھی میں بڑے منشی کا پاؤں پھنسا جس سے وہ گر پڑا۔ اس پر اس نے دوسرے منشی کو کہا "نوشتہ کن، زینہ ہیچ مردار است" (یعنی لکھو، سیڑھیاں بالکل خراب ہیں) اگر وہ نہ گرتا تو شائد اتنا بھی نہ لکھتا۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ گھر بدلا نہ گیا اور ہم کوئی چار ماہ اسی تنگ و تاریک جگہ میں رہے۔

ہندوستانی۔ ترکی۔ جرمن مشن کی آمد

ہم ابھی اسی گھر میں رہتے تھے کہ ۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن یورپ سے ایران کے راستہ کابل پہنچا۔ اس مشن کے ہیڈ راجہ مہندر پرتاپ تھے جو ہاتھرس واقع نزدیک بنارس کے ایک جاگیردار تھے اور یورپ میں رہتے ہوئے انگریزوں کے برخلاف پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں سے مل گئے تھے۔ ان کے ساتھ مولانا برکت اللہ تھے جو اصل بھوپال کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے جاپان میں اشاعت اسلام کا کام کیا تھا اور بعد میں امریکہ میں بنی ہوئی غدار پارٹی میں داخل ہو کر انگریزوں کے برخلاف کام کرنے لگے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران وہ بھی جرمنوں سے مل گئے تھے۔ ترکی نمائندے ایک ژاندار مری فرسٹ لیفٹنٹ (Gendarmeriefirstlieut) کاظم بیگ تھے جن کو بعد میں کیپٹن کا رتبہ ملا تھا۔ جرمن ڈیلیگیٹ فون ہنٹس (Von.Heintisch) اور آسٹرین نمائندہ نیڈر مائر (Nei der Mayer) تھا اس وفد کے ممبروں کا فوٹو مجھے روس میں سنہ ۱۹۲۳ء میں راجہ مہندر پرتاپ نے دیا تھا۔ جو یہاں درج ہے۔ (۲) اس کی پشت پر راجہ صاحب نے ۱۹/۰۷/۲۳ تاریخ ڈال کر اپنے دستخط کے ساتھ یہ لکھا تھا۔ (میرے دوست جناب ظفر حسن خان صاحب کو) (۳)

اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف اکسا کر افغانستان سے ہندوستان پر

حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح پر انگریزی فوجوں کے ایک معتد بہ حصے کو یورپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا اور جرمن اور ترکی فوجوں کو روس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع دینا اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، مولانا عبیداللہ صاحب سندھی شاگرد رشید حضرت شیخ الہند محمود الحسن نے جو کابل میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے آئے تھے، ان سے مل کر معلوم کیا تو پتہ لگا کہ راجہ صاحب کا مقصد ہندوستان آزاد ہونے پر وہاں راجہ نیپال کی مدد سے ایک ہندو حکومت قائم کرنا تھا۔

چھٹا باب

کابل میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کا ورود مسعود اور حکومت موقتہ ہند کی سرگرمیاں

مرحوم مولانا عبیداللہ صاحب سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ وہ ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے، مرحوم حکیم اجمل خان، مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مرحوم مولانا محمد علی جوہر اور مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے دہلی میں ملے تھے اور ان کو حضرت شیخ الہند کے حکم سے اپنے کابل جانے کے متعلق اطلاع دی تھی۔۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے مقصد سفر کو پسند کیا تھا اور ان کی تائید کی تھی اور ان کو اپنا نمائندہ مان لیا تھا۔ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے کابل آنے سے پہلے، شیخ محمد ابراہیم کو جو بمبئی یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے پاس کر چکے تھے، اور وہ مولانا صاحب مرحوم کے بہت عقیدت مند تھے کابل کے مکتبہ حبیبیہ میں معلم کے طور پر بھیج دیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری ولد مولوی عبدالقادر قصوری جو کیمبرج سے میتھے میٹکس کے رینگلر (wrangler) تھے، حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر مکتبہ حبیبیہ کی تجویز سے اس سکول میں معلم مقرر ہو گئے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے بھتیجے عزیز احمد تھے جو اب کراچی میں مشن روڈ نمبر ٦٢ میں ایک مذہبی درس گاہ میں قرآن شریف کا سبق پڑھاتے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے کابل آنے سے پہلے، ان کے لئے یہاں کی فضا کو تیار کر دیا تھا اور یہاں کے سربر آوردہ لوگوں میں خاص کر سردار سپہ سالار محمد نادر خان (اعلیٰ حضرت نادر شاہ مرحوم) کے خاندان میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کابل پہنچنے کے کچھ دنوں بعد اسی گھر میں رہنے لگے جہاں شیخ محمد

ابراہیم اور مولوی محمد علی رہتے تھے۔ یہ گھر کابل کے پرانے حصہ میں مشہور شور بازار کے نزدیک ایک گلی میں جس کو کوچہ حضرت صاحب کہا جاتا تھا، واقع تھا۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار محمود بیگ طرزی اور سردار محمد نادر خان سپہ سالار کے نام تعارفی خطوط اپنے ساتھ لائے تھے۔ کابل پہنچنے سے پہلے انہوں نے سردار محمود بیگ طرزی کو خبر بھیجی تھی۔ ان کے کابل پہنچنے کے بعد سردار طرزی کا شاگرد عبدالہادی خان جو سراج الاخبار کے ادارے میں ان کا دست راست تھا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں، سردار محمود بیگ طرزی کی طرف سے "خوش آمدید" کہنے کے لئے آیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار طرزی صاحب کے ذریعہ ان کے داماد سردار عنائت اللہ خان معین السلطنۃ سے ملے۔ شہزادے نے ایک روز قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو کھانے پر بلایا۔ اس طرح پر دوسرے افغان سرداروں کو بھی قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے کابل پہنچنے کی اطلاع ہو گئی۔

قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خان جو افغانستان کے محکمہ شرعیہ کے (جس کو میزان التحقیقات شرعیہ کہتے تھے) رئیس تھے، دیوبند کے تعلیم یافتہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب سردار نصراللہ خان نائب السلطنۃ کے ساتھ جو غیر سرکاری طور پر افغانستان کے سیاسی حالات، خاص کر امور متعلقہ قبائل سرحد کا انتظام کرتے تھے، خاص تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو نائب السلطنۃ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا چاہا لیکن قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ یہ ملاقات سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ ہو۔ کیونکہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم اپنی فراست کی وجہ سے کابل میں پہنچتے ہی سمجھ گئے تھے کہ سرداروں کی باہمی رقابتیں ان کے کام میں رکاوٹیں ڈال سکتی ہیں۔ اس لئے ممکن حد تک ان رقابتوں کے جال میں پھنسے بغیر اپنا کام کرنا اور سلسلہ مراتب کا خیال رکھنا انہوں نے اپنے لئے ضروری سمجھا۔ حاجی صاحب نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی بات مان لی اور ان کو سردار نائب السلطنت کی خدمت میں سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ پیش کرنا منظور کر لیا۔ اس کے لئے قبلہ مولانا مرحوم صاحب سے ایک عریضہ لکھوایا جس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنا مقصد سفر مختصر طور پر یوں لکھا کہ وہ مسلمانان ہند کے نمائندے کے طور پر افغانستان آئے ہیں تاکہ شاہ افغانستان کو انگریزوں

کے بر خلاف ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائیں۔ اس طرح قبلہ مولانا صاحب مرحوم سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ سردار نائب السلطنۃ سے ملے اور ان سے دو گھنٹے تک تخلیہ میں باتیں کرتے رہے۔

سردار نائب السلطنۃ نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے اس گفتگو کا خلاصہ مانگا جس کو قبلہ مولانا صاحب نے سات آٹھ صفحہ پر لکھا اور مسودہ شیخ محمد ابراہیم صاحب کو دکھلایا۔ انہوں نے اس میں بعض تبدیلیاں کیں جس سے اس کو، صرف ہندوستانی مسلمانوں کی ایک تجویز کے بجائے تمام ہندوستان کی تجویز کا رنگ حاصل ہو گیا۔ یہ تحریر سردار محمود بیگ طرزی اور سردار معین السلطنۃ کے ذریعہ سردار نائب السلطنۃ کو بھیج دی گئی، انہوں نے اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کو اپنے بھائی یعنی اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ سراج الملۃ والدین کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک روز سردار نائب السلطنۃ نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنی کوٹھی پر بلایا۔ عصر کے وقت امیر صاحب بھی یہاں آ گئے۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنے حضور میں باریابی دی جیسا کہ مولانا مرحوم نے اپنی ذاتی "ڈائری" میں لکھا ہے۔ ان کو امید نہ تھی کہ کابل پہنچ کر وہ اتنی جلدی امیر افغانستان کے دربار میں باریابی حاصل کر سکیں گے۔

امیر حبیب اللہ خان نے قبلہ مولانا مرحوم کی تحریر کا بغور مطالعہ کیا اور مختصر الفاظ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کام کرنے کے لئے زبانی حکم دیا اور ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کی نصیحت کی۔ افسوس کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی اس تحریر کی جو سردار نائب السلطنۃ کے ذریعہ امیر حبیب اللہ خان کی خدمت میں پیش کی گئی تھی نہ کوئی نقل آج ہمارے پاس موجود ہے اور نہ ہی اس کا مسودہ ملتا ہے جس سے اس کے مضمون اور مندرجات کا پتہ ٹھیک طور پر اور مفصل مل سکے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی زندگی کا مقصد اسلام کی خدمت تھا۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے پھر وہی عزت کی جگہ حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کو انگریزی راج سے پہلے حاصل تھی۔ ان کے استاد شیخ الہند قبلہ مولانا محمود الحسن مرحوم کی ساری کوششیں اس کے حصول پر مرکوز رہی تھیں۔ انہوں نے اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے ان کو کابل اسی مقصد کے لئے بھیجا تھا۔ مگر کوئی خاص پروگرام اس بارے میں ان کو نہ دیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے افغانستان کو انگریزوں سے لڑا کر ہندوستان کا آزاد کرانا

ضروری تھا۔ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں کا دوست اور وظیفہ خوار تھا۔ ایسے شخص کو انگریزوں سے لڑنے پر آمادہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کو ایک ایسا لالچ دینا ضروری تھا جس سے وہ کم از کم ان کی بات تو سن لے۔ ہمیں اس کے کئی سال بعد قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی باتوں سے اس کا پتہ چلا کہ انہوں نے امیر صاحب کے سامنے، اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ افغانی فوجیں ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو انگریزوں سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں تو ایک افغانی شہزادہ دستوری بادشاہ کے طور پر دہلی کے تخت پر بیٹھے گا۔ امیر صاحب کی منظوری سے یہ شہزادہ امان اللہ خان عین الدولہ تھا اور افغانستان میں ایک دستوری بادشاہت قائم ہوگی اور ہندوستان اور افغانستان کے درمیان ایک معاہدے کے ذریعہ اتحاد قائم کیا جائے گا۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے امیر صاحب کے حضور میں باریاب ہونے کے کچھ دن بعد، ان کی اور حاجی عبدالرزاق کی کوششوں سے ہم کو بھی کوچہ حضرت صاحب کے اسی گھر میں جگہ دے دی گئی جس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم، شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری رہا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے لئے اس گھر کا سراچہ (یعنی مردانہ حصہ) مقرر ہوا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ یہ حصہ سرائے یعنی اندرونی زنانہ حصے سے چھوٹا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی بہت آرام دہ تھا اور محلہ خواجہ رواش کے تاریک گھر کی نسبت بہت پر تکلف تھا۔ مگر اس کی گلی یعنی کوچہ حضرت صاحب بہت تنگ اور کابل کے دوسرے کوچوں کی مانند بہت گندی تھی۔ یہاں ہمارے لئے نئے بستر اور لحاف اور سردی میں گرم رہنے کے لئے صندلیاں اور فرش پر بچھانے کے لئے اونی دریاں جن کو کابل میں (گلیم) کہتے ہیں، گورنمنٹ افغانستان کی طرف سے خرید کر ہم کو دی گئیں اور ہمارا روزانہ وظیفہ دوچند کر دیا گیا۔ اس لئے اب ہم کو روزمرہ کے خرچ کے لئے فی آدمی ایک افغانی روپے کی بجائے دو افغانی روپے ملنے لگے۔

قبلہ مولانا مرحوم نے ہمیں، مرحوم عبدالمجید خان کی جگہ ایک نیا سردار (پریزیڈنٹ) چننے کو کہا اور ہم نے اتفاق آراء سے عبدالباری صاحب کو اس عہدے کے لئے انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد جب مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستانی، ترکی، جرمن وفد سے ملنے کی اجازت حاصل ہو گئی تو وہ عبدالباری کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے تاکہ وہ انگریزی میں ترجمانی کرے اور ان کی گفت وشنید سے بھی واقف ہو۔ آئندہ کے لئے جو منصوبے وہ بنائیں انہیں ان کے مشیر کے طور پر کام دے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے راجہ مہندر پرتاپ کا مقصد بحیثیت پریزیڈنٹ ہند، ترک، جرمن، مشن کے کچھ اور ہی تھا اور وہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا برکت اللہ مرحوم ہندوستان سے مدتوں دور رہنے کی وجہ سے وہاں کے تازہ حالات اور مسلمانوں کی اہمیت سے بے خبر تھے۔ اس لئے وہ ہر بات میں راجہ صاحب کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ جرمن نمائندے بھی راجہ صاحب کی قابلیت کے قائل ہونے کی وجہ سے انہی کے نقطہ نظر کی تائید کیا کرتے تھے۔ لیکن قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم سے مل کر جرمن اور آسٹرین نمائندے کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ راجہ صاحب نے برلن میں جرمن گورنمنٹ کو ہندوستان کے موجودہ حالات اور اس کے مستقبل کے متعلق کہا تھا، وہ حقیقت سے دور ہے اور اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ ان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہستی اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے قائل ہو گیے کہ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ہندوستان کے موجودہ حالات سے راجہ صاحب کی نسبت زیادہ باخبر ہیں اور ان کے خیالات حقیقت کے زیادہ نزدیک ہیں اور ان کو سرحدی علاقوں، افغانستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی اہمیت کے بارے میں زیادہ معلومات ہیں۔ ان وجوہ سے جرمن اور ہندوستانی ممبران مشن کے درمیان وہ اختلاف جو پہلے بعض دوسرے اسباب سے پیدا ہو گئے تھے اور بھی بڑھ گئے۔

اس مشن کے کابل پہنچنے سے ہماری امیدیں پھر پنپ اٹھی تھیں۔ جو لوگ افغانستان میں انگریزوں کے مخالف تھے وہ بھی اس مشن کی آمد پر خوش تھے۔ لیکن افغانی حکومت سے، جس میں انگریز پرستوں کا زور تھا، یہ مشن اپنی تجویزیں نہ منوا سکا۔ امیر حبیب اللہ خان ایک طرف اس مشن کے ساتھ اور دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ایک طرف تو اس مشن کو کہتے رہے کہ اگر ترک اور جرمن افواج افغانی سرحد تک پہنچ جائیں تو وہ فوراً انگریزوں کے برخلاف اعلان جنگ کر دیں گے اور دوسری طرف انگریزی حکومت کو، مشن سے جو بات چیت ہوتی تھی اس کی خبر دیتے رہے۔ اس مشن نے لاسلکی کے ذریعہ کچھ اپنی حکومت سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کو امیر کی تجویزوں سے خبردار کرے۔ لیکن اس کے ذرائع خبر رسانی اتنے ترقی یافتہ اور کارگر نہ تھے کہ کابل سے برلن یا کابل سے استانبول تک خبر رسانی کر سکے۔ انگریز امیر صاحب کو، ان کی ایسی خدمات کی وجہ سے

بہت روپیہ دیتے تھے اور جنگ کے خاتمہ پر ان کے لئے ایک بہت گراں بہار قم کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے امیر صاحب سرحدی قبائل میں، جو انگریزوں کے خلاف ہمیشہ دانت پیستے رہتے تھے، یہ پروپیگنڈا کرواتے رہے کہ جہاد کے لئے ایک امیر اور ایک مسلمان اولوالامر کی ضرورت ہے ورنہ انگریزوں کے برخلاف جو لڑائی لڑی جائے گی وہ ایک دنیوی جنگ ہوگی اور جہاد شمار نہ کی جائے گی۔ اور ایسی لڑائی میں مرنے والے مسلمان شہیدوں کا درجہ حاصل نہ کرسکیں گے۔ امیر صاحب کے اس قسم کے پراپیگنڈے کا اثر بہت ہوا اور ساری جنگ عظیم اول کے درمیان قبائل سرحد نے انگریزوں کے برخلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ کیونکہ ہمیشہ یہی کہا جاتا تھا کہ جب جہاد کے لئے مناسب وقت آئے گا تو امیر صاحب خود جہاد کا اعلان کر کے ان کی قیادت کریں گے۔

ترکی اور جرمن فوجوں کا رخ ہندوستان کی طرف پھیرنے کے لئے جو کوششیں ہوئی وہ بھی چنداں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس مقصد کے لئے ایک ترکی فوجی دستہ ایران کے راستے افغانستان کو روانہ ہوا، اس مہم کے سردار رؤف بے تھے جن کے کارنامے جنگ بلقان کے زمانے میں حمیدیہ کروزر (Hamidiyacruiser) کے یونانی بیڑے پر جاں نثارانہ حملوں کی وجہ سے ہر کہ ومہ کے ورد زبان تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مہم ناکام رہی اور ایران میں انگریزی اور روسی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ دستہ افغانی سرحد کی طرف نہ بڑھ سکا، اور اس کو ترکی واپس جانا پڑا۔ اس ناکامی کی وجہ سے مشن کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور مشن کے جرمن ممبر ۱۹۱۶ء کے شروع میں کابل سے چلے گئے۔

حکومت موقتہ ہند

راجہ صاحب نے "حکومت موقتہ ہند" (عارضی حکومت ہند) کے نام سے ایک حکومت قائم کی تھی جس کے وہ لائف پریزیڈنٹ یعنی مدت العمر کے لئے رئیس تھے اور مولانا برکت اللہ صاحب اس کے وزیر اعظم تھے۔ اس حکومت میں بعض جرمن اور ترک ممبر بھی شامل تھے۔ مگر اس حکومت کی روح رواں صرف راجہ صاحب ہی تھے، اور وہ جو چاہتے تھے حکومت اسی میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی۔ مشن جب کابل پہنچا تو ترک اور جرمن ممبران مشن کو معلوم ہوا کہ راجہ صاحب نے جو کچھ ہندوستان کے بارے میں ان کی حکومتوں کو برلن اور استانبول میں کہا تھا، حقیقت سے دور تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہاں

راجہ صاحب کی کچھ نہ چلتی تھی اور ان کے خیالات کی نسبت قبلہ مولانا عبید اللہ مرحوم کے خیالات اور رائے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اس پر راجہ صاحب نے قبلہ مولانا مرحوم کو اس حکومت میں وزیر داخلہ کا عہدہ دے دیا۔ اس حکومت کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر کے ان کو انگریزوں کے برخلاف اپنا اتحادی بنائے۔ چنانچہ اس غرض سے روس کو ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

حکومت موقتہ ہند کا مشن روس میں

یہ وفد روس پہنچ کر زار روس کی حکومت سے گفتگو کرے گا اور اس کو سیاسی اور تجارتی رعایات کا وعدہ دے کر اس کو انگریزوں سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرے گا اور روس کو ہندوستان کا دوست بنائے گا۔ اس کام کے لئے راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو انتخاب کیا۔ متھرا سنگھ ایک زمانے میں امریکہ میں غدر پارٹی کا ممبر بن گیا تھا اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لئے (گوما گاٹا مارو) نام جہاز پر ہندوستان آیا تھا۔ اس کے بعض ساتھی تو پکڑے گئے تھے لیکن وہ انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر افغانستان پہنچ گیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک مسلمان کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا چاہا۔ راجہ صاحب پہلے تو اس پر راضی نہ ہوئے لیکن بعد میں افغانی حکومت اور سردار نائب السلطنۃ کے حکم سے اس کو منظور کر لیا، مگر اس کو سفر خرچ دینے سے کترا گئے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پاس اتنے لمبے سفر کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے روپیہ بھلا کہاں تھا۔ وہ تو ساری عمر صرف خدا کے بھروسے پر ہی کام کرتے رہے تھے اور خداوند کریم ان کے لئے ہمیشہ اسباب مہیا کرتا رہا تھا۔ اس وقت اتنے تنگ دست تھے کہ کابل پہنچنے کے چند دنوں بعد وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے گزارے کے لئے اپنے کپڑے بھی بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے، اور اس وقت شیخ ابراہیم کے مہمان بنے ہوئے تھے۔ اس سفر کے خرچ کے لئے انہوں نے مولوی محمد علی سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی فراخدلی سے ان کو سو پونڈ دے دئے۔ متھرا سنگھ کے ساتھ جانے کے لئے ہمارے ساتھیوں میں سے شیخ خوشی محمد کو محمد علی مرزا کا فرضی نام دے کر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

راستے میں ان کی خدمت کے لئے ہرنام سنگھ نام ایک سکھ اور ایک افغان مقرر کیا گیا۔ اس طرح پر متھرا سنگھ اور خوشی محمد (عرف محمد علی مرزا) روس کی طرف روانہ ہوئے۔ روسی ترکستان پہنچ کر ان کو ترکستان کے روسی گورنر نے تاشقند میں باریابی دی اور ان سے حکومت موقتہ ہند کا وہ نامہ جو ایک سونے کی پتری پر کھدا ہوا تھا، لیا اور اس کو سینٹ پیٹر سبرگ (St.Petersburg) پایہ تخت روس میں زار کو بھیجا اور جواب کے انتظار میں وفد کو تاشقند میں ٹھیرایا۔ جب جواب میں دیر لگی تو اس وفد کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ جواب آنے پر ان کو خبر دے دی جائے گی۔ زار روس نے اس نامہ کو انگریزوں کو دکھلایا اور ان کو جرمنی سے علیحدہ صلح کرنے کی دھمکی دے کر ان سے فوجی مدد مانگی۔ انگریزوں نے اس خط کا ذکر رولٹ سیڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں جو کلکتہ میں ۱۹۱۸ء میں سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کی طرف سے شائع ہوئی تھی، صفحہ ۱۷۸ پر ان الفاظ میں کیا ہے۔

The Provisional Govt despatched letter to both the Governor of Russian Turkistan and the then czar of Russia invititing Russia to throw over her alliance with Great Britain and assist in the overthrow of the British rule in India. These were signed by Mahendra Pratap and subsequently fell in British hands. The letter to the Czar was on a gold plate, a photograph of which has been shown to us.

اس کا ترجمہ یہ ہے ("حکومت موقتہ ہند نے روسی ترکستان کے گورنر اور اس زمانے کے زار روس کو خط لکھ کر، اس کو برطانیہ عظمیٰ کا ساتھ چھوڑنے کا بلاوا دیا اور ہندوستان سے انگریزی راج کو ختم کرنے کے لئے اس سے مدد مانگی۔ ان چٹھیوں پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے۔ بعد میں یہ خط انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ زار کے نام جو خط تھا وہ ایک سونے کی پتری پر لکھا ہوا تھا۔ اس کا فوٹو ہمیں دکھایا گیا ہے")

خوشی محمد (محمد علی مرزا) ایک عقلمند اور دور اندیش نوجوان تھا۔ وہ روسی گورنر ترکستان کی ملاقات اور تاشقند کے حالات اور راستہ کے متعلق نوٹ لکھتا رہا جو آخر کار واپسی پر اس کے لئے اور قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا رسوخ بڑھانے میں بہت کام آئے۔

جب وفد کابل واپس آیا تو راجہ صاحب فوراً متھرا سنگھ کو نائب السلطنۃ کے حضور میں لے گئے۔ انہوں نے جب اس سے سفر کے حالات پوچھے تو ڈاکٹر متھرا سنگھ نے بہت سادہ لوحی سے "صاحب بخیر رفتیم وبخیر باز آمدیم" (یعنی حضور ہم خیریت سے گئے اور خیریت سے آگئے) سردار نائب السلطنۃ نے اس سے چند ایک سوالات اور پوچھے لیکن اس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا "صاحب بخیر رفتیم وبخیر باز آمدیم۔" حاجی عبدالرزاق صاحب جو اس ملاقات کے وقت موجود تھے بڑے مایوس ہوئے۔ انہوں نے فوراً قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کو خبر بھیج کر خوشی محمد کو نائب السلطنۃ کے حضور میں پیش کیا۔ خوشی محمد نے اپنے مختصر نوٹوں سے راستہ کے حالات، اس زمانہ کے شہر تاشقند کی حالت اور گورنر سے ملاقات کی تفصیل بہت اطمینان بخش طور پر بیان کی۔ اس سے نائب السلطنۃ بہت خوش ہوئے اور قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کی رائے کی جو انہوں نے خوشی محمد کو متھرا سنگھ کے ساتھ بھیجنے کے بارے میں ظاہر کی تھی، بہت داد دی۔ اس طرح پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا رسوخ افغانی سرکاری حلقوں میں، اور ترکی اور جرمن ممبران مشن کے نزدیک اور بھی بڑھ گیا۔

میری تعلیم قرآن شریف

جب ہم کوچہ حضرت صاحب شور بازار میں رہتے تھے تو ہمارا وقت بے کاری ہی میں گذرا کرتا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ہمیں قرآن شریف کی تفسیر پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس درس میں میرے ساتھ شیخ عبدالقادر اور شیخ خوشی محمد شریک ہوئے تھے۔ شیخ عبدالقادر اور میں درس کے بعد نوٹ لکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیخ عبدالقادر کو اس مشن کی وجہ سے جس کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا کابل سے جانا پڑا۔ اس لئے ان کا درس ادھورا رہ گیا۔ انہوں نے اپنے نوٹ (الدین والسیاست فی القرآن) کے عنوان سے ایک کاپی میں مرتب کئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ نوٹ ضائع ہو گئے۔ خوشی محمد نے میرے ساتھ اس درس کو چند ماہ اور جاری رکھا۔

لیکن بعد میں اس نے بھی سبق پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کے بعد اور دو سال تک قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے فیض حاصل کیا۔ میں نے اپنے نوٹوں کو (المذہب والسیاسہ فی القرآن) کی سرخی سے لکھا۔ ان درسوں میں جن سورتوں اور سیپاروں کی تفسیر میں نے پڑھی، ان کا انتخاب خود مولانا مرحوم ہی کیا کرتے تھے اور اس انتخاب میں اس وقت کے حالات اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے رجحانات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ شکر ہے کہ یہ نوٹ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ خدا کرے کہ کبھی ان کو بھی چھپوانا نصیب ہو جائے تاکہ دوسرے نوجوان مسلمان بھی ان سے ایسے ہی مستفیض ہوں جیسا کہ جوانی میں میں ہوا تھا۔ جب کہ مختلف کتابوں، بدلے ہوئے ماحول اور نئے نئے نظریات کی وجہ سے ایمان میں کچھ نہ کچھ تزلزل واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ (اس کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا)

انہی دنوں میں مولوی محمد علی قصوری نے یہ تجویز کی کہ میں مکتب حبیبیہ میں ریاضی کا سبق پڑھاؤں اور اس طرح پر ایک طرف تو افغانی طالب علموں کی تعلیم میں مدد دوں اور دوسری طرف خود بھی بیکاری سے نجات پاؤں۔ اس کام کے لئے میرا نام تجویز کئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بی۔ اے میں (Mathematics A & B Courses) کا کورس لیا ہوا تھا اور جماعت میں اول نمبر پر تھا۔ لیکن اس میں غلطی یہ کی گئی کہ حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر مکتب حبیبیہ کو اس کی اطلاع نہ کی اور نہ ہی ان سے اس کے لئے منظوری لی گئی۔ کیونکہ مولوی محمد علی قصوری ان کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ خود کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے، انگریزوں کے مخالف اور قوم پرست تھے۔ حالانکہ حافظ احمد دین انگریزی کے دلدادہ شمار ہوتے تھے اور وہ صرف ہندوستان کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس پر حافظ احمد دین نے سردار معین السلطنۃ سے جو محکمہ تعلیم کے انچارج تھے شکایت کی کہ مولوی محمد علی قصوری کے ساتھ ایک ہندوستانی مہاجر بھی مکتب میں آتا ہے اور ان کے ساتھ ریاضی کے گھنٹے میں کلاس میں موجود رہتا ہے، اور مکتب میں ریاضی کا سبق پڑھانا چاہتا ہے۔

جاپان اور ترکی کو مشنوں کی روانگی

ہندوستانی، روسی مشن (یعنی متھرا سنگھ اور محمد علی مرزا کے مشن،) کے بعد راجہ صاحب

نے ایک مشن روس کے راستے جاپان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے تجویز کی کہ ایک مشن ایران کے راستے ترکی بھیجا جائے۔ جاپانی مشن میں شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر متھرا سنگھ شریک ہوں گے اور ترکی مشن میں عبدالباری اور شجاع اللہ شامل ہوں گے۔ ان کے اخراجات کے لئے وون ہیٹنگ (Von Henting) نے جو اپنے مشن کابل کی ناکامی سے بد دل ہو کر ۱۹۱٦ء کے شروع میں افغانستان سے روانہ ہونے والا تھا تین سو پونڈ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو دیئے۔ اس رقم میں سے سو پونڈ تو راجہ صاحب نے اپنے اور مولانا برکت اللہ صاحب کے کپڑوں کے لئے اور دوسری ضروریات سفر کے لئے لے لئے۔ باقی دو سو پونڈ امانت کے طور پر شیخ محمد ابراہیم کے پاس رکھ دیئے گئے۔ شیخ صاحب ان دنوں کوچہ حضرت شور بازار والے گھر سے علیحدہ ہو کر محلہ شہر آرا میں جو ایک زیادہ صحت افزا جگہ ہے، مولوی محمد علی قصوری، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے عزیز احمد کے ساتھ ایک باغ والے گھر میں رہا کرتے تھے۔ چند روز بعد ایک رات کو اس گھر میں چوری ہوئی اور یہ تمام روپیہ اور شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری کی قیمتی اشیاء چرائی گئیں۔ اس سے ان دو مشنوں کا بھیجنا دشوار ہو گیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ڈر ہوا کہ اس سے راجہ صاحب کہیں اس چوری کی واردات کو روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور نہ کریں۔ اس لئے باوجود اس کے کہ پولیس کی رپورٹ سے اس چوری کے سچ مچ واقع ہونے کی تائید اور تصدیق ہو گئی تھی پھر بھی قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے راجہ صاحب کو روپیہ کے ضائع ہونے کی خبر نہ دی اور مولوی عبدالرحیم عرف مولوی محمد بشیر صاحب سے جو اس وقت کابل میں جماعت مجاہدین کے نمائندے کے طور پر آئے ہوئے تھے سو پونڈ قرض لئے۔ یہ روپیہ ان کو تین سال بعد محمد علی مرزا کی طرف سے ادا کیا گیا (اس کا ذکر آئندہ مفصل آئے گا) اس رقم کے علاوہ سو پونڈ سردار نائب سلطنۃ سے حاصل کئے گئے اور اس طرح یہ دونوں مشن روانہ کر دیئے گئے۔ لیکن افسوس کہ دونوں مشن ناکام رہے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ روسیوں نے متھرا سنگھ اور شیخ عبدالقادر کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ متھرا سنگھ چونکہ اس سے پہلے ایک بم کیس کی وجہ سے پھانسی کی سزا پا چکا تھا اور انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر کابل آ گیا تھا اب ان کے قبضے میں آنے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ شیخ عبدالقادر مرحوم جنگ کے خاتمہ تک نظر بند رہے اور غالباً انہوں نے جیل ہی میں وفات پائی۔ دوسرا مشن مشہد میں روسیوں کے ہاتھ پڑا۔ انہوں نے عبدالباری اور شجاع اللہ کو بہت اذیتیں دیں اور اس کے بعد

ان کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے انگریزوں کے ہاتھ بھی بڑی سختیاں جھیلیں۔ آخر ان کو ہندوستان لے جایا گیا۔

انگریزوں نے، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کابل کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق اس طرح واقفیت حاصل کرنے پر، افغانی گورنمنٹ سے احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری کو مکتب حبیبیہ کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور ان کو کابل چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ عزیز احمد کو بھی مکتب حبیبیہ سے خارج کر دیا گیا جس کی وجہ سے اس کی تعلیم رک گئی اور اس کی ساری زندگی بیکار ہو گئی حالانکہ وہ لیاقت اور محنت کشی میں اپنے افغان ہم جماعتوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ وہ لوگ تو تعلیم پا کر آج اپنی حکومت میں قونصل جنرل، سفیر اور وزیر بنے ہوئے ہیں اور عزیز احمد جیسا جان نثار، ہونہار اور محنتی نوجوان نئی تعلیم نہ پانے کی وجہ سے بے کاری میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔

شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے اس کے بعد یاغستان (علاقہ سرحد آزاد) میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں جا کر مولوی محمد علی قصوری تو اس قسم کی سخت اور کٹھن زندگی کو برداشت نہ کر سکے اس لئے ہندوستان چلے گئے۔ شیخ محمد ابراہیم نے فیصلہ کیا کہ سرحد سے قطغن اور بدخشاں کے راستے روس جائیں۔ ان کے ساتھ حاجی ترنگزائی صاحب کا ایک مرید فضل محمود تھا۔ اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ راستہ میں شیخ صاحب ٹائفائیڈ کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ لیکن یہ شبہ بھی موجود ہے کہ راستہ میں ان کو انگریزوں کے آدمیوں نے مار ڈالا۔

اس زمانے میں مولوی بشیر صاحب کابل سے رخصت ہو رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے قبلہ مولانا صاحب کو کہا تا کہ اسمس کی جماعت مجاہدین میں ایک تازہ اور نئی روح پھونکیں۔ لیکن افسوس ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ان دونوں نوجوانوں کو وہاں بھیجنے کے باوجود بھی، وہ لکیر کے فقیر لوگ ایسے دقیانوسی خیالات کے ثابت ہوئے کہ عبدالرشید تو ان کے رئیس نعمت اللہ کی منافقت سے تنگ آگیا۔ اس کو شبہ ہوا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔ اس لئے اس نے ایک روز شام کو نعمت اللہ کو قتل کر دیا۔ اس کے محافظوں نے عبدالرشید کو زخمی کیا اور ابھی وہ جان ہی توڑ رہا تھا کہ اس کو تنور میں ڈال کر جلا دیا۔ مولوی محمد بشیر صاحب نے، مولوی فضل الٰہی کے اسمس میں ہجرت کر کے آنے پر، چمر کنڈ میں جو افغانی سرحد کے نزدیک علاقہ مہمند میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے

جماعت مجاہدین کا ایک دوسرا مرکز بنایا اور یہاں سے کچھ مدت محمد حسن یعقوب کی مدد سے سائیکلو سٹائل سے چھپا ہوا انگریزوں کا مخالف ایک ماہوار پرچہ بھی نکالا اور بعد میں وزیرستان کے علاقے میں محمد حسن یعقوب کی سرکردگی میں ایک مجاہدین کی ٹولی بنائی اور اس طرح پر انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اکسانے کی کوششیں کیں۔ لیکن یہ سب جدوجہد بے مائیگی کی وجہ سے ناکام رہی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی حجاز کو روانگی

ریشمی چٹھی

جن دنوں قبلہ مولانا صاحب مرحوم جاپان اور ترکی کو ... بھیجنے میں مصروف تھے۔ مولوی محمد میاں انصاری عرف منصور انصاری جو دیوبند سے حضرت شیخ الہند قبلہ مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ ہجرت کر کے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز چلے گئے تھے حجاز کے ترکی کمانڈر غالب پاشا کی چٹھی لے کر جس کو (غالب نامہ) کہا جاتا تھا اور جو حضرت شیخ الہند مرحوم کی تجویز پر مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، ہندوستان اور وہاں سے کابل پہنچے تھے۔ حضرت شیخ الہند اپنے زمانے میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کے روح رواں تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے نئے تعلیم یافتہ لیڈروں مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے [illegible] کارروائی کے بارے میں گفتگو کر کے بڑی دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کا نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے گفتگو کرنا ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک آزادی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے جیسی کہ سرسید احمد خاں مرحوم کی دور اندیشی رکھتی ہے۔ جنہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال کر ہندوستانی مسلمانوں میں نئی تعلیم کو رواج دیا اور ان کو اس ہولناک قعر ذلت سے بچایا جس کے کنارے پر وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہند کی ناکامی کی وجہ سے ہندوستانی ... اخلاقی طاقت کے ٹوٹنے کے بعد پہنچ چکے تھے۔ حضرت شیخ الہند مرحوم ... میں غالب پاشا سے ملے اور ان سے غالب نامہ لے کر اس کو مولوی محمد میاں انصاری کو دیا کہ اس کو ہندوستان لے

ساتواں باب

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی حجاز کو روانگی

ریشمی چٹھی

جن دنوں قبلہ مولانا صاحب مرحوم جاپان اور ترکی کو مشن بھیجنے میں مصروف تھے، مولوی محمد میاں انصاری عرف منصور انصاری جو دیوبند سے حضرت شیخ الہند قبلہ مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ ہجرت کر کے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز چلے گئے تھے حجاز کے ترکی کمانڈر غالب پاشا کی چٹھی لے کر جس کو (غالب نامہ) کہا جاتا تھا اور جو حضرت شیخ الہند مرحوم کی تجویز پر، مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، ہندوستان اور وہاں سے کابل پہنچے تھے۔ حضرت شیخ الہند اپنے زمانے میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کے روح رواں تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے تعلیم یافتہ لیڈروں مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے متحد کارروائی کے بارے میں سمجھوتا کر کے بڑی دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کا نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے سمجھوتا کرنا، ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک آزادی میں ایسی ہی اہمیت رکھتا ہے جیسی کہ سرسید احمد خاں مرحوم کی دور اندیشی رکھتی ہے، جنہوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال کر ہندوستانی مسلمانوں میں نئی تعلیم کو رواج دیا اور ان کو اس ہولناک قعر مذلت سے بچایا جس کے کنارے پر وہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی ہند کی ناکامی کی وجہ سے ہندوستان سے اسلامی سلطنت کے مٹنے کے بعد پہنچ چکے تھے۔ حضرت شیخ الہند مرحوم مکہ معظمہ میں غالب پاشا سے ملے اور ان سے غالب نامہ لکھوا کر اس کو مولوی محمد میاں انصاری کو دیا کہ اس کو ہندوستان لے

جائیں، انہوں نے یہ خط ایک آئینہ کے ڈھکنے کے پیچھے چھپا کر اپنی بیوی کو دے دیا۔ وہ چونکہ پردہ پوش تھیں ان کی بندرگاہ پر ہندوستان میں تلاشی نہ لی گئی اور یہ چٹھی حفاظت سے ہندوستان پہنچی۔ وہاں اس کو لیڈروں اور سرکردوں کو دکھلایا گیا اور پھر کابل لایا گیا۔

جنود اللہ کی تشکیل

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے قیام کابل کے زمانے کا وہ حصہ جو انہوں نے کوچہ حضرت واقع شور بازار والے گھر میں رہ کر گزارا تھا غالباً ان کی افغانستان میں بسر کردہ زندگی کا سب سے زیادہ ثمردار حصہ تھا۔ انہوں نے اسی گلی میں رہتے ہوئے "جنود اللہ" کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان لیڈروں اور کارکنوں کو کرسچین سالویشن آرمی (Christian salvation Army,) کی طرح ایک نیم فوجی نظام میں منسلک کر کے ان کو عالم اسلام کی بہبودی کے لئے اعزازی طور پر اور بلا تنخواہ کام کرنے والے رضا کاروں کی حیثیت سے کام پر لگایا جائے۔ اس تنظیم کے سالار اعظم قبلہ مولانا محمود الحسن شیخ الہند مرحوم تھے۔ دوسرے لیڈر حسب مراتب جنرل، لیفٹیننٹ جنرل، میجر جنرل، بریگیڈیئر، کرنل لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے رکھتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی اس میں مختلف عہدے دیئے گئے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم ہم میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیتے اور نصیحت کیا کرتے تھے اور ہر ایک کو آئندہ اسلامی ممالک کی اقتصادیات اور مالی حالت کو درست کرنے کے لئے کس طرح اور کہاں کہاں کام کرنا چاہئے اس کے بارے میں راستہ بتایا کرتے تھے۔

ان منصوبوں کا تعلق ایران، ترکی اور عرب سے تھا۔ مثلاً مجھے اور محمد حسن یعقوب کو، اس کام کو اپنے ذمے لینے پر تیار کر رہے تھے کہ ہم حجاز جا کر آہستہ آہستہ ایک ایسی تنظیم (Organisation) بنائیں جو حج کے موقع پر ذبح شدہ بھیڑ اور بکریوں اور اونٹوں کی کھالوں کو جمع کر کے ان سے دباغت خانہ (Tannery) میں مختلف قسم کے چمڑے بنائے اور ان کو اسلامی ممالک کو برآمد کرے۔ اس کے لئے حجاز میں بین الاسلامی کمپنی قائم کی جائے جو کھالوں کو صاف کر کے ان سے چمڑا بنائے۔ اس کام کے لئے مالی ذرائع بہم پہنچانے والے ایک

بین الاسلامی بنک کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کاموں کے لئے سرمایہ بہم پہنچائے۔ آہستہ آہستہ یہ کمپنی اتنی بڑھ جائے کہ چمڑے کی مصنوعات بنانا شروع کر دے اور ان کو برآمد کرنے کے لئے رفتہ رفتہ خود اپنے تجارتی جہازوں سے کام لینے لگے۔ اس کام کی ابتدا ہم حجاز جا کر، وہاں آنے والے حاجیوں سے مل کر اور ان کو یہ منصوبہ سمجھا کر، ان کا تعاون حاصل کر کے سرانجام دینے والے تھے۔ یہ منصوبہ اتنا عظیم الشان تھا اور اس کے لئے اتنی ہمت اور جانفشانی کی ضرورت تھی کہ ہم دونوں اپنے کو اس بار کے اٹھانے کے لئے کافی تنومند نہ سمجھتے تھے۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی تلقینات اور ہدایات نے ہمیں ایسی جرات دلا دی تھی کہ اگر افغانی گورنمنٹ ہم کو اس وقت اجازت دے دیتی تو افغانستان سے حجاز کو خشکی کے راستے روانہ ہو جاتے تاکہ اس کار خیر کو شروع کرنے کے لئے مسلمان مالداروں کو آمادہ کریں۔

میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ایسے ہی مختلف منصوبے بتائے گئے تھے لیکن چونکہ ہر ایک کا کام دوسروں سے بالکل خفیہ رکھا جاتا تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کے منصوبے سے واقف نہ ہوتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ ساز گار نہ ہو سکا۔ چند ماہ بعد جب ترکی جرمن مشن کی ناکامی پر راجہ مہندر پرتاپ افغانستان سے چلے گئے تو افغانی حکومت نے ہم پر اور سخت پابندیاں لگا کر ہم کو پھر نظر بندی میں ڈال دیا اور ہم کو لوگوں سے ملنے جلنے سے منع کر دیا۔ عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یاغستان میں جماعت مجاہدین میں چلے گئے اور ہم باقی لوگ کابل میں نظر بند کر دیئے گئے۔ راجہ مہندر پرتاپ نے کابل سے روانہ ہونے سے پہلے، اپنے بھائی سے جو سوئٹزر لینڈ میں تھا ہندوستان کے راستہ خط و کتابت کرنی چاہی اور اس کے لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے مدد مانگی۔ اس پر قبلہ مولانا مرحوم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو جو ہندوستان سے براہ قندھار ان کے ساتھ کابل آیا تھا، اس کام پر مقرر کیا۔ وہ راجہ صاحب کے خطوط لے کر خفیہ طور پر ہندوستان گیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اور اپنی جان پر کھیل کر، یہ خطوط ان کے گھر واقع ہاترس (بنارس) پہنچا دیئے، اور وہاں سے ان کی رسید لے کر واپس کابل آ گیا۔ لیکن راجہ صاحب اس وقت کابل چھوڑ چکے تھے۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ان کو شہر مزار شریف واقع شمالی افغانستان میں، یہ اطلاع بھیج دی کہ ان کے خطوط خیریت سے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

ریشمی چٹھی

انہی دنوں میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنی کابل کی کارروائیوں کی اطلاع حضرت شیخ الہند کو دینا چاہی۔ یہ سب خبریں اور رپورٹیں ریشمی کپڑے پر لکھی گئیں اور ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو، ان کے ہندوستان لے جانے کے لئے اور شیخ عبدالرحیم صاحب حیدر آبادی کو سندھ میں دینے کے لئے ہمارے ساتھیوں میں سے، اللہ نواز خان کے باپ رب نواز خان کا پروردہ شیخ عبدالحق نام ایک نومسلم انتخاب کیا گیا۔ یہ رپورٹ کسی معتبر حاجی کے ذریعہ شیخ عبدالرحیم صاحب کی طرف سے حجاز میں حضرت شیخ الہند کو بھیجی جانے والی تھی۔ اگر اس کام کے لئے کوئی قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو خود شیخ عبدالرحیم کو حجاز جانے کے لئے کہا گیا تھا۔

عبدالحق سندھ جاتا ہوا، اپنے گھر جانے کے لئے ملتان میں ریل سے اترا اور اللہ نواز خان کے والد خان بہادر رب نواز خان سے ملا۔ اس نے عبدالحق سے ضرور اس کے آنے کا سبب پوچھا ہو گا، جس پر اس نے یہ چٹھیاں اس کو دے دی ہوں گی۔ رب نواز کے ہاتھ یہ چٹھیاں آتے ہی اس نے اپنی گورنمنٹ پرستی کا ثبوت دینے کے لئے یہ خطوط گورنمنٹ کو دے دیئے۔ جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت سی گرفتاریاں ہوئیں اور یہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔ عبدالحق کو اس کے صلے میں پولیس میں نوکری ملی اور خان بہادر کو مربعے دے دیئے گئے۔ یہ بات ابھی تک پوری طرح ثابت نہ ہو سکی کہ عبدالحق ہمارے ساتھ شروع ہی سے ایک انگریزی جاسوس کے طور پر آیا تھا یا اس کو رب نواز نے ہندوستان آنے پر، ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر ورغلایا تھا۔ رولٹ رپورٹ (Rowlatt Report) میں اس ریشمی چٹھی والی سازش کا ذکر صفحہ ۷۸ پر آتا ہے۔ عبدالحق کے ہمارے ساتھ ایک انگریزی جاسوس کے طور پر آنے کے بارے میں ہمارے ہاتھ میں کوئی قطعی اور مکمل دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا شبہ ضرور موجود ہے کہ کابل آنے کے بعد اللہ نواز خاں کا بھائی شاہ نواز کبھی کبھار سیر پر جاتے ہوئے افغانی پہرہ دار کو رشوت وغیرہ دے کر اپنے سے دور کرنے کے بعد انگریزی قونصل خانے کے عملے سے خفیہ طور پر ملا کرتا تھا۔ اس کا علم اللہ نواز کو قطعی طور پر تھا یا نہ تھا، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ عبدالحق کے کابل سے روانہ ہونے کے وقت، اللہ نواز اور شاہ نواز نے اس کو کہا ہو کہ سندھ جاتا ہوا ملتان سے گزرے اور ان کے والد سے ملے۔ یہ ملاقات صرف

ہجراں دیدہ رشتہ داروں کی تسلی کے لئے تھی یا حقیقتاً اس کا مقصد ریشمی چٹھی کو رب نواز تک پہنچانے یا اس چٹھی کے اس تک پہنچنے کے لئے راستہ صاف کرنا تھا، یہاں یقینی طور پر نہیں لکھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے عبدالحق کو اپنے گھر، صرف اپنی خیریت کی خبر پہنچانے کے لئے بھیجا ہو۔ یہ ان کے لئے ایک قدرتی حرکت تھی اور طبیعت بشری کا تقاضا بھی تھا۔ شائد وہاں جا کر اور رب نواز سے ملنے پر، عبدالحق نے کابل کے حالات اس کو بتا دیئے ہوں اور اس نے اس سے ہندوستان آنے کا اصلی مقصد پوچھا ہو، اور لالچ یا دھمکی دے کر اس سے یہ راز معلوم کر لیا ہو۔ گمان ایسا ہے کہ شاہ نواز ضرور انگریزی قونصل خانہ کے عملے سے مل گیا تھا۔ چنانچہ وہ جب ایک سال کے بعد یاغستان کے راستے ہندوستان واپس چلا گیا تو اس کو نہ انگریزوں نے نظر بند کیا نہ ہی کوئی اور سزا دی بلکہ اس کو محکمہ ریلوے میں ایک ملازمت دے دی۔ اللہ نواز خان بھی سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کے کابل کا بادشاہ بننے پر، ہندوستان کے راستے آزادی سے یورپ آنے جانے لگ گیا تھا، غالباً اس کے باپ کی انگریز پرستی کے صلہ میں اس کو یہ آسانیاں مل گئی تھیں۔

ہماری دوسری نظر بندی

راجہ مہندر پرتاپ کے کابل سے چلے جانے پر ان کا مشن بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد افغانی گورنمنٹ نے ہم پر جو پابندیاں لگائیں ان کے سلسلہ میں یہ بھی کیا کہ ہم کو کوچہ حضرت شور بازار والے گھر سے نکال کر، شہر سے باہر باغ بالا کے نزدیک ناظر محمد صفر نام گورنر قطغن بدخشاں کے قلعہ چہ (چھوٹے قلعہ کی مانند گھر) میں نظر بند کر دیا۔ جہاں سے کبھی اپنے پرائے شخص کا بھی گزر نہ ہو سکتا تھا، وہاں تک پہنچ کر کسی کا ہم سے ملنا تو بالکل ہی خارج از امکان تھا۔ ناظر محمد صفر سردار نصراللہ خان نائب السلطنتہ کا قابل اعتماد آدمی تھا۔ اس کا لڑکا محمد اختر (امین الاطلاعات) کا عہدہ رکھتا تھا۔ یعنی سردار نائب السلطنتہ کی C.I.D کا ہیڈ head تھا۔ اس قلعہ چہ کے برج میں سب سے اوپر کی منزل کا کمرہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو دیا گیا تھا۔ نیچے کی منزل کے کمروں میں ہم لاہوری طلباء رہا کرتے تھے۔ پشاوری اور کوہاٹی مہاجر ہم سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ اس گھر سے ہمارے فرار کو روکنے کے لئے افغانی سپاہیوں نے ہر طرح کی

تدبیریں سوچیں۔ یہ گھر انگوروں کے باغ کے اندر تھا اور باغ اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ گھر کے دروازے تک پہنچنے کے لئے ایک ٹیلے پر چڑھنا پڑتا تھا۔ کھڑکیاں بھی زمین سے بہت اونچی تھیں۔ دروازے پر ہمیشہ سنتری کھڑا رہتا تھا۔ اس لئے یہاں سے بھاگنا سخت مشکل تھا۔ اس کے باوجود بھی افغانی سپاہی گھر کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کو دکھلا کر اور "اگر کیفیت ازیں سو آمد چہ میکنیم" (یعنی فرار کا واقعہ اس طرف سے ہوا تو ہم کیا کریں گے) کہہ کر ایک دوسرے کو چوکنا رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

اس گھر میں رہتے ہوئے، میں اور خوشی محمد زیادہ تر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لئے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کرنے میں یا اس کا خلاصہ ان کو سنانے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتاب انگلستان کے قانون اساسی یا آئین Constitution کے بارے میں تھی۔ قبلہ صاحب مرحوم ہندوستان کے مستقبل طرز حکومت کے بارے میں جو کچھ تصورات رکھتے تھے، ان کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انگریزی حکومت کے نظام اور پارلیمنٹری ادارے کے بارے میں پوری واقفیت پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کو امید تھی کہ ایک روز حکومت موقتہ ہند کی تجویز کے مطابق ہندوستان افغانستان کی مدد سے آزاد ہو جائے گا اور دہلی میں ایک افغانی شہزادہ (قانونی بادشاہ) Constitutional monarch کے طور پر حکمران ہو گا اور اس کی حکومت انگریزی گورنمنٹ کی طرح ایک آئینی حکومت ہوگی۔ حکومت موقتہ ہند کی ایک شاخ Branch ماوراء سندھ Trans—Indus ہوگی جس کے ماتحت صوبہ سرحد، سندھ بلوچستان سرحد آزاد ہندوکش پہاڑ تک کا علاقہ ہو گا۔

میری معلمی کی ابتداء

اس گھر میں رہتے ہوئے میری معلمی کا دور شروع ہوا۔ محمد اختر نے اپنے دفتر کے ایک نوجوان کلرک کے ساتھ جس کا نام میر غلام محمد تھا اور جو بعد میں افغانی سفارت متعینہ پیرس کا سیکرٹری بنا اور جس نے غبار کا تخلص لے کر افغانستان میں فارسی شاعری میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی اور جو موجودہ حکومت کے زیر عتاب ہونے کی وجہ سے قید میں پڑا ہوا ہے، مجھ سے انگریزی پڑھنا شروع کی۔ چونکہ قلعہ چہ اس کے دفتر سے بہت دور تھا۔ اس لئے محمد اختر میری

سواری کے لئے ہفتہ میں تین دفعہ اپنا گھوڑا سائیس کے ہاتھ بھیجا کرتا تھا۔ انگریزی سبقوں کے درمیان میں مجھے معلوم ہوا کہ محمد اختر اور اس کے کلرک دونوں کی تعلیم بہت کم ہے۔ یہاں تک کہ وہ فارسی کی گرائمر (صرف و نحو) سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ "اندھوں میں کانا راجہ" اس زمانے میں افغانستان کے باشندے اور ان کا حکمران طبقہ اس ضرب المثل کا مصداق تھا۔ لوگ ان پڑھ اور پس ماندہ تھے، اس وقت جس کو ذرا لکھنا پڑھنا آتا تھا وہی بر سرکار ہو جاتا تھا۔ حکومت میں نالائق آدمی بھی داخل تھے اور کوئی نہ پوچھتا تھا کہ کس قابلیت کی بنیاد پر وہ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ہیں۔ موجودہ افغانستان میں بھی گریجویٹ اور ڈگری، Degree یافتہ اعلیٰ افسر ابھی تک بہت کم ہیں۔

سنہ ۱۷۔ ۱۹۱۶ء کی سردی کے دنوں میں ہمیں پھر شہر میں منتقل کر دیا گیا اور ایک چھوٹا سا گھر ہماری رہائش کے لئے مقرر ہوا جس میں پشاوری اور کوہاٹی مہاجر بھی آ گئے۔ اس گھر میں رہتے ہوئے ہم پر ایسی تہمت لگائی گئی کہ اگر خدا کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہوتا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم ہماری مدد نہ کرتے تو ہم سب افغانی قید خانے میں پڑ جاتے اور شائد وہیں مر جاتے۔ ہم سے پہلے مولوی عبدالغنی اور ان کے بھائی چراغ دین، مولوی محمد حسین علیگ اور ان کے ساتھی ایک معمولی الزام میں امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں سال ہا سال قید رہے تھے۔

تہمت کا واقعہ اس طرح ہوا کہ ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ کا بھائی عبدالرحمن، جو ہمارے بعد ہندوستان سے نکل کر ہمارے پاس پہنچا تھا اور ایک عجیب طبیعت کا لڑکا تھا، اس کی قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے محمد علی سے نہیں بنتی تھی۔ ایک روز محمد علی جس پر ہماری طرح پہرہ نہیں تھا اور جو آزادی سے گلی اور بازار میں آ جا سکتا تھا، شاہی محل (ارگ) کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس کو اجنبی سمجھ کر ایک سپاہی نے پکڑا اور اس کو کوتوالی لے گیا۔ وہاں اس نے اپنے بیانات میں بتایا کہ وہ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم کا بھتیجا ہے۔ اس پر اس کو اس وقت چھوڑ دیا گیا لیکن بعد میں وہ بھی ہماری طرح نظر بندی میں رکھ دیا گیا۔ اس پر عبدالرحمن نے ایک عرضی لکھ کر سردار محمد نادر خان مرحوم کے دربار میں پیش کی جس میں لکھا کہ محمد علی امیر حبیب اللہ خان کو مارنے کے لئے (ارگ) کے نزدیک پھرنے گیا تھا، اور باقی لاہوری مہاجر بھی اس کے شریک جرم ہیں۔ اس پر ہم کو سردار محمد نادر خان مرحوم کے دربار میں حاضر ہونا پڑا۔

اس زمانے میں افغانی شہزادوں کے سوا جن کو عدالتی اختیار حاصل تھے، سردار محمد نادر خان مرحوم کو بھی دربار کرنے اور فوجی معاملات کے علاوہ بعض جرائم کے مقدمے سننے کے اختیارات ملے ہوئے تھے۔ ایک دو پیشیوں میں تو ہمارے مقدمے کی سماعت نہ ہو سکی۔ آخر تیسری پیشی میں دوپہر کے نزدیک اس کی عرضی کے پڑھے جانے کی نوبت آئی تو سردار محمد نادر خان مرحوم نے حکم دیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد اس مقدمے پر غور کیا جائے گا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ان پیشیوں میں ہمارے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس روز دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے دربار ہی نہ کیا اور اس عرضی کو کھٹائی میں ڈال دیا اور بعد میں اس کو پھڑوا دیا۔ ان کے اس احسان کو ہم ساری عمر نہیں بھول سکتے کیونکہ اگر اس عرضی پر کوئی کارروائی کی جاتی یا اس کو وہ امیر صاحب کے دربار میں بھیج دیتے تو ضرور تھا کہ ہم کو کم از کم عمر قید کی سزا تو ضرور مل جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ عبدالرحمن نے یہ عرضی سردار معین السلطنتہ یا سردار نائب السلطنتہ یا سردار عین الدولہ کے دربار میں نہ دی تھی۔ وہ اگر ایسا کرتا تو ہماری جانوں کا بچنا سخت مشکل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان شہزادوں کے دربار میں آسانی سے نہیں پہنچ سکا یا اس کے سپاہی نے جو اس کو بازار لے گیا اس کو کہا کہ سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو اپنی عرضی دے جو اس کو امیر حبیب اللہ خان کے دربار میں بھیج دیں گے۔

ہم اسی گھر میں رہتے تھے کہ جون ۱۹۱۷ء میں سید علی عباس بخاری پشاور سے ہجرت کر کے کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پشاور میں انگریزوں سے مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے قوم پرست جذبات کے سبب سے بہت قابل قدر ہستی مانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر سے ان کا تعلق تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے وہ دہلی میں ملے تھے۔ کابل آنے پر امیر حبیب اللہ نے ان کو نظر بند کر دیا۔ ان کی نظر بندی ہماری نظر بندی کی نسبت بہت سخت تھی۔ وہ بالکل اکیلے ایک گھر میں رہتے تھے اور ان کو بازار جانے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی ان کے گھر جا کر ان سے مل سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے انگریزوں کے اشارے پر ان کو اتنی سخت نظر بندی میں ڈالا تھا۔ ہم نے ایک دو دفعہ اپنے پہرہ داروں کو رشوت دے کر اور ان کے مہمان دار مرزا کو پھسلا کر ان سے ملاقات کی۔ اس قید تنہائی کی وجہ سے ان کے حواس مختل ہونے لگے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ایک دفعہ ان سے ملنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جس سے ان کو بہت تسلی

ہوئی تھی۔ وہ بہت ایماندار، اسلام کے دردمند شیدا تھے اور ایک حساس شخصیت رکھتے تھے۔ عالم اسلام کی حالت اور ترکی جنگ کی رفتار سے ان کو بہت صدمہ ہوتا تھا۔ ان جیسی قابل قدر ہستی کا اس طرح مخبوط الحواس ہو کر بے کار ہونے کا گناہ امیر حبیب اللہ خان کی گردن پر رہے گا۔

اس گھر میں گرمی کے دنوں میں رہنا سخت دشوار تھا۔ اس لئے سپہ سالار سردار محمد نادر خان مرحوم نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے اپنی عقیدت کی وجہ سے ہم سب کے لئے شہر کے باہر درختوں کے نیچے ایک باغ میں جو چڑیا گھر کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، اور جہاں پنجروں کے اندر ایک شیر ببر اور چند ایک درندے رہتے تھے سنہ ۱۹۱۷ء میں خیمے لگوا دیئے۔ ہم یہاں چند ایک مہینے رہے۔ اس عرصہ میں بقرعید بھی آئی اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ملنے اور عید مبارکی دینے کے لئے آئے۔ اس ملاقات کے دوران میں انہوں نے شیر ببر کی طرف اشارہ کر کے قبلہ مولانا مرحوم کو کہا۔ ”اس باغ میں دو شیر رہتے ہیں“۔

یہاں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ایک پورا خیمہ ملا ہوا تھا اور ہم لوگوں میں سے دو دو آدمی ایک خیمہ میں رہتے تھے۔ میں خوشی محمد کے ساتھ ایک ہی خیمہ میں سویا کرتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے خوشی محمد کا وہ روپیہ جو اس کو ہماری مشترک پونجی کے آپس میں مساوی طور پر تقسیم کے بعد اس کو ملا تھا، ختم ہو گیا تھا۔ میں نے چونکہ اپنے حصے کو ذرا احتیاط سے صرف کیا تھا اس لئے میرے پاس کچھ چھوٹی سی رقم موجود تھی۔ خوشی محمد کو اپنی بے مائیگی کی وجہ سے ذرا مایوسی ہوئی۔ اس لئے میں نے اس سے کہا کہ ”جو کچھ میرے پاس ہے وہ اب ہمارا مشترک مال ہو گا اور ہم اس کو مل کر خرچ کریں گے“۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا اور اس کی ڈھارس بندھ گئی۔

اللہ نواز کی قید

ہماری یہاں کی رہائش کے زمانے میں دو افسوسناک واقعات ہوئے۔ ان میں سے ایک واقعہ کی وجہ سے ہم سب کی بہت بے عزتی ہوئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک روز دوپہر سے پہلے اللہ نواز نے بازار جانا چاہا۔ اس نے ایک سپاہی کو اس کے ساتھ بھیجنے کے لئے حوالدار کو کہا، حوالدار نے اس کو کچھ گستاخی سے جواب دیا۔ اس پر اللہ نواز نے اس کو پیٹا جس سے اس کی آنکھ پر زخم آ

گیا۔ اس نے فوراً حکومت سے شکایت کی کہ ہندوستانی مہاجروں نے ان کو مارا۔ حالانکہ وہ ایک افغانی عہدہ دار ہے۔ اگلے روز یہ مقدمہ سردار عنائت اللہ خان معین السلطنۃ کے دربار میں پیش ہوا۔ ہم سب کو بحیثیت مجرم کچہری میں بلایا گیا۔ اس واقعہ میں اگر کسی کا قصور تھا تو صرف اللہ نواز کا تھا۔ ہم سب کو خاص کر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ایک مجرم کی طرح کچہری میں بلانا بالکل بے معنی تھا۔ دوپہر تک ہم نے پیشی کا انتظار کیا۔ آخر ہماری باری آئی اور مقدمہ سنا گیا۔ سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم بحیثیت کمانڈر اعلیٰ فوج افغانستان اس مقدمے کی سماعت کے وقت دربار میں موجود تھے لیکن انہوں نے اپنے سپاہی کی حمایت کی بجائے ہماری طرف داری کی۔ مگر معین السلطنۃ نے ان کو بولنے نہ دیا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آ پہنچا تھا اس لئے کچہری بند ہو گئی اور وہاں ہی بغیر کھانے پینے کے دوسری پیشی کے انتظار میں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے۔ دوپہر کے بعد پھر دربار لگا تو معین السلطنۃ نے بہت غصے سے کہا۔ در ملک ما مہمان خر صاحب خانہ میباشد، ادہر طوریکہ بخواہد اورا می راند۔ ایں مہمانہا سپاہی ما را زخمی کردہ اند۔ زخمی کہ بر چشم سپاہی ما است بر دل ما ست ایں آدم را بگیرید و بندی اش بجنید " (یعنی ہمارے ملک میں مہمان کو میزبان کا گدھا مانا جاتا ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے ہانک سکتا ہے۔ چونکہ اس مہمان نے ہمارے سپاہی کو زخمی کیا ہے۔ ہمارے سپاہی کی آنکھ پر جو زخم لگا ہے وہ ہمارے دل پر لگے ہوئے زخم کی مانند ہے۔ اس آدمی کو پکڑو اور قید میں ڈال دو)

اس مقدمے میں ہم میں سے کسی کو بولنے اور مدافعہ کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ سارے اسلامی ملکوں میں مہمان کی قدر و منزلت بہت اونچی مانی جاتی ہے لیکن افغانستان میں اس کو صاحب خانہ کا گدھا بنا دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے اور اس فیصلے کے سننے سے ہم سب بہت رنجیدہ ہوئے۔ اللہ نواز کو یہاں سے سپاہی کابل کے قید خانہ میں جہاں قاتل، ڈاکو اور چور بھی قید تھے، لے گئے۔ اس کے دو دن بعد مولانا صاحب مرحوم نے کوتوال شہر کو خط لکھا اور ہم سب نے مل کر ایک عرضی دی اور اللہ نواز کے لئے معافی اور شفاعت چاہی اور وعدہ کیا کہ پھر کبھی ایسی واردات نہ ہو گی۔

اللہ نواز خان چھ روز کی قید کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اگر قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ہم سب مل کر اس طرح کی عرضی نہ دیتے تو ممکن تھا کہ اللہ نواز خان سالہا سال اسی قید خانہ میں پڑا رہتا۔

کیونکہ اس زمانے میں افغانستان میں نہ باقاعدہ عدالتیں تھیں نہ باقاعدہ جج تھے کہ ملزموں کے مقدموں کی سماعت کریں۔ نہ ہی وکیل اور بیرسٹر تھے کہ ملزموں کا مدافعہ کریں۔ وہاں اس وقت ایسا اندھیر کھاتہ مچا ہوا تھا کہ قیدیوں کی پیشی کی نوبت بڑی مشکل اور دیر سے آتی تھی اور عام طور پر اس کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور رشوت دینی پڑتی تھی۔ اس افراتفری کے بارے میں، ایک مثال دینے کے لئے میں یہاں ایک واقعہ لکھتا ہوں جو کابل میں اس وقت ایک کہاوت کے طور پر زبان زد عام تھا اور جو اس کی بھی دلیل ہے کہ افغانستان کا حکمران طبقہ، علاقہ ہزارہ جات کے باشندوں کے ساتھ جن کو (ہزارے) کہتے ہیں جو مغل نسل کے شیعہ ہیں جو باقی افغان آبادی کی نسبت زیادہ غریب اور عام طور پر مزدور پیشہ ہیں، کیسا برا سلوک کرتا ہے اور ان کو کیوں کر ہر طرح کے حقوق سے محروم رکھتا ہے۔ ہم کو یہ واقعہ اس طرح پر سنایا گیا تھا۔

"ایک دن سات قیدی اسی قید خانے میں امیر صاحب کے دربار میں پیشی کے لئے سپاہیوں کی طرف سے نکالے گئے۔ یہ لوگ شہر کے کوچوں میں سے گزر کر بازار پل خشتی میں آئے۔ یہاں کی بھیڑ بھاڑ سے فائدہ اٹھا کر ایک قیدی نے سپاہیوں کے ہاتھ سے اپنے کو چھڑایا اور بازار کے جم غفیر میں مل کر، سپاہیوں کی آنکھ سے اوجھل ہوا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ پل خشتی سے گزرنے کے بعد سپاہیوں نے قیدیوں کا جائزہ لیا تو ان کو معلوم ہوا کہ ایک قیدی کم ہے۔ اس سے وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کو ڈر لگا کہ وہ اس مفرور قیدی کی بجائے قید خانہ میں پڑیں گے۔ اس پر انہوں نے وہاں کے لوگوں کو گھیر لیا اور قیدیوں کو پھر گننا شروع کیا۔

"یک، دو، سہ، چہار، پنج، شش" (ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ) اور اس کے فوراً بعد ہی گھرے ہوئے آدمیوں میں سے ایک ہزارے کو پکڑا اور قیدیوں کی طرف اس کو دھکیل کر کہا "این ہفت" (یعنی یہ ہے ساتواں) وہ بیچارہ چیختا چلاتا رہا لیکن سپاہیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کو ہتھکڑی لگا کر کچہری میں پیش کر دیا۔"

سرحدی علاقوں میں سے گزرتے ہوئے ہم نے سرحدی پٹھانوں کی مہمان نوازی خوب دیکھی تھی۔ حالانکہ آج افغانی حکومت جو ان کے افغانی قوم کا ایک جزو ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، اس کا اس زمانے کا ایک سردار اور ولی عہد سلطنت معین السلطنۃ بڑے فخر سے سر دربار ایک افغانی ضرب المثل کو دہراتا ہے اور مہمان کو میزبان کا گدھا بناتا ہے۔ قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ سرحدی پٹھان اور افغانستان کے حکمران افغان، جب ایسا جدا جدا کیرکٹر رکھتے ہوں تو ان کو کیسے ایک قوم کے دو حصے مانا جا سکتا ہے۔

عبداللہ کا فرار

اس چڑیا گھر کے باغ میں رہتے ہوئے ہم پر جو دوسری مصیبت آئی وہ یہ تھی کہ ہمارے ساتھیوں میں سے عبداللہ اور اس کا بھائی عبدالرحمٰن اور اللہ نواز خان کا بھائی شاہ نواز فرار ہو گئے۔ انہوں نے پشتو زبان سیکھ لی تھی اور پہرہ داروں سے اپنا میل جول بہت بڑھا لیا تھا۔ ان کو اتنا یقین دلایا تھا کہ اگر وہ ایک دو گھنٹے باغ سے باہر جا کر درختوں کے نیچے اور کھیتوں میں جا کر بیٹھ جائیں تو سپاہی ان کو کچھ نہ کہتے تھے۔ انہی دنوں میں جماعت مجاہدین کا ایک وفد بھی اپنا سالانہ وظیفہ لینے کو کابل آیا ہوا تھا۔ ان تینوں نے ان سے بھی گہرے تعلقات پیدا کئے اور ان کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ یاغستان لے جانے کے لئے افغانستان کی سرحد سے خفیہ طور پر گزار دیں۔ روانگی کے مقررہ دن انہوں نے پہرہ داروں کو کہہ دیا کہ وہ سارا دن باغ سے باہر درختوں کے نیچے رہیں گے۔ سپاہیوں کو تو ان پر بھروسہ تھا ہی، انہوں نے ان کی تلاش نہ کی اور وہ صبح سویرے ہی مجاہدین کے نمائندے کے ساتھ نکل گئے اور سارا دن اور اگلی رات راستہ چلتے رہے۔ جب اگلے دن سپاہیوں نے ان کو باغ میں نہ دیکھا، اس وقت تک وہ جلال آباد کا راستہ آدھا کاٹ چکے تھے۔ جب تک کہ پولیس والے جلال آباد کے حکام کو خبر دیتے وہ وہاں سے بھی گزر گئے اور جماعت مجاہدین کے مرکز چرکنڈ واقع علاقہ آزاد میں پہنچ گئے۔

اس فرار کی وجہ سے ہم پر اور بھی زیادہ پابندیاں لگ گئیں۔ ہماری نظر بندی سخت تر ہو گئی اور ہمیں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قسم کے فرار کی وارداتوں کا آئندہ سد باب کرنے کے لئے ہم کو پھر شہر میں منتقل کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۔۱۹۱۷ء کی سردیاں بھی آ رہی تھیں اور سردیوں میں ہمارے لئے خیموں میں رہنا بھی ناممکن تھا۔ اس دفعہ ہم کو کوچہ تیلیان میں ایک گھر دیا گیا جہاں ایک زمانے میں حافظ احمد دین ہیڈ ماسٹر حبیبیہ سکول رہا کرتے تھے۔ یہ گھر تو اچھا تھا لیکن اس کی گلی بڑی تنگ اور گندی تھی۔ اس گھر کے سراچہ (مردانہ حصہ) میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور عزیز احمد رہتے تھے اور اندرونی (زنانہ حصہ) میں ہم اور پشاوری اور کوہاٹی مہاجر جاگزین تھے۔ نیچے کی منزل میں ایک کوٹھڑی میں پہرہ دار اور دروازہ پر ایک سنتری رہا کرتا تھا۔ گلی اور بازار کو جانے پر، ایک افغانی سپاہی حسبِ سابق ہمارے ساتھ جایا کرتا تھا جو ہمیں کسی سے بات کرنے کی اجازت تک نہ دیتا تھا۔ کوچہ حضرت میں بھی بازار جاتے ہوئے ہمارے ساتھ

سپاہی ہوا کرتا تھا لیکن اتنی سختی نہ کیا کرتا تھا۔ بلکہ ضرورت کے وقت ہم کو کام میں مدد بھی دیتا تھا۔

اس گھر میں رہتے ہوئے بھی میں نے درس قرآن شریف جاری رکھا اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پڑھائے ہوئے سبقوں کے نوٹ لکھتا رہا۔ اس کے سوا میرا باقی وقت دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گزرتا تھا جو عام طور پر شطرنج اور تاش کھیلا کرتے تھے۔

یہاں رہتے ہوئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم نے اپنے بڑے بیٹے محمد طاہر جان کی تعلیم کے لئے ایک شخص مانگا۔ اس پر انہوں نے مجھے اس کام پر مقرر کیا۔ میں ہر روز سپاہی کے ساتھ شام کو ان کے سراچہ کو جا کر اس لڑکے کو جو اپنے ہندوستانی مسلمان اتالیق (لالا) کی نگرانی میں رہتا تھا، مدرسے کے دیئے ہوئے کام میں، خاص کر حساب کے سوالوں کے حل کرنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس طرح پر میرے تعلقات سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم سے اور ان کے خاندان سے بہت بڑھ گئے جس کا اثر میری آئندہ کی زندگی پر بہت زیادہ پڑا۔ اس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔ انہی تعلقات کی وجہ سے میں نے ایک روز ان سے وعدہ لیا کہ وہ مجھے جب کبھی موقع ملے تو یورپ کو تعلیم پوری کرنے کے لئے ضرور بھیج دیں گے۔

رحمت علی کا فرار

اس گھر میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھیوں میں سے رحمت علی زکریا نے بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ رحمت علی بڑا منچلا نوجوان تھا۔ اس کی طبیعت حالات سے جلد تنگ آ جاتی تھی اور وہ اپنے ماحول کے برخلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس نے نظر بندی سے تنگ آ کر ارادہ کر لیا کہ جس طرح ہو سکے کابل سے فرار کر لے۔ اس نے قبلہ مولانا صاحب کو اپنے ارادے سے خبردار کیا۔ انہوں نے اس کی ممانعت تو نہ کی لیکن اس فرار کی وجہ سے ان پر جو الزام آ سکتا تھا اس سے بچنے کے لئے انہوں نے حکومت افغانستان سے درخواست کی کہ ان کو ہم سے علیحدہ کر کے کسی اور جگہ پر ان کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے۔ حکومت نے ان کو مستوفی الممالک (یعنی وزیر مالیات) مرزا محمد حسین کے گھر کے سراچہ میں جگہ دے دی۔ ان کے دونوں بھتیجے محمد علی اور

عزیز احمد بھی ان کے ساتھ چلے گئے اور وہ وہاں نسبتاً آزادی سے رہنے لگے۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں رحمت علی اس کے بعد ایک رات کو ایک چھوٹی سی کھڑکی سے ایک کمند کے ذریعہ گلی میں اترا اور جماعت مجاہدین کے ایک ممبر عبدالرزاق کے ساتھ جس سے اس نے پہلے ہی سے اس بارے میں سمجھوتا کیا ہوا تھا کابل سے بھاگ کر شہر مزار شریف کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ وہاں گورنر سردار محمد یوسف خان سے ملا اور اس کو کہا "مجھے حاجی عبدالرزاق رئیس محکمہ شرعیہ نے روس بھیجا ہے اور اس لئے میں مزار شریف آیا ہوں کہ روس پہنچوں" اس زمانے میں روس میں بولشکویکی انقلاب ہو چکا تھا اور کمیونسٹوں نے زار کو تخت سے اتار کر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ گورنر نے رحمت علی سے حاجی صاحب کا تعارفی خط مانگا۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ "ایسی خفیہ کارروائی کے لئے حاجی صاحب نے امیر حبیب اللہ خان کے ڈر سے کوئی خط تو نہیں دیا لیکن نشانی کے طور پر یہ کہا تھا کہ آپ نے جو گھوڑا ان کو بطور تحفہ کے بھیجا تھا وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔" گورنر کو اس پر یقین آ گیا کیونکہ اس نے حاجی صاحب کو ایک ترکی گھوڑا بھیجا تھا اور رحمت علی کو یہ خبر قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے باتیں کرتے ہوئے اتفاقاً معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے بڑی عقل مندی سے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس طرح پر اپنے لئے روس جانے کا راستہ صاف کر لیا۔

مستوفی الممالک مرزا محمد حسین جس کو بعد میں، امیر امان اللہ خان نے خود بادشاہ بننے کے بعد سزائے موت دی تھی، بہت ہی زیادہ انگریز پرست تھا۔ اس انگریز پرستی کی وجہ سے اس نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم پر اور ان کے ساتھ ہم پر ایک ناپاک سا حملہ کیا۔ اس نے امیر حبیب اللہ خان سے ایک فرمان حاصل کیا جس کا ظاہری مقصد تو یہ تھا کہ ہم کو ہماری لیاقتوں کے مطابق کام پر لگایا جائے۔ لیکن حقیقت میں اس کے ذریعہ ہماری بے عزتی کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ اس فرمان کے الفاظ ایسے ہتک آمیز تھے کہ ان کو کوئی باعزت شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس فرمان میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ہم سب کے لئے یہ الفاظ درج تھے:

"معلوم کردہ شود کہ ایں مردم چیزے کار کردہ می توانند یا ہمہ ایشاں کندۂ ناتراش میباشد" (یعنی معلوم کیا جائے کہ یہ لوگ کوئی کام کر سکتے ہیں یا سب کے سب ناکارہ اور ناتراشیدہ لکڑی کی طرح ہیں) اس فرمان پر امیر حبیب اللہ خان نے جو اس سے پہلے قبلہ مولانا صاحب کو باریابی دیکر ان کی قابلیت اور اہمیت کو دیکھ چکا تھا اور ان کی تحریر اور تجویز کو سراہ چکا تھا،

کیسے دستخط کر دیئے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ مرزا محمد حسین نے یہ فرمان قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو پڑھ کر سنایا اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچانا چاہا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس بات پر بہت رنج ہوا۔ ہم سب نے بھی افغانی حکام کی کوتاہ اندیشی پر افسوس ظاہر کیا۔ اس کے سوا ہم اس وقت اور کیا کر سکتے تھے؟

رحمت علی زکریا کے فرار کرنے کی وجہ سے ہم پر اور بھی سختی سے پہرہ لگ گیا اور ۱۹۱۸ء کی گرمیاں ہم نے اسی تنگ گھر اور بدبودار کوچہ میں گزاریں۔ اسی سال جنگ عظیم ختم ہوئی اور دولت عثمانیہ کو شکست ہونے کی وجہ سے ترکی کے حصہ بخرے کئے جانے لگے۔ جب متارکہ کی خبر کابل پہنچی تو مستوفی الممالک نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنے پاس بلا کر بڑی استہزاء کے ساتھ کہا۔

"اینہ ترکی تمام شد" (یعنی یہ لو! ترکی کا تو، اب خاتمہ ہو گیا)۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس خبر سے جتنا رنج ہوا اس کو یہاں بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔

آٹھواں باب

امیر حبیب اللہ خان کا قتل

افغانستان کی داخلی سیاست کا ایک رخ

امیر حبیب اللہ خان ۱۹ - ۱۹۱۸ء کے موسم سرما کو گزارنے کے لئے اپنی عادت کے مطابق جلال آباد گیا اور سردار نصر اللہ خان نائب السلطنۃ، سردار عنائت اللہ معین السلطنۃ، سردار محمد نادر خان سپہ سالار اور ان کے والد اور چچا جو امیر صاحب کے مصاحبان خاص کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، مستوفی الممالک اور دوسرے امرا دربار کو اپنے ساتھ جلال آباد لے گیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو بھی جلال آباد جانا پڑا کیونکہ وہ مستوفی الممالک کی نظر بندی میں تھے۔ کابل کا گورنر ہمیشہ کے قاعدہ اور رواج کے مطابق سردار امان اللہ خان عین الدولہ کو مقرر کیا گیا۔

سردار محمد نادر خان مرحوم کی روانگی سے دو روز پہلے میں ان سے ملا اور مجھے تعلیم کے لئے یورپ بھیجنے کے بارے میں، جو انہوں نے وعدہ کیا ہوا تھا، وہ ان کو یاد دلا کر پھر ان سے یہی گزارش کی۔ اس دفعہ انہوں نے پکا وعدہ کیا کہ وہ جلال آباد سے واپسی پر ضرور میری اس آرزو کو پورا کریں گے۔ لیکن مجھ سے انہوں نے قول لیا کہ میں اس بات کو کسی سے نہ کہوں گا اور جدا ہوتے ہوئے کہا "دیکھیں! خدا کو کیا منظور ہے۔"

میں ان سے ہمیشہ اردو ہی میں بات کیا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ڈیرہ دون میں پلے تھے جہاں ان کے والد اور ان کا خاندان امیر دوست محمد خان کے زمانے میں فرار کر کے پناہ گزیں ہوا تھا اور وہاں ان کے خاندان کے لوگوں نے اردو بہت اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ میں نے اپنے قول پر قائم

رہتے ہوئے، ان کی ان باتوں کا قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے بھی ذکر نہ کیا۔ حالانکہ میں ان کو ہر طرح کی کارروائی سے خبردار کر دیا کرتا تھا۔ اس بات کو خفیہ رکھنے پر ان کا اصرار کرنا اور ان کا چلتے ہوئے یہ کہنا کہ "دیکھیں! خدا کو کیا منظور ہے" مجھے اس وقت ذرا پُر معنی تو معلوم ہوا تھا، لیکن میں اس وقت اس کی پوری اہمیت نہیں سمجھ سکا تھا مگر کچھ عرصہ بعد اس کی حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی اِس کی تفصیل میں آگے چل کر لکھوں گا۔

فروری ۱۹۱۹ء کا آخری ہفتہ تھا (۲۱ یا ۲۲ فروری) کہ ایک روز صبح کو ہم کو خبر ملی کہ امیر حبیب اللہ خان کو قلعہ گوش (لغمان) ,Laghman علاقہ جلال آباد میں جہاں وہ شکار کو گئے ہوئے تھے اور سردیوں کے دن درباریوں کے ساتھ گزار رہے تھے۔ ۱۹۱۹۔ ۲۔ ۲۰ کی رات کو کسی نے قتل کر دیا۔ افغانستان میں بادشاہ کے قتل ہونے پر بدامنی کا پھیلنا ہمارے خیال میں ایک بالکل قدرتی بات تھی۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ہم کو جو پردیسی اور غریب الوطن سمجھے جاتے ہیں اور قید میں پڑے ہوئے ہیں اور بھی زیادہ صعوبتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسے خطرات کے وقت ہم ہمیشہ سب مل کر قرآن شریف ختم کیا کرتے تھے اور خداوند کریم سے اپنے لئے رحم کی نیاز کرتے تھے۔ ہر ایک شخص دو سیپارے پڑھا کرتا تھا۔ ختم کے بعد خداوند ذوالجلال سے ہم کو آفات دہر سے محفوظ رکھنے کے لئے دعا مانگا کرتے تھے۔ خدا نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو اس وقت تک تو ہر طرح کی مصیبتوں سے بچائے رکھا تھا اس لئے اس خبر کے آنے پر ہم نے مل کر قرآن شریف ختم کیا اور دعا کی کہ خداوند کریم افغانستان میں امن و امان رکھے۔ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ ولی عہد سلطنت سردار عنائت اللہ خان معین السلطنۃ نے اپنے چچا سردار نصر اللہ خان نائب السلطنۃ کے حق میں جلال آباد میں تخت سے دستبرداری کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس پر نصر اللہ خان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور وہ افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے جو ان دنوں میں جلال آباد میں تھے کابل واپس آنے پر ہمیں بتلایا کہ امیر حبیب اللہ خان نے مرنے سے ایک ہفتہ پہلے اپنے کو جمعہ کے خطبہ میں امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس کی اس حرکت سے بہت رنج ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا منتظر تھا کہ اپنے کو خلیفہ اعلان کرے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ عالم اسلام میں پھوٹ پڑے گی۔ اسی ہفتہ امیر نے انگریزوں سے اپنی غیر جانبداری کی قیمت وصول کرنے کیلئے

پشاور خچریں بھیجی تھیں تاکہ غیر جانب دار رہ کر جو اس نے جنگ میں انگریز کو مدد دی تھی (یعنی بالفاظ دیگر خلافت اسلامیہ ترکیہ کے مفاد اور جہاد کے اعلان کو پس پشت ڈال کر جو اس نے عالم اسلام کو نقصان پہنچایا تھا) اسکا صلہ اور معاوضہ حاصل کرے۔ لیکن خدا کی شان دیکھئے کہ نہ اسکو ـــــ المسلمین بننا نصیب ہوا اور نہ ہی اسکو عیش و عشرت پر خرچ کرنے کیلئے روپیہ ملا۔

شہزادہ امان اللہ خان عین الدولہ نے جو کابل میں بحیثیت گورنر حکمران تھا، اپنے چچا کی بادشاہت نہ مانی اور اپنے آپ کو بادشاہ ہونے کا اعلان کر کے جلال آباد پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وجہ سے خانہ جنگی یقینی معلوم ہوتی تھی۔ امیر امان اللہ خان نے اپنے سپاہیوں کی تنخواہ پندرہ روپیہ کابلی ماہوار سے دفعتاً بیس روپیہ ماہوار کر دی۔ حالانکہ اس کے چچا نے جلال آباد میں سپاہیوں کی تنخواہ میں صرف ماہانہ دو روپیہ کا اضافہ کیا تھا۔ اس پر جلال آباد کی فوج نے نصر اللہ خان کے برخلاف بغاوت کر کے اس کو تخت سے اتار دیا۔ اس طرح پر امیر امان اللہ خان بغیر خون ریزی کے تخت افغانستان پر متمکن ہو گئے۔ جلال آباد کی فوج نے نصر اللہ خان اور عنائت اللہ خان کو نظر بند کر لیا۔ سردار محمد نادر خاں سپہ سالار اور ان کے بھائیوں کو جو امیر کے باڈی گارڈ اور رسالہ شاہی کے افسر تھے اور امیر حبیب اللہ خان کی حفاظت کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور ان کے والد اور چچا کو جو مصاحب خاص مانے جاتے تھے، بیڑیوں میں جکڑ دیا۔ انہوں نے سردار سپہ سالار محمد نادر خان اور ان کے خاندان کے سارے آدمیوں کو قتل بھی کرنا چاہا کیونکہ وہ ان سب کو امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے ملزم خیال کرتے تھے۔ امیر امان اللہ خان کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے وہاں کی فوج کو خبر بھیجی کہ وہ قیدیوں کو سالماً کابل لے آئیں تاکہ ان کو سب کے سامنے سزا دی جائے۔ اس سے قیدیوں کی جان تو بچ گئی لیکن سب پابہ زنجیر کابل آئے اور کابل میں قید میں ڈال دیئے گئے۔ اس طرح پر سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم جن کی قسمت میں آگے چل کر افغانستان کا استقلال حاصل کرنا اور اس کے بعد باغی بچہ سقاء سے افغانستان کو چھڑا کر پھر اس کو دنیا کے مہذب ملکوں کی صف میں شامل کرنا لکھا تھا، ان جاہل اور بپھرے ہوئے سپاہیوں کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے اسرار آج تک پوری طرح نہیں کھل سکے۔ اس بارے میں مختلف روایتیں اور نظریے موجود ہیں۔ امیر امان اللہ خان کا دعوی تھا کہ امیر حبیب اللہ خان کو نصر اللہ خاں نے مروایا تاکہ اس کے تخت پر قبضہ کر لے۔ مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر نے

اپنی عیش و عشرت اور زن بازی کی وجہ سے اپنی ملکہ علیا حضرت کی ہتک کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے انتقام لینے اور اپنے بیٹے امان اللہ خان کو بادشاہ بنانے کے لئے امیر کے بر خلاف سازش کی تھی۔ اس قسم کا احتمال میرے نزدیک بالکل نہیں ہے، ملکہ صرف اکیلی اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امیر کی تند مزاجی اور سنگ دلی کی وجہ سے بعض لوگوں کو جن میں اس کا غلام بچہ شجاع الدولہ بھی شامل ہے، بہت بری طرح سزائیں دی تھیں۔ اس قسم کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے ان لوگوں میں سے کسی نے امیر کو، خیمہ میں رات کے وقت جب وہ سویا ہوا تھا، پستول سے مار ڈالا تھا۔ امان اللہ خان کے بچہ سقاؤ کی بغاوت کی وجہ سے افغانستان سے نکل جانے کے وقت شجاع الدولہ بھی یورپ چلا گیا تھا اور جرمنی میں رہنے لگا تھا۔ پرانے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بعض افغانوں کو اپنی پیٹھ کھول کر ان زخموں کے نشان دکھلائے جو کہ امیر حبیب اللہ خان کے کوڑوں کی وجہ سے اس کی پشت پر پڑ گئے تھے۔ زخموں کے نشانوں کو دیکھنے والے افغانی شہزادوں نے مجھے یہ بات خود استانبول میں سنائی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس جذبہ انتقام میں آکر ایسے ہی کسی شخص نے امیر کو قتل کر دیا ہو۔

ترکی آکر مجھے اس بارے میں ایک روایت اور معلوم ہوئی اور وہ یہ ہے کہ مشہور انگریزی جاسوس مصطفیٰ صغیر نے جس کو انگریزوں نے جمعیت خلافت ہند کے نمائندے کے بہروپ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کو قتل کرنے کے لئے ترکی بھیجا تھا، ترکی میں پکڑے جانے پر اپنے مقدمے کے دوران میں بیان کیا کہ اس نے انگریزوں کی طرف سے افغانستان جاکر امیر حبیب اللہ خاں کو قتل کیا کیونکہ وہ جنگ عظیم کے دوران اپنی غیر جانبداری کے معاوضہ میں انگریزوں سے بہت زیادہ قیمت مانگنے لگا تھا۔ مصطفیٰ صغیر کا یہ دعوی اتنا بے معنی ہے کہ اس پر زیادہ جرح کرنا بے سود ہے۔ ایک غیر ملکی آدمی کا، امیر افغانستان کے دربار میں اتنا رسوخ حاصل کرنا کہ وہ رات کو بالکل بے خبر اور پہرہ داروں سے چھپ کر اس کے خیمے میں داخل ہو اور اس کو وہاں قتل کرے، ناممکن ہے۔ اگر کوئی غیر ملکی ان کے دربار میں موجود ہوتا تو ضرور اس کا نام اس سلسلہ میں بیان کیا جاتا اور ہم کو بھی اس کا علم ہوتا۔ اگر کوئی ایسا شخص دربار میں ہوتا تو قتل کا سارا الزام (جائز یا ناجائز طور پر) افغان ضرور اس کے نام تھوپ دیتے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ قوم پرست اور آزادی خواہ اور استقلال پسند افغانوں نے جن کے لیڈر سردار محمود طرزی خان اور سردار محمد نادر خان تھے امان اللہ خان کے ساتھ سمجھوتہ اور

سازش کر کے، افغانستان کو شاہراہ ترقی پر لگانے اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے، انگریز دوست امیر حبیب اللہ خان کو قتل کروا دیا۔

میری رائے میں افغانی قوم پرستوں کا اس قتل میں ضرور ہاتھ تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی دو مختلف موقعوں پر، رات کو امیر پر جب وہ سڑک سے گزر رہا تھا، گولی چلائی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

میری اس رائے کے لئے میرے پاس ناقابل جرح کوئی ثبوت تو موجود نہیں ہے۔ لیکن بعض چھوٹی چھوٹی دلیلیں اس بارے میں موجود ہیں جو مجھے اس قسم کی رائے قائم کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل کے متعلق ذیل کا واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں (اس واقعہ کی طرف اوپر ایک جگہ اشارہ کر چکا ہوں)۔

جن دنوں میں سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کے بیٹے محمد طاہر جان کو سبق پڑھانے جایا کرتا تھا تو اکثر اوقات ان سے بھی ملا کرتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں ان سے ہمیشہ یہی درخواست کیا کرتا تھا کہ مجھے اپنی تعلیم کو پورا کرنے کے لئے یورپ بھیج دیں۔ وہ اس پر ہمیشہ یہی جواب دیا کرتے تھے کہ اس کا ابھی وقت نہیں ہے۔ ۱۹۔ ۱۹۱۸ء کی سردیوں میں جب وہ امیر حبیب اللہ خان کے ساتھ آخری دفعہ جلال آباد روانہ ہونے لگے تو میں نے پھر ان سے یہی درخواست کی۔ اس پر انہوں نے جواب دیا "جلال آباد سے واپسی پر ضرور آپ کو یورپ بھیج دوں گا لیکن اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا" جدا ہوتے ہوئے انہوں نے فرمایا "دیکھیں خدا کو کیا منظور ہے"۔ میں نے اپنے اس وعدے کی وجہ سے قبلہ مولانا صاحب سے بھی ان باتوں کا ذکر نہ کیا حالانکہ میں ان کو اپنے تمام افعال و حرکات کی خبر دیا کرتا تھا۔

امیر کے قتل کے واقعہ کے بعد، میرے دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا سردار سپہ سالار محمد نادر خان کو اس سازش کا علم تھا اور وہ خود بھی اس میں شریک تھے؟ میں نے ان سے بارہا مجھے یورپ بھیجنے کی درخواست کی تھی لیکن انہوں نے اس سے قبل کبھی ایسا یقینی جواب نہ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس بات کو کسی اور کو نہ کہنے کے بارے میں جو تنبیہ کی تھی وہ بھی اس کی دلیل ہے کہ ان کے اس وعدے کا کسی اہم راز سے تعلق تھا جس کو وہ ہر طرح پنہاں رکھنا چاہتے تھے۔ ایسا وعدہ دیتے ہوئے ان کو اس کا ضرور یقین ہوگا کہ آئندہ ایسے حالات ظہور پذیر ہونے والے ہیں جن کے ماتحت میرے لئے یورپ جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اگر ان کو

اس کا یقین نہ ہوتا تو اس دفعہ بھی وہ پرانا جواب دے سکتے تھے کہ ابھی اس کے لئے وقت موزوں نہیں ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ امیر پر پستول چلانے والا شخص ان قوم پرستوں میں سے کوئی نہ تھا، بلکہ انہوں نے کسی ایسے شخص کو جس کے دل میں اپنی بے عزتی اور کھلم کھلا رسوائی کی وجہ سے امیر کے برخلاف کینہ تھا اور اس سے انتقام لینا چاہتا تھا، اس کام کے لئے استعمال کیا۔ ممکن ہے کہ افغان قوم پرستوں نے اس کے جذبہ انتقام سے فائدہ اٹھا کر اس کو امیر کے قتل کرنے پر راضی کر لیا ہو۔ شجاع الدولہ امیر امان اللہ خان کے زمانے میں پہلے کوتوال کابل اور بعد میں "وزیر امنیہ Minister of security بنایا گیا تھا۔ ایک غلام بچے کو اتنا بڑا عہدہ دینا بھی بہت پر معنی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر کو قتل کرنے کی وجہ سے جو خدمات اس نے افغان قوم پرستوں کے لئے سرانجام دی تھیں ان کا صلہ اس کو اس طرح پر دیا گیا تھا۔ ایک دوسری دلیل یہ ہے کہ امیر کے قتل کے بعد ایک اور غلام بچہ جس کا نام محمد ولی تھا اور جو امان اللہ خان کی تخت نشینی پر افغانی استقلال کو یورپ کی مختلف حکومتوں سے منوانے کے لئے ایک مشن پر روس کے راستہ یورپ گیا تھا اور افغانستان کے پہلے وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی خان کے بعد افغانستان کا وزیر خارجہ اور امان اللہ خان کی سیاحت یورپ کے دوران میں ان کا کابل میں نائب مقرر ہوا تھا، فوراً جلال آباد پہنچا اور کابل کی طرف ایک پڑاؤ اور بڑھ کر (بادلی) کے مقام سے امان اللہ خان کو ٹیلیفون سے امیر کے قتل کی خبر اس طرح پر دی تھی "کار بخیر خلاص شد" (یعنی کام اچھی طرح ختم ہو گیا) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ افغان قوم پرستوں کے ساتھ امان اللہ خان بھی شریک تھے اور ان کی والدہ علیا حضرت صاحبہ کی دعائے خیر بھی ان کے ساتھ تھی۔ باقی واللہ اعلم بالصواب!

سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کے امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے الزام کی وجہ سے اپنے باقی رشتہ داروں کے ساتھ قید ہو جانے کے باوجود بھی۔ میں ان کے بیٹے طاہر جان کو سبق پڑھاتا رہا۔ حالانکہ ان کے نعمت پروردہ لوگ اور ان کے پرانے نوکر ان کے گھر کو بلا حفاظت چھوڑ کر حکومت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے۔ مجھے بھی بعض لوگوں نے ان کے گھر جانے سے منع کیا۔ لیکن میں نے اس کا جواب ہمیشہ یوں دیا کہ "خواہ مجھ پر کتنی ہی مصیبت کیوں نہ آئے میں ایک ایسی ذات والا صفات کو، جس نے ہم پر احسانات کئے ہیں اور ہم کو امیر حبیب اللہ خان کے زمانے میں

عبدالرحمٰن جیسے بے وقوف اور مفسد آدمی کی لگائی تہمت سے، جو ہمارے ساری عمر قید خانہ میں پابہ زنجیر رہنے کا باعث بن سکتی تھی، بچا لیا تھا، کبھی بھی ان کے ادبار کے زمانے میں نہیں چھوڑ سکتا"

ے دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و در ماندگی

میری اس وفاداری کا جب سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو علم ہوا تو اس کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا اور جب وہ قید سے چھوٹ کر اپنے گھر آئے تو انہوں نے میری جرأت کی داد دی۔ اس کے بعد ہمارے اور ان کے تعلقات اور بھی زیادہ بڑھ گئے۔

نوواں باب

جنگ استقلال افغانستان

جنگ کی تیاری۔ جنگ کے مختلف محاذ۔ ٹھل پر حملہ

امیر امان اللہ خان نے تخت پر بیٹھتے ہی، فوج اور قوم کے سامنے دو باتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ وہ اپنے والد کے قاتل کا پتہ لگا کر اس کو سزائے موت دیں گے، دوسری بات یہ تھی کہ انگریزوں سے افغانستان کا استقلال حاصل کریں گے۔ وہ اپنی سب تقریروں میں ان دونوں وعدوں کو ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔

چنانچہ قتل کے واقعہ کی تحقیقات کے نتیجہ میں، میجر سید علی رضا شاہ کو جو قتل کی رات پہرے داروں کا افسر تھا، اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور اس کو اس جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ قتل کے مجرم کو سزا مل جانے کے معنی یہ تھے کہ سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم اور ان کے خاندان کے ممبر بے گناہ تھے، اس لئے ان کی رہائی ہونی چاہئے تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ سب لوگ قید سے چھوٹ گئے۔ لیکن عام سپاہی جنہوں نے ان کو امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے الزام میں خود گرفتار کیا تھا، ان کے رہا ہونے سے خوش نہ ہوئے۔ وہ اور ان کے افسر ڈرتے تھے کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم دوبارہ برسرکار آ کر اُن سے انتقام لیں گے۔ ان کی اس ناخوشی کا ایک مظاہرہ جنگ استقلال افغانستان کے دوران میں (گردیز) کے قلعہ میں ہوا جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

اپنے دوسرے وعدے کو پورا کرنے کے لئے امیر امان اللہ خان نے انگریزوں کے برخلاف اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان تیاریوں میں

(جیساکہ آگے چل کر آئے گا) ایک اہم حصہ، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کوششوں کا تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم، سردار نصراللہ خان کے بلاوے پر جلال آباد سے کابل آئے اور امیر صاحب سے ملے۔ اس پر امیر صاحب نے ان سے کہا۔ "من ہموں ہستم" (یعنی میں تو وہی ہوں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے افغانستان اور ہندوستان کے اتحاد کے بارے میں، جو کچھ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے ان کے والد امیر حبیب اللہ خان کو کہا تھا ان کو علم تھا۔ اس پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے بحیثیت وزیر داخلہ حکومت موقتہ ہند، امیر امان اللہ خان سے وہی معاہدہ کیا جو ان کے والد سے کیا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بدامنی تھی اور پنجاب میں جلیانوالے باغ کے واقعات کی وجہ سے بہت ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اس وقت انگریزی فوجیں ہندوستان میں، یورپ کی جنگ کی وجہ سے بہت کم تعداد میں تھیں۔ اگرچہ جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن انگریزی فوجیں ابھی تک مختلف محاذوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں جو فوجیں تھیں وہ اندرون ملک میں امن و امان قائم کرنے میں مصروف تھیں۔ افغانستان کو اپنا استقلال حاصل کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے ایک طرف فوجی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور دوسری طرف قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستان کے لوگوں کو افغانی فوجوں کے حملے سے خبردار کرنے اور ان کو اس فوج کے خیر مقدم کے لئے آمادہ کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک رات کو مشین خانہ کابل کے چھاپ خانہ میں جا کر ہندوستانیوں کے نام مندرجہ ذیل اعلان اردو اور انگریزی میں چھپوایا۔

اردو کا اعلان دستاویزات میں چسپاں ہے (۴) اس کی نقل یہاں درج کی جاتی ہے:

حکومت موقتہ ہند

نظارت داخلہ

"عارضی حکومت ہند کی خبر، رولٹ سیڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں پڑھ چکے ہو۔ یہ حکومت اس لئے بنائی گئی ہے کہ ہند میں موجودہ غاصب، غدار، ظالم حکومت کے عوض بہترین حکومت قائم ہو۔ تمہاری عارضی حکومت چار سال سے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔ اس وقت جب تم نے ظالمانہ قانون کے نہ ماننے کا پکا ارادہ کر لیا عین اسی زمانے میں حکومت موقتہ بھی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ حملہ آور فوجوں سے حکومت موقتہ ہند نے معاہدہ کر لیا ہے اس لئے اس سے مقابلہ کر کے اپنے حقیقی فوائد ضائع نہ کریں، بلکہ انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ

سے قتل کریں۔ انہیں آدمی اور روپے کی مدد نہ دیں، ریل اور تار خراب کرتے رہیں۔ حملہ آور فوج سے امن حاصل کر لیں۔ ان کو رسد اور سامان سے مدد دے کر اعزازی سندیں حاصل کریں۔ حملہ آور فوج ہر ہندوستانی کو بلا تفریق نسل و مذہب امن دیتی ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کی جان مال عزت محفوظ ہے۔ فقط وہی مارا جائے گا یا بے عزت ہو گا جو مقابلہ میں کھڑا ہو گا۔ خدا ہمارے بھائیوں کو سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔

عبیداللہ — ظفر حسن

وزیر حکومت موقتہ ہند — سیکرٹری حکومت موقتہ ہند

انگریزی اعلان کی نقل یہ ہے:

Brave Indians! Courageous Countrymen!

You have read the account of the organisation of the Provisional Government of India. It has Raja Mahindra Paratap as its President, M.Barkat Ullah (of Ghadar Party) as its Prime Minister and M. Ubeidullah as its Administrative Minister. Its object is to liberate India from the ironclutches of the English and to establish indigenous government there.

This government of yours heard with utmost pleasure, the news of your gallant deeds done for the noble cause of liberty. You have no arms to extripate the enemies of india and mankind. This government of yours has tried and succeeded in obtaining help from without. Our government has assured itself and made agreements as to your full freedom with the allied invad-

ing powers.

Murder the English wherever you find them, cut the telegraph lines, destroy the railway lines and the railway bridges and help in all respects the liberating armies. None shall be molested but who shall resist. Your properties and your homes are safe.

A.H.AZIZ
Assistant Adm. Minister

(دستخط)
عبید اللہ

Administrative Minister
ZAFAR HASAN
Delhi Scretary
P.Govt. of India.

ان اعلانات میں افغانستان کا نام جان بوجھ کر نہیں لکھا گیا تھا کیونکہ ابھی تک افغان حکومت نے باقاعدہ طور پر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ نہ کیا تھا۔ اور وہ انگریزوں کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی، ان کو بھڑکا کر اپنی جنگی تدبیروں کو ناکام بنانا نہیں چاہتی تھی۔

افغانی حکومت اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے درمیان یہ قرار پایا تھا کہ افغانی فوجیں سرحدوں کی طرف روانہ ہوں اور وہاں پہنچ کر مورچہ بندی کریں۔ اس عرصہ میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم ان اعلانات کو ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کو بھیج کر ان کو افغانی فوجوں کے ارادوں سے خبردار کریں تاکہ ہندوستان میں کوئی شخص ان فوجوں کا مقابلہ نہ کرے۔ یہ

فوجیں بھی جب تک ہندوستانی مسلمانوں کو اس پیغام کے پہنچنے کے بارے میں کابل میں پوری خبر نہ آجائے اس وقت تک انگریزوں پر حملہ نہ کریں۔

ان اعلانات کو خفیہ طور پر ہندوستان میں مختلف لوگوں کو بھیجنے کے لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے محمد علی اور اللہ نواز خان ہندوستان روانہ کئے گئے۔ یہ دونوں اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کر کے تقریباً ایک ماہ کے بعد بخیر کابل پہنچ گئے (مگر، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا جلال آباد کے افغانی کمانڈر کی غلط کارروائی کی وجہ سے جنگ شروع ہوگئی تھی۔) محمد علی حیدر آباد دکن تک ان اعلانات کو لے گیا تھا۔ اللہ نواز خان نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پنجاب میں رہنے والے دوستوں کو یہ اعلان پہنچائے تھے۔

اللہ نواز خان کا صداقت سے اس فرض کو سرانجام دے کر افغانستان واپس آنا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا شیخ عبدالحق کی غداری میں کوئی ہاتھ نہ تھا، اگر وہ بھی عبدالحق کی طرح سیدھے راستے سے بھٹکا ہوتا تو اس اعلان کو انگریزوں تک پہنچا دیتا اور انگریزوں کو افغانی جنگی تیاریوں کی خبر مل جاتی اور وہ افغانستان پر حملہ کر کے، افغانی فوجوں کے سرحدوں کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہی اہم افغانی چوکیوں پر قبضہ کر لیتے۔

افغانستان کی جنگی تیاریوں کا ذکر کرتے ہوئے، میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں یہاں سامان جنگ کے بہم پہنچانے، گولہ بارود، توپ اور بندوق کے فراہم کرنے، نئے سپاہی بھرتی کرنے وغیرہ جیسے کاموں کا ذکر کرنا زائد از ضرورت خیال کرتا ہوں کیونکہ ایسی تیاریاں تو جنگ کرنے والا ہر ملک کرنے پر مجبور ہے۔ میں یہاں تیاریوں کی ذیل میں ان حالات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے افغانستان بہت ہی اچھی پوزیشن حاصل کر چکا تھا۔ یہ حالات ہندوستان کی فضا پر بدامنی کی ڈراؤنی گھٹاؤں کے چھانے سے پیدا ہوگئے تھے۔ ہندوستانی لوگوں نے نہتے ہونے کے باوجود، انگریزی ہتھیار بند فوجوں کے مقابلے میں اپنا سینہ سپر کیا ہوا تھا۔ خاص کر پنجاب میں سلسلہ رسل و رسائل کو خراب کر کے انگریزی فوجوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کو مشکل بنا دیا تھا۔ افغانستان نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور حکومت موقتہ ہند کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جس سے اس کو جنگی تیاریوں سے بھی زیادہ فائدہ ہوا۔ اگر ہندوستان میں حالات اس قدر نامساعد نہ ہوتے تو صرف افغانی فوجوں کے بل بوتے پر استقلال حاصل کرنا افغانستان کے لئے ناممکن تھا۔ اس کی تفصیل میدان جنگ کے واقعات کی ذیل میں بھی لکھی

جائے گی، لیکن افغانستان نے جنگ کے بعد (جیسا کہ آئندہ لکھا جائے گا) انگریزوں سے اپنا استقلال منوا کر ہندوستان سے بالکل بے اعتنائی برتی اور برصغیر کے مسلمانوں نے خاص کر جو قربانیاں کی تھی، ان کو بھلا دیا۔

اس زمانے میں افغانستان کے غیر ملکوں سے سفارتی تعلقات نہ تھے۔ اس لئے اپنی تیاریوں کے سلسلہ میں اس نے سردار محمود بیگ طرزی کے زمانہ وزارت میں جو امیر امان اللہ خان کے پہلے وزیر خارجہ تھے، بولشویکی روس اور دوسرے یورپی ممالک سے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کے لئے ایک وفد جس کا رئیس غلام بچہ محمد ولی خان تھا، جس نے امیر امان اللہ خان کو امیر حبیب اللہ خان کے قتل کی (باؤلی) کے پڑاؤ سے ٹیلیفون پر خبر دی تھی، روانہ کیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا چھوٹا بھتیجا عزیز احمد بھی اس وفد کے ساتھ روس گیا اور وہاں سے ماسکو پہنچا۔ وہ وہاں کچھ مدت روسی زبان سیکھتا رہا اور یونیورسٹی محنت کشان آسیا University of Asiatic, Toilers میں پڑھتا رہا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس وفد کے ممبروں کے ساتھ کابل واپس آگیا۔ دوسرا وفد جس میں مولانا محمد میاں (منصور) انصاری اور ایک افغانی نوجوان محمد گل خان نام جو بعد میں صوبہ ترکستان افغانی کا رئیس ہیئت تنظیمیہ مقرر ہوا تھا، شامل تھے۔

ان سیاسی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ، جنگی تیاریوں کے سلسلہ میں فوج کا کمانڈران چیف بھی مقرر ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ سردار سپہ سالار صاحب محمد نادر خان کے قید ہو جانے کی وجہ سے یہ عہدہ خالی پڑا ہوا تھا۔ اس عہدے پر اس وقت سردار سپہ سالار محمد نادر خان کا اسسٹنٹ صالح محمد خان نائب سالار مقرر کیا گیا۔ اگرچہ وہ فوجی قابلیت اور جنگی تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اس کو یہ عہدہ اس کے سب سے سینئر افسر ہونے کی وجہ سے دیا گیا تھا۔

جنگ استقلال کے مختلف محاذ

افغانستان میں اس وقت رسل و رسائل کا انتظام اتنا ناقص تھا کہ فوجی نقل و حرکت اور جنگی ساز و سامان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جلد پہنچانا ناممکن تھا۔ ملک کی سرحدیں جو ہندوستان کے ساتھ مشترک تھیں بہت لمبی اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں سے گزرتی تھیں۔ اس وجہ سے ایک متحد محاذ کا

قائم کرنا اور جنگ کا ایک مرکز سے کنٹرول کیا جانا، غیر ممکن تھا (چنانچہ آج بھی یہی حالت ہے)۔ اس لئے مجبوراً تین علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے سے بالکل آزاد محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جن کے کمانڈر ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کی کارروائیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ حالانکہ فن جنگ کے اصولوں کا تقاضا ہے کہ جنگ، سوق الجیشی (سٹریٹجی Strategy) اور (ٹیکٹکس tactics) کے قواعد کے مطابق لڑی جائے اور سارے جنگی امور کا مرکزی ادارہ یعنی جنرل ہیڈ کوارٹرز سے ایک کمانڈران چیف کی طرف سے انتظام کیا جائے جس کے ماتحت مختلف خدمات کو سرانجام دینے کے لئے متعدد افسر ہوں اور وہ مختص کام کریں۔

یہ تین علیحدہ علیحدہ محاذ مندرجہ ذیل جگہوں پر قائم کئے گئے تھے:۔

محاذ سمت مشرقی، جس کا کمانڈران چیف سپہ سالار محمد صالح خان تھا۔ یہ محاذ کابل کے مشرق میں جلال آباد سے آگے درہ خیبر کے مقابلہ میں بنایا گیا تھا اور یہاں سے لنڈی کوتل اور جمرود جیسے انگریزی فوجی قلعوں پر اور پشاور کی چھاؤنی پر حملہ کیا جانے والا تھا، بہترین افغانی پلٹن جن کی بندوقیں نئی اور جن کی توپیں سریع آتش (Quiek firing) تھیں اسی محاذ پر مقرر کی گئیں تھیں۔

محاذ سمت جنوبی، جس کے کمانڈران چیف سردار محمد نادر خان مرحوم تھے، کوتل پیواڑ سے لے کر وزیرستان کے قلعہ وانا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس محاذ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دائیں حصے کا یعنی وزیرستان کا کمانڈر سپہ سالار سردار محمد نادر خان کا چھوٹا بھائی سردار شاہ ولی خان تھا اور بائیں حصے یعنی کرم کے شمالی علاقے کا کمانڈران کا دوسرا چھوٹا بھائی سردار شاہ محمود خان تھا۔ (۵) سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم خود مرکز کے حصے یعنی خوست میں تھے۔ یہ محاذ کابل کے جنوب میں وزیرستان، کوہاٹ اور کرم کی انگریزی فوجوں کے مقابلہ میں قائم کیا گیا تھا

محاذ سمت مغربی، کابل کے مغرب میں قندھار میں کوئٹہ کے مقابلہ میں قلعہ جدید کے ارد گرد بنایا گیا تھا۔ اس کا کمانڈر سردار عبدالقدوس خان صدر اعظم تھا۔

ان سب کمانڈروں کو حکم دیا گیا تھا کہ جب تک تینوں محاذوں کی فوجیں اپنی اپنی جگہوں پر نہ پہنچ جائیں اور کابل سے لڑائی کا حکم نہ آجائے کوئی جنگی کارروائی نہ کی جائے۔

اس زمانے میں ہم کو آزادی مل گئی تھی اور ہم بغیر پہریدار کے گھر سے باہر نکل سکتے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو قصر عین العمارہ جہاں امیر امان اللہ خان زمانہ شہزادگی میں رہا کرتے

تھے، کے سراچہ میں جس میں اس سے پہلے سردار محمود بیگ طرزی خان رہائش رکھتے تھے، جگہ مل گئی تھی۔ یہ گھر بہت آرام دہ اور فراخ تھا اور ایک کھلی جگہ پر لب سڑک واقع تھا۔ ہم لوگ اگرچہ ابھی کوچہ تیلیاں میں ہی رہتے تھے لیکن بعض ساتھی وہاں سے علیحدہ ہو کر دوسری جگہوں میں رہنے لگے تھے۔ کیونکہ ہم پر اس بارے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ہمارے ساتھیوں میں سے خوشی محمد، صالح محمد خان (کمانڈر ان چیف) محاذ سمت مشرق کے ساتھ مشاورت کے طور پر امیر امان اللہ خان کی طرف سے مقرر کئے گئے تھے، اور صالح محمد خان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے مشورہ پر کام کرے۔ سمت جنوبی کے محاذ کو روانہ ہونے کے دن، سردار محمد نادر خان مرحوم نے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ "یہ صرف مولانا صاحب کی اجازت کے بعد ممکن ہو سکتا ہے۔" جب میں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کی اس خواہش کا ذکر کیا اور ان کو اپنا جواب بتلایا تو انہوں نے فرمایا: "آپ کو اس جواب کی بجائے فوراً ان کی تجویز کو منظور کر لینا چاہئے تھا۔" خیر، سردار محمد نادر خان مرحوم کابل سے تین پیادہ پلٹنیں (Infantry regiments) اور ۴ پرانی ساخت کی چھوٹی خچری توپیں اور دو جرمن ہوٹر (Howitzer) توپیں جن کو ہاتھیوں کی پیٹھ پر لادا جاتا تھا، اور شاہی رسالہ کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے کر شہر گردیز کی طرف جو صوبہ سمت مشرق کا مرکز ہے، روانہ ہو گئے۔

اگلے روز میں نے بندوق اور گولیاں لینے کی درخواست کی اور تین دن بعد سرکاری گھوڑے پر سوار ہو کر عازم گردیز ہوا اور وہاں جا کر سردار محمد نادر خان مرحوم سے ملاقی ہوا! وہ اس طرح اچانک مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مجھ سے پہلے کوہاٹی مہاجروں کا لیڈر عبداللطیف اور سرحدی خوانین میں سے ایک باجوڑی خان جس کا نام محمد ایوب خان تھا اور جو ایک بہت ہی مخلص مہاجر تھا، سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔

کابلی پلٹنوں کے گردیز پہنچنے کے چند روز بعد جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کو تقسیم کر کے ایک پلٹن کو وزیرستان اور دوسری پلٹن کو پیواڑ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، تو انہوں نے بعض شریر افسروں کے ورغلانے کی وجہ سے سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم اور ان کے دونوں بھائیوں کے برخلاف سر اٹھایا اور ان کو امیر حبیب اللہ خان کا قاتل کہنا شروع کر دیا، اور ان کے برخلاف پھر بغاوت کی ٹھان لی، لیکن سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم نے بہت سمجھ اور دور اندیشی سے

کام لیا اور اس فتنے کو فرو کر دیا۔ ورنہ بپھرے ہوئے سپاہی ان کو پھر قید کر دیتے اور شاید اس دفعہ تو ان کو مار ہی دیتے۔

اس وقت افغانی قبائل کے سردار وفد لے کر گردیز میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی خدمت میں آتے تھے اور جنگ کے لئے اپنی خدمات پیش کیا کرتے تھے۔ اس طرح پر باقاعدہ افغانی فوجوں کے ساتھ ساتھ افغانی رضاکاروں اور مجاہدین کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کو افغانی حکومت کی طرف سے ہتھیار، گولہ بارود اور خوراک کے لئے روپیہ دیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ قبیلوں سے منسوب تھے اور ان کی تعداد باقاعدہ فوج کے سپاہیوں سے بہت زیادہ تھی۔

لیکن جیسا کہ آگے چل کر جنگ ٹھل کے تجربہ سے معلوم ہوا، یہ لوگ فوجی تنظیم (ڈسپلن) کے قائل نہ تھے، اس لئے ان سے جنگ میں چنداں فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ یہ لوگ جم کر لڑائی کرنے کے قابل نہ تھے۔ ان کو صرف دھاڑا بازی کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ان افغانی قبیلوں میں سب سے مشہور منگل اور جدران کے قبیلے تھے۔ قبیلہ جدران کا سردار ببرک خان بھی اپنے فدائیوں کے ساتھ گردیز میں آیا ہوا تھا اور یہاں قلعہ گردیز میں سپہ سالار محمد نادر خان کا مہمان بنا ہوا تھا۔

(بدقسمتی سے ببرک خان کا پوتا اکبر خان، پاکستان بننے پر نوابزادہ لیاقت علی خان کا قاتل بنا۔)

ایک دن دوپہر کے کھانے سے پہلے جب سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم قلعہ کے ایک بڑے کمرے میں مختلف قبیلوں کے سرداروں سے جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، اور میں ان کے بھائی سردار شاہ محمود خان اور ببرک خان کے ساتھ پہلو کے کمرے میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا، تو سردار شاہ علی خان نے مجھے کہا کہ: "اب میدان جنگ میں جانے کے دن نزدیک آرہے ہیں، آیئے ہم آپ کو پستول بھرنا اور چلانا سکھلائیں۔" اس پر انہوں نے اپنا پستول نکال کر، مجھے گولی بھرنے، فیر کرنے اور پستول کو خالی کرنے کے طریقے بتائے لیکن تنبیہ کی کہ پستول کو خالی کرتے ہوئے یا خالی کرنے کے بعد اس کا گھوڑا گراتے ہوئے، خلاصہ یہ کہ ہر وقت جب کہ ہدف (target) پر فیر نہ کرنا ہو، پستول کی نالی کا منہ ضرور یا زمین کی طرف رکھا جائے یا دیوار کی طرف پھیر دیا جانا چاہئے اور نالی کو کبھی بھی ایسی حالت میں کسی شخص کی طرف موڑنا نہ چاہئے۔

ان توضیحات کے بعد اس نے کہا کہ "لو، اب اس پستول کو خود ہی بھرو، پھر خالی کرو اور

جب پستول سے گولیاں نکال چکو تو اس کا گھوڑا گراؤ۔" میں نے پستول لے کر ان کی ہدایت کے مطابق پستول کو بھرا، پھر خالی کیا اور نالی کا رخ زمین کی طرف کر کے گھوڑا گرا دیا۔ اس پر دفعتاً بڑی گونج کے ساتھ پستول چل گیا اور گولی نالی سے نکل کر زمین میں دھنس گئی۔ اس سے ہم سب حواس باختہ ہوئے کہ یہ گولی کہاں سے آئی اور پستول کیوں چل گیا۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم ساتھ کے کمرے سے دوڑے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ ان کو یقین تھا کہ ہمارے کمرے میں کسی نے ایک شخص کو مار ڈالا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں گردیز میں قبیلوں کے سرداروں کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے یا لٹیروں اور چوروں کے سبب سے ایسی وارداتیں عام تھیں۔ جب ان کو ساری کیفیت سنائی گئی تو ان کو اطمینان ہوا کہ بالکل خریت ہے رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گزشت" (بلا تو آئی تھی لیکن خیریت سے ٹل گئی) معلوم ہوتا ہے کہ میں نے غلطی سے پستول کو بالکل خالی ہو جانے کے بارے میں کوئی پڑتال نہ کی اور نہ ہی سردار شاہ محمود خان اور ببرک خان کو خیال آیا کہ پستول کی نالی میں ایک گولی رہ گئی ہے۔ جب میں نے نالی کو زمین کی طرف موڑ کر گھوڑا گرایا تو یہ گولی چل گئی۔ اگر خدانخواستہ میں ان کی ہدایات پر عمل نہ کرتا اور پستول کی نالی کو زمین کی طرف موڑنے کی بجائے کسی اور طرف پھرا کر فیر کرتا یا جیسا کہ انسان اکثر پستول ہاتھ میں لے کر مذاق کے طور پر اپنے ساتھیوں کو ڈرانے کے لئے نالی ان کی طرف کر دیا کرتا ہے، میں بھی کمرے میں بیٹھے ہوئے اشخاص میں سے کسی ایک کی طرف نالی موڑ دیتا اور گولی چل جاتی تو ضرور تھا کہ وہ آدمی یا زخمی ہو جاتا یا مر جاتا، ایسی حالت میں یہی کہا جاتا کہ ظفر نے جان بوجھ کر پستول چلایا اور وہ انگریزی جاسوس ہے اور خاص طور پر اس کام کے لئے گردیز آیا تھا کہ ایک فوجی کمانڈر کو یا کسی قبیلے کے سردار کو قتل کر دے۔ لیکن خداوند کریم نے مجھ پر احسان کیا کہ اس نے مجھے اس قسم کی غلطی سے بچایا، جس کا خمیازہ نہ صرف مجھے بلکہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور میرے باقی ساتھیوں کو بھی اٹھانا پڑتا۔ میں اس کے بعد خواہ کتنا ہی اپنے اخلاص کا دعویٰ کرتا وہاں میری کچھ نہ سنی جاتی بلکہ مجھے فوراً تکہ بوٹی کر دیا جاتا۔

سردار محمد نادر خان سپہ سالار گردیز میں کوئی ۲۰ روز ٹھیرے۔ اس قیام سے ان کا مقصد اپنی جنگی تیاریوں کو پورا کرنا اور مختلف قبیلوں کے سرداروں سے گفتگو کر کے ان سے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کتنے کتنے رضا کار فراہم کر سکتے ہیں اور ان کو کس وقت اور کیونکر میدان جنگ میں پہنچا سکتے ہیں اور اس کے لئے ان کو کتنی مالی مدد ملنی چاہئے۔ اس کے سوا یہاں اتنی مدت ٹھہرنے سے

یہ بھی مطلوب تھا کہ سردار عبدالقدوس خان قندھار پہنچ جائے اور وہاں کی جنگی تیاریاں پوری کر سکے۔ صالح محمد خاں سب سے پہلے محاذ پر پہنچ گیا تھا اور اس کی تیاریاں نسبتاً آسانی سے پوری ہو گئی تھیں۔ کیونکہ کابل اور جلال آباد کے درمیان فاصلہ کے کم ہونے کی وجہ سے اس کو فوجی سامان کابل سے نسبتاً بہ آسانی اور جلد مل سکتا تھا۔

گردیز کے قیام سے فائدہ اٹھا کر، میں نے کوہاٹ اور بنوں جانے والے اشخاص کی تلاش شروع کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ بعض ہندو اور سکھ ساہو کار اور دکاندار کوہاٹ جانے والے ہیں۔ ان میں سے، میں نے ایک شخص کو جو زیادہ سمجھ دار اور قابل اعتماد تھا، سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کے حکم سے قلعہ گردیز میں بلایا اور اس کو قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے تیار کردہ اعلانات جن کی نقل اس سے پہلے درج کی جاچکی ہے، ایک آئینہ کے پیچھے ڈھکنے کے نیچے لگا کر دیئے کہ ہندوستان پہنچ کر اس آئینہ کا ڈھکنا اتار کر ان اعلانات کو نکالے اور ان کو لوگوں میں تقسیم کر دے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ان اعلانات کو ٹھل کے لوگوں میں بانٹا تھا کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، ان لوگوں نے افغانی فوجوں کی بہت تپاک کے ساتھ آؤ بھگت کی اور بڑے جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ اعلانات انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ عبدالوہاب اور محمود طرزی نے ان اعلانات کو ہندوستان کی آرکائیوز (Archive) میں دیکھا تھا۔

مئی ۱۹۱۹ء کے شروع میں سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم نے گردیز سے جدا ہونے سے پہلے، اپنے بھائی سردار شاہ ولی خان کو وزیرستان کے محاذ کی کمان دے کر شہرار گون واقع افغانستان کی طرف روانہ کیا۔ لوگوں میں جہاد کا شوق پیدا کرنے کے لئے حضرت صاحب شور بازار کا چھوٹا بھائی جو امیر صاحب کی طرف سے بھیجا گیا تھا اس کے ساتھ کیا گیا۔

لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے مریدوں اور لوگوں سے اپنی شکم پری کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ سردار شاہ ولی خان جنگ کے بعد ہمیشہ اس بارے میں شکایت کیا کرتا تھا۔ ایوب خان مہاجر بھی اس قافلہ میں داخل ہوا۔ ایوب خان کی خدمات سے سردار شاہ ولی خان ہمیشہ ستائش سے بحث کیا کرتا تھا اور اس کی تعریف اس کے ورد زبان رہتی تھی۔ سردار سپہ سالار محمد نادر خان کا دوسرا بھائی سردار شاہ محمود خان پیواڑ کے محاذ کا کمانڈر مقرر ہوا۔ اس کے ساتھ عبداللطیف مہاجر بھیجا گیا۔

ان دونوں سرداروں کا اپنے اپنے محاذوں کی طرف روانہ ہونا اور سپہ سالار صاحب مرحوم کا ان سے جدا ہونا ایک بہت رقت آمیز منظر تھا۔ تینوں بھائی ایک دوسرے سے گلے ملے اور چشم پرنم ایک دوسرے کے لئے فتح ونصرت کی دعا کرتے ہوئے اپنے اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ ان کے ساتھ رسالہ شاہی کا ایک ایک چھوٹا سا دستہ، ایک ایک پیادہ پلٹن اور دو دو خچری توپیں قلعہ گردیز سے دی گئیں۔(۶)

اگلے روز سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم نے بھی سرحد کی طرف بڑھنے کے لئے گردیز سے اپنی فوج کے ساتھ حرکت کی۔ ان کی رکاب میں باقی ماندہ رسالہ شاہی کے سوار، ایک رجمنٹ سے کچھ زیادہ سپاہی، دو جرمن ہوٹزر جن کو افغان (توپہائے، ہژدہ پی) کہتے تھے کیونکہ ان کے گولہ کا وزن ۱۸ پونڈ تھا اور چار پرانی قسم کی خچری توپیں تھیں۔ اس فوجی کالم (Column) کے آگے سپہ سالار صاحب محمد نادر خان مرحوم ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ حضرت صاحب شور بازار جو خوست کے لوگوں کو جہاد پر ابھارنے کے لئے امیر صاحب کی طرف سے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ساتھ مقرر ہوئے تھے، اور میں گھوڑوں پر ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ گردیز سے کوئی دو سو گز ہی نکلے تھے کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے گھوڑے نے سخت ٹھوکر کھائی اور اس کے دونوں اگلے گھٹنے زمین پر جا لگے۔ اگرچہ سپہ سالار صاحب مرحوم خود تو گرتے گرتے سنبھل گئے لیکن ان کی پگڑی اتر گئی۔ میں نے اس واقعہ کو فال خیر نہ سمجھا اور مجھے ذرا اندیشہ پیدا ہوا کہ ہندوستان پر ان کا حملہ کامیاب نہ ہو گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

گردیز کے بعد پہلے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد فوجیوں نے رات بسر کرنے کے لئے خیمے لگائے۔ سپہ سالار صاحب مرحوم نے جو خیمہ اپنے لئے لگوایا وہ ایک بہت بڑا خیمہ تھا جس کے تین حصے تھے۔ ان میں سے دروازے کے دائیں طرف کے حصے میں وہ خود سوئے۔ درمیانی حصہ میں ان کا محافظ سپاہی پہرہ پر کھڑا ہوا اور بائیں طرف کے حصے میں میرے سونے کے لئے بستر لگوایا۔ ٹھل کے میدان جنگ میں پہنچنے تک ہر پڑاؤ پر یہی انتظام ہوتا رہا۔ سردار صاحب مرحوم نے اپنے خیمے میں مجھے جگہ دے کر جو مجھ پر اعتماد ظاہر کیا تھا، اس وجہ سے میں ان کا بہت ممنون تھا۔ ان کی اس مہربانی کی وجہ سے افغانی افسروں میں میرا اعتماد اور رسوخ جم گیا اور خوب ساکھ بندھ گئی۔ اس کے بعد اگر ان میں سے کسی کو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم سے کوئی درخواست کرنا ہوتی

تھی تو میرے واسطہ سے ہی ان کو اپنی عرضی پہنچانے کے لئے مجھے کہا کرتے تھے۔

اس کوچ (فوجی مارچ) کے دوران میں نے دیکھا کہ گردیز سے روانگی کے بعد دوپہر تک سپاہی بغیر کسی وقفہ کے یا ستانے کے لئے راستہ میں بغیر ٹھہرنے کے چلتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ایک گھنٹہ کا وقفہ ہوا اور اس کے بعد پھر کوچ شروع ہو گیا، حالانکہ ترکی آ کر جب میں نے ملٹری کالج میں تعلیم پانا شروع کی تو دیکھا کہ ایسے لمبے کوچ کے دوران میں ہر گھنٹے کے بعد دس منٹ کے لئے سپاہیوں کو ستانے، پانی پینے اور دوسری ایسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے موقع دیا جاتا جس سے وہ پھر تازہ دم ہو کر کوچ کرنے لگ جاتے اور اس طرح پر گھنٹوں چلتے رہتے ہیں۔ صرف جبری کوچ کے وقت جب دشمن پر جلد حملہ کرنا ہو یا ضروری ہو کہ کسی مقام پر دشمن سے پہلے قبضہ کیا جائے تو بلا وقفہ کوچ کیا جاتا ہے۔

اس پہلے پڑاؤ سے میں نے سراج الاخبار کے لئے جنگی حالات کے بارے میں ہفتہ میں دو تین مقالے لکھنے شروع کئے، تاکہ کابل کے لوگوں کو ہمارے محاذ کے حالات سے خبردار رکھا جائے۔ اس طرح میں اس اخبار کا اعزازی نامہ نگار (Correspondent) بن گیا تھا۔ مگر میری تحریرات کو سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم اپنی نظر سے گزار لیا کرتے تھے۔ یعنی سنسر کر لیتے تھے۔ میرے مقالے سراج الاخبار میں باقاعدہ چھپتے رہے اگرچہ ان کی حقیقی حیثیت سرکاری کمیونک (Communique) کی ہی تھی۔

پڑاؤ پر سپاہیوں کو ایک مرکزی باورچی خانے سے کھانا ملنے کی بجائے جیسا کہ دوسرے ملکوں میں باقاعدہ فوجوں کو ملا کرتا ہے، ہر افغانی سکواڈ (Squad) کے سپاہیوں کو خشک راشن دیا جاتا تھا اور وہ خود روٹی اور ہنڈیا پکایا کرتے تھے۔

فوج اس طرح کوچ کرتی ہوئی چھ روز کے بعد متون سے، جو ضلع خوست کا مرکز ہے، ایک پڑاؤ پہلے جب رات بسر کرنے کے لئے ٹھہری تو خبر ملی کہ جرنیل صالح محمد خان نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے مشورہ کئے بغیر جیسا کہ اس کو افغانی گورنمنٹ کی طرف سے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ساتھ طے شدہ سمجھوتے کے مطابق کام کرنے کا حکم دیا گیا تھا، تورخم کے مقام پر، جو درہ خیبر کے شروع میں ایک افغانی سرحدی چوکی ہے، ایک متنازعہ فیہ چشمے کی وجہ سے حملہ کر دیا اور اس کے ساتھ والے مجاہدین نے لنڈی کوتل پر قبضہ کر کے پشاور کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اس خبر پر ایک طرف تو شادمانی ہونے لگی اور دوسری طرف ہم کو یہ اندیشہ ہوا کہ جلال آباد کے محاذ پر

جنگ کا ایسے وقت میں شروع ہونا جب کہ محاذ سمت جنوبی کی فوجیں سرحد سے تین چار روز کے فاصلے پر ہیں اور محاذ سمت مغربی کا کمانڈر ابھی قندھار بھی نہیں پہنچا ہے، سارے جنگی منصوبے (Plan) کو خراب کر دے گا اور انگریز ہر محاذ پر علیحدہ علیحدہ حملہ کر کے افغانی فوجوں کو شکست دے دیں گے۔ اس اندیشے کے ساتھ سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو یہ قلق بھی ہوا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے میں پہل نہ کر سکے، اور صالح محمد خان جو ایک زمانے میں ان کا نائب تھا، ان سے سبقت لے گیا۔

اس خبر پر اظہار شادمانی اور لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے جرمن ہٹرہ پنی (Howitzer) سے دو گولے چلائے گئے۔ یہ توپ چونکہ مستور موضع (Covered position) سے یعنی دشمن کی نگاہ سے اوجھل ہو کر فیر کر سکتی تھی اور اس کے گولے کا محرک (Trajectory) قوس دار ہونے کی وجہ سے گولہ پہاڑ کی چوٹی کے اوپر سے گزر کر پہاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے ہدف (نشان) پر لگ سکتا تھا، اس سے لوگوں کی بہت ہمت افزائی ہوئی۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے ایک تقریر کی اور لوگوں کو جہاد کا شوق دلایا، افغانی فوج اور قوم کی بہادری اور جنگ جوئی کو سراہا۔

اس تقریر کا مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم جب کبھی اپنے افسروں اور قبیلوں کے سرداروں سے جنگ کے بارے میں گفتگو کرتے تو ہمیشہ صرف افغانوں کی بہادری کا ذکر کرتے اور کبھی بھی یہ نہ کہتے کہ اس لڑائی میں ہندوستانی مسلمان ہمارے ساتھ ہیں اور ہم کو ان کی مدد کی ضرورت ہے اور اگر وہ افغانی فوجوں کا ساتھ نہ دیں تو کام مشکل ہو گا۔ اس لئے ہندوستانی لوگوں سے اور خاص کر وہاں کے مسلمانوں سے تعاون کرنا اور ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کے مال اور ان کی جان کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ تقریر کے ختم ہونے پر میں نے ان کی خدمت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی توجہ اس پر دلائی کہ اگر ہندوستانی مسلمان ان کی فوج کی مدد نہ کریں تو ان کے کام میں بہت رکاوٹیں پڑ جائیں گی۔

سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو میری باتیں پسند نہیں آئیں۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی افغانوں کی بہادری کا دم نہ بھرا۔ اگر وہ اس بارے میں میری رائے پر کام کرتے تو ٹھل کے شہر میں، جو افسوس ناک واقعات ہم کو پیش آئے اور جن کا ذکر آگے چل کر ٹھل کی لڑائی کے

سلسلہ میں کیا جائے گا، وہ ہمیں ہرگز پیش نہ آتے۔

کابل سے جو خبریں بعد میں آئیں ان سے معلوم ہوا کہ لنڈی کوتل پر قبضہ کی خبر اور پشاور کے محاصرہ کی اطلاع سب غلط اور مبالغہ آمیز تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرحدی قبیلوں کے آدمیوں نے افغانوں کے کہنے پر انگریزوں کے بر خلاف ہتھیار اٹھائے اور لنڈی کوتل پر چند ایک فیر کر دیئے۔ اس سے لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ لنڈی کوتل پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا اور پشاور کا محاصرہ کر لیا گیا۔

اگلے روز ہم خوست کے مرکز متون میں پہنچے۔ یہاں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے دس روز قیام کر کے رسد کا بندوبست کیا۔ رسد کو محاذ تک پہنچانے کے لئے جتنے باربرداری کے جانوروں کی ضرورت تھی، اس کا انتظام کیا۔ یہاں رہتے ہوئے میں نے ایک انگریزی فوجی نقشہ سے جو کسی طرح سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ہاتھ آ گیا تھا، ٹھل کے علاقے کا نقشہ بڑے پیمانے پر بنایا۔ یعنی اس فوجی نقشے کا وہ حصہ جو ٹھل کے متعلق تھا اس کو (enlarge) کیا۔ اس طرح پر چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی اچھی طرح واضح نظر آنے لگیں۔ آگے چل کر یہ نقشہ افغانی فوجوں کے بہت کام آیا۔

سردار سپہ سالار صاحب محمد نادر خان کو رسد کا سامان بہم پہنچانے میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ کیونکہ ضلع خوست کے کمشنر نے جس کو افغان حاکم کہا کرتے ہیں، باوجودیکہ اس کو بہت پہلے سے خبر دی گئی تھی، اس نے نہ غلہ جمع کیا اور نہ ہی فوجی کمانڈر کے ساتھ تعاون کر کے فوجی تیاریوں میں اس کو مدد دی۔ فوجیوں کو کئی مہینے سے تنخواہ نہ ملی تھی کیونکہ خزانہ میں پیسہ نہ تھا۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے، جو روپیہ ان کے ساتھ تھا، اس سے سپاہیوں کی پچھلی تنخواہیں دیں اور اس طرح پر ان کی ذرا ڈھارس بندھی۔ یہاں اگلے روز ہمیں خبر ملی کہ وزیریوں اور محسودیوں نے وانا اور دوسرے انگریزی قلعوں پر حملے کیے۔ وانا کے سرحدی ملیشیا (militia) کے سپاہی قلعے کو خالی کر کے کچھ اپنے گھروں کو چلے گئے اور چند ایک سردار شاہ ولی خان کے پاس آ گئے اور ان کو اپنے ہتھیار دے دیئے۔ وزیریوں اور محسودوں نے ٹیلیفون کے تار اور کھمبے اکھاڑ کر انگریزوں کے ذرائع رسل و رسائل کو تہ و بالا کر دیا جس سے انگریزوں میں بہت ہراس پیدا ہوا۔ بعد میں اس لوٹ کے سامان کو ملیشیا کے سپاہی اور سرحدی مجاہد انعام لینے کے لئے کھینچ کر افغانستان لے آئے تھے۔ متون میں ہمیں آئے ہوئے تین دن ہوئے تھے کہ کابل

سے جلال آباد کے محاذ کے درہم برہم ہونے کے متعلق سرکاری طور پر خبر آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صالح محمد خاں نے کابل سے اعلان جنگ کئے جانے سے پہلے، تورخم کے مقام پر ایک متنازع فیہ چشمہ پر قبضہ کر کے ۲/ مئی ۱۹۱۹ء کو انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ایک ہوائی جہاز بھیج کر اس کی فوج پر بم پھینکے۔ جس سے اس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اس پر وہ "پائے ماشہید شد" (میرا پاؤں شہید ہو گیا) کہتا ہوا محاذ سے ہٹ کر ڈکہ کی طرف پسپا ہوا۔

فوج اپنے کو بے سر اور بے کمانڈر دیکھ کر میدان سے پیچھے ہٹی۔ انگریزی رسالہ نے اس کا تعاقب (پیچھا) کیا اور ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد کے صوبے کے لوگوں نے اس شکست سے یہ سمجھا کہ بس اب حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس پر انہوں نے آکر شہر جلال آباد کو لوٹ لیا۔ ان کی اس پاجیانہ حرکت سے قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں حب الوطنی کس حد تک تھی۔ اس سرکاری خبر کے ساتھ امیر صاحب نے سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو یہ حکم بھی بھیجا کہ فوراً آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کریں تاکہ انگریزی فوجیں ڈکہ سے آگے بڑھ کر جلال آباد پر قبضہ نہ کر سکیں۔

اس خبر سے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو اور ان کے ہمراز اشخاص کو جن میں میں بھی داخل تھا، بہت رنج ہوا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ سارے جنگی منصوبے خاک میں مل گئے۔ لیکن یہ خبر فوجیوں، افسروں اور ملکی کارکنوں سے بالکل پوشیدہ رکھی گئی اور اگلے روز فوج کو سرحد کی طرف بڑھنے کا حکم دے دیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کے حواس بالکل باختہ تھے، وہ نہ تو فوجی کشف (reconnaieanee) کرا کے افغانی فوجوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اطلاع حاصل کر سکے، اور نہ ہی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ افغانستان کے اصلی حالات معلوم کر سکے۔ پنجاب کی بدامنی اور شورش کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ ورنہ اگر ذرا اطمینان سے، جرأت سے کام لیتے تو ڈکہ پر قبضہ کرنے کے بعد جلال آباد کے لٹنے کی خبر پر جلال آباد کو باآسانی اپنے قبضے میں لا سکتے تھے، اور سمت جنوبی کے محاذ پر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے سرحد سے آگے قدم بڑھاتے ہی ان پر حملہ کر کے ان کی فوج کو شکست دے سکتے تھے۔ کیونکہ افغانی فوج کو جنگ کا تجربہ نہ تھا، اور نہ ہی اس میں فوجی نظم وضبط (Discipline) کا نام و نشان تھا۔ سرحدی چوکیوں کے ملیشیا کا افغانوں کے ساتھ مل جانا بھی، انگریزوں کے لئے ہراس کا باعث ہو گیا تھا۔

سپہ سالار سردار محمد نادر خان کا ٹھل پر حملہ

متون میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے میرے تیار کردہ نقشے کا مطالعہ کیا اور اس کو تدقیق کر کے، اس کی بنیاد پر اپنے جنگی پلان کو بنایا۔ لیکن اس کا کسی سے ذکر نہ کیا۔ یہاں چار روز کے قیام کے بعد متون سے انہوں نے ایک پیادہ رجمنٹ اور چند ایک پرانی خچری توپیں اپنے ساتھ لیں۔ دو جرمنی ہڑدہ پنی ہوٹزروں (Howitzers) میں سے ایک توپ کو متون میں چھوڑا اور اس کے گولہ بارود کو دوسری توپ کے گولہ بارود میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے کر سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دونوں توپوں کا گولہ بارود اتنا تھوڑا تھا کہ اس کو دو توپوں پر تقسیم کرنا اور دونوں توپوں کو محاذ پر لے جانا بالکل بے سود تھا۔

اگلے روز افغانی فوج ایک ایسے چھوٹے سے سرحدی گاؤں میں پہنچی جو ٹھل اور میرام شاہ کی انگریزی چھاؤنیوں سے پیدل ایک ایک روز کے فاصلہ پر تھا۔ اس پڑاؤ پر پانی بہت کم میسر آتا تھا۔ سایہ کے لئے درخت تو بالکل نہ تھے۔ آخر شام کے وقت سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنے خیمے میں جو پہلے کی نسبت چھوٹا تھا اور جس میں اب ان کے ساتھ نہ سو سکتا تھا، مجھے اور حضرت شور بازار کو بلا کر اپنی جنگی پلان بتائی اور اس کے بارے میں ہماری رائے لی۔ اس سے افغانی فوجی افسروں اور فوجی سسٹم کے اس زمانے میں کس قدر نکمے ہونے کے بارے میں ذرا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ سپہ سالار صاحب مرحوم اپنے فوجی افسروں سے مشورہ کر کے اپنی جنگی پلان بنائیں، انہوں نے اکیلے ہی پلان بنائی اور اس کی خوبی یا خرابی کے بارے میں مجھ سے جس کو فنون جنگ کا بالکل علم نہ تھا، اور حضرت شور بازار سے جس کو نقشہ دیکھنا اور سمجھنا بھی نہ آتا تھا، رائے طلب کی، اور اپنے افسروں کو بالکل بے خبر رکھا۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کا اپنی فوجی پلان کو اپنے افسروں سے پوشیدہ رکھنے کا شاید مقصد یہ تھا کہ انگریزوں پر اچانک حملہ کریں اور ان کو کسی طرح بھی اپنے منصوبوں سے خبردار نہ ہونے دیں۔ اگر ان کا مقصد یہ تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے افسروں میں سے کسی پر بھی بھروسہ نہ تھا کہ ان کے منصوبوں کو پوشیدہ رکھے گا اور مجھ پر اور حضرت شور بازار پر اپنے افسروں کی نسبت زیادہ رازداری کا اعتماد تھا۔

سردار سپہ سالار مرحوم نے اس پلان کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ "یا تو ٹھل پر اصلی حملہ ہونا چاہئے یا میرام شاہ پر۔ اگر میرام شاہ کی چھاؤنی پر حملہ کیا جائے تو وزیریوں کی مدد حاصل ہو سکتی ہے اور میرام شاہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد بنوں تک افغانی فوجوں کا راستہ کھل جائے گا اور وہاں سے پنجاب میں داخل ہونا آسان ہو گا۔ لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ کوہاٹ کی انگریزی فوجیں ٹھل کے گیریزن (garrison) کو اپنے ساتھ لے کر کرم کے راستہ کوتل پیواڑ پر حملہ کر سکتی ہیں اور اگر پیواڑ ان کے قبضے میں آ جائے تو وہاں سے علاقہ جاجی کے راستے (لہوگرد) کے علاقہ میں اتر کر تین دن کے اندر اندر کابل پر حملہ آور ہو سکتی ہیں اور اس طرح پر ان کے لڑائی جیتنے کا امکان بڑھ جاتا ہے، کیونکہ کابل میں اب زیادہ فوج موجود نہیں ہے۔

"لیکن اگر ٹھل پر پوری طاقت سے حملہ کیا جائے تو کوہاٹ اور پیواڑ کی انگریزی فوجیں ایک دوسرے سے کٹ جائیں گی اور کابل پر انگریزی یلغار کا خطرہ بالکل مٹ جائے گا۔ اس کے بعد افغانی فوجیں کوہاٹ کی طرف بڑھ کر پشاور کی انگریزی فوجوں کو پیچھے سے دھمکی دے سکیں گی۔ لیکن اس میں صرف یہ ڈر ہے کہ انگریز میرام شاہ سے جرات کے ساتھ متون پر حملہ کریں تو افغانی فوجیں ٹھل اور متون کے درمیان گھیرے میں پڑ سکتی ہیں"۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنی پلان کو واضح کرتے ہوئے اپنی تقریر کو اس طرح جاری رکھا۔ "میں انگریزوں کے، میرام شاہ سے پیش قدمی کر کے متون پر حملہ کرنے کی کوشش کو چنداں ممکن نہیں سمجھتا، کیونکہ ہندوستان میں سخت بدامنی ہے، وہ ایسی حالت میں افغانی سرزمین پر قدم رکھنے کی جرات نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میں نے ٹھل پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انگریزوں کو جنگی طور پر دھوکہ دیا جائے اور خدع حرب سے کام لیا جائے۔

(یعنی ایسی چال چلی جائے جس سے انگریزوں کو گمان ہو کہ افغانی فوج کا بڑا حصہ میرام شاہ پر حملہ کرے گا۔) اس لئے میں آج رات کو ایک چھوٹا سا پیادہ فوجی دستہ اور دو توپیں کرنل عبدالقیوم خان کی کمان میں دے کر میرام شاہ کو روانہ کروں گا تا کہ صبح کو دن نکلتے ہوئے میرام شاہ کی چوکی سپین دام (آوٹ پوسٹ) پر جو میرام شاہ اور ٹھل کے درمیان ہے گولہ باری کرے جس سے انگریزوں کو یقین ہو جائے کہ یہ دھاوا افغانی فوج کے ہراول کی طرف سے بولا گیا ہے اور اس کے بعد اصل افغانی فوج میرام شاہ پر حملہ آور ہو گی۔ اس دستہ کو حکم دیا جائے گا کہ اپنا یہ فرض ادا کرنے کے بعد ٹھل کی طرف بڑھے۔ اس کے بعد اگلی شام کو ایک پیادہ پلٹن اور دو خچری توپیں

کرنل عبداللطیف خاں کی کمان میں ٹھل کی طرف روانہ کی جائیں گی۔ لیکن وہ انگریزوں سے جنگ نہ کریں گی بلکہ دریائے کرم کے کنارے کی پہاڑیوں کو اپنے قبضہ میں لا کر اگلے روز وہاں پہنچنے والی بڑی افغانی فوج اور میرے آنے کا انتظار کریں گی اور جب ساری فوج ٹھل کے محاذ پر پہنچ جائے تو دفعتہً ہلہ بولا جائے گا"۔

ہم نے ان کی اس جنگی پلان کو بہت پسند کیا۔ اس لئے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس وقت اس پلان کا ہم تینوں کے سوا اور کسی کو علم نہ تھا۔ آخر کار سردار سپہ سالار مرحوم نے کرنل عبدالقیوم خاں کو بلا کر ضروری احکام دیئے اور اس کو راتوں رات میرام شاہ کی طرف روانہ کر دیا۔ صبح کو اس نے میرام شاہ کی اس چوکی پر حملہ کیا۔ اس کی گولہ باری کی وجہ سے وہاں کے سپاہی اپنے تھانے کو چھوڑ کر بھاگ نکلے اور میرام شاہ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ عبدالقیوم خاں اس طرح پر اپنے فرض کی ادائیگی میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے یہ خبر ہم کو دوپہر کے وقت بھیج دی اور خود وہاں سے ٹھل کی طرف روانہ ہو گیا۔

شام کو عبداللطیف خان کو حکم ملا کہ اپنے فوجی دستہ، اپنی توپوں اور قبیلہ منگل کے مجاہدوں کے ساتھ پڑاؤ سے ٹھل کی طرف روانہ ہو اور دریائے کرم کے کنارے کی پہاڑیوں پر اپنی دو توپیں چڑھا کر اصل فوج کے آنے کا انتظار کرے۔

اگلے روز (۲۷/مئی) سردار سپہ سالار مرحوم نے علی الصباح اپنی فوج کے بڑے حصے کے ساتھ ٹھل کی طرف کوچ کیا۔ چار گھنٹے کے سفر کے بعد، باوجود اس کے کہ ہم ابھی ٹھل سے بہت دور تھے کہ ہمارے کانوں میں توپوں کی آواز آنے لگی۔ ہم اس کے معنی بالکل نہ سمجھے کیونکہ عبداللطیف کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوج کا بڑا حصہ پہنچنے سے پہلے لڑائی شروع نہ کرے۔ اس پر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سرپٹ محاذ کی طرف بڑھے۔ میں اور امیر عبدالرحمٰن خان کا وزیری غلام بچہ پادشاہ میر خان، محمد یوسف خان لہوگردی اور شاہی رسالے کے سپاہی ان کے ساتھ چلے۔ میں، پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہی رہا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو جب کبھی کسی اہم کام کے سرانجام دینے کی ضرورت پیش آتی تھی، جس کو ان کے فوجی افسر نہ کر سکیں، تو وہ ہم میں سے ایک کو ایسے کام پر مقرر کر دیا کرتے تھے۔ ہم گویا ان کے ایک طرح کے مشاور خاص اور ضرورت کے وقت ان کے دست و بازو تھے۔ کچھ آگے بڑھنے پر ہم کو ایک سپاہی ملا جس کے ہاتھ

عبداللطیف خان نے سردار سپہ سالار صاحب کو ایک پیغام بھیجا تھا

اس نے ہمیں بتایا کہ "لڑائی منگل مجاہدین کے شہر ٹھل پر بلا اجازت حملہ کرنے اور شہریوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جانے کے باوجود ان کے شہر میں لوٹ مار کرنے کی وجہ سے شروع ہوئی۔ انگریزوں نے مجاہدین پر فیر کئے۔ اس لئے عبداللطیف خان نے انکی حفاظت کے لئے توپ چلانے کا حکم دیا۔ اس پر انگریزی توپوں نے عبداللطیف خان کی توپوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کی توپیں پرانی قسم کی تھیں جو موضع مستور سے یعنی دشمن کی نگاہ سے اوجھل رہ کر فیر نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے انگریزی توپوں کا گولہ ان میں سے ایک توپ کو بہ آسانی لگا اور وہ خراب ہو گئی اور توپ چلانے والے افغانی سپاہی بھی زخمی ہوئے۔ توپوں کے پاس مرہم پٹی کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ زخمی سپاہی بالکل بے کسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور فوج شکست کھا کر اپنے مورچوں سے پیچھے ہٹنے کو تیار ہو رہی ہے"۔

اس پر سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنے محافظوں میں سے رسالہ شاہی کے دو سواروں کو حکم دیا کہ فوراً واپس جا کر فوج کو کہیں کہ جبری مارچ کرتے ہوئے اور راستہ میں رکنے کے بغیر آگے بڑھے اور جتنی جلدی ہو سکے محاذ پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ لیکن ان نمک حرام سواروں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور یہ بہانہ کیا کہ "ہم تو آپ کی ذات کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں اور آپ کا ساتھ چھوڑ کر اور کسی دوسرے کام پر نہ جائیں گے"۔ لیکن اصل میں وہ ڈرتے تھے کہ کہیں واپس جاتے ہوئے راستے میں ان کو انگریزی رسالے کا سامنا نہ ہو جائے۔ سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم ان کی سرکشی سے بہت پریشان ہوئے۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھ کر فوراً اپنی خدمات پیش کیں اور ان کو کہا کہ "میں اکیلا جا کر انکے اس حکم کو فوج تک پہنچا دوں گا اور فوج کو جلد از جلد کوچ کرا کے محاذ پر لے آؤں گا"۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم اس سے بہت خوش ہوئے اور میری جرات کی داد دینے لگے۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر: "آپ کو میں کسی اور اہم فرض پر بھیجوں گا" مجھے اس کام پر روانہ نہ کیا۔ ان کا اپنا نوکر اس کام پر بھیجا گیا جس نے انکا حکم پیادہ فوج کے کمانڈر کو پہنچا دیا۔ فوج اس کے کوئی تین گھنٹے بعد یعنی ظہر کے بعد محاذ پر پہنچی۔ اس نوکر کے روانہ ہونے تک دوپہر ہو چکی تھی۔ گرمی اتنی شدت سے پڑ رہی تھی کہ میرے لئے بندوق کی نالی کو ہاتھ لگانا اور اس میں گولی بھرنا بہت دشوار تھا۔ بندوق کے پرزے آگ کی طرح ہاتھ جلاتے تھے۔ وہاں نہ کوئی درخت تھا اور نہ

کہیں سایہ تھا کہ ذرا دھوپ سے بچاؤ ہو۔ ہم اپنے گھوڑوں کی ٹانگوں کے نزدیک زمین پر بیٹھے ہوئے تھے تاکہ ان کے بدن کے سایہ میں ذرا دھوپ اور گرمی سے بچیں۔

اس عرصے میں خبر آئی کہ انگریزی رسالہ دریائے کرم کو عبور کر کے عبداللطیف خان کی توپوں کے موضع (position) کو پیچھے سے گھیرنے کے لئے بڑھ رہا ہے، اور ہماری طرف بھی اسکے آنے کا احتمال ہے۔ اس پر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے حکم دیا کہ "رسالہ شاہی کے سپاہی ارد گرد کی پہاڑیوں پر چڑھ جائیں اور اگر انگریزی رسالہ کو ادھر آتا دیکھیں تو اس پر فیر کریں"۔

اس پر بھی رسالہ شاہی کے سواروں نے وہی بہانہ کیا جو پہلے فوج کو بلانے کے لئے جانے سے انکار کرتے وقت کیا تھا۔ اس طرح انہوں نے سرکشی کر کے اس حکم کی تعمیل سے بھی انکار کر دیا۔ ایسے نازک موقع پر جب کہ کمانڈر کے پاس سپاہی بھی کم ہوں اور وہ سپاہی بھی اس کا حکم نہ مانیں تو اس کی پریشانی اور مایوسی کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ سردار سپہ سالار محمد نادر خان اس وقت ایک ایسی ہی خطرناک حالت میں تھے۔ اس پر میں، پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان آگے بڑھے اور ہم نے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو کہا کہ "ہم اس کا ذمہ لیتے ہیں اور ہم سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر دشمن کی دیکھ بھال کرے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس پر فیر کر کے اس کو ہم یہ دکھلائیں گے کہ میدان بالکل خالی نہیں ہے۔ اس طرح اس کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کریں گے اور آخری دم تک اپنی جگہ پر جم کر لڑتے رہیں گے"۔ ہمارے ایسے نازک وقت پر اپنی خدمات پیش کرنے سے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی ہمت بڑھی اور ہم ان کے حکم کے مطابق ان پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن خدا کی شان کہ انگریزی رسالہ دریائے کرم کے کنارے ہی رک گیا اور ہماری طرف نہیں بڑھا۔ اگر بڑھتا تو ہم تین آدمی اس کو کیسے روک سکتے تھے۔ اس وقت تو ایسا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریز سوار ذرا جرأت سے کام لے کر آگے بڑھ آتے تو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم اور ان کے سارے سپاہیوں کو قید کر سکتے تھے۔

ابھی اس طرف سے ذرا سا اطمینان ہی ہوا تھا کہ دور کی پہاڑیوں پر سے ہم نے ایک جم غفیر کو دریائے کرم سے افغانی سرحد کی طرف جاتا ہوا دیکھا۔ اس طرف ایک سوار بھیجا گیا۔ اس نے وہاں سے واپس آ کر خبر دی کہ قبیلہ منگل اور قبیلہ جدران کے مجاہد کپڑے کے تھان لئے ہوئے

اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے ان کو گھروا کر موڑنا چاہا لیکن ان میں اکثر بچ کر نکل گئے اور اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ گویا ان کی رائے میں ان کے جہاد کا کام ختم ہو چکا تھا۔ جو پکڑے گئے ان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے کپڑے کے تھان شہر ٹھل کو لوٹ کر حاصل کئے تھے۔ یہ تھان ان کے ہاتھ سے لے لئے گئے اور ان کی اور ان کے سرداروں کی آنکھوں کے سامنے جلا دیئے گئے۔ ان لوگوں کو پھر محاذ کی طرف بھیج دیا گیا۔
تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جب ان قبیلوں نے شہر کی طرف پیش قدمی کی تو شہر کے ارد گرد کی بعض فوجی چوکیوں کے سپاہی یہاں سے نکل کر ٹھل کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے اور اس طرح پر شہر کا راستہ مجاہدین کے لئے کھل گیا۔ جب مجاہدین شہر کی طرف بڑھے تو وہاں کے لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو شربت اور لسی پیش کی۔ یہ قبیلے والے جو گرمی میں پیاس سے بڑے ہراساں تھے شہر کے لوگوں کے اس برتاؤ سے بہت خوش ہوئے۔ لیکن اپنی پیاس بجھاتے ہی انہوں نے شہر میں لوٹ مار شروع کر دی، اور بزازوں کی دکانیں یغما کر کے، کپڑے کے تھانوں کو اپنے کندھوں پر لاد کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ جیسے کہ جہاد کا مقصد، صرف کپڑے کے چند ایک تھان ہی حاصل کرنا تھا۔ ان لوگوں کی اس ناپاک حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے لوگ افغانی فوج سے دل برداشتہ ہو گئے۔ تمام دکانیں بند ہو گئیں۔ اس وجہ سے مجاہدین کو روٹی اور آٹا داموں سے بھی ملنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ افغانستان سے صرف باقاعدہ فوج کے لئے رسد کا سامان آتا تھا اور مجاہدین کو نقدی دی جاتی تھی کہ وہ اپنے کھانے کا خود انتظام کریں۔

اس یغماگری کی پیش بندی ممکن تھی۔ اگر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم اپنی تقریروں میں جو مجاہدین کی ہمت افزائی کے لئے وہ وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے، ان کی توجہ اس طرف دلاتے اور ان کو لوٹ مار نہ کرنے کے بارے میں نصیحت کرتے رہتے تو شاید ان لوگوں کو یغماگری سے باز رکھنا ممکن ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے کبھی ان لوگوں کو اس قسم کی نصیحت نہ کی اور جب میں نے ان کو ایک دفعہ یہ بات سجھائی (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) تو ان کو میرا یہ کہنا ذرا ناگوار گزرا۔ ان لوگوں کی اس مذبوحانہ حرکت سے یہ بات تو اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ مجاہدین ایک بے سروپا لشکر ہے جس میں نظم و ضبط (Discipline) کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں سے باقاعدہ جنگ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے ۱۹۴۹ء میں

جب میں پہلی دفعہ ۳۴ سال کے بعد لاہور گیا تو سنا کہ جہاد کشمیر میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آئے اور وہاں بھی مجاہدین نے اپنے اور پرائے میں کوئی فرق نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدین اور رضاکاروں پر تکیہ کر کے فوجی کارروائی کا اقدام کرنا بالکل غلط ہے اور اس کا نتیجہ شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس روز عصر کے قریب افغانی فوج کا بڑا حصہ بھی میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ شام تک سپاہی اپنے خیمے لگانے اور روٹی سالن پکانے میں لگے رہے۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنے بڑے خیمے کی بجائے دوسرے سپاہیوں کے خیموں کے مانند ایک چھوٹا خیمہ اپنے لئے لگوایا۔ اس لئے میں یہاں ان کے خیمے میں نہ سو سکا۔ میرے لئے باہر ان کے خیمہ کے دروازے کے نزدیک بستر بچھا دیا گیا۔

ایک طرف خیمہ بندی کی یہ کارروائی ہو رہی تھی اور دوسری طرف سپہ سالار صاحب مرحوم نے اگلے روز کے لئے فوجی مورچوں اور خاص کر جرمن ہوٹزر (Howitzer) توپ کے لئے مناسب مورچہ کی جگہ تلاش کرنے کی خاطر دریائے کرم کے کنارے کی پہاڑیوں کا دورہ شروع کیا۔ ان کی طبیعت اس روز کچھ ناساز تھی۔ بعض جگہوں پر گھوڑے سے اتر کر پیادہ بھی چلنے کی ضرورت پیدا ہوتی تھی۔ تکان اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ آخر کار اتنے بے سکت ہو گئے کہ ان میں پڑاؤ تک جانے کی بھی طاقت نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ وہ رات یہیں پہاڑیوں میں گزاریں گے۔ لیکن ہم چند مخلص جوان کے ساتھ تھے، اس پر راضی نہ ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ "اگر آپ کی فوج کو یہ خبر ملی کہ ان کے سپہ سالار پڑاؤ میں نہیں ہیں تو اس سے ان کی بے دلی ہو گی اور ان میں ہر طرح کی بری افواہیں پھیل جائیں گی۔ یہاں تک کہ بعض بدخواہ شاید یہ بھی مشہور کر دیں کہ سردار سپہ سالار صاحب کو انگریزوں نے پکڑ لیا ہے"۔ اس پر وہ راضی ہو گئے اور اندھیرے میں گرتے پڑتے پڑاؤ کو واپس آئے۔ بھوک سے ہم سب بے تاب تھے۔ جب دسترخوان لگایا گیا اور سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے پلاؤ اور گوشت کی رکابیاں بھری ہوئی دیکھیں، تو حکم دیا کہ میدان جنگ میں ان کے لئے صرف اسی قسم کا کھانا تیار کیا جائے جو ان کے ایک معمولی سپاہی کو نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ چھ راتیں جب ہم ٹھل کے میدان جنگ میں تھے تو ہم سب نے سپاہیوں کے کھانے جیسے سالن اور روٹی کے سوا اور کسی قسم کا کھانا نہ کھایا۔ یہ کھانا بھی ہمیں صرف رات کو ملتا تھا۔ دن کے وقت تو روکھی روٹی اور پانی پر ہی گزارہ ہوتا تھا۔

اگلے روز جرمن ہوٹزر توپ کو ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر انتخاب شدہ مورچہ تک لایا گیا۔ یہاں سردار سپہ سالار مرحوم نے مجھے کہا کہ اس نقشہ کی مدد سے جو میں نے متون میں تیار کیا تھا اس مورچہ سے ٹھل کے قلعہ تک کا فاصلہ معلوم کروں۔ میں نے نقشہ سے ماپ کر یہ فاصلہ میل اور گز کے حساب سے ان کو بتایا۔ انہوں نے مجھے اس کو میٹر (Meter) میں تحویل کرنے کو کہا۔ کیونکہ اس توپ کی مار منزل یعنی رینج (range) میٹر کے حساب سے تھی۔ توپ کا افسر اس عمل تحویل سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی وہ نقشہ سے دو جگہوں کے درمیانی فاصلہ کو ماپ سکتا تھا۔ توپ کا مورچہ ایک پہاڑی کے پیچھے اور دشمن کی نظر سے اوجھل ہونے کی وجہ سے، مورچہ سے قلعہ ٹھل جو گولہ باری کے لئے نشانہ بنایا گیا تھا، نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے توپ کی نالی کو اس چھپے ہوئے مورچہ سے ٹھل کے قلعہ کی جانب ٹھیک طور پر موڑنا ضروری تھا۔ توپ کا افسر یہ کام بھی نہ جانتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صلح میں افغانی سپاہیوں کو فوجی تعلیم، خاص کر توپ بازی کی تعلیم اس وقت بالکل نہ دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ افسر بھی اپنے فوجی فرائض کو نہ جانتے تھے۔ اس پر سردار سپہ سالار مرحوم نے خود ہی اس توپ کو تین (Aiming Post) یعنی نشانہ لگانے والے بانس کے ذریعے قلعہ ٹھل کی سیدھ میں لگایا اور فیر کیا۔ توپ کا ٹھیک طور پر قلعہ کی سیدھ میں آجانے اور قلعہ کا توپ کے مورچہ سے فاصلہ بھی درستی سے حساب کئے جانے کی وجہ سے پہلا گولہ ہی قلعہ کے گوداموں پر پھٹا جس سے وہاں کے گولہ بارود اور گھاس کے تودوں کو آگ لگ گئی اور قلعہ سے سیاہ دھوئیں کا ایک ستون آسمان کی طرف بلند ہوا۔ اس کو دیکھ کر مجاہدین کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے شہر کے ارد گرد کی بعض چوکیوں پر، جو ابھی تک انگریزوں کے ہاتھ میں تھیں، قبضہ کر لیا۔ فوج میں بھی اس نظارے سے ایک شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس توپ نے چند ایک گولے اور چلائے لیکن چونکہ اس کا بارود گولہ بہت کم تھا اور کابل سے بھی آنے کی امید نہ تھی، اس لئے فیر بند کر دیئے گئے۔

اس گولہ باری کے بعد انگریز کمانڈر نے اپنا ہوائی جہاز اس توپ کے مورچے کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے ہمارے محاذ کی طرف بھیجا۔ کچھ دیر بعد یہ ہوائی جہاز ہمارے سروں پر سے گزرا لیکن وہ نہ تو توپ کے مورچہ کو پہچان سکا اور نہ ہی محاذ کے فوجیوں کا کھوج لگا سکا۔ اس لئے اس نے ہم پر کوئی بم نہ گرایا اور افغانی سرحد کی طرف بڑھا۔ کچھ منٹ کے بعد بموں کی گونج پہاڑیوں سے سنائی دینے لگی۔

شام کو ہم جب پڑاؤ پر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ اس ہوائی جہاز نے ہمارے خیموں کو دیکھ

کر ان پر چند ایک بم گرائے جس سے کچھ سائیس، رسد پہنچانے والے سپاہی اور فوج کا کھانا پکانے والے آدمی زخمی ہوئے۔ ان کی آہ و بکا پر ڈاکٹر اور کمپونڈر کی تلاش کی گئی۔ لیکن ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا اور زخمی بلا مرہم و پٹی تڑپتے رہے۔ آخر اندھیرا ہونے پر ڈاکٹر اپنے خیمے میں واپس آیا۔ اس کو وہاں سے پکڑ کر سپاہی سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی خدمت میں لائے۔ یہ ڈاکٹر حصار کے ضلع کا رہنے والا ایک ہندوستانی عبدالحلیم نام تھا۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم تو اپنے زخمی سپاہیوں کا حال زار دیکھ کر لال پیلے ہو چکے تھے۔ جب انہوں نے ڈاکٹر کو دیکھا تو اس کو اس نازک موقع پر اپنا فرض منصبی پورا نہ کرنے اور سارا دن کسی غار میں، جان بچانے کے لئے چھپے رہنے اور زخمیوں کی دیکھ بھال نہ کرنے پر بہت کچھ برا بھلا کہا اور مجھے بلا کر اس کو دکھلایا اور کہا:۔

"یہ بھی ایک ہندوستانی ہے جو آپ سے عمر میں بہت چھوٹا ہے لیکن اپنے افغانی بھائیوں کے ساتھ جاں نثارانہ لڑائی میں شریک ہے۔ نہ اس کو ہوائی جہاز سے ڈر لگتا ہے اور نہ توپ کے گولوں سے۔ آپ کو ذرا شرم آنی چاہئے کہ آپ سارا دن چھپے رہے اور میرے زخمی سپاہی بغیر مرہم پٹی کے تڑپتے رہے"۔

ڈاکٹر نے اس پر دم نہ مارا اور وہاں سے جدا ہو کر، سپاہیوں کے علاج معالجہ میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز پھر ہماری جرمن ہوٹزر نے چند ایک گولے چلائے اور فوج نے قلعہ کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس لئے قلعہ والوں کے ہتھیار ڈالنے کے بارے میں کچھ امید پیدا نہ ہو سکی اور یہ سارا دن اسی طرح دونوں طرف سے کہیں کہیں فیر کرنے میں گزرا۔ انگریزی ہوائی جہاز نے پھر ہمارے پڑاؤ پر بم گرائے اور قلعہ کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں جہاں کہیں مجاہدین کی ٹولی دیکھی اس پر بم باری کی۔ اس سے کوئی بڑا جانی نقصان تو نہ ہوا لیکن مجاہدین حواس باختہ رہنے لگے اور جب کبھی ہوائی جہاز ان کے اوپر سے اڑتا تو وہ سارا کاروبار چھوڑ کر "جوز راغے" (یعنی جہاز آگیا) کہتے ہوئے تتر بتر ہو جاتے تھے۔

جنگ کے تیسرے روز سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے مجھے انگریزی فوجوں کو ہتھیار ڈالنے پر راضی کرنے کی غرض سے ٹھل بھیجا تا کہ وہاں سے ایک سفید جھنڈا لے کر قلعہ کی طرف جاؤں اور انگریزی کمانڈر سے بات چیت کر کے اس کو قلعہ ٹھل کو افغانی فوجوں کے حوالے کرنے

پر تیار کروں۔ شہر میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ساری دکانیں بند ہیں اور نہ صرف فوج کو بلکہ شہریوں کو بھی روٹی اور ضروریات زندگی نہ ملنے کی وجہ سے، بہت تکلیف ہے۔ میں نے اپنے رہبر کے ذریعہ شہر کے شرفا اور تاجروں کو بلا کر ان کو اطمینان دیا کہ ان کی جان اور مال کو اب کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اس لئے اب ان کو چاہئے کہ خاطر جمع سے رہ کر اپنی دکانیں کھول دیں اور حسب دستور کاروبار میں لگ جائیں۔ اس پر سب سے پہلے کھانے پینے کی دکانیں کھل گئیں اور بازار میں پھر آہستہ آہستہ چہل پہل ہونے لگی۔

ایک طرف تو شہر اور قلعہ کے درمیان اور دوسری طرف ہمارے محاذ اور شہر کے درمیان بعض انگریزی چوکیاں اور پکٹیں (pickets) ابھی تک مقابلہ کر رہی تھیں، اور ان کے اندر رہنے والے سپاہی اپنی جگہوں پر ڈٹے ہوئے تھے، اور آنے جانے والوں پر وہاں سے گولیاں چلاتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے محاذ اور شہر کے درمیان آمدورفت امن اور اطمینان سے نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ان چوکیوں کے سپاہیوں کو خبر بھیجی کہ اگر وہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں تو ان کی جانیں بخش دی جائیں گی۔ ان کے ہتھیار ان کے ہاتھ میں رہنے دیئے جائیں گے، اور کوئی ان سے پرخاش نہ کرے گا۔ اس پر بعض چوکیوں کے سپاہی بمعہ اپنے ہتھیاروں کے ہم سے آملے، اور میں نے ان کو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی خدمت میں بھیج دیا۔ لیکن چند ایک دوسری چوکیوں کے سپاہی جو قلعہ کے نزدیک تھیں، اپنی چوکیوں کو خالی کر کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔

میں نے رات کو شہر میں کرفیو لگایا اور رات کو لوگوں کو بغیر اجازت اپنے گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں کہیں پھر فتنہ و فساد اور یغماگری نہ ہو سکے۔ شہر میں مختلف اور اہم جگہوں پر پہرے لگوا دیئے اور فوجی پٹرول (Petrol) چلانے کا انتظام کیا۔ تاکہ رات کو سپاہی شہر میں گھوم کر دورہ کریں۔ پاس ورڈ (Password) جس کو افغانستان میں جہاں اس زمانے میں امن وامان کے دنوں میں بھی رات کو کرفیو لگایا جایا کرتا تھا، (نام شب) کہا جاتا تھا، مقرر کیا تاکہ اگر کوئی شخص کسی ضرورت کی وجہ سے رات کو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس (پاس ورڈ) کو بتا کر امن سے گلی میں نکل سکے۔ اس طرح پر میں اس پہلے آزاد ہندوستانی شہر کا پہلا، سول ایڈمنسٹریٹر بنا۔ اس انتظام کی وجہ سے رات کو شہر میں کوئی واردات نہ ہوئی۔

اگلے روز صبح کو میں نے ایک سفید جھنڈا لیا اور چند آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر رہبر کے

ساتھ قلعہ کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن قلعہ سے ہم پر گولہ باری ہونے لگی۔ اس سے ہمیں یقین آگیا کہ قلعہ کی فوج ہمارے ساتھ گفت وشنید کرنے اور ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں ہے۔ ہم نے اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ ان کو کسی کمک کے پہنچنے کی بھی امید ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ قلعہ والے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہیں تو میں نے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو لکھا کہ قلعہ پر پوری طاقت سے اور ساری توپوں کے ساتھ گولہ باری کی جائے تاکہ اس کی دیواروں میں شگاف پیدا ہوں اور وہاں سے مجاہدین حملہ کر کے قلعہ میں داخل ہو سکیں۔

میں نے اگلی رات بھی ٹھل میں گزاری اور مثل سابق شہر میں امن وامان قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس میں مجھے پوری کامیابی ہوئی۔ لوگ اپنے کاروبار میں اطمینان سے مصروف رہے اور مجاہدین کو بھی کھانے کا سامان بہم پہنچتا رہا۔

اگلے روز صبح کو مجھے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کا زبانی پیغام ملا جس میں انہوں نے مجھے پڑاؤ کو لوٹ آنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں شہر کا انتظام ایک افغانی فوجی افسر کے سپرد کر کے پڑاؤ کو واپس آگیا۔ وہاں آکر مجھے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے چیف پرائیویٹ سیکرٹری مرزا محمد یعقوب خان سے معلوم ہوا کہ مجھے واپس بلانے کا سبب یہ تھا کہ بعض میرے بدخواہوں نے میرے بارے میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے کان بھرے اور کہا کہ ظفر انگریزوں سے مل گیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ امتحاناً مجھے واپس بلایا گیا تھا۔ سیکرٹری نے کہا کہ آپ کی واپسی سے آپ کی صداقت کا ان کو ثبوت مل گیا، اور آپ کی غیبت کرنے والے لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اس کے اگلے روز سپہ سالار صاحب نے سارے محاذ کا دورہ کیا اور توپ خانے کے کمانڈروں کو مقرر اشارہ ملنے پر ایک دم قلعہ پر گولہ باری کا حکم دیا۔ دوپہر کے قریب یہ گولہ باری شروع ہوئی اور وقفہ دے دے کر کئی گھنٹے جاری رہی۔ لیکن اس سے کوئی بڑا نتیجہ نہ نکلا اور مجاہدین قلعہ پر ہلہ نہ بول سکے۔ دوپہر کے بعد کوہاٹ اور ٹھل کی درمیانی سڑک پر انگریزی گولے پھٹے اور ہوائی جہاز نے بم گرائے۔ پہلے تو ہم اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ لیکن بعد میں ہم نے پہاڑی سے دوربین لگا کر دیکھنا شروع کیا اور اس سڑک پر کچھ سواروں کو سرپٹ قلعہ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلعہ کی انگریزی فوج کو وہ کمک پہنچ گئی ہے جس کا اس کو انتظار تھا اور جس کی امید پر اس نے ہمارے صلح کے سفید جھنڈے کو اہمیت نہ دی تھی اور ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔

(جنگ ختم ہونے کے چند مہینے بعد جو ہندوستانی اخبارات ہمارے ہاتھ لگے ان سے معلوم ہوا کہ اس کمک والی انگریزی فوج کا کمانڈر جلیاں والے باغ کا بدنام افسر اور بے ہتھیار لوگوں کا قاتل جنرل ڈائر تھا اور سڑک پر جو گولے پھٹے تھے وہ راستہ صاف کرنے اور مجاہدین کو ڈرا کر وہاں سے بھگانے کے لئے پھینکے گئے تھے)

اس روز ابھی شام بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ہماری مشین گنیں جو قلعہ کی چوکیوں پر گولہ باری کے لئے دریائے کرم کے پار بھیجی گئی تھیں، خچروں پر لدی ہوئی پہاڑیوں کے درمیانی نالوں کے راستے واپس لائی جارہی ہیں۔ میں نے ان کے سپاہیوں کو روک کر واپس محاذ پر بھیجنے کی کوشش کی۔ لیکن سپاہیوں کے تیور اتنے بدلے ہوئے تھے کہ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تو شاید وہ مجھ پر گولی چلا دیتے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ محاذ سے پسپا ہونے والے سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سردار سپہ سالار صاحب کو اس کی خبر دینے کیلئے میں ان کی تلاش میں چلا اور آخر شام کو جب ان سے ملاقی ہوا تو ان سے معلوم ہوا کہ دریائے کرم کے پار کے تمام پاپیادہ سپاہیوں، توپوں اور مشین گنوں سے مسلح سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور اپنے افسروں کے حکم کے برخلاف سرکشی کر کے خود بہ خود پڑاؤ کو واپس آگئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر باقی فوج میں بھی ہل چل مچ گئی۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے افغانی سرحد کی طرف پسپا ہونے کو تیار ہو گیا۔ یہاں تک کہ بعض سپاہیوں نے باربرداری کی خچروں پر سوار ہو کر افغانستان کا راستہ لیا، اور سامان جنگ اور رسد وغیرہ کو جو ان خچروں پر لدنے والا تھا، پیچھے چھوڑ دیا۔

ہم کو ان لوگوں کی بددلی، سرکشی اور فرار کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ نہ ان میں سے کوئی شہید ہوا اور نہ ہی کسی کو گھاؤ لگا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل بزدل تھے۔ انہوں نے، صرف قلعہ کو کمک پہنچ جانے سے ڈر کر پسپائی اختیار کی۔ ان کو شاید خطرہ ہوا کہ اگلے روز انگریزی فوج ضرور قلعہ سے نکل کر ان پر حملہ کرے گی۔

دسواں باب

امیر کابل امان اللہ خان کا انگریزوں سے جنگ بندی کا معاہدہ

خدا کی شان ہے کہ اسی شام کو کابل سے امیر صاحب کا فرمان آیا کہ انگریزوں سے ۲۷/ مئی ۱۹۱۹ء کو متارکہ ہو گیا ہے، اور انگریزوں نے افغانستان کی آزادی کو منظور کر لیا ہے۔ مگر اس کے بدلے میں افغانی فوجوں کا سرحد سے بیس میل پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس لئے افغانی فوجیں جو تمہارے زیر کمان ہیں فوراً ہندوستان کی سرزمین کو خالی کر کے افغانی سرحد کی طرف لوٹنے اور سرحد سے بیس میل پیچھے ہٹنے پر مجبور ہیں۔ اس فرمان کے آنے سے ہمارے فوجیوں کی فراری اور پسپائی اور ان کی خود اپنے ہاتھوں اپنے سر پر لائی ہوئی شکست پر پردہ پڑ گیا۔

امیر صاحب کے اس حکم پر، سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے ایک طرف تو فوج کو سرحد کی طرف کوچ کرایا اور دوسری طرف ٹھل سے اس وقت اتفاقاً آئے ہوئے اپنے معتمد کو جس کے ہاں میں ٹھل کے قیام کے دوران ٹھہرا تھا، انگریزی کمانڈر کے نام مجھ سے انگریزی میں ایک خط لکھوا کر دیا۔ اس خط میں انہوں نے لکھوایا تھا کہ انگریزی اور افغانی حکومتوں کے درمیان متارکہ ہو گیا ہے اور آج (یکم جون) رات کے بارہ بجے کے بعد اس محاذ پر لڑائی بند کر دی جائے گی۔

یہ خط معتمد کے ذریعہ راتوں رات ٹھل بھیج دیا گیا، لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انگریزی کمانڈر کو یہ خط کب ملا۔ اس کی اس کے بعد کی کارروائی سے اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ خط اس کو ضرور مل گیا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد انگریزی ہوائی جہاز نے جو اس کے دو دن بعد تک خوست

کے علاقہ پر پرواز کرتا رہا، ہم پر کوئی بم نہیں گرایا۔ صرف ہماری فوجوں کی دیکھ بھال کر کے اور ان کے پڑاؤ کی جگہ معلوم کر کے واپس چلا گیا۔ (ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ انگریزی رسالہ اگلے روز صبح کو دریائے کرم عبور کر کے ہمارے پرانے پڑاؤ کی جگہ تک آیا اور وہاں پڑاؤ کو خالی پا کر واپس چلا گیا۔ اس نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔)

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے حکم کے مطابق اس رات خیمے اکھاڑ کر خچروں پر لادے گئے تھے۔ سامان جنگ کی باربرداری کے لئے جتنے جانور مل سکے ان پر گولہ بارود لادا گیا، لیکن چونکہ بعض سپاہی خچروں پر سوار ہو کر بھاگ گئے تھے، اس لئے کچھ سامان ہمیں میدان جنگ میں چھوڑنا پڑا۔ مگر اس افراتفری اور بدانتظامی کا نہ خوست کے لوگوں کو چنداں پتہ چلا اور نہ ہی کابل کے سرکاری حلقوں میں اس کا کچھ چرچا ہوا۔ وہ سب یہی سمجھتے رہے کہ یہ فوج ٹھل میں فتحیاب رہی اور صرف امیر صاحب کے فرمان پر ٹھل سے واپس لوٹی ہے۔ سردار سپہ سالار صاحب کی خوش قسمتی اور خدا کا کرم و عنایت ان کے شامل حال تھا کہ یہ شکست فتح کے رنگ میں نظر آنے لگی، اور اس طرح پر خود ان کی عزت بھی بنی رہی۔ اگر انگریزی کمانڈر ذرا جرأت سے کام لیتا اور ایک رسالے کو ہمارا پیچھا کرنے پر مقرر کر دیتا، تو یہ سوار نہ صرف بہ آسانی افغانی سرحد تک پہنچ جاتے، بلکہ آگے بھی بڑھ جاتے اور ان کے ڈر سے افغانی فوج جو ٹھل سے پسپا ہو کر اسی پڑاؤ پر آئی تھی جہاں سے کہ وہ سات دن پہلے ٹھل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوئی تھی، وہاں سے شاید گردیز تک پیچھے ہٹ جاتی اور راستے میں کہیں دم تک بھی نہ لیتی۔

جس روز ہم افغانی سرحد میں واپس داخل ہوئے اس کی دوپہر کو ایک انگریزی ہوائی جہاز نے ہمارے پڑاؤ پر ایک چکر لگایا لیکن کوئی بم نہیں گرایا۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریزی کمانڈر نے متارکہ منظور کر لیا ہے۔ لیکن ہماری فوج کا کھوج نکالنے اور آئندہ کے متعلق اطمینان حاصل کرنے کی خاطر ہوائی جہاز کو بھیجا تھا۔ افغانی فوج اس محض اڑنے والے ہوائی جہاز سے بھی اتنی ہراساں ہوئی کہ شام کو خود بہ خود یہاں سے خوست کو روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس پر مجبور ہو کر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اگلی صبح کو خوست کی طرف کوچ کا حکم دیا اور ہم نے اگلے روز خوست میں پڑاؤ ڈالا (فوٹو دیکھئے) اس فوٹو میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم، کرنل عبدالقیوم خان اور ان کے زیر کمان مجاہد نظر آتے ہیں۔ میں، پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان پہلو بہ پہلو دوسری قطار میں کھڑے ہیں۔

اس روز بھی ہوائی جہاز ہمارے سر پر اڑا، لیکن گولہ باری کئے بغیر واپس چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اطمینان ہو گیا کہ اس محاذ پر افغانی فوجیں متارکہ کی شرطوں کے مطابق سرحد سے بیس میل پیچھے ہٹ گئی ہیں۔

چند روز کے بعد کابل سے امیر صاحب کا ایک دوسرا فرمان آیا جس میں لکھا تھا کہ افغانی فوجوں کو متارکہ کی شرائط کے بموجب تمام سرحدوں سے ۲۰ میل پیچھے ہٹنا چاہئے ورنہ متارکہ ٹوٹ جائے گا اور پھر سے لڑائی شروع ہو جائے گی۔ اس فرمان کے طرز تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ کابل کے ارباب حکومت انگریزوں سے جلد از جلد صلح کرنے اور لڑائی کو ختم کرنے کے سخت خواہش مند ہیں۔ اگرچہ اس فرمان میں مذکورہ شرائط متارکہ ہمارے محاذ کے ایک بڑے حصہ پر، واقعات کی رفتار کی وجہ ہی سے پوری ہو گئی تھیں اور خوست کی فوجیں جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے خود بہ خود ٹھل سے پسپا ہو کر متون تک آ گئی تھیں اور سرحد سے بیس میل پیچھے ہٹ چکی تھیں۔ اگرچہ خوست اور پیواڑ کے درمیان کی افغانی چوکی جس کا نام (پٹان) تھا انگریزوں کے ہاتھوں جل چکی تھی اور وہاں کے افغانی سپاہی اندرون ملک کی طرف پسپا ہو چکے تھے لیکن پیواڑ کی سربلند کوتل (Pass) جو ایک طرف (جاجی) کے افغانی علاقہ پر اور دوسری طرف پاراچنار کی انگریزی چھاؤنی کے اوپر سربہ فلک کھڑی ہوئی ہے، ابھی تک ان افغانی فوجوں کے ہاتھ میں تھی جو سردار صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی سردار محمود خان کے زیر کمان تھیں۔ یہاں افغانی فوج نے مضبوط مورچے بنا رکھے تھے جو دیار کے درختوں کے گھنے جنگلوں میں ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز کو بھی نظر نہ آ سکتے تھے۔ اگرچہ انگریزوں نے اس حصہ محاذ پر ایک دفعہ حملہ بھی کیا تھا لیکن منہ کی کھا کر واپس ہو گئے تھے۔ ٹھل پر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے حملہ کی وجہ سے، پاراچنار کی انگریزی فوجوں کو پھر اس کی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ دوبارہ کوتل پیواڑ پر حملہ آور ہوں۔ سردار صاحب مرحوم نے افغانی فوج کے بڑے حصے کے ساتھ ٹھل پر حملہ کر کے جو جنگی چال چلی تھی اس کی درستی اور اصابت کا اب پورا ثبوت مل گیا تھا۔ اگر وہ ٹھل پر حملہ کر کے کوہاٹ اور پاراچنار کا باہمی حمل و نقل کا راستہ نہ کاٹ دیتے تو ضرور انگریز اس بلند کوتل پر قبضہ کر لیتے اور پھر وہاں سے بہ آسانی کابل کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ اگر امیر صاحب کے فرمان کے بموجب، اس حصہ محاذ سے بھی افغانی فوجوں کو بیس میل پیچھے ہٹا لیا جاتا تو انگریز ضرور پیواڑ کے اردگرد کی بلند پہاڑیوں اور چوٹیوں پر قبضہ کر لیتے اور کابل کو جو یہاں سے صرف تین

منزل دور ہے دھمکی دیتے۔ انگریزوں اور افغانوں کے درمیان پرانے زمانے میں جو لڑائیاں ہوئی تھیں، ان کے دوران اکثر انگریزوں نے پیواڑ پر قبضہ کر کے کابل کی طرف پیش قدمی کی تھی، اور کابل کو بہ آسانی فتح کر لیا تھا۔

متون واپس آنے پر ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ جنگ کے شروع میں جب جلال آباد کے محاذ پر صالح محمد خان کی فوجوں کو شکست ہوئی تو انگریزوں نے ایک ہوائی جہاز کابل بھیجا تھا جس نے وہاں چند ایک بم گرائے تھے۔ اس سے ارباب حکومت اور کابل کے باشندے اس قدر ہراساں ہوئے تھے کہ کابل چھوڑ کر مرکز حکومت کو اندرون ملک کی طرف پنج شیر کے علاقہ میں منتقل کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے پیواڑ کی اہمیت اور کابل والوں کی نفسیاتی حالت کو مد نظر رکھ کر، امیر صاحب کے اس فرمان کی تعمیل کرنے سے پہلے مجھے، پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان کو بلا کر اس بارے میں ہمارے ساتھ ایک خفیہ مجلس حرب جس کا انہوں نے اپنے افسروں سے بھی ذکر نہ کیا، منعقد کی۔ گفت و شنید کے بعد انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ پیواڑ کے محاذ پر کی افغانی فوجیں اپنے مورچوں پر ڈٹی رہیں اور ان کو کبھی بھی یہاں سے پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ اس مشورہ کے بعد انہوں نے امیر صاب کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا کہ پیواڑ کے سوا سارے محاذوں پر افغانی فوجیں سرحد سے بیس میل پیچھے ہٹ چکی ہیں لیکن پیواڑ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹیں گی۔ اگر اس کے باوجود بھی امیر صاحب اور ان کی وزارت (Cabinet) افغانی فوجوں کے پیواڑ سے بیس میل پیچھے ہٹنے پر اصرار کرے گی تو وہ اس حکم کی تعمیل نہ کریں گے، اور اس پسپائی کے خمیازہ کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں گے، اور اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں گے، تاکہ کوئی دوسرا کمانڈر ان کی جگہ آ کر اس حکم کی تعمیل کرے۔

یہ مراسلہ فوراً سواروں کے ہاتھوں ہاتھ کابل بھیجا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے بھی متارکہ کی اس شرط پر زور دینا چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ بھی ہندوستان کی اندرونی بدامنی کی وجہ سے پھر لڑائی شروع کرنے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے امیر صاحب نے بھی سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے اس مراسلہ کا کوئی جواب نہ دیا اور محاذ کی حالت بطور سابق باقی رہی۔

ہمارے وفد کی کابل کو روانگی

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو کابل کے ارباب حکومت کی ذہنی حالت، اندیشہ اور تذبذب کے بارے میں کابل سے جو اطلاعات پہنچ رہی تھیں ان سے ان کو ڈر تھا کہ افغانی حکومت انگریزوں کو کچھ بے جا مراعات دے دیگی اور افغانستان کے استقلال کے بارے میں، جس کو انگریزوں نے متارکہ کے وقت مان لیا تھا، بعض پابندیاں اور کچھ نہ کچھ کمی قبول کر لے گی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے، پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان کو بحیثیت اپنے نمائندوں کے امیر صاحب کی خدمت میں بھیجیں، تاکہ ہم وہاں جا کر امیر صاحب کو، ارباب حکومت اور اہل دربار کو سمت جنوبی کے محاذ کے حالات سے بہ تفصیل واقف کریں اور ان کو بتائیں کہ ہم اس محاذ پر انگریزوں پر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ اور اگر ہمارے پاس ذرا اور قوت ہو تو ہم پیواڑ سے بھی آگے بڑھ کر پاراچنار پر حملہ کر سکتے ہیں، اور انگریزوں کو دریائے کرم کی وادی سے نکال سکتے ہیں۔ اس طرح پر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو امید تھی کہ کابل والوں میں جو ڈر اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے اس کی روک تھام ہو جائے گی اور لوگوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے ہم تینوں کو اس کام پر روانہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ سرحد کے پاس پاس سے گزر کر انگریزی فوجوں کی موجودگی کے بارے میں خبریں حاصل کریں اور افغانی فوجوں کی معنویات (MORALE) کا بھی اندازہ لگائیں اور ان کی ڈھارس بندھائیں۔ مجھے اس کے سوا یہ کام بھی دیا گیا کہ محاذ کے مختلف اہم ٹکڑوں کے خاکے تیار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں تاکہ امیر صاحب کو انگریزی اور افغانی فوجوں کے مورچوں کی جگہوں اور اہمیت کا باہم مقابلہ اور مقائسہ کرنے میں مدد ملے۔

ہم متون سے گھوڑوں پر سوار ہو کر (پٹان) کی جلی ہوئی افغانی چوکی کے نزدیک سے گزرے اور وہاں کی پہاڑیوں اور نالوں کا خاکہ کھینچ کر آگے بڑھے۔ تین دن کے بعد علاقہ جاجی میں جہاں پیواڑ واقع ہے، داخل ہوئے۔ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے دوپہر کا کھانا ایک پہاڑی پر جہاں ایک قدرتی چشمہ بہ رہا تھا کھایا۔ یہ کھانا کیا تھا؟ تین دن کی سوکھی روٹی سے ہم اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور تھے۔ روٹی سوکھ کر اتنی سخت ہو گئی تھی کہ پتھر سے بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔ نزدیک کوئی آبادی بھی نہ تھی کہ وہاں سے کچھ کھانے کی چیز مل جائے۔ ہم نے اس سوکھی

روٹی کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو کر ذرا نرم کیا اور بڑے مزے سے کھانا شروع کیا۔ پادشاہ میر خان کو اس وقت محاذ ٹھل کا ایک مضحکہ خیز واقعہ یاد آگیا اور اسے ہمیں سنا کر، ہم کو ہنسانے کی کوشش کی۔ اس پر مجھے ہنسی آئی اور اس سوکھی روٹی کا لقمہ جو میرے منہ میں تھا، میرے حلق میں پھنس گیا۔ اس سے میرے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ میری آنکھیں باہر نکلنے لگیں اور دم بند ہونے لگا۔ میرے ساتھیوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میں سانس کے رکنے کی وجہ سے مر ہی نہ جاؤں۔ میرے منہ میں انہوں نے پانی ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پادشاہ میر خان کے حواس ذرا ٹھکانے تھے۔ اس نے میرے کندھوں کے درمیان پیٹھ پر ایک سخت مکا رسید کیا جس سے وہ روٹی کا سوکھا ٹکڑا میرے حلق سے نیچے اتر گیا اور میں نے پھر سانس لینا شروع کر دیا۔ اگر خدانخواستہ گلے کے گھٹنے کی وجہ سے میں یہاں مر جاتا تو میرے دوست اور خاص کر میرے مہاجر ساتھی تو اس کو سن کر ضرور یہی کہتے کہ پادشاہ میر خان اور محمد یوسف خان نے کسی خفگی یا لالچ کی وجہ سے گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالا۔

شام کے قریب ہم پیواڑ پہنچے اور اگلے روز ہم کو سردار شاہ محمود خان نے اپنے محاذ کا دورہ کرایا۔ ہم نے یہاں کی افغانی فوجوں کے مورچوں کو بہت مضبوط پایا۔ یہاں جنگل اتنا گھنا تھا کہ دن کے وقت بھی دس پندرہ قدم پرے کے آدمی کو دیکھنا محال تھا۔ یہاں کی فوج کی معنویات (MORALE) بہت اچھی تھیں۔ میں نے یہاں کی پہاڑیوں اور مورچوں کا بھی ایک خاکہ بنایا اور ہم وہاں سے کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔

تیسرے دن ہم کابل پہنچے اور اسی روز امیر صاحب کے حضور میں پیش ہوئے۔ امیر صاحب کو ہم نے اپنے محاذ کے حالات سنائے اور وہاں کی فوجوں اور جاجی کے علاقے کے باشندوں کی ہمت اور جرأت کا ان سے ذکر کیا۔ پیواڑ کے مورچوں کی مضبوطی کا حال ان کو سنایا۔ نقشے اور خاکے کے ذریعہ اس جگہ کی اہمیت ان پر واضح کر کے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ جب تک پیواڑ کا بلند درہ (PASS) ہمارے ہاتھ میں ہے انگریز اس راستے سے کابل پر خشکی کے ذریعہ کبھی بھی حملہ نہیں کر سکتے اور ہوائی جہازوں کے حملوں سے چنداں ڈر ہونا ہی نہ چاہئے۔ لیکن اگر پیواڑ کی چوٹی سے ہماری فوجیں پیچھے ہٹ جائیں تو ایک مہلک فوجی غلطی ہو گی۔ اس لئے انگریزوں کی جو تجویز اس کے متعلق ہے، اس کو رد کرنا ضروری ہے۔ انگریزوں میں اس وقت اتنا دم نہیں ہے کہ وہ افغانستان پر حملہ کر سکیں۔ اگر وہ اس قسم کا اقدام کریں گے تو ہم پھر

ٹھل پر حملہ کر کے ان کے رسل و رسائل اور آمد و رفت کا راستہ کاٹ دیں گے اور ان کی فوج کو پیچھے سے گھیر لیں گے۔ اس لئے انگریز پیواڑ کے راستہ سے کبھی بھی کابل پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

امیر صاحب کو ہماری باتوں سے بہت اطمینان ہوا۔ ان کے درباریوں نے ہم سے جدا جدا حالات سنے جس سے ان کی بھی ہمتیں بلند ہو گئیں۔ میں سردار محمود بیگ طرزی سے ملا۔ وہ اس وقت وزیر خارجہ تھے اور انگریزوں سے جتنی گفتگو ہوتی تھی، وہ انہی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے ان کو بھی اپنے محاذ کے حالات سنائے۔ اس پر وہ بڑی خوشی میں آئے اور کہنے لگے۔ "سمت جنوبی کے محاذ کی فوجوں نے ہماری عزت رکھ لی"۔

میں نے ان سے قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا، جو صالح محمد خاں کی شکست کے بعد جلال آباد سے خوشی محمد کو اپنے ساتھ لے کر چمرکند چلے گئے تھے، اور کابل واپس آنے کے لئے امیر صاحب کے احکام کے منتظر تھے، ذکر کیا اور ان سے درخواست کی کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو کابل بلا کر ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ انہوں نے امیر صاحب سے کہہ کر حکم بھجوا دیا کہ قبلہ حضرت مولانا صاحب اور ان کے ساتھیوں کو سرکاری مہمان بنا کر یاغستان سے جلال آباد اور وہاں سے کابل روانہ کر دیا جائے۔

کابل میں رہتے ہوئے، ہم نے دربار میں ایک شخص کو دیکھا جو کابلی یا افغان نہ تھا بلکہ زیادہ تر پشاوری معلوم ہوتا تھا۔ اس کو لوئے خان (بڑے خان صاحب) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ صاحب پشاور سے ہجرت کر کے آئے ہیں اور ان کا وہاں کا نام قاضی محمد ولی خان تھا۔ انہوں نے بھی کابل میں رہتے ہوئے قبلہ مولانا صاحب اور ہماری جماعت سے علیحدہ اپنی ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی تھی اور افغانی گورنمنٹ سے وظیفہ لیا کرتے تھے۔ وہ ہجرت کی تحریک کے بعد (جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) ترکی، یورپ اور پھر مصر چلے گئے تھے اور غالباً وہیں فوت ہو گئے۔

کابل کے اسی قیام کے دوران میں ہمیں خبر ملی کہ افغانی حکومت یورپ کی سلطنتوں کو اپنی آزادی کی خبر دینے اور ان سے سفارتی تعلقات پیدا کرنے کے لئے مختلف وفد بھیجنا چاہتی ہے۔ ان میں سے روس اور یورپ کو جانے والے وفد کا سرکردہ غلام بچہ محمد ولی خان مقرر کیا گیا جس نے امیر حبیب اللہ خان کے قتل کی خبر ٹیلیفون سے امان اللہ خاں کو پہنچائی تھی۔ ایک وفد ترکی

جانے والا تھا جس میں مولوی محمد منصور انصاری شامل ہوئے۔ روس میں جانے والے وفد میں، قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کابل واپس آکر اپنے بھتیجے عزیز احمد کو شامل کرا دیا تھا۔

ہم کابل میں تین دن رہ کر پھر محاذ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس وقت افغانی ہیئت سردار علی محمد خان ایشیک آقاسی کی قیادت میں انگریزوں کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لئے راولپنڈی جانے والی تھی۔ ہمارے کابل کے سفر سے اس ہیئت کی بھی بہت ڈھارس بندھ گئی تھی۔ اس نے راولپنڈی میں جو عارضی صلح کا معاہدہ ۸/ اگست ۱۹۱۹ء کو کیا، اس میں انگریزوں کو افغانستان کے استقلال کا پھر قائل کر دیا اور انگریزوں نے افغانی استقلال کی، جس کو انہوں نے متارکہ کے وقت ۲۷/ مئی ۱۹۱۹ء کو مان لیا تھا، تصدیق کر دی۔

اگرچہ افغانوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی تجاویز کے مطابق عمل نہ کیا تھا۔ لیکن پھر بھی حضرت مولانا کے تدبر اور ہندستان کے جنوب میں موپلوں کی جاں نثاریوں اور شمال میں پنجاب کے لوگوں کی قربانیوں کی وجہ سے افغانستان آزاد ہوگیا۔ مگر افسوس کہ ہندستان ویسا ہی غلام رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ افغانستان نے اپنے جنگی حلیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو، اپنی قدیم روایتی عادت کے بموجب، ان کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے جو ظلم ہندستانیوں پر کئے وہ تو سب دنیا کو معلوم ہی ہیں۔ مگر امیر امان اللہ خان مستقل پادشاہ بن گئے اور اس کامیابی کا سہرا انہوں نے صرف اپنے سر پر رکھ لیا۔

خوست میں ہمارے قیام کے آخری ایام

متون واپس آنے پر ہم نے دیکھا کہ ہمارا پڑاؤ اب چھاؤنی سے دور اور درختوں کی چھاؤں میں ایک بڑی ندی کے کنارے لگا ہوا ہے۔ یہاں میرے لئے علیحدہ خیمہ لگایا گیا تھا جو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے خیمے کے نزدیک تھا۔ یہاں میرا کوئی خاص فرض تو نہ تھا جس کی ادائیگی میرے لئے مجبوری ہو۔ صرف میں کبھی کبھی سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے جنرل سیکرٹری مرزا محمد یعقوب خان کو اس کے سرکاری کام میں مدد دے دیا کرتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اکثر اوقات سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا جس میں عام طور پر میری جیت ہوتی تھی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے افغانستان میں اس وقت عدلیہ (Judiciary) اور انتظامیہ (Executive) (امور اجرائیہ) ایک دوسرے سے علیحدہ نہ تھے۔ یعنی ضلع کا کمشنر یا صوبے کا گورنر جج (Judge) کے فرائض بھی ادا کیا کرتا تھا اور مقدمے سن کر فیصلے دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مار پیٹ، چوری اور اس قسم کی وارداتوں کے متعلق جو مقدمے ہوتے تھے وہ اسی کے سامنے پیش ہوا کرتے تھے۔ صوبوں میں قاضی بھی موجود تھے جو شرع محمدی کے احکام کے بموجب وراثت اور قتل کی وارداتوں کے مقدمے سنا کرتے تھے، اور قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم دیا کرتے تھے۔ چنانچہ متون میں لوگوں کے آپس کے نزاع اور جھگڑے کے بارے میں جو مقدمے ہوتے تھے ان کے سننے کے لئے کرنل عبدالقیوم مقرر تھا۔ ایک روز اس کے سامنے ایک قیدی لایا گیا جس نے مدعی کے مال پر ناحق قبضہ کر لیا تھا، قیدی کے ہاتھ پر ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ارد گرد سپاہی بھی موجود تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ پہلو بہ پہلو عبدالقیوم خان کے سامنے جو اپنے خیمے کے باہر بغیر فوجی وردی کے مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا، کھڑے تھے کہ جھپٹ کر مدعا علیہ نے مدعی پر حملہ کیا اور ہتھکڑیوں کے باوجود، اس کی پیٹی سے اس کا خنجر چھین کر، اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ مدعی کو تو اس نے وہیں ڈھیر کر دیا اور اس کے بعد اس نے عبدالقیوم خان پر اور ارد گرد کے لوگوں پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ عبدالقیوم تو فوراً اپنے خیمے میں داخل ہو گیا اور وہاں سے خیمے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگ گیا۔ مگر قاتل ایک دو اور شخصوں کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر پہرے داروں نے فیر کرنے شروع کئے۔ سپاہیوں کے بے تکے فیر کرنے کی وجہ سے لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ فیر سن کر میں بھی اپنے خیمے سے نکل کر ادھر گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک افراتفری اور نفسانفسی پھیلی ہوئی ہے۔ میدان میں صرف وہ قاتل ہے جو پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود بھی ادھر ادھر حملہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ سپاہی اس پر مختلف طرف سے بے تک گولیاں چلا رہے ہیں اور لوگ ان گولیوں سے بچنے کے لئے آڑ میں اور گھروں میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر ایک سپاہی کی گولی قاتل کی ٹانگ میں لگی جس سے وہ گر گیا، اور سپاہیوں نے ارد گرد سے آکر اس پر قابو پایا اور اس کو پھر قید میں ڈال دیا۔ اگلے روز قاضی نے اس پر مدعی کو قتل کرنے کی وجہ سے موت کا فتویٰ لگا دیا اور سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے سب پڑاؤ والوں اور شہر کے باشندوں کے سامنے اس کو چاند ماری کروا دیا، تاکہ سب لوگوں کے

لئے جائے عبرت ہو۔

افغانستان کے مشرقی اور جنوبی صوبوں میں اس وقت امن وامان کم ہونے کی وجہ سے ہر شخص ہتھیار بند رہتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں پستول یا بندوق تو اکثر نہیں ہوتی تھے لیکن پیٹی میں خنجر ضرور رکھا کرتے تھے۔ اگر اس وقت ہتھیار بندی پر کچھ پابندیاں لگی ہوتیں تو شاید مندرجہ بالا واقعہ پیش نہ آتا اور مدعا علیہ مدعی کو اس طرح خنجر سے قتل نہ کر سکتا۔ فوجی سپاہیوں کے بے تکے فیر کرنے سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اگر ان کو اچانک کسی مسلح آدمی کا سامنا ہو جائے تو وہ اپنے حواس کو ٹھیک رکھ کر اس پر گولی چلانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ ایسے ناگہانی حالات میں ان کو چاہیے تھا کہ فوراً زمین پر لیٹ کر قاتل کو اپنی گولی کا نشانہ بناتے۔ قاتل چونکہ سروقد کھڑا تھا، وہ ایک ہی فیر میں اس کو زخمی کر کے بہ آسانی گرفتار کر سکتے تھے۔

ہمارے متون کے اس قیام کے دوران میں، متون میں اس واقعہ کے سوا ایک اور واقعہ ہوا جس کا میرے دل پر بہت گہرا اور برا اثر پڑا۔ یہ واقعہ قصاص دینے کے متعلق قاضی خوست کے ایک فیصلے کی وجہ سے ظہور میں آیا۔ اس کی تفصیل یوں ہے:۔

متون میں ایک نوجوان اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ اس کا ایک ہمسایہ سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بات بڑھ کر مکا ڈکی پر پہنچی۔ اس پر اس کے ہمسایہ نے خنجر نکال کر اس کے دل میں گھونپ دیا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ مقتول ایک بیوہ عورت کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس بیچاری کو جتنا صدمہ ہوا ہو گا اس کا اندازہ لگانا کچھ آسان نہیں ہے۔ مقدمہ قاضی کے سامنے پیش ہوا اور اس نے قصاص کا حکم دے دیا۔ غمزدہ ماں نے کہا کہ وہ قصاص خود لے گی۔ اس پر قاضی نے مجرم کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور قاتل کو پہرہ داروں کے ساتھ میدان قصاص میں بھیج دیا۔ یہ جگہ ہمارے پڑاؤ سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھی۔ سپاہیوں اور لشکریوں کے ساتھ میں میدان قصاص کو گیا، جو بہت بھیانک جگہ تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اردگرد خالی کھیت موجود تھے جن میں سے پانی کی ایک نالی بہ رہی تھی۔ فصلیں کٹ چکی تھیں۔ سپاہی قاتل کو جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں، یہاں لائے۔ مقتول کی ماں اور ماموں بھی وہاں پہنچے۔ سپاہی نے قاتل سے اس کی آخری آرزو پوچھی تو اس نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ سپاہیوں نے اس کی ہتھکڑیاں اتارنے کے بغیر، اس کو وضو کرا کے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ نماز کے ختم ہونے پر پہرہ داروں نے اس کے ہاتھ اس

کی پیٹھ کے پیچھے باندھ کر اس کو زمین پر چت لٹا دیا۔ اب پر مقتول کی ماں ایک چھرا لئے ہوئے آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی خون ٹپک جائے گا۔ انتقام کے جذبات کی وجہ سے وہ ایسی بپھری ہوئی تھی کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ قاتل کو کچا کھا جاتی۔ اس نے جھجکے بغیر، اپنے چھرے سے، قاتل کا گلا کاٹنا شروع کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خون دیکھ کر اس کے بازو میں سکت نہ رہی۔ آخر عورت ہی تھی۔ اس کا انتقام کا جذبہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہوتا اس کا ارادہ ڈگمگا گیا۔ اس پر اس نے چھرا اپنے بھائی کو دیا جس نے قاتل کا دو ضربوں ہی میں خاتمہ کر دیا۔ مجرم کے ہاتھ چونکہ اس کی پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اس لئے، وہ باوجود جان خراشی کے اٹھ نہ سکا اور نہ ہی کچھ مقابلہ کر سکا۔ صرف ذرا ایک دو دفعہ حرکت کی، لیکن اس کے بعد وہ مر گیا۔ اس خونیں نظارے کو دیکھتے ہوئے تو مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا، لیکن جب یہاں سے پڑاؤ کی طرف لوٹا تو راستہ میں میرا جی متلانا شروع ہوا اور سر چکرانے لگا، جس سے میں ڈرا کہ کہیں مجھے قے نہ لگ جائے یا راستہ میں سر گھوم جانے کی وجہ سے گر نہ جاؤں۔ لیکن میں نے ہمت نہ چھوڑی اور سنبھل کر پاپیادہ اپنے خیمے تک پہنچ گیا۔ اس طرح میری ساکھ قائم رہ گئی۔ ورنہ افغان کہتے کہ بڑا بزدل آدمی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس جانگداز نظارے کو دیکھ کر مجھ پر بہت ہی برا اثر پڑا تھا۔ میں نے افغانوں کے مضحکہ کے ڈر سے اپنے کو سنبھالے رکھا تھا۔ اگر خدانخواستہ مجھے کہیں قے آجاتی یا راستہ میں سر چکرانے کی وجہ سے گر جاتا، تو ساری عمر افغانوں کے طعن و تشنیع اور مضحکہ کا نشانہ بنا رہتا۔

کابل سے میدان جنگ تک اور پھر وہاں سے متون تک جرمن ہوٹزر (German Howitzer) ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر لے جائی گئی تھی۔ اس کے سوا ان پہاڑوں پر سے اس بھاری توپ کا گزارنا ناممکن تھا۔ ہر روز ہاتھی کی پیٹھ پر توپ لادنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ زخم پڑ گیا، اس کے باوجود بھی یہ جفاکش جانور بہت تندہی سے اپنا فرض ادا کرتا رہا اور اپنی تکلیف کی وجہ سے اس نے کبھی سرکشی نہ کی۔ متون واپس پہنچ کر اس کے زخم کی مرہم پٹی کرائی گئی۔ اس کام پر فقیر محمد نام ایک کوہاٹی مہاجر سلوتری مقرر تھا۔ زخم بہت آہستہ آہستہ مندمل ہوتا تھا۔ کیونکہ اچھی دوائیاں نہ ملتی تھیں۔ ایک دن فقیر محمد نے مجھے بھی ہاتھی کا زخم دھوتے ہوئے بلا کر زخم دکھلایا اور زخم میں ہاتھ ڈالنے کو کہا۔ میرا ہاتھ کہنی تک زخم کے اندر چلا گیا۔ اس میں میں کوئی مبالغہ نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن ہاتھی نے ذرا

بھی کوئی اضطراب یا تندی نہ دکھلائی۔ آخر کار اس کا زخم بالکل بھر گیا اور وہ پھر اس توپ کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر کابل لے گیا۔

سپہ سالار محمد نادر خان کی کابل واپسی

اب ہمارے متون کے قیام کے دن ختم ہونے والے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ختم ہونے کے قریب امیر صاحب کا فرمان پہنچا کہ چونکہ اب مختلف محاذوں پر امن وامان ہے اس لئے، سمت جنوبی کی فوج کا بھی سرحد کے نزدیک سے ہٹ کر کابل واپس آ جانا باعث خطر نہیں ہو سکتا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم، ان کے بھائی سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خان جو اپنے فوجی دستوں کے ساتھ علی الدرجات ارغون اور پیواڑ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، کابل کی طرف روانہ ہو جائیں۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے کوچ کی تیاریاں شروع کیں اور اپنے بھائیوں کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنے اپنے فوجی مرکزوں سے روانہ ہو کر گردیز میں ان سے آ ملیں۔ چنانچہ تینں کمانڈر مقررہ تاریخ پر گردیز پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک روز، خاص کر اس انگریزی مال غنیمت، ہتھیاروں اور سامان جنگ کے ساتھ جس کو وانا سے بھاگے ہوئے ملیشیا کے سپاہی اور مجاہد انعام لینے کے لئے کھینچ کر افغانستان لے آئے تھے (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ایک فوٹو کھنچوایا جس میں وہ خاصہ دار بھی شامل تھے جو وزیرستان کی چھاؤنیوں سے بھاگ کر افغانی فوج کے ساتھ آ گئے تھے۔ اس فوٹو گراف کی ایک نقل یہاں بھی نتھی کی جاتی ہے (۸) یہاں (۱) دو گنیں (نو پونڈ کے گولے پھینکنے والی) توپوں کی نالیاں (۲) دو مشین گنیں (۳) ایک ہوائی جہاز کے ٹکڑے، پورٹیبل ٹیلیفون (Portable Telephone) کانٹے دار تار، ٹیلیفون کے تار نظر آتے ہیں۔ سردار شاہ ولی خان اور سردار شاہ محمود خان یہاں سے پھر اپنے اپنے محاذوں پر لوٹ گئے تاکہ سرحدیں بالکل خالی نہ پڑی رہیں۔ گردیز میں چند روز رہنے کے بعد سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے بمعہ اپنی فوج کے کابل کی طرف کوچ کیا۔ خدا کی شان ہے کہ پانچ یا چھ ماہ پہلے جو کمانڈر اپنے بلند عہدے سے محروم اور امیر حبیب اللہ خان کے قتل کی تہمت کی وجہ سے رسوا ہو کر، کابل سے محاذ کی طرف روانہ ہوا تھا اور جس کے برخلاف گردیز میں چند ماہ ہوئے فوج نے پھر سر اٹھانے کی کوشش کی تھی، وہ آج ایک کامیاب سردار فوج

اور ایک فاتح کی حیثیت سے پایہ تخت کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

کابل میں ان کے لئے شاندار استقبال کی تیاریاں کی گئی تھیں اور اہل شہر جان و دل سے ان کا خیر مقدم کرنے کو جوق در جوق اپنے گھروں سے نکل کر چمن حضوری میں جمع ہو گئے تھے۔ ہم جب سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ہمرکاب چمن حضوری کے نزدیک پہنچے ہم نے تو دیکھا کہ سارا شہر جھنڈیوں سے آراستہ ہے۔ کابل کی فوجیں گردیز سے آنے والی فوج کے استقبال کے لئے صف بستہ ہیں۔ خود اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان بھی مع اپنے درباریوں کے چمن حضوری میں اپنے سپہ سالار کے خیر مقدم کے لئے، جس نے افغانستان کی عزت رکھ لی اور ملک کو استقلال اور آزادی دلائی تھی، قدم رنجہ فرما چکے تھے۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب اور سردار سپہ سالار صاحب گھوڑوں پر سوار ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ کابل اور سمت جنوبی کی فوجوں نے سلامی اتاری۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم اپنے گھوڑے سے اتر کر اعلیٰ حضرت امیر صاحب کے گھوڑے کی طرف چلے۔ اس پر اعلیٰ حضرت بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑے اور سردار سپہ سالار صاحب کو بہت محبت سے اپنے گلے لگا لیا۔ یہ نظارہ بہت ہی مسرت انگیز تھا۔ یہاں کی کارروائی ختم ہونے پر فوج کے مختلف دستے اپنی اپنی چھاؤنیوں کو چلے گئے۔ اگلے روز دربار شاہی منعقد ہوا۔ دفاتر اس روز بھی بند رہے۔ اس دربار میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اعلیٰ حضرت امیر صاحب کی خدمت میں اپنے فوجی افسروں، قبیلوں کے سرداروں اور ان لوگوں کو جنہوں نے اس لڑائی میں کارہائے نمایاں کئے تھے اور بہادری دکھلائی تھی ایک ایک کر کے پیش کیا۔ ان لوگوں میں سے قبیلوں کے سرداروں کو خلعت اور نقد انعام دیئے گئے۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے مجھے اعلیٰ حضرت امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو الفاظ استعمال کئے ان کا ترجمہ یہ ہے "اس نوجوان کی عمر کم ہے لیکن اس نے ایسی بہادری دکھائی ہے کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ ایک ہندوستانی مسلمان مہاجر ہے لیکن ایسا من چلا ہے کہ اس نے اپنی جرات سے بہت سے افغانوں کو شرمندہ کر دیا ہے"۔ مجھے ان خدمات کا جو صلہ دیا گیا، اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کا، ان کے بھائی سردار شاہ ولی خان اور سردار شاہ محمود خان اور وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی کو افغانستان کا سب سے بڑا تمغہ جس کو (اعلیٰ) کہا جاتا ہے دیا گیا۔ اس تمغے کے ساتھ زمینوں کے کچھ مربعے بھی دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ سردار سپہ

سالار صاحب مرحوم کو اس سلسلہ میں کابل کے نزدیک قلعہ علی آباد اور اس کے ارد گرد کی زمینیں دی گئیں، لیکن انہوں نے یہ ساری جائداد جیسا کہ آگے چل کر بہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔ علی آباد کے مکتب کے لئے وقف کر دی۔

سمت جنوبی کے باقی افسران اور سپاہیوں کو (نشان استقلال) نام ایک تانبے کا تمغہ دیا گیا۔

اس قومی خدمت کے صلے میں اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے سردار محمد نادر خان کے نام پر، شہر کابل کے باہر بڑی سڑک کے بیچ میں ایک یادگار قائم کرنے کا حکم دیا۔ یہ یادگار سنگ مرمر کے ستون کی شکل میں بنائی گئی۔ ارگ کابل کے دروازے سے جو سڑک شہر کے باہر کو جاتی ہے۔ اس یادگار کے ارد گرد گھوم کر گزرتی ہے۔ اس یادگار کے پتھر پر جو کتبہ کندہ ہے اس میں سردار محمد نادر خان سپہ سالار افغانستان کی قومی خدمات کا ذکر ہے۔ اور ان کو افغانستان کی آزادی حاصل کرنے والا ایک ہیرو مانا گیا ہے۔ ایک مطلق العنان بادشاہ کا اپنے ایک کمانڈر کی خدمات کا اس طرح پر اعتراف کرنا اور اس فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کی بجائے اس کمانڈر کے نام پر ایک یادگار قائم کر کے وہاں ایک کتبہ لگوانا ایک ایسی عالی ظرفی کا ثبوت ہے جو مسلمان ملکوں میں بادشاہت کا دور قائم ہو جانے اور بادشاہوں کو "ظل اللہ علی الارض" مانا جانے کے بعد شاید ہی کسی مطلق العنان مسلمان بادشاہ نے دیا ہو گا۔ کیونکہ اس دور استبداد میں ہر بڑا کام اور اچھی کارروائی کا سہرا صرف بادشاہ ہی کے سر رہتا ہے خواہ اس کا وزیر اعظم یا سپہ سالار ملک اور قوم کے لئے کتنی ہی بڑی سے بڑی خدمات سرانجام کیوں نہ دے۔

شاہی دربار کے چند روز بعد سردار محمد نادر خان کو وزیر جنگ اور سپہ سالار کل افواج افغانستان کا عہدہ اور رتبہ ملا انہوں نے از سر نو فوج کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

مجھے اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے افغانی وزارت خارجہ میں مقرر کیا اور سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی سفارش پر ماہانہ تیس (۳۰) گنی (انگریزی سونے کا پونڈ) تنخواہ دی۔ لیکن چند دن بعد ہی سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اعلیٰ حضرت امیر صاحب کو عرض کر کے مجھے وزارت جنگ میں منتقل کرا دیا اور اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا کر ریاست ارکان حربیہ عمومہ (General Staff Office) میں انگریزی اور اردو اخبارات کے ترجمہ کرنے اور ملٹری انٹیلیجنس (Militaryintelligence) کے کام پر لگا دیا۔

ہیئت تنظیمیہ سمت مشرقی

اس تقرری کے بعد میں نے جو چند ماہ کابل میں گزارے ان کے دوران میں ہندوستان سے آنے والے انگریزی اور اردو اخبارات میں سے افغانی حکومت کی دلچسپیوں کی خبریں اور دنیا کے سیاسی حالات کے متعلق مقالات کا امیر صاحب اور وزارت حربیہ کے لئے ترجمہ کرتا رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد امیر صاحب نے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو سمت مشرقی کے علاقہ کی ہیئت تنظیمی کا رئیس بنا کر جلال آباد بھیجا۔ میں بھی ان کے ساتھ جلال آباد گیا۔ انگریزی، افغانی جنگ کے دوران میں اس محاذ پر افغانی فوجوں کو شکست ہونے کے باعث، ارد گرد کے قبیلوں نے شہر جلال آباد کو لوٹ لیا تھا۔ حکومت کے احکام کی کوئی پروانہ کرتا تھا۔ حکام سے، یہاں تک کہ فوج سے بھی لوگ نہ ڈرتے تھے۔ لگان جمع کرنا حکومت کے کارندوں کے لئے ناممکن سا تھا۔ ان حالات کو درست کرنے، وہاں کے باشندوں کے جان و مال کو پھر محفوظ بنانے اور حکومت کے اثر و نفوذ، اتھارٹی (Authority) کو از سر نو قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک قابل اور ہر دلعزیز افسر کو پورے اختیارات دے کر اس علاقے میں بھیجا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے امیر صاحب نے ۱۹۲۰ء کے شروع میں سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم کو اس کام پر مقرر کیا۔ یہاں آ کر انہوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا اور ہر طرف امن و امان ہو گیا۔

سردار محمود بیگ طرزی

اس زمانے میں انگریزوں سے باقاعدہ صلح کرنے کے لئے ایک افغانی وفد کا ہندوستان بھیجا جانا کابل میں زیر غور تھا۔ دربار سے جو خبریں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو جلال آباد میں ملا کرتی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس وفد کی روانگی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو امید تھی کہ اس وفد کی سرکردگی ان کے سپرد کی جائے گی اور وہ ہندوستان جا کر انگریزوں سے بات چیت کریں گے۔ انگریزوں نے افغانستان کے استقلال کو تو منظور کر ہی لیا

تھا۔ مگر افغانوں کی اور خاص کر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ انگریزوں سے دریائے سندھ تک کا علاقہ لے لیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم قبائلی علاقہ یعنی (Non—AdministrativeArea) کہ جس میں بنیر، سوات، دیر، مہمند، آفریدی اور گزالی، محسود اور وزیریوں کا علاقہ شامل ہے، انگریزوں کے ہاتھ سے چھڑا کر ان کا افغانستان سے الحاق کرا لیا جائے، اور ان علاقوں کی انگریزی چوکیاں اور چھاؤنیاں وہاں سے ہٹالی جائیں اور یہاں کے لوگوں کو بالکل آزادی مل جائے۔ افغانوں کی ان خواہشات کو بھلا انگریز کب منظور کر سکتے تھے۔ لیکن سردار سپہ سالار صاحب مرحوم اپنے کو ایک کامیاب کمانڈر مانتے تھے جنہوں نے انگریزوں کو ٹھل کے میدان میں (کم از کم ان کے اپنے خیال کے مطابق شکست دی تھی اور افغانستان کا استقلال حاصل کیا تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریز ہندوستان میں بالکل کمزور ہیں اور اگر وہ خود افغانی وفد کے سرکردہ ہو کر ہندوستان بھیجے جائیں تو ان کو اس بارے میں ضرور کامیابی ہو جائے گی۔ انگریزوں کا دریائے سندھ تک کے علاقے کو افغانستان کو دے دینا تو ناممکن سا نظر آتا تھا۔ اس کو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم بھی جانتے تھے۔ لیکن ان کو یہ امید تھی کہ ایسا بڑا مطالبہ کرنے کے بعد اتنا سودا ضرور ہو جائے گا کہ قبائلی علاقے کا افغانستان کے ساتھ الحاق ہو جائے۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ سرحدی اقوام پشتو زبان بولنے اور افغان کہلانے کے باوجود بھی، افغانستان کی حکمرانی میں رہنا پسند نہ کریں گی، اور ان لوگوں سے لگان لینا افغانی حکومت کے لئے ناممکن ہو گا۔ ایسی حالت میں اس کا بھی احتمال ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کے دیکھا دیکھی افغانستان کے منگل اور جدران قبیلے اپنی حکومت کو لگان دینے سے انکار کرنے لگیں گے۔ تیسری شق یعنی سرحدی علاقوں سے انگریزی فوجی تھانوں اور چھاؤنیوں کا اٹھ جانا اور ان کا بالکل منتقل ہو جانا بھی اقتصادی لحاظ سے ایک ناقابل عمل چارہ کار تھا، کیونکہ قبائلی علاقہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کھیتی باڑی کے لئے کافی زمینیں نہیں ہیں۔ وہ یا تو انگریزی فوج میں نوکری کر کے یا افغانی حکومتوں سے وظیفہ لے کر گزارا کرتے ہیں یا مار دھاڑ کر کے اپنے دن کاٹتے ہیں۔

آخر کابل سے خبر آئی کہ افغانی وفد صلح کے رئیس سردار محمود بیگ طرزی ہوں گے۔ اس سے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو بہت مایوسی ہوئی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ یہ وفد انگریزوں

سے جرات اور ہمت کے ساتھ گفت و شنید نہ کرے گا اور ان سے مزید رعایات نہ لے سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ وفد منصوری کی کانفرنس صلح میں افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا اور کوئی اچھی شرطیں حاصل نہ کر سکا۔ ہمیں امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلوانے اور ہوم رول قائم کرانے میں ضرور مدد دے سکے گا، اور اس طرح اس ہندوستانی معاونت کا معاوضہ ادا کر سکے گا جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان کی بدامنی سے ڈر کر افغانستان پر پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکے اور اپنی ساری فوجوں کو افغانوں کے بر خلاف استعمال نہ کر سکے اور ڈکہ کو لے کر وہیں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے اور جلال آباد تک بڑھنے کی جرات نہ دکھلا سکے۔ افغانستان کے وفد کی طرف سے ہندوستان میں ہوم رول قائم کرانے کے بارے میں مدد ملنا تو درکنار، اس وفد کے قیام ہندوستان کے دوران (۱۹۲۱ء کے شروع میں) وہاں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اس سے مجھے بہت رنج ہوا۔ لیکن اس کا سبب اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ افغانی وفد، ہندوستان سے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کافی کامیابی حاصل کر کے لوٹ آیا۔

میں جب کوئی ایک سال بعد جلال آباد سے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ساتھ کابل واپس گیا تو قبلہ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم نے ان گرفتاریوں کی اصل وجوہ بتائیں۔ انہوں نے فرمایا۔ "سردار محمود بیگ طرزی نے منصوری جانے سے پہلے مجھ سے ہندوستان میں رہنے والے میرے دوستوں کے نام جن میں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی شامل تھے ایک خط مانگا تھا کہ اگر انگریز افغانی وفد کے مطالبات کو منظور نہ کریں یا افغانستان کی آزادی کی تصدیق میں لیت و لعل برتیں تو یہ خط ہندوستانی مسلمان لیڈروں کو دے کر، ان کے ذریعے انگریزوں کے بر خلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی جائے۔ وفد نے کابل واپس آنے پر نہ تو مجھے یہ بتلایا کہ انہوں نے اس خط کو میرے دوستوں کو پہنچا دیا تھا اور نہ ہی (اگر یہ خط مرسل الیہم کو نہیں بھیجا گیا تھا) اس خط کو مجھے واپس دیا۔ میں نے خود اس نازک معاملے کو سردار محمود بیگ طرزی سے بالکل نہیں پوچھا۔ لیکن ان کے شاگرد عبد الہادی خان سے جو اس وفد میں ان کے ساتھ تھا۔ دریافت کیا تھا، اس نے کچھ گول مول سا جواب دیا۔ اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہوا کہ افغانی وفد نے انگریزوں سے کچھ رعایات حاصل کرنے کے لئے اس خط کو انگریزی حکومت کو دے دیا

جس کی وجہ سے میرے دوست ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی اتنی زیادہ گرفتاریاں ہوئیں اور ان پر حکومت سے غداری کرنے اور اجنبی حکومتوں سے مل کر انگریزوں کے برخلاف سازش کرنے کاالزام لگایا گیا"۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا شبہ کس حد تک درست ہے اور وہ اس قسم کا گمان رکھنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں. میں اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی بڑی تعداد نظر بند کی گئی تھی۔ نیز یہ بھی سچ ہے کہ افغانی وفد نے یہ خط قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو واپس لاکر نہیں دیا۔ آیا یہ خط افغانی وفد نے خود انگریزی حکومت کو دے دیا یا افغانی وفد کی طرف سے مرسل الیہم کو بھیجنے کے لئے جس قاصد کو دیا گیا تھا اس نے خط کو انگریزوں کے حوالے کر دیا. اس کا فیصلہ کرنا بھی میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر قاصد اس خط کو انگریزوں کو دیتا تو ضرور انگریزی حکومت افغانی وفد سے مواخذہ کرتی اور پوچھتی کہ وہ ہندوستان میں صلح کی گفتگو کرنے آیا ہے یا ملک میں بغاوت پھیلانے کے لئے آیا ہے۔ اگر قاصد اس خط کو انگریزوں کو دیتا تو شاید اس سے انگریز اتنے برہم ہوتے کہ صلح کی گفت وشنید کو بھی بند کر دیتے۔ مگر انگریزوں نے اس بارے میں نہ افغانی وفد سے کوئی پوچھ گچھ کی اور نہ صلح کی گفتگو کو بند کیا اور نہ ہی کبھی اخبارات میں اس بارے میں اشارۃً بھی اظہار ناراضگی کیا۔ اس کے سوا یہ بھی ہے کہ اگر قاصد نے انگریزوں کو یہ خط دیا ہوتا تو انگریز اس پر اپنی سی۔ آئی۔ ڈی کی بہت تعریف کرتے اور ڈینگیں مارتے۔ اخبارات میں اس کا اعلان کرتے کہ ان کے ہاتھ اس قسم کا ایک خط پڑا ہے جس سے ملک میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی. جیسا کہ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے شیخ عبدالحق اور خان بہادر رب نواز کے ذریعہ حاصل کردہ خط کے متعلق اعلان کیا تھا۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ خود افغانی وفد نے یہ خط انگریزوں کو دے دیا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں اتنے مسلمان لیڈر گرفتار کئے گئے تھے۔

گیارہواں باب

صلح کے بعد کے حالات

اس وقت ان واقعات سے ہم کو یہ سبق ضرور حاصل ہوا کہ ہمیں اپنے ملک کی جنگ آزادی میں اپنے مسلمان ہمسایوں کی بجائے خود اپنی کوششوں پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے۔ کوئی مسلمان قوم ہماری خاطر اپنے مفاد کو قربان نہ کرے گی. جب تک کہ ہم غلامی سے نہ چھوٹ جائیں اور آزاد اور مضبوط بن کر اپنا لوہا جہان میں نہ منوالیں۔ ہماری باہر عزت جبھی ہو سکتی ہے جب ہم ملک کے اندر باعزت. مستقل اور طاقتور ہوں۔

خوشی محمد کا سفر روس:—

۱۹۱۷ء میں روس میں بولشویکی انقلاب ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہاں جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن قحط سالی باقی تھی۔ اس انقلاب کے بعد روس نے انگریزوں سے اپنا اتحاد توڑ لیا تھا۔ روس کی حکومت یعنی بولشویک ادارہ کی انگریزوں سے دشمنی تھی۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اس حکومت سے رابطہ پیدا کر کے اس سے ہندوستان کی آزادی میں مدد لینا چاہی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے میرے جلال آباد چلے جانے کے بعد ۱۹۲۰ء کے شروع میں خوشی محمد کو تاشقند بھیجا. جہاں بولشویکوں نے ایک مشرقی یونیورسٹی قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد ایشیائی ملکوں کے نوجوانوں کو امپریالسٹوں (Imperialist) کے برخلاف پروپیگنڈا کرنے کی تعلیم دینا اور ان میں بولشویکی خیالات پھیلانا تھا۔ اس کے ہندوستانی

صیغہ پر مہندر اناتھ رائے (M. N. Roy) نام بنگالی ہندو مقرر تھا۔ خوشی محمد اس سے ملا اور وہاں سے ماسکو گیا. جہاں وہ کومنٹرن (Comintern) یعنی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے بعض لیڈروں سے ملا۔ اس نے وہاں کمیونسٹ لٹریچر کا مطالعہ کیا جس سے اس کے خیالات ان کی طرف مائل ہو گئے اور اس نے کمیونزم قبول کر لیا اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا۔ وہ وہاں سے کابل واپس آیا۔ اس کو ماسکو میں کہا گیا کہ وہ کابل کی روسی سفارت سے تعلق رکھے اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنے قومی کام میں جتنے روپے کی ضرورت ہو اس کو روسی سفارت سے حاصل کرے۔ اس طریقہ کار سے ہمیں جو فائدے پہنچے اور جو نقصان اٹھانے پڑے ان کا ذکر آگے چل کر مفصل کیا جائے گا۔

انگریزوں کے خلاف میرا پروپاگنڈا

۱۹۱۹ء کا سال ایسا تھا کہ انگریزوں کے برخلاف ہندوستان میں جلیانوالے باغ کے قتل عام اور رولٹ بل کی وجہ سے بہت ایجی ٹیشن پھیلا ہوا تھا۔ سیورے (Severes) کے معاہدہ صلح کی وجہ سے ترکی کے حصے بخرے کئے جانے پر، مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ خلافت کی حفاظت کے لئے پروپیگنڈا ہو رہا تھا اور جمعیت خلافت ہند کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس لئے میں نے بھی جلال آباد میں رہتے ہوئے ایک دو دفعہ کوشش کی کہ ہندوستان میں کچھ سیڈیشس پمفلٹ بھیج کر انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اور بھڑکاؤں۔ لیکن ہر دفعہ یہ پمفلٹ انگریزوں کے ہاتھ پڑے۔ یا تو پمفلٹ لے جانے والے شخص نے روپیہ کے لالچ کی وجہ سے ان کو انگریزوں کو دے دیا، یا پمفلٹ تقسیم ہونے کے بعد، ان میں سے کچھ انگریزوں کے ہاتھ پڑ گئے. بہرحال انہوں نے افغانی گورنمنٹ کو احتجاج بھیجا جس پر مجھے وزارت خارجہ افغانستان کی طرف سے زجر و توبیخ کی گئی۔

ڈاکٹر نور محمد کی ہجرت

انہی دنوں ہندوستان سے، حیدر آباد سندھ کے باشندوں میں سے ڈاکٹر شیخ نور محمد صاحب

مرحوم دو اور ساتھیوں کے ساتھ جماعت مجاہدین کے ذریعہ ہجرت کر کے جلال آباد پہنچے۔ وہ جلال آباد سے کابل بھیج دیئے گئے۔ بعد میں ان کے دو ساتھی تو کابل کے حالات سے مایوس ہو کر ہندوستان واپس چلے گئے لیکن ڈاکٹر نور محمد کابل میں ٹھہر گئے۔ وہ اصل میں نو مسلم تھے۔ انہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ ایک زمانے میں حیدر آباد سندھ میونسپلٹی کے صدر اور سندھ کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کے ساتھ، مرحوم شیخ عبدالرحیم صاحب سندھی کی کوشش سے اسلام قبول کیا تھا۔ بعد میں ان کی والدہ نے شیخ صاحب مرحوم سے شادی کر لی تھی۔ شیخ صاحب قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے دوست تھے۔ اس لئے ڈاکٹر نور محمد کے لئے کابل میں رہنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ بعد میں وہ ہماری جماعت کے اہم رکن بن گئے۔ انہوں نے اپنی ڈاکٹری کی خدمات کی وجہ سے کابل میں جلد شہرت حاصل کر لی اور عوام اور خواص کا بلا معاوضہ معالجہ کرنے کے باعث ہندوستانی مہاجروں کا نام بلند کر دیا۔ اس طرح پر انہوں نے سردار محمد نادر خان مرحوم سپہ سالار اور سردار محمود بیگ طرزی مرحوم کے خاندان میں اچھا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔

اخبار اتحاد مشرقی

جلال آباد میں سپہ سالار صاحب مرحوم نے "اتحاد مشرقی" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنا چاہا۔ اس کی ایڈیٹری مجھے دی گئی. لیکن میں اپنے لیڈنگ آرٹیکل کے نیچے اپنا نام نہیں لکھا کرتا تھا۔ کیونکہ افغانی وزارت خارجہ نے اخبار کے نکالنے کی اجازت دیتے وقت اس قسم کی ایک شرط لگا دی تھی۔ مدیر اخبار، برہان الدین کشککی نام ایک افغانی ملا مقرر ہوا جس نے مذہبی تعلیم ہندوستان میں حاصل کی تھی اور جو ٹوٹی پھوٹی اردو بھی جانتا تھا۔ لیکن اس کو اخباری دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ اس کی عمومی تعلیم اس درجہ کی تھی کہ وہ ایک اخبار کا ادارہ اپنے ہاتھ لے کر چلا سکے، اس لئے سارا بوجھ میرے سر پر تھا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ لیڈنگ آرٹیکل کے سوا، انگریزی اور اردو اخبارات سے خبروں کا ترجمہ کرنا بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ میں اس اخبار میں جو آرٹیکل لکھا کرتا تھا، وہ زیادہ تر اس مضمون پر ہوا کرتے تھے کہ سمت مشرقی کے لوگوں کو باہم اتحاد واتفاق رکھنا چاہئے اور ملک میں امن وامان قائم کر کے، انگریزی، افغانی جنگ کی وجہ سے جو نقصان

سمت مشرقی کو پہنچا ہے اس کی تلافی کی کوشش کرنا چاہئے۔ خارجی خبروں کے سلسلے میں زیادہ تر ہندوستان کے حالات، وہاں کے ایجی ٹیشن کے بارے میں اور جنگ عظیم میں شکست کے بعد ترکی میں جو قومی تحریک پیدا ہوئی تھی، ان کے متعلق خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اخبار کو جاری ہوئے ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ۱۶/مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں کے استانبول پر قبضہ کرنے کی خبر آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے بیڑوں نے اپنی فوجیں خشکی پر اتار کر شہر کے اہم نقاط کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا اس لئے رات کو ایک ترکی فوجی چوکی پر اچانک حملہ کر کے وہاں سوئے ہوئے بیس ترکی سپاہیوں کو شہید کر دیا۔ یہ خبر ہم کو بعد میں معلوم ہونے والی مبالغہ آمیز تفصیلات کی وجہ سے، بہت ہولناک لگی۔ ہمیں کہا گیا کہ انگریزوں نے دارالخلافہ ترکی پر قبضہ کر کے شہر میں قتل عام کیا اور غارت گری مچادی اور خلیفہ المسلمین کو قید کر لیا۔ شہر میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ میں نے اس خبر کو انہی الفاظ میں درج کر کے سخت پیرایہ میں ایک لیڈر لکھا اور قبائل سرحد کو مشتعل کر کے جہاد پر ابھارا۔ اس سے سرحدی لوگوں میں انگریزوں کے بر خلاف سخت نفرت اور دشمنی پھیل گئی۔ احتمال تھا کہ وزیری اور آفریدی بغاوت کر ڈالیں۔ اس پر انگریزوں نے فوراً پروٹسٹ کر کے افغانی وزارت خارجہ سے مطالبہ کیا کہ یہ اخبار بند کر دیا جائے۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اخبار تو بند نہ کیا لیکن مجھے اس کی ایڈیٹری سے ہٹا دیا۔

برصغیر سے مسلمانوں کی ہجرت کی تحریک

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا، اس زمانے میں تحریک خلافت ہندوستان میں بڑے زور سے چل رہی تھی۔ ترکوں کی مدد کے لئے چندے جمع ہو رہے تھے اور یہ روپیہ سیٹھ چھوٹانی کے ذریعہ ترکی قومی حکومت کو بھیجا جا رہا تھا۔ اس چندے کے روپیہ سے، ترکوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی صدارت میں، لندن اور پیرس کو وفد بھیجے گئے تھے تاکہ معاہدہ سیورے کو جس کے ذریعہ دولت ہائے ائتلاف نے ترکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے چاہے تھے تبدیل کرایا جائے۔ ان کارروائیوں سے ترکوں کو مدد تو ضرور ملی لیکن اس سے ہندوستان کی آزادی کا راستہ نہ کھلا۔ صرف انگریزوں کے لئے ذرا ہندوستان میں پریشانی بڑھ گئی، مگر ان کو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اس پر صوبہ یو۔ پی کے مولانا عبدالباری مرحوم نے ہندوستان کو، علمائے دیوبند کی طرح

دارالحرب قرار دے کر فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں۔ اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن ہجرت کر کے کہاں جائیں اور کس ملک میں پناہ لیں؟ اس بارے میں ان کو تردد تھا۔ اس پر امیر افغانستان اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے یہ الفاظ خاص کر قابل ذکر ہیں:۔

"افغانستان بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد"۔

(یعنی افغانستان سارے کا سارا ملک ہندوستانی مہاجروں کو پناہ دینے پر تیار ہے) اس قسم کے بیانات کو قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کچھ پسند نہ کیا۔ لیکن ان پر اعتراض بھی نہ کیا۔ امیر صاحب کے ان بیانات کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانان ہند کے لئے زبانی ہمدردی کریں اور اس سے ذرا انگریزوں کو ڈرا کر، افغانستان کے لئے کچھ رعایات لے لیں، ورنہ (جیسا کہ آگے چل کر لکھا جائے گا) نہ تو ان بے چارے مہاجروں کے کسی جگہ بسانے کا اور نہ ہی ان کو باقاعدہ مدد دینے کے لئے کوئی انتظام کیا گیا تھا، اور نہ اس بارے میں کوئی اچھی سوچی ہوئی پلین موجود تھی؛ یہ بیانات تو فوری جذبات کی وجہ سے دیئے گئے تھے۔

افغانستان میں اس بارے میں جتنی کوتاہ اندیشی ہوئی اتنی ہی بد انتظامی ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئی؛ کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا کہ امیر صاحب کے ان بیانات کے بعد کابل میں کسی کو خط لکھ کر، یا ایک آدمی بھیج کر معلوم کریں کہ ان مہاجروں کی پذیرائی اور ان کے بسنے کے لئے کیا انتظامات کئے گئے ہیں۔ نہ ہی کسی کی عقل میں یہ بات آئی کہ ان مہاجروں کو چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل میں اور چند چند روز کے فاصلے سے بھیجا جائے تاکہ ایک قافلے کے رہنے کا اچھی طرح کا انتظام ہو جانے کے بعد دوسرا قافلہ روانہ کیا جائے۔ ہجرت کے فتوے پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دیئے اور نتیجہ اور عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان بے چاروں کے اس جوش میں نہ صرف ان کی مذہب دوستی کا دخل تھا بلکہ ایک حد تک ان کی مالی خرابی کا بھی اثر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں ان کے لئے سرکاری خزانے کا منہ کھلا ہوا ہے جہاں وہ جاتے ہی مال دار ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس کا امکان نہ تھا۔ کیونکہ افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے اور پس ماندہ ہے۔ یہاں ہزاروں مہاجروں کا جلد اور بہ آسانی بس جانا ناممکن ہے۔ افغانستان میں قابل کاشت زمین اتنی کم ہے کہ وہ اپنے پیوندوں کو جو سردی کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں

برصغیر ہندو پاکستان کو جایا کرتے ہیں. زمینوں اور کھیتوں پر آباد کرنے سے عاجز ہے۔

مہاجروں کا جم غفیر بے سروسامانی کی حالت میں افغانستان کی طرف روانہ ہوا. اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم تھے۔ چند ایک ہائی سکول پاس شدہ اور شاید چار پانچ گریجویٹ تھے جن میں لاہور سے اقبال شیدائی. پشاور سے اکبر خان اور احمد شاہ خان. بھوپال سے مسٹر عثمانی شامل تھے۔ انگریزوں نے جن کو افغانستان کی مالی کمزوری اور ہندوستانی تحریک ہجرت کی بے سروسامانی کا خوب علم تھا. اس تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کے کارندوں نے ہندوستان میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ کابل پہنچتے ہی مالدار ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہجرت کی ترغیب دی اور اس طرح پر اس تحریک کو افغانستان اور پنجابی اور سرحدی مسلمانوں کے لئے ایک رحمت کی بجائے ایک آفت بنا دیا۔ امیر صاحب کو امید تھی کہ ہماری جماعت کی طرح کے لکھے پڑھے ہندوستانی اس تحریک کے ذریعہ افغانستان آئیں گے۔ لیکن یہاں تو یہ ہوا کہ جتنے ان پڑھ کاشتکار تھے. جن کے لئے ہندوستان میں ساہوکاروں. زمینداروں اور گورنمنٹ کے مطالبات کی وجہ سے زندگی تنگ ہو چکی تھی. اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اکثر تو پیدل آئے۔ جنہوں نے اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا انہوں نے اپنی بیل گاڑیوں پر سامان لاد کر ان کو ان پر سوار کیا. یا کرایہ پر گاڑیاں لیں۔ بعض کو امید تھی کہ افغانی سرحد میں داخل ہوتے ہی ان کے لئے سواری کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن افغانستان میں نہ زیادہ گھوڑے گاڑیاں ہیں اور نہ تانگے ہیں۔ صرف جلال آباد میں چند ایک تانگے کرایہ پر مل سکتے تھے۔ یہ مہاجر افغانی سرحد سے جلال آباد تک بہت بے سروسامانی سے پہنچے۔ جلال آباد میں ان میں سے بعضوں نے کچھ سواری اور باربرداری کا سامان کیا۔ لیکن ان گاڑیوں کے گھوڑے ان کو راستہ کی پہاڑیوں پر سے گزار کر کابل تک نہ پہنچا سکے۔ پہلے قافلے کے بعد جو قافلے آئے ان کو تو باربرداری بالکل مل ہی نہ سکی. جو اپنی گاڑیاں لائے تھے ان کے بیلوں کو چارہ نہ مل سکا۔ ان مہاجروں کے کھانے پینے کا انتظام بھی بہت مشکل تھا۔ جلال آباد میں کوئی ہوٹل تھا اور نہ کوئی ریسٹورانٹ۔ کھانے کی چند ایک دکانیں تھیں جن میں کھانا بہت نکما تھا اور زیادہ مقدار میں بھی موجود نہ ہوتا تھا. اس لئے ان بچاروں کو اپنے پیسے سے بھی روٹی نہ مل سکی۔ جلال آباد میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے حکومت سے منظوری لے کر ان کو روٹی کھانا دیا. لیکن ان کے ہاتھ میں بھی نہ کافی روپیہ تھا اور نہ پورا انتظام. اور نہ ہی ایسے ذرائع موجود تھے کہ ہزاروں اشخاص کی ایک دم ضروریات پورا کریں۔ میں نے جلال آباد میں ان لوگوں کی

ناگفتہ بہ حالت دیکھی جو افغانی گورنمنٹ کی مدد کے باوجود بھی پریشان تھے۔ اس افراتفری کا مجھ پر بہت برا اثر ہوا۔ میں نے مولانا عبدالباری صاحب کو خط لکھے کہ اس سیلاب کو روکیں اور صرف پڑھے لکھے لوگوں کو جو افغانستان کے لئے مفید ثابت ہو سکیں، بھیجیں۔ لیکن وہاں تو محشر برپا تھا۔ میری یا اور کسی کی کون سنتا تھا۔

قافلے پے درپے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے۔ شروع میں انکو خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی۔ لیکن ان سب کیلئے قابل اطمینان انتظام ناممکن تھا. بے چاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں ــــ بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی بھی کی۔ بعض لوگوں نے تو روٹی اور کھانا خریدنے کے لئے اپنا اثاثہ البیت بھی فروخت کرنا شروع کیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا۔ ان لوگوں کا فارسی زبان سے بے بہرہ ہونا. ان کی بے مائیگی، پردیس اور اس پر وفادار دوستوں کا فقدان. یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے. جس نے ان کو خود دیکھا اور ان کا سامنا کیا ہو۔ آخر جب مہاجرین کی تعداد بڑھنے لگی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبوں مثلاً پنج شیر، قطغن، بدخشاں اور ترکستان کو روانہ کیا گیا۔ پہاڑی راستہ. ان کی خود بے سروسامانی، پڑاؤں پر کھانے پینے کی چیزوں کا نہ ملنا. ایسی مشکلات تھیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن تھا۔ صرف چند ایک نوجوان ترکستان پہنچے اور وہ وہاں سے تاشقند چلے گئے۔ کچھ قطغن اور بدخشاں میں آباد ہوئے مگر وہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ پنپ نہ سکے۔ باقی پھر کابل کی طرف واپس لوٹے اور وہاں سے ہندوستان واپس جانے پر تیار ہو گئے۔ اس پر کابل میں ٹھہرے ہوئے مہاجر بھی پشاور کو لوٹنے لگے۔ اب یہ سیلاب الٹا پھرا اور ہندوستان کی طرف مڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے، افغانستان پر مالی بوجھ پڑا، ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں کے کبیدہ خاطر بنے۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے۔ ہجرت کی تحریک گو بذات خود ایک اچھی تحریک تھی، لیکن بد انتظامی بے سروسامانی اور بغیر سوجھے بوجھے چلائے جانے کی وجہ سے مفید ہونے کی بجائے بہت مضر ثابت ہوئی۔ اگر مسلمان مکے کی ہجرت سے سبق لیتے تو یہ مفید ہوتی۔

ہجرت کے سلسلہ میں جو مہاجر کابل میں آئے. ان میں سے چند ایک قابل ذکر ہیں: ۔ ان میں اول نمبر مولوی احمد علی صاحب مرحوم کا ہے. جو قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے بھتیجے تھے اور لاہور میں شیرانوالہ دروازہ میں قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ وہ ایک اہم شخصیت رکھتے تھے

لیکن کابل میں ان کے لئے اور ان کی قابلیت علمیہ کے مطابق کوئی کام نہ تھا۔ وہ فارسی نہ جانتے تھے کہ کابل میں قرآن شریف کی تفسیر پڑھاتے۔ ان کو کابل میں رہنے کے لئے مکان تک نہ مل سکا۔ وہ بمعہ اپنے اہل و عیال کے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے پاس ٹھہرے۔ ان کے لئے ہجرت کی نیت توڑ کر دوسرے مہاجروں کی طرح واپس ہندوستان جانے کا بھی امکان نہ تھا۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ان کو ہندوستان میں کام کرنے پر مقرر کیا اور اس طرح ان کو واپس جانے پر راضی کیا۔ اس سے ان کی ضمیر بھی ذرا مطمئن ہوئی کہ وہ ہجرت کی نیت نہیں توڑ رہے ہیں بلکہ اپنے بزرگ کے دیئے ہوئے فرض کی ادائیگی کے لئے واپس لوٹ رہے ہیں۔

دوسرے اہم شخص خان عبدالغفار خان تھے جو اتمان زئی پشاور کے رہنے والے تھے (وہ بعد میں سرحدی گاندھی کے لقب سے مشہور ہوئے اور انہوں نے سرخ قمیص پوشوں (RedShirts) کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور پاکستان بننے پر صوبہ سرحد کو پاکستان سے علیحدہ کر کے پشتونستان بنانے کا ڈھونگ کھڑا کیا) یہ جب کابل پہنچے تو قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ان کی بڑی عزت اور خاطر داری کی اور ان کو حکومت موقتہ ہند کی کارروائیوں سے خبردار کیا اور بتایا کہ وہ افغانستان کو صوبہ سرحد کے ساتھ ملانے کا وعدہ کر کے افغانستان سے ہندوستان کی آزادی میں مدد لینے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس پر خاں صاحب بہت سیخ پا ہوئے کہ کیوں قبلہ مولانا ترقی یافتہ صوبہ سرحد کو پسماندہ افغانستان کے ساتھ ملانا چاہتے ہیں۔ (خدا کی شان ہے کہ انہوں نے پاکستان بننے پر صوبہ سرحد کے لئے ایسی ایسی تجویزیں کیں جو اس سے کہیں زیادہ خراب اور نقصان دہ تھیں۔) تیسرے شخص ارباب صاحب تھے جو پشاور کے ضلع کے شرفا میں سے تھے۔ لیکن ان کی تعلیم بالکل نہ تھی اور وہ سیاسی وسعت نظر کے مالک نہ تھے۔ آخر کار وہ بھی عبدالغفار خان کی طرح پشاور لوٹ گئے۔

چوتھے بلوچستان کے ایک سردار جن کا نام محمد اسلم خان تھا، اپنے چند ایک لوگوں کے ساتھ کابل تک پہنچ گئے تھے، وہ افغانستان ہی میں بس گئے لیکن ان کو بھی بہت سی مالی مشکلات کا سامنا ہوا اور افغانی گورنمنٹ کے وظیفہ خوار بننے پر مجبور ہوئے۔

پانچویں شخص عزیز صاحب تھے جو اصل میں تو امرتسر کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے اپنے کو عزیز ہندی کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے میں مصروف ہو گئے

تھے۔ باقی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے چند ایک گریجویٹ آئے تھے۔ ان میں سے صرف اقبال شیدائی صاحب کابل میں ٹھہرے اور ہمارے ساتھ مل کر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی صدارت میں کام کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

احمد شاہ خان ترکستان میں بسے اور وہاں محکمہ تعلیم میں کام کرنے لگے۔ لیکن کچھ سال بعد وہ کابل آئے اور میں جب ۱۹۳۳ء میں ترکی سے فوجی معلم کے طور پر کابل آیا تو دیکھا کہ وہ کابل میں تجارتی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی اچھی ساکھ بنی ہوئی ہے۔ بعد میں، پاکستان بننے پر وہ کراچی چلے گئے جہاں میں نے ان کو ۱۹۴۹ء میں ۳۴ سال بعد پھر اپنے وطن مالوف کو لوٹ کر، کراچی میں دیکھا۔ وہاں بھی ان کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔

بھوپال کے عثمانی صاحب تاشقند پہنچے۔ وہاں انہوں نے کچھ بولشویکی لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ میں نے بعد میں سنا کہ وہ بھی پھر ہندوستان لوٹ گئے۔ پشاور کے اکبر خان بھی کچھ مدت ترکستان میں رہے۔ پھر وہاں سے تاشقند پہنچے۔ جہاں سے وہ بھی ہندوستان چلے گئے۔

مہاجروں میں مل کر بعض انگریزی جاسوسوں کا افغانستان پہنچنا بالکل ایک قدرتی بات تھی۔ ان جاسوسوں میں سے ایک شخص عبدالحق نامی تھا۔ یہ اپنے کو بڑا متقی اور پرہیزگار دکھلاتا تھا۔ یہاں تک کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو بھی اس کے زہد و تقویٰ سے دھوکا لگا تھا۔ اس نے بھی قندھار کے راستہ ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر کابل سے چلنے سے پہلے کوئٹہ کے انگریزی افسر کو خط لکھا جس میں اس کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ یہ خط افغانوں کے ہاتھ پڑا۔ میں نے بھی یہ خط سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے دفتر میں دیکھا۔ اس سے مجھے بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ تحقیقات کے بعد اس شخص کو جیل میں ڈال دیا گیا اور بعد میں اس کو موت کی سزا دے دی گئی۔ اس طرح عبدالرحمٰن جو ہماری جماعت میں بعد میں آ کر شریک ہوا تھا اور اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ کابل کے چڑیا گھر کے باغ سے بھاگ کر یاغستان (سرحد آزاد) میں چلا گیا تھا اور وہاں سے ہندوستان پہنچ گیا تھا، پھر افغانستان آیا۔ مگر اس دفعہ انگریزوں کی طرف سے تحریک ہجرت کے سلسلہ میں وہاں بھیجا گیا تھا۔ وہ خوست میں افغانوں کے ہاتھ پڑا اور قید خانے میں ڈال دیا گیا، جہاں وہ بعد میں مر گیا۔

میری کابل کو واپسی۔

منصوری میں انگریزوں سے صلح ہو جانے اور سمت مشرقی میں پوری طرح سے امن وامان قائم ہونے پر، سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کا سمت مشرقی کی تنظیم کا فرض پورا ہو گیا تھا اس لئے امیر صاحب کی طرف سے ان کو کابل واپس آنے کا حکم پہنچا، اور تقریباً ایک سال جلال آباد میں رہ کر کابل واپس روانہ ہو گئے۔ ان کی جگہ ان کے چھوٹے سوتیلے بھائی سردار ہاشم خان مقرر ہوئے جو امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے وقت ہرات میں کمانڈر تھے اور امیر صاحب کے قتل پر جس طرح ان کے رشتہ داروں کو فوج نے جلال آباد میں قید کر دیا تھا اسی طرح وہ بھی ہرات میں فوج کی طرف سے اپنے چچازاد بھائی سلیمان خان والئی ہرات کے ساتھ قید کر کے کابل لائے گئے تھے۔ لیکن جب سردار سپہ سالار مرحوم اور ان کے بھائی اس قتل کے الزام سے بری ہوئے تو وہ بھی رہا کر دیئے گئے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے جیسے مجھے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے ساتھ بطور ان کے سیکرٹری کے بھیجا تھا، اسی طرح انہوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے اللہ نواز خان کو سردار محمد ہاشم کے ساتھ بھیجا۔ سردار موصوف جلال آباد میں اللہ نواز خان کے کام سے بہت خوش رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو اپنے سے بالکل جدا نہ کیا۔

میں کابل واپس آنے پر پھر وزارت حربیہ میں دائرہ ارکان حربیہ عمومیہ (General Staff) (General Head Quarters) میں مقرر ہوا۔ یہاں میں نے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کی ہدایت کے مطابق سرحدی قبائل کے بارے میں ایک فائل تیار کیا جس میں ہر قبیلے کے سردار اور خوانین، اور اس کے ممبروں کی تعداد، تقریبی فوجی طاقت، بندوقوں کی تقریبی تعداد، اس کی مالی حالت، اس کا سیاسی میلان وغیرہ کے بارے میں معلومات جمع کیں۔

نیز اس فائل میں اس بارے میں بھی رائے دی گئی تھی کہ اس قبیلے کو انگریزوں سے پھرا کر افغانی گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے اس کے خوانین کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے اور ان کو کتنی کتنی تنخواہیں دی جائیں۔ اس کے سوا اس میں یہ بھی درج تھا کہ قبیلوں کی باہمی رقابت یا دشمنی سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس سلسلہ میں، میں نے ایک انگریزی کتاب کا جس کا نام (Black Mountains to Wiziristan) (From H.C. Willy) کی طرف

سے لکھی گئی تھی، فارسی میں ترجمہ کر کے چھپوانا شروع کیا۔ اس کتاب کے مضامین سے مجھے اس فائل کے تیار کرنے میں کافی مدد ملی۔ اس فائل کا مقصد یہ تھا کہ صلح کے زمانے میں افغانستان کو ان قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں مدد ملے تاکہ اگر کبھی پھر انگریزوں سے لڑائی ہو تو جو مشکلات اس دفعہ لڑائی میں افغانی کمانڈروں کو پیش آئیں یا جن ناکامیوں کا انہوں نے منہ دیکھا، ان کا دوبارہ سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن میرے افغانستان میں باقی ماندہ ایام قیام میں اس قسم کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میرے بعد اس فائل کا کیا حشر ہوا؟ اس سے وزارت حربیہ افغانستان نے کتنا فائدہ اٹھایا اور سرحد کے متعلق جو (H.C Willy) کی کتاب میں نے ترجمہ کر کے چھپوانی شروع کی تھی وہ پوری چھپی یا نہیں؟ اس کے بارے میں مجھے افغانستان چھوڑنے کے بعد کوئی خبر نہیں مل سکی۔ استفسار کرنے پر، افغانستان سے آنے والوں سے میں جتنا کچھ معلوم کر سکا، وہ یہی تھا کہ اس کتاب کی چھپائی نا تمام رہی اور اس فائل کو بالکل طاق نسیان پر رکھ دیا گیا تھا۔

اس زمانے میں افغانستان کے ملک کا کوئی باقاعدہ نقشہ بھی موجود نہ تھا جس سے سکولوں یا دفتروں میں کام لیا جائے۔ اس لئے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے چاہا اگر فوجی نقشہ نہ بھی ہو تو کم از کم ایک بڑے پیمانے کا عمومی نقشہ جو سکولوں کی دیواروں پر لٹکایا جا سکے اور جس میں پہاڑ، دریا، ندیاں اور نالے، راستے اور شہر و قصبات علیحدہ علیحدہ رنگ میں چھپے ہوں، تیار کیا جائے۔ اس کے لئے میں نے پہلے تو ہندوستان سے ایسے افغانستان کے نقشے جستہ جستہ منگائے جن سے اس قسم کا ایک بڑا نقشہ بنانے میں مدد مل سکے۔ لیکن ان نقشوں کا پیمانہ Scale چھوٹا تھا۔ اس لئے ان کو بڑا کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کام کو سرانجام دینے کے لئے ہندوستان سے ایک (Pantograph) منگا کر اس کا استعمال مرزا عبدالرسول نقشہ نویس وزارت حربیہ کو سکھایا اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے جو اس قسم کے رنگین نقشوں کی چھپائی کا اصول مجھے بتایا تھا، اس کے مطابق اس نقشے کو چھپوانے کے لئے وزارت حربیہ کے چھاپے خانے میں جس کو سردار سپہ سالار مرحوم نے سرکاری افغانی مطبع سے علیحدہ کر کے اپنی نگرانی میں وزارت حربیہ میں قائم کر لیا تھا، تیاریاں شروع کیں۔ مرزا عبدالرسول نے ان چھوٹے پیمانے کے نقشوں کو بڑا کیا اور اس نے ان کو لیتھو گرافی کے اصول پر یعنی پتھر پر چھپوانا شروع کیا۔ اس زمانے میں کابل میں ایسے بڑے نقشے کا رنگین چھپ جانا ایک بڑا کارنامہ سمجھا گیا تھا۔ لیکن اس

نقشہ کی چھپائی ختم ہونے سے پہلے ہی میرے افغانستان چھوڑنے پر مجبور ہونے کی وجہ سے یہ نقشہ بھی ادھورا ہی رہ گیا اور اس کو بھی میرے بعد کسی نے پورا نہ کیا۔

جمال پاشا کی کابل میں آمد

اس زمانے میں (یعنی ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں) ترکی کے سابق وزیر بحر احمد جمال پاشا (مرحوم) کابل پہنچے۔ ان کے وردو نے کابل کی سیاسی زندگی میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ جمال پاشا نے، طلعت پاشا مرحوم، انور پاشا مرحوم اور نیازی بک مرحوم کے ساتھ مل کر یوروپین ترکی میں نوجوان ترکوں کی (جمعیت اتحاد و ترقی) کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس جمعیت نے ۱۹۰۸ء میں مطلق العنان سلطان عبدالحمید خان ثانی کو تخت سے اتار کر ملک میں دستوری حکومت اور پارلیمنٹری نظام قائم کیا تھا اور بعد میں جرمنی سے اتحاد کر کے ترکی کو پہلی جنگ عظیم میں شریک کرا دیا تھا۔ جمال پاشا مرحوم جنگ کے زمانے میں وزیر بحر رہ چکے تھے۔ وہ فلسطین کے محاذ کے کمانڈر کی حیثیت سے مصر کو انگریزوں کے ہاتھ سے چھڑانے والی ترکی فوجی مہم کے سربراہ بھی مقرر ہوئے تھے اور ترکی فوجوں کو جنگی ساز و سامان کی کمی کے باوجود بھی صحرائے سینا سے گزار کر نہر سویز تک لے جانے اور سویز کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن فوجی طاقت کی کمی کی وجہ سے سرزمین مصر میں داخل نہ ہو سکے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے اس جنگ میں ناکام رہنے پر وہ اتحاد و ترقی کے دوسرے ارکان کے ساتھ یورپ چلے گئے تھے۔ ترکی کی حمایت میں جب ہندوستانی مسلمانوں میں ایجی ٹیشن شروع ہوا اور اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ہندوستانی وفد خلافت یورپ بھیجا گیا تو اس وقت ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اتحاد و ترقی کے لیڈروں کو خبر بھیجی کہ اگر جمعیت اتحاد و ترقی کے تین موجودہ بانیوں یعنی طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا میں سے کوئی ایک شخص کابل پہنچ جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک بہت طاقت پکڑ جائے گی اور وہاں بہ آسانی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرائی جا سکے گی۔ جمال پاشا مرحوم نے اپنے کابل آنے کا یہ سبب خود قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنی پہلی ملاقات کے دوران میں، جس میں قبلہ مولانا

صاحب مرحوم کے ساتھ ہمارے ساتھیوں میں سے ڈاکٹر نور محمد شامل تھے، بیان کیا تھا۔ اس سفر میں جمال پاشا کے ساتھ استانبول کا سابق مدیر پولیس بدری بک بھی تھا۔ ملاحظہ ہو نتھی شدہ فوٹو گراف (۹) اس زمانے میں مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم بھی دوبارہ کابل میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے قبلہ مولانا صاحب کا تعارف جمال پاشا سے کرایا تھا۔

جمال پاشا مرحوم کو امیر امان اللہ خان نے قصر عین العمارہ میں جہاں وہ خود اپنی شاہزادگی کے زمانے میں رہا کرتے تھے اور جو اب ترکی سفارتخانہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جگہ دی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی اس زمانے میں اس قصر کے نزدیک اس گھر میں رہا کرتے تھے جہاں امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں سردار محمود بیگ طرزی کی رہائش تھی۔ جمال پاشا کے آنے کے چند روز بعد قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے مجھے ان سے ملایا اور ان کو یہ بتایا کہ میں افغانی وزارت حربیہ میں ملازم ہوں اور وزیر حرب سردار سپہ سالار صاحب محمد نادر خان کا بہت معتمد ہوں۔ اس کے بعد میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی پر ان کے کابل پہنچنے کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ لیکن انہوں نے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر افغانی فوج کی ماڈرن اصولوں پر تعلیم و تربیت کے انتظامات کے لئے کوشش شروع کی اور اس کام کے لئے ان ترکی افسروں سے فائدہ اٹھایا جو جنگ عظیم کے دوران میں روسیوں کے ہاتھ جنگی قیدی بن گئے تھے اور سائبریا میں نظر بند تھے۔ لیکن وہاں سے خفیہ خفیہ بھاگ کر افغانستان پہنچ گئے تھے۔ ان افسروں کی مدد سے انہوں نے کابل میں قطعہ نمونہ (Model Military Contingent) کے نام سے ایک فوجی دستہ تیار کیا (بعد میں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں افغانستان میں جو امیر صاحب کے برخلاف قبائل نے بغاوتیں کیں ان کو قطعہ نمونہ میں تربیت یافتہ افغانی افسروں نے فرو کیا تھا)

ایک طرف تو جمال پاشا مرحوم اس قطعہ نمونہ کی تعلیم و تربیت کے کام میں مصروف تھے اور دوسری طرف انہوں نے افغانستان کے طرز حکومت کی اصلاح، اور محکموں کو وزارتوں کی شکل میں منظم کرنے کا کام اور وزارت حربیہ کو ماڈرن اصولوں پر چلانے کا فرض اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ان کاموں میں ان کو باوجود درباری رقابتوں اور چہ مگوئیوں کے کافی کامیابی ہوئی۔ لیکن اس بارے میں ان سے بعض غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ مثلاً وزارت حربیہ کی از سر نو تنظیم کے سلسلہ میں جو کارروائیاں انہوں نے کیں ان سے سردار سپہ سالار صاحب

مرحوم کو یہ گمان ہوا کہ وہ خود ان کی جگہ افغانی وزیر حربیہ بننے کی کوشش میں ہیں۔ اس میں بعض بدخواہ لوگوں کا بھی دخل تھا جنہوں نے جمال پاشا مرحوم کے برخلاف سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے کان بھرے تھے۔ لیکن بعض فوجی کاموں کے بارے میں جمال پاشا مرحوم، سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے مشورے کے بغیر امیر صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ان کی منظوری لے لیا کرتے تھے۔ یہ بات سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو ناگوار گزرتی تھی۔

جمال پاشا مرحوم مردم ناشناس تھے۔ کابل میں رہتے ہوئے اس قسم کے کئی واقعات ایسے پیش آئے جن سے ان کی یہ کمزوری اچھے خاصے طور پر نمایاں ہو گئی تھی۔ ان میں سے میں یہاں صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا، باقی آگے چل کر تاریخی سلسلہ سے لکھوں گا۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ شجاع الدولہ کوتوال کابل کو، شاید امیر صاحب کی اس سے محبت ہونے کی وجہ سے، امور امنیہ یا خلاصتہ وزیر امنیہ (Ministry for Security) بنا دیا تھا حالانکہ نہ اس کو ایسے بڑے کاموں سے واقفیت تھی اور نہ اس میں اس قسم کی قابلیت تھی۔ وہ ایک غلام بچہ تھا جس نے شاہی دربار میں نوکر کے طور پر تعلیم و تربیت پائی تھی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے وزارت حربیہ میں مختلف افغانی افسروں اور مدیروں کو جمع کر کے افغانی وزارت حربیہ کی از سر نو تنظیم کے لئے ایک جلسہ کیا اور مجھے وہاں دیکھا تو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم سے یہ کہہ کر کہ میں ایک پرائے ملک کا آدمی ہوں اور ہندوستانی ہوں، اس لئے مجھے اس جلسہ میں شریک نہیں کیا جانا چاہئے، مجھے اس اجتماع میں بیٹھنے سے رکوا دیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب نے مجھے ان کی خدمت میں پیش کر کے ان کو بتا دیا تھا کہ مجھ پر سردار سپہ سالار محمد نادر خان کو پورا اعتماد ہے۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے جمال پاشا مرحوم کی اس خواہش کو اس خیال سے رد نہ کیا کہ مبادا پاشا اس کو بہانہ بنا کر ان کے برخلاف امیر صاحب کو کچھ کہیں۔ اگر پاشا سے میرا تعارف نہ ہوا ہوتا تو مجھے پہچان نہ سکتے تھے اور میری شرکت پر اعتراض نہ کر سکتے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اور مجھے ان کے اس رویہ سے بہت رنج ہوا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کے بارے میں پوری طرح خبردار رہنے کی غرض سے جمال پاشا مرحوم نے ہندوستانی اخبارات کا فارسی میں ترجمہ کرانے کے لئے اقبال شیدائی کے ماتحت ایک دفتر قائم کیا۔ جمال پاشا مرحوم نے تھوڑے ہی دنوں میں فارسی سیکھ لی اور اس طرح اس

دفتر کی ترجمہ کردہ فارسی خبروں کے ذریعہ بہ آسانی ہندوستان کے سیاسی حالات سے باخبر ہونے لگے۔ بعد میں ان کا (Aid-de-Camp) عصمت بک، جو انگریزی اچھی جانتا تھا، روس کے راستہ کابل پہنچ گیا، جس سے جمال پاشا مرحوم کو کاروبار میں آسانیاں ہو گئیں۔

اگرچہ جمال پاشا مرحوم افغانی حکومت کے مہمان تھے اور حکومت ان کے اخراجات برداشت کر رہی تھی لیکن وہ اپنی سیاسی کارروائیوں کے لئے مثلاً دفتر ترجمہ کے اخراجات کے لئے روسی سفیر سورٹس (Suritz) سے مدد لیا کرتے تھے۔

انہی دنوں میں انگریزوں نے افغانستان سے باقی ماندہ متنازع فیہ مسائل کے فیصلے کے لئے اپنا ایک وفد ڈوبس (Dobbs) کی قیادت میں کابل بھیجا تھا۔ اس وفد کی افغانی گورنمنٹ سے بہت خفیہ طور پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس وفد کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ افغانستان روس سے جدا ہو جائے اور انگریزوں کے ساتھ ایک دوستی کا عہدنامہ کر لے۔ روسی سفیر جمال پاشا مرحوم کے ذریعہ، ایک ایسے عہدنامہ کے ہونے کی مخالفت کر رہا تھا اور افغانستان کے انگریزوں کے ساتھ ایک ایسا عہدنامہ نہ کرنے کی حالت میں افغانستان کو بہت سا جنگی سامان اور اس قسم کی اور امداد دینے کا وعدہ دے رہا تھا۔ اس سامان جنگ کی ذیل میں کابل میں ایک باروت سازی کا کارخانہ بنانے کا بھی روسیوں نے وعدہ کیا تھا۔

اس زمانے میں (۱۹۲۱ـ ۱۹۲۰ء میں) ترکی میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کی کمان میں یونانیوں اور ان کے اتحادیوں یعنی انگریزوں کے برخلاف جنگ آزادی جاری تھی۔ جمال پاشا مرحوم جن کی غازی مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم سے خط و کتابت تھی، کابل میں رہ کر ہندوستان میں انگریزوں کے برخلاف بغاوت پھیلانا چاہتے تھے تاکہ انگریزوں کو ڈر لگے کہ ہندوستان ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ یونانیوں کو ترکی مجاہدین کے خلاف مدد نہ دے سکیں گے۔ ان کوششوں کی ذیل میں، جمال پاشا مرحوم نے ڈوبس (Dobbs) سے ملاقات کر کے اس کو دھمکی دی کہ اگر انگریز ترکی کے ساتھ صلح نہ کریں گے تو ان پر پامیر کی طرف سے حملہ کر کے ہندوستان کو انکے ہاتھ سے نکال لیں گے۔ انگریزوں جیسے "گرگ باران دیدہ" لوگوں پر ایسی سوکھی پھیکی دھمکیوں کا بھلا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ ڈوبس نے اس ملاقات میں ان کی باتوں کا بہت معمولی طور پر جواب دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جمال پاشا مرحوم کو اپنی مردم ناشناسی کا خمیازہ اٹھانا پڑا اور بعد میں وہ جب کابل سے روس کو افغانستان کے لئے مدد لینے کو گئے تو ان کو ایک ارمنی نے ان کے ایڈیکانگ ثریا بیک کے ساتھ قفقاز کے شہر طفلس میں شہید کر دیا۔

اس قتل کے واقعہ میں اگرچہ ترکوں اور ارمینوں کی پرانی قومی عداوت کا بہت دخل ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ انگریزوں نے جمال پاشاکی اس دھمکی کی وجہ سے جو انہوں نے ڈوبس کو پامیر کے راستہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں دی تھی، ان کے مروانے کے لئے سازش کرائی ہو۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم جمال پاشامرحوم کے ڈوبس سے ملنے کے شروع ہی سے مخالف تھے، لیکن پاشامرحوم نے ان کی رائے نہ مانی تھی۔

جمال پاشامرحوم کے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے گہرے تعلقات نہ بنے۔ ان کی باہمی ملاقاتیں بھی شاذ ہی ہوتی تھیں۔ اگر کبھی قبلہ مولانا صاحب مرحوم کوئی تجویز ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تو وہ اکثر میرے ذریعہ ان کو پیغام بھجوادیا کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر بھی لکھا جاچکا ہے، جمال پاشامرحوم میں مردم شناسی کا ملکہ زیادہ نہ تھا، وہ غالباً قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو بھی ایک معمولی سا آدمی سمجھا کرتے تھے اور اپنے کو ابھی تک سلطنت عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کا وزیر بحر خیال کرتے تھے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم ان کی خدمت میں چند ایک بار حاضر ہو چکے تھے، وہ کبھی بھی بازدید کے لئے ان کے ہاں نہیں آئے۔ حالانکہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم قصر عین العمارہ کے متصل والے مکان میں رہتے تھے۔ لیکن جب ایک روز روسی سفیر سورٹس جس کے ساتھ خوشی محمد (محمد علی عزیز) کے ذریعہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اچھے تعلقات قائم کئے ہوئے تھے اور جو قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی پوزیشن کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے گھر ان سے ملنے اور ہندوستانی مسائل پر ان سے گفتگو کرنے آیا اور ایک گھنٹے سے زیادہ ان سے باتیں کرتا رہا، تو جمال پاشامرحوم اگلے روز قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ گویا روسی سفیر کے ان کے گھر آنے سے اب ان کو چار چاند لگ گئے تھے۔ ہمارے لے ان کا قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے گھر آنا ضرور باعث عزت تھا لیکن ان کی قدر ان کے اس رویہ سے ہماری نظر میں بڑھنے کی بجائے ذرا گھٹ گئی۔ اگر وہ روسی سفیر کے آنے سے پہلے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں بازدید کے لئے آتے تو ان کی قدرو منزلت ہمارے نزدیک بہت زیادہ ہوتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی پوزیشن کو خود بہ خود سمجھنے کی قابلیت نہ تھی۔

کابل میں رہتے ہوئے جمال پاشامرحوم کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کی

ان کے برخلاف سازشیں، افغانی ارباب سلطنت کی ان سے رقابتیں اور ان لوگوں کا ان کے برخلاف امیر صاحب کے کان بھرنا، خود جمال پاشاکی بے مائیگی اور ان کا مالی اخراجات کے لئے افغانی حکومت اور روسی سفارت کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہونا، یہ ایسے اسباب تھے جنہوں نے جمال پاشامرحوم کے لئے انگریزوں کے برخلاف کام کرنا محال بنادیا تھا۔

جمال پاشاکے کابل کے قیام کے دوران میں خبر آئی کہ ۱۵/مارچ ۱۹۲۱ء کو طلعت پاشاکو ایک ارمنی نے برلین میں شہید کردیا۔ اس سے ان کی کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد کابل میں جمعیت اتحاد وترقی کا رسوخ اور بھی کم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب جمال پاشا مرحوم کو یقین آگیا تھا کہ اگر روس ایک بڑے پیمانے پر افغانی گورنمنٹ کو فوجی سامان اور روپیہ سے مدد نہ دے تو انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنے سے افغانستان کو باز رکھنا ناممکن ہے۔ روسیوں نے افغانوں کو ایک باروت سازی کا کارخانہ دینے کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ وہ انگریزوں سے معاہدہ نہ کریں۔ جمال پاشامرحوم نے اس کارخانے کو چلانے کے لئے ڈاکٹر عبدالحفیظ کو جو جنگ عمومی کے زمانے میں اسی قسم کے فرائض ادا کر چکے تھے، یورپ سے افغانستان بلایا تھا اور خود اس کارخانے کو جلد از جلد روس سے افغانستان لانے کے لئے روس جانے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔

جولائی ۱۹۲۱ء میں کابل سے جانے پر، پہلے انہوں نے ایک ایک فوٹو جو افغانی لباس میں لیا گیا تھا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور اقبال شیدائی کو بطور یادگار دیا ملاحظہ ہو مجھے اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو دیئے ہوئے فوٹو اور اس پر لکھے ہوئے الفاظ (۱۰) افسوس ہے کہ انہوں نے ان تینوں فوٹوؤں پر بالکل ایک ہی عبارت لکھی ہے، اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اپنا فوٹو دیتے ہوئے اس پر وہی عبارت لکھی ہے جو میرے اور اقبال شیدائی کے لئے لکھی تھی۔ حالانکہ ۔ چہ نسبت خاک رابہ عالم پاک۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم ہمارے استاد، ہمارے مرشد اور ہمارے سر کا تاج تھے، سارے ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے تھے۔ جمال پاشامرحوم کی یہ حرکت بھی ان کی مردم ناشناسی کی ایک بڑی دلیل ہے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ کا کابل آنا

میرے جلال آباد سے کابل واپس آنے کے کوئی دوماہ بعد ڈاکٹر عبدالحفیظ یورپ سے

افغانستان پہنچے۔ انہوں نے علی گڑھ سے ایف اے پاس کر کے ۱۹۰۴ء میں مائننگ انجینئرنگ (Mining Engineering) کی تعلیم کے لئے انگلینڈ کا عزم کیا تھا۔ وہ وہاں سے امتحان میں ایک گولڈ میڈل لے کر ۱۹۱۰ء میں جرمنی گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے کیمسٹری میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۴۔۱۹۱۳ء میں انہوں نے امریکہ میں ریسرچ کیمسٹ کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۱۴ء میں انور پاشا مرحوم کے بلاوے پر ترکی آئے۔ وہ جرمنی میں انور پاشا سے جہاں پاشا مرحوم ترکی ملٹری اٹیچی تھے مل چکے تھے۔ ایک سال کے بعد ان کو انور پاشا مرحوم نے جرمنی اور آسٹریا میں باروت سازی اور مواد انفلاقیہ (Explosive) کی ساخت سیکھنے کے لئے بھیجا۔ وہ ۱۹۱۸ء تک ترکی میں اور جنگ کے بعد ۱۹۲۰ء میں ویانا میں کیمیکل فیکٹریوں میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے وہاں ایک آسٹرین عورت سے شادی کی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ ۱۹۲۰ء کے وسط میں جمال پاشا مرحوم کے بلاوے پر کابل پہنچے؛ لیکن یہاں آکر ان کو فوراً کوئی نوکری نہیں ملی کیونکہ اس وقت کابل میں باروت سازی کا کوئی کارخانہ موجود نہ تھا۔ ان کو نوکری حاصل کرنے میں دیر لگنے سے ان کی پونجی ختم ہو گئی اور وہ دوسرے مہاجروں کے ساتھ کابل میں محلہ دہ افغانان میں رہنے لگے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم جن کو عمر بھر مال و دولت کی کبھی پروا نہ ہوئی تھی، اپنا سارا وظیفہ جو افغانی حکومت ان کو دیتی تھی اور میری تنخواہ کا دو تہائی حصہ مہاجروں کی مدد پر خرچ کیا کرتے تھے۔ اس روپیہ سے وہ ڈاکٹر عبدالحفیظ کے گزارے کے لئے بھی ایک رقم دیا کرتے تھے۔ آخر افغانی گورنمنٹ نے باروت سازی کا کارخانہ بنائے جانے کی سکیم کے سلسلہ میں ان کو نوکری دے دی، اور ماہوار پندرہ سو روپے (۱۵۰۰) افغانی روپے تنخواہ مقرر کر دی، اور ان کی گزشتہ چند ماہ کی تنخواہ بھی ان کو ایک دم دے دی۔ جس سے وہ کافی مال دار ہو گئے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد آپ پاکستان آ گئے۔ افسوس پاکستانی حکومت نے آپ کی قابلیت اور وسیع تجربہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ آپ کا انتقال لاہور میں جولائی ۱۹۶۴ء میں ہو گیا۔ "اناللہ وانا الیہ راجعون"۔

اس کے کچھ عرصہ بعد (یعنی مارچ ۱۹۲۱ء میں) جمال پاشا مرحوم روس چلے گئے تاکہ وہاں سے باروت سازی کے کارخانے کے لانے کا انتظام کریں۔ ان کی عدم موجودگی میں افغانوں نے ڈوبس مشن سے صلح کر لی (۱۹۲۱ء) اس پر روسیوں نے باروت سازی کا کارخانہ افغانستان کو دینے سے انکار دیا۔ اس لئے افغانی گورنمنٹ نے ڈاکٹر عبدالحفیظ کو کابل میں

کیمسٹری کی ایک ریسرچ لیبارٹری بنانے کے لئے مشین لانے کو یورپ بھیجا اور وہ کابل سے اس کام کے لئے جون ۱۹۲۱ء میں جرمنی چلے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ افغانی گورنمنٹ نے جو انگریزوں سے اب صلح کر چکی تھی، ڈاکٹر عبدالحفیظ کو اس طرح پر کابل سے بھیج کر اپنے سر پر ایک انگریزی مخالف کو دور کر دیا۔ کابل میں رہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے انتہا پسند رویہ کی وجہ سے ان کے اور ڈوبس مشن کے ہندوستانی ممبروں اور ان کے ہندوستانی پہرہ داروں کے درمیان کچھ ناگوار واقعات بھی پیش آ چکے تھے۔ شاید انگریزوں کے ساتھ افغانوں نے کوئی ایسا سمجھوتہ بھی کر لیا تھا جس کی بنیاد پر انگریزوں کے مخالفوں کو آہستہ آہستہ کابل سے نکالنے کا ذمہ لیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس بارے میں کوئی تحریری سمجھوتہ نہ ہو لیکن میرا گمان ہے کہ کم از کم صلح کی گفتگو کے درمیان انگریزوں نے؛ کابل میں ہندوستانی مسلمان سازشیوں کا مرکز بننے کی وجہ سے زبانی ضرور گلہ شکوہ کیا ہو گا۔ افغانی گورنمنٹ بھی صلح کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد ایسے لوگوں کی موجودگی سے اپنے لئے خواہ مخواہ سیاسی پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے آہستہ آہستہ انگریزوں کے مخالف لوگوں کو کابل سے نکال دینا اس کے لئے ضروری تھا۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ کو کام کے بہانے سے کابل سے یورپ کو بھیج دینا بھی اسی سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کو وہاں پہنچنے پر افغانی نمائندے مقیم جرمنی نے کہہ دیا کہ افغانی سفارت کے پاس اس قسم کی لیبارٹری کے لئے آلات خریدنے کو روپیہ نہیں ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی۔ مگر پیرس کے افغانی سفیر اور سابق وزیر خارجہ افغانستان محمود بیگ طرزی نے ان کو ایک دم ان کی پانچ ماہ کی باقی ماندہ تنخواہ دے کر ان کو افغانی حکومت کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔

۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں بولشویکوں نے بخارا کے نوجوان لیڈر عثمان خواجہ اور فیض اللہ خواجہ کے ساتھ مل کر امیر بخارا کے برخلاف بغاوت پھیلائی۔ امیر بخارا نے امیر افغانستان سے مدد مانگی اور کہا کہ اگر افغانستان روسیوں اور نوجوان بخاریوں کا قلع قمع کر کے بخارا کو ان کی دست برد سے بچانے میں کامیاب ہو جائے تو بخارا افغانستان کے زیر حمایت رہنے پر راضی ہو جائے گا۔ امیر افغانستان نے چند ایک فوجی دستے سول لباس میں وہاں بھیجے اور دو توپیں بھی روانہ کیں۔ افغانستان میں اس سے زیادہ مدد کی طاقت نہ تھی۔ وہ کھلم کھلا بخارا کو فوجی مدد نہ دے سکتا تھا۔

ورنہ روس سے لڑائی ہو جاتی۔ ان افغانی فوجی دستوں کی منظم روسی فوج کے سامنے کچھ نہ چلی۔ امیر بخارا کو شکست ہوئی اور اس نے افغانستان میں پناہ لی۔ بخارا کا سارا خزانہ روسیوں کے ہاتھ لگا جس کو وہ ریل کے ڈبوں میں بھر کر ماسکو لے گئے۔ بخارا کی جمہوری حکومت اس طرح پر بالکل بے مایہ رہ گئی۔ بخارا کا رئیس جمہور عثمان خواجہ مقرر ہوا لیکن خزانہ خالی تھا۔ ملک میں اتنے لکھے پڑھے لوگ بھی نہ تھے کہ حکومت کا انتظام سنبھال سکتے۔ یہاں تک کہ ریل چلانے کو ان کے ہاں کافی ٹیکنیشن بھی موجود نہ تھے۔ اس لئے روسیوں نے ان بخاری نوجوانوں کا تختہ الٹ کر، اپنے روسی افسروں اور اپنے پھٹو بخاری کمیونسٹوں کو ان کی جگہ متمکن کر دیا۔

افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ۱۹۲۰ء میں منصوری میں سمجھوتہ ہو جانے پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم سمجھ گئے تھے کہ اب ان کو افغانستان میں انگریزی کے برخلاف کسی قسم کا خفیہ سیاسی کام کرنے کی اجازت نہ مل سکے گی اس لئے انہوں نے صرف قانونی سیاسی کارروائیاں کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ڈاکٹر نور محمد سے مشورہ کر کے کانگرس کمیٹی کابل کی بنیاد ڈالی اور وہ خود اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ اور ڈاکٹر نور محمد اس کے جنرل سکرٹری بنے۔ ہمارے باقی ساتھی اس کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۲۰ء میں کانگرس کے (گیا) سیشن میں جو مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس کمیٹی کا آل انڈیا نیشنل کانگرس سے الحاق منظور ہوا۔ یہ کمیٹی سب سے پہلی کمیٹی تھی جو انگریزی ممالک سے باہر ایک آزاد ملک میں بنی تھی، اور جس کا کانگرس سے الحاق منظور کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کی کانگرس کی طرف سے منظوری کے بعد، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی سیاسی اہمیت کابل میں افغانوں، ترکوں اور روسیوں کے درمیان اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کو طاقتور بنانے کے لئے دسمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں۔ یہ کوششیں کانگرس اور انگریزی حکومت کے درمیان رسہ کشی کے مانند تھیں۔ اگر ۱۹۲۱ء کے سالانہ جلسہ کانگرس سے پہلے وہ ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو کانگرس اور ہندوستانی تحریک آزادی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اخبارات سے جو خبریں ہمیں ملتی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کا اس میں کامیاب ہونا محال ہے۔ کانگرس کے دسمبر ۱۹۲۱ء کے سالانہ اجلاس میں کوئی ہفتہ باقی تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ روپیہ پورا

ہونے کے لئے ابھی چند ایک لاکھ کی اور ضرورت ہے۔ ظاہراً یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مقررہ تاریخ تک ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے گا۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے فیصلہ کیا کہ روسیوں سے مالی مدد مانگی جائے۔ یہ فیصلہ بہت اہم تھا۔ کیونکہ اگر روسیوں نے ان کی درخواست کو رد کر دیا تو ان کا سیاسی رسوخ خاک میں مل جائے گا اور ان کی سیاسی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اگر منظور کر لیا تو روسیوں کا ہندوستانی تحریک آزادی میں داخل انداز ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن ہرچہ بادا باد، قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے خوشی محمد کے ذریعہ روسی سفیر کو پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس سے کانگرس کمیٹی کابل کے نام پر درخواست کی کہ وہ اپنی گورنمنٹ سے مالی مدد لے کر ہم کو دسمبر ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتے سے پہلے جواب دے۔ روسی گورنمنٹ نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی پوزیشن اور ان کی درخواست کی اہمیت کو فوراً سمجھ لیا اور باقی ماندہ چندہ ایک لاکھ روپیہ کانگرس کمیٹی کابل کے ذریعہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کو دینا منظور کر لیا، اور یہ روپیہ کابل کے روسی سفارت خانے کو بھیج دیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کو خبر دی کہ کانگرس کمیٹی کابل یہ باقی ماندہ رقم دینے کو تیار ہے، تاکہ مقررہ تاریخ تک کانگرس کے پاس ایک کروڑ روپیہ جمع ہو جائے۔ مگر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ایک کروڑ روپیہ کے پورا ہونے کی خبر ہمیں پہنچ گئی۔ اس سے ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہندوستانی تحریک آزادی کو روسی مدد کی ضرورت نہ رہی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے روسی سفیر کو خبر بھیج دی کہ اب روپے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اور کانگرس کمیٹی کابل اس مدد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ ہمارے کوہاٹی ساتھیوں میں سے عبداللطیف نے جو وزیر امنیہ شجاع الدولہ کو انگریزی کا سبق پڑھایا کرتا تھا اور اس طرح پر اس کا اعتماد حاصل کر چکا تھا، اس کے پاس میری چغلی کھائی کہ میں خفیہ طور پر انگریزی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ وزیر امنیہ نے یہ بات فوراً امیر صاحب کے کان تک پہنچائی کہ وزیر حربیہ سپہ سالار محمد نادر خان کا اعتماد کردہ اور نعمت پروردہ ظفر حسن تو انگریزی جاسوس ہے، جو افغانی وزارت حربیہ کے سارے راز انگریزوں کو دیتا رہتا ہے۔ امیر صاحب نے سردار سپہ سالار صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس پر وہ بالکل حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے پوچھا۔ اس پر قبلہ مولانا

مرحوم نے ان کو میرے بارے میں ایک خط لکھ کر ذاتی ضمانت دی اور کہا کہ "اگر ظفر حسن کے انگریزی سفیر سے ملنے کا واقعہ ثابت کر دیا جائے تو وہ خود پھانسی پانے کو تیار ہیں۔" یہ الزام تو تھا ہی بالکل بے بنیاد، بھلا اس کا ثبوت کہاں مل سکتا تھا! اس لئے یہ بات رفع دفع ہو گئی۔ لیکن عبداللطیف کو اس غمازی کی کوئی سزا نہ ملی۔ (مگر خدا نے اس کو بعد میں اس بدکرداری کی سزا دی۔ وہ بچہ سقا کا طرف دار بنا اور امیر امان اللہ خان کے افغانستان چھوڑنے کے بعد قندھار میں بچہ سقا کا کارگزار مقرر ہوا۔ جب اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ مرحوم نے بچہ سقا کو مغلوب کیا اور قندھار ان کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے ۱۹۳۱ء میں عبداللطیف کو پھانسی دیدی)

اس چغلی کے واقعہ کے چند روز بعد، میں ایک دن شام کو ہوا خوری کے لئے شہر سے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ وزیر امنیہ وہاں سے گھوڑے پر گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ کر یہ کہا، "خیر اس دفعہ تو تمہاری جان بچ گئی لیکن آئندہ دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔"

قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے صرف قانونی سیاسی کارروائی کرنے کے فیصلے کے سلسلے میں، دوسرا کام یہ کیا کہ افغانی گورنمنٹ سے کابل میں ایک ہندوستانی اردو یونیورسٹی بنانے کے لئے چارٹر مانگا اور اس یونیورسٹی کا نظام نامہ تیار کر کے سردار محمود بیگ طرزی وزیر خارجہ افغانستان کو دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ افغانی گورنمنٹ اور امیر صاحب سے اس کی منظوری لے گا۔

۱۹۲۱ء میں ڈوبس کے مشن سے عہد نامہ صلح ہو جانے پر، قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنی ساری طاقت کو اس ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے پر خرچ کرنا شروع کیا۔ اس یونیورسٹی کی ابتدا کے طور پر، سردار سپہ سالار محمد نادر خان مرحوم سے ان کی اس جاگیر سے جو ان کو افغانی استقلال حاصل کرنے کے صلہ میں ملی تھی، قلعہ علی آباد میں ایک سکول کھولنے کی اجازت مانگی۔ اس سکول میں اردو زبان سکھلائی جائے گی اور اس کا ذریعہ تعلیم آہستہ آہستہ اردو زبان بن جائے گی۔ اس سکول کے اخراجات اگر جاگیر کی زمینوں کی آمدنی سے پورے نہ ہو سکیں تو وہ خود (یعنی قبلہ مولانا صاحب مرحوم) ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اس خرچ کے ذمہ دار ہوں گے۔ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنی یہ تمام جاگیر اس کام کے لئے وقف کر دی۔ چنانچہ یہ سکول قائم ہو گیا۔ اس کا ہیڈ ماسٹر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا ایک شاگرد جس نے ان سے قرآن شریف کی تفسیر کا درس لیا تھا اور جس کا نام عبدالنبی تھا، مقرر ہوا۔ مجھے وزارت حربیہ کے میرے سرکاری کام کے سوا قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور سردار سپہ سالار

صاحب مرحوم نے یہ فرض بھی دیا کہ میں اس سکول کی نگرانی، انتظام اور مالی امور کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ اس لئے مجھے شام کو اپنے وزارت حربیہ کے سرکاری کام کے بعد، علی آباد کو جو دہ افغانان کابل سے کوئی چار میل کے فاصلہ پر ہے، جانا پڑتا تھا اور صبح کو پھر وزارت حربیہ میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس طرح پر دو فرائض ادا کرنا میرے لئے اگرچہ کافی تکان کا باعث ہوتا تھا لیکن اس کو ایک قومی کام سمجھ کر یہ بار بھی میں نے اپنے اوپر لے لیا تھا۔ (۱۱)

اس طرح یہ سکول اچھی بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ شروع میں اس کے اخراجات جاگیر کی آمدنی سے پورے ہوتے رہے لیکن ۱۹۲۲-۱۹۲۱ء کے موسم سرما میں یہ آمدنی اخراجات کو پورے کرنے کے لئے کافی ثابت نہ ہو سکی۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے پھر روسی سفارت سے مالی مدد لے کر اس کے اخراجات کو پورا کرنے اور سکول کو قائم رکھنے کا کام سرانجام دینا شروع کیا۔ اس زمانے میں کابل میں روسی سفیر رسکولیکوف (Ruskolivikov) نام ایک مشہور انقلابی کمیونسٹ تھا جس کے ساتھ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے خوشی محمد اور سفیر کے خسر پرہ (سالے) رائسنر (Reisner) کے ذریعہ جو سفارت کا فرسٹ سیکرٹری بھی تھا بہت گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے (اس رابطے سے آگے چل کر ماسکو میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس کی تفصیل آگے حالت کے سلسلہ میں لکھی جائے گی)

انور پاشا کی بخارا میں آمد اور شہادت

نومبر ۱۹۲۱ء میں مرحوم انور پاشا بخارا پہنچے۔ ان کے پہنچنے پر افغانی حکومت نے ان کو روس کے برخلاف خفیہ مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو قطغن اور بدخشان کے افغانی صوبوں کا رئیس تنظیمیہ مقرر کر کے خان آباد بھیجا۔ چونکہ وہ پاشا مرحوم کو روسیوں کے برخلاف مدد دینے کو جا رہے تھے اور میں انگریزوں کا دشمن ہونے کی وجہ سے روسیوں کا دوست مانا جاتا تھا، اس لئے وہ مجھے اس کام پر اپنے ساتھ نہیں لے گئے حالانکہ اس سے پہلے انہوں نے مجھے نہ جنگ کے دنوں میں اور نہ صلح کے زمانے میں کبھی اپنے سے جدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب مجھے ایک روز بخار ہوا اور میں وزارت حربیہ کے سرکاری کام پر نہ جا سکا تو وہ شام کو میری بیمار پرسی کے لئے میرے گھر بھی تشریف لائے تھے۔

انور پاشا مرحوم پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کے مغلوب ہو جانے پر ۱۹۱۸ء کے آخر میں جمعیت اتحاد و ترقی کے دوسرے لیڈروں کی طرح ملک سے نکل کر یورپ چلے گئے تھے، تاکہ وہاں سے انگریزوں کے برخلاف کچھ کارروائی کریں۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں زار کی سلطنت کا تختہ الٹ چکا تھا اور ملک میں دو انقلابی جماعتیں یعنی بولشویک (Bolshevik) اور منشویک (Monshovik) باہم لڑ رہی تھیں۔ اس خانہ جنگی میں آخر کار بولشویک غالب آئے اور اتلافی، قوتیں جو منشویکی وزیر اعظم کرنسکی (Kerensiky) کے طرف دار سفید روسی جنرل ڈیکن (Denikan) اور کوچک (Kotchak) کو مدد دے رہی تھیں، شکست کھا کر روس سے واپس آئیں اور روس میں لینن (Lenin) اور ٹروٹسکی (trotsky) کی سرکردگی میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی۔ انور پاشا مرحوم انگریزوں کے برخلاف ان سے مدد لینے ماسکو گئے اور ۱۲/ فروری ۱۹۲۰ء کو لینن سے ملے اور مشرقی قوموں کو انگریزوں کے برخلاف ابھارنے کے لئے اس سے سمجھوتہ کیا۔

اس فرض کو پورا کرنے کے لئے، پاشا مرحوم باکو میں اقوام مشرقی کے نمائندوں کی کانگرس میں شریک ہوئے اور وہاں سے وسط ایشیا کو روانہ ہوئے۔ تاکہ وہاں ان ترکستانی باغیوں کا جن کو (باصماچی) کہا جاتا تھا، اور جنہوں نے بولشویکوں کے برخلاف سر اٹھایا ہوا تھا، قلع قمع کریں۔ لیکن انہوں نے لینن سے جو سمجھوتہ کیا تھا وہ انہوں نے اپنے حقیقی مقصد کو چھپانے، اور اس بہانے سے وسط ایشیا اور بخارا تک پہنچنے کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے کیا تھا۔ ان کی اصل تمنا ترکستان اور بخارا کو بولشویکوں سے آزاد کرا کے یہاں ایک مستقل ترکی حکومت قائم کرنا تھا۔ وہ بہت من چلے سورما تھے۔ لیکن جاہ پرستی کے جذبہ کی وجہ سے دور اندیشی اور تدبر سے کام لینے کا خاصہ ان میں موجود نہ تھا۔ ان کے پاس نہ منظم فوج تھی، نہ روپیہ اور نہ ہی تجربہ کار افسر اور قابل اہل کار تھے۔ وسط ایشیا میں ایک آزاد ترکی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بالکل ایک خام خیالی تھی۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران روسیوں کے برخلاف قفقاز میں جنگ کرتے ہوئے عین سردی کے موسم میں ایک فوجی ڈویژن کو ساتھ لے کر روسیوں کے مورچوں پر، جو کوہ اللہ اکبر میں تھے، باوجود اپنی بے سروسامانی کے ہلہ بولا تھا اور روسیوں کو وہاں شکست دی تھی، لیکن ان کی ساری فوج ان برفانی علاقوں میں سردی کی شدت اور بے سروسامانی کی وجہ سے بالکل ہلاک ہو گئی تھی۔ اس سے ترکی میں ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔

ترکستان میں روسیوں کے برخلاف انہوں نے صرف اپنی بہادری اور جرات پر تکیہ کیا تھا۔ بخارا میں عثمان خواجہ کی حکومت سے تعاون کرنے میں گریز کیا۔ شروع میں ان کو کچھ کامیابی ضرور ہوئی لیکن آخر کار عید کو جمعہ کے دن روسیوں کے رسالہ کے ناگہانی حملہ کی وجہ سے وہ تیغ بہ کف میدان جنگ میں ۵/ اگست ۱۹۲۲ء کو شہید ہو گئے۔

افغانی حکومت نے بھی ان کو کچھ بڑی فوجی یا مالی مدد نہ دی۔ کھلم کھلا فوجی مدد دینا تو ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے سول لباس میں کچھ سپاہی اور رضا کار ان کے پاس بھیجے تھے اور ان سے خط و کتابت بھی جاری رکھی تھی، مالی مدد کے لئے تو افغانی خزانہ میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ جنگ کا خرچ برداشت کر سکتا۔

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے جو کچھ تھوڑی بہت مالی مدد ان کو افغانی حکومت کی طرف سے دی تھی، اس کا حال مجھے سپہ سالار صاحب مرحوم کے اردلی سے معلوم ہوا تھا جو انور پاشا مرحوم کی شہادت سے چند ہفتے قبل قطغن اور بدخشان سے کابل آیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر خوشی محمد سے کیا تو اس نے اس میں بہت دلچسپی لی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسی خبروں کا متلاشی ہے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم جن کی فراست کا مجھے اس سے پہلے صدہا بار ثبوت مل چکا تھا، اس کو بھانپ گئے کہ خوشی محمد ان خبروں کو روسی سفارت کو پہنچائے گا۔ اس لئے انہوں نے مجھے تنہائی میں تنبیہ کر دی کہ خوشی محمد کے سامنے اس قسم کی باتیں نہ کیا کروں۔ مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس کے بعد بہت سی مثالیں دیکھیں جن میں مختلف کمیونسٹوں نے اپنے ملک اور قوم کے مفاد کو تو بالائے طاق رکھ دیا، اور روسی کمیونسٹوں کے لئے خبریں بہم پہنچانے لگے اور ان کے لئے جاسوسی کرتے رہے۔

کمیونسٹوں کا شیوہ ان کے ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہے کہ جن کے ماتحت وہ روس کو فائدہ پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خواہ اس سے ان کے اپنے ملک اور قوم کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ وہ اس طرح پر اپنی قوم سے غداری کرنے پر ہمیشہ تیار رہتے ہیں، اور روسی اور کمیونسٹی مفاد کو ہر چیز سے برتر مانتے ہیں۔ میں نے تو اپنے آئندہ کے تجربہ میں یہی دیکھا کہ ہر کمیونسٹ خواہ وہ کسی قوم کا ہو، ضرور ایک روسی جاسوس ہوتا ہے اور روس کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہر اصول اور مفاد کو قربان کرنے پر تیار رہتا ہے۔

ترکی سفیر عبدالرحمٰن بک کا کابل پہنچنا

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے افغانی حکومت نے افغانستان کی آزادی حاصل کرنے پر مختلف یوروپین ممالک کو اور اسی سلسلہ میں ترکی کو سفارتی وفد بھیجے تھے اور اس طرح پر نئی ترکی انقلابی حکومت کو جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا (اتاترک) کی سرکردگی میں انقرہ (انگورہ) میں قائم ہوئی تھی، تسلیم کرنے والے ملکوں میں افغانستان پہلی صف میں تھا۔ اس پر ترکی حکومت نے بھی افغانستان کو اپنا سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت نے اس کام کے لئے مرحوم عبدالرحمٰن پشاوری کو منتخب کر کے ایران کے راستہ کابل بھیجا۔ ان کا یہ انتخاب برصغیر (ہند، پاکستان) کے مسلمانوں کے لئے بہت عزت کا باعث تھا۔ انہوں نے ترکی کی مدد کے لئے اب تک جتنی مادی اور اخلاقی مدد کی تھی اس تعیناتی کو اس کا صلہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک ایسے شخص کو جو ترکی سرزمین پر پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی ترکی الاصل تھا، ترکی کا سفیر بنا کر بھیجا جانا ایک ایسا واقعہ تھا جس کی نظیر اس سے پہلے بہت کم ملے گی۔ مرحوم عبدالرحمٰن بک حاجی صمدانی پشاوری کے فرزند تھے، ان کا خاندان اصل میں کشمیری اور ان کے والد پشاور میں ایک مشہور ٹھیکیدار تھے۔ جب جنگ بلقان کے زمانے میں ۱۹۱۲ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی سرکردگی میں ہلال احمر کا ایک طبی وفد ترک زخمیوں کے علاج معالجہ کے لئے ترکی بھیجنے کا ارادہ کیا تو عبدالرحمٰن صاحب بھی جو اس وقت علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے، اس وفد میں شریک ہونے لگے۔ باپ نے تو اس کی اجازت نہ دی لیکن انہوں نے اپنا کوٹ نیلام کر کے سفر کے لئے پیسے جمع کئے۔ یہ اس طرح ہوا کہ ان کے ہم جماعتوں نے نیلام سے کوٹ لے کر کئی دفعہ ان کو واپس کیا اور کوٹ کے کئی دفعہ بکنے سے، بہت کچھ پیسہ جمع ہو گیا اور ان کے ہاتھ زادِ راہ آگیا۔ یہ وفد دسمبر ۱۹۱۲ء میں استنبول پہنچا اور یہاں سے یوروپین ٹرکی میں ترکی زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے چتالجہ (Chatalja) محاذ پر گیا۔ یہاں (عمرلی) کے گاؤں میں اپنا ہسپتال قائم کیا۔ اس پر گاؤں کا نام (ہندیاکوئی) یعنی ہندوستانی گاؤں رکھا گیا۔ جنگ بلقان کے ختم ہونے پر یہ وفد ترکی سے واپس چلا گیا۔ لیکن عبدالرحمٰن صاحب فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وفد کے ایک دوسرے نوجوان ممبر کے ساتھ جو بحری تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، ترکی میں رہ گئے۔ یہ دوسرا شخص بیمار ہو جانے کی وجہ سے بعد میں ترکی چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ لیکن عبدالرحمٰن صاحب یہاں ہی متوطن ہو گئے انہوں نے بیروت میں تعلیم شروع کی۔ کیونکہ ترکی ملٹری کالج میں داخل ہونے کے لئے

ہائی سکول کا پاس شدہ ہونا ضروری تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی سے ایک فوجی وفد ۱۹۱۵ء میں ترکی کے مشہور سورما، بحری افسر رؤف بک کی سرکردگی میں، جنہوں نے جنگ بلقان میں حمیدیہ کروئی زر (Cruiser) کے کمانڈر کی حیثیت سے یونانی جنگی اور تجارتی بیڑے پر چھاپے مار مار کر یونان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے اور ترکی کی جنگ آزادی کے ۱۹۲۲ء میں ختم ہونے پر وزیراعظم بنے تھے، ایران کے راستہ افغانستان بھیجا گیا تھا۔ رؤف بک نے عبدالرحمٰن صاحب کو ان کے افغانی اور فارسی زبان جاننے کی وجہ سے اس وفد میں شریک کر لیا تھا۔ ایران کے مغربی علاقہ میں اس وفد کا ایک انگریزی فوجی دستہ سے سامنا ہوا۔ عبدالرحمٰن صاحب نے خشکی کے راستہ حج کو جانے والے کچھ افغانوں کو جو اتفاقاً اس وقت وہاں موجود تھے، جمع کر کے بہت دلاوری سے اس دستہ کا مقابلہ کیا اور وفد کے ممبروں کو انگریزوں کے ہاتھ پڑنے سے بچا لیا۔ عبدالرحمٰن صاحب اس جھڑپ میں زخمی بھی ہو گئے تھے۔ مگر انگریزوں کے اس فوجی حملہ کے ناکام رہنے کے باوجود بھی رؤف بک کا وفد ایران میں قدم جما کر افغانستان کی طرف نہ بڑھ سکا، اور ترکی لوٹنے پر مجبور ہوا۔ استانبول واپس آنے پر عبدالرحمٰن صاحب رؤف بک کی مدد سے ترکی ملٹری کالج میں داخل ہو گئے اور دو سال کی تعلیم کے بعد ان کو فوجی کمیشن مل گیا اور وہ ترکی فوج میں افسر بن گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے متارکہ کے بعد جب انگریزوں نے ۱۶/مارچ ۱۹۲۰ء کو استانبول پر قبضہ کر لیا، تو وہ شہر میں روپوش ہو گئے تاکہ انگریزوں کے ہاتھ نہ پڑیں۔ جب رؤف بک کو خفیہ خبر ملی کہ انگریز ترکی پارلیمنٹ کو توڑنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے عبدالرحمٰن صاحب کو خفیہ طور پر انقرہ کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ وہاں جا کر ترکی قومی فوج میں جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر کمان منظم ہو رہی تھی، داخل ہو جائیں۔ ترکی قومی حکومت ایک طرف تو یونانی حملہ آوروں کا جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سہارے اور ان کے شوق دلانے کی وجہ سے ترکوں کے سات سو سالہ آبائی وطن ایشیا کوچک (یعنی اناطولیہ) کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتے تھے، مقابلہ کر رہی تھی اور دوسری طرف ان خارجی ملکوں کو جنہوں نے اس نئی ترکی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا، سفیر بھیج کر ان کے ساتھ سیاسی تعلق پیدا کرتی جا رہی تھی۔ افغانستان قومی ترکی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلقات پیدا کرنے والے ملکوں میں سے ایک پہلا ملک تھا۔ اس لئے ترکی قومی حکومت نے فیصلہ کیا کہ افغانستان کو اپنا سفیر بھیجے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کام کے لئے عبدالرحمٰن صاحب کو چنا۔ وہ ایران کے راستے افغانستان آئے۔ سفر کے آخری حصہ میں زادِ راہ

کی کمی کی وجہ سے ان کو پیدل بھی چلنا پڑا۔ ان کے ملازم نے راستہ میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا، اور وہ اکیلے غزنی پہنچے۔ یہاں سے غزنی کے کمشنر نے ٹیلیفون سے افغانی وزیر خارجہ کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ اس پر افغانی حکومت نے بہت عزت کے ساتھ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں کابل پہنچنے کا انتظام کیا۔ مگر کابل میں افغانی حکومت نے ان کے اعتماد نامہ (Letter of Credentials) کو ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا اور جب تک افغانی سفیر متعینہ انقرہ سے ان کے متعلق کوئی خبر نہ آئی، اس وقت تک ان کو سفیر کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں ذرا جھجک دکھلائی۔ لیکن ان کو قصر عین العمارہ میں جہاں اس سے پہلے جمال پاشا مرحوم ٹھہر چکے تھے، جگہ دی۔ یہ قصر اب بھی ترکی سفارت خانہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

عبدالرحمن صاحب کی قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور ڈاکٹر نور محمد سے بہت راہ و رسم ہو گئی تھی اور وہ ان سے بہت بے تکلف ملنے جلنے لگے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا۔ ان کی باتوں سے ہمیں تعجب ہونے لگا کہ وہ باوجود کشمیری ہونے کے، اپنے کو افغان کہا کرتے تھے کیونکہ وہ پشتو بول سکتے تھے۔ اس کی جو وجہ اس وقت ہماری سمجھ میں آئی، وہ یہ تھی کہ یا تو وہ اپنے کو ہندوستانی مسلمان کہلانا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس وقت ہندوستان غلام تھا یا اپنے کو افغان بنا کر، افغانی حلقوں میں، جو اپنے کو پہلے افغان اور پھر مسلمان کہتے تھے، اپنا رسوخ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ لوگوں سے پشتو بولنے کی کوشش کیا کرتے تھے حالانکہ ان کو چاہیے تھا کہ اپنے کو ترکی رعایا ہونے کی وجہ سے ترک کہتے۔ کیونکہ قاعدہ تو یہی ہے کہ ایک آدمی جس حکومت کی رعایا ہو، اسی حکومت کو اپنی حکومت مانتا ہے اور اسی کی قومیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ہر قسم کے لوگ آباد ہیں اور ہر سال مختلف ملکوں سے لوگ وہاں متوطن ہو کر رعایا بنتے رہتے ہیں۔ وہ سب اپنے کو امریکن ہی کہتے ہیں۔ کم از کم امریکہ سے باہر تو ایسا ہی ہے کہ وہ لوگ خواہ جرمن، فرانسوی، یا ایطالوی نسل کے ہوں، باہر اپنے کو امریکن ہی کہا کرتے ہیں۔ شاید ملک کے اندر، اپنے پرانے زاد بوم سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہوں۔

عبدالرحمن صاحب کے، باوجود کشمیری، ترکی سفیر اور ترکی رعایا ہونے کے، اپنے کو افغان کہنے سے، نہ کوئی افغان ان سے خوش ہوتا تھا، اور نہ اس وجہ سے افغانوں کے درمیان ان کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ ہم تو ان کے اس رویہ کو بالکل مذبوح سمجھتے تھے۔

اس زمانے میں ترکی اور روس کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی،

عبدالرحمن صاحب روسی سفیر سے کچھ زیادہ ملاپ نہ رکھتے تھے۔ ترکی حکومت نے چند ایک مہینے بعد ان کی جگہ جنرل فخرالدین پاشا کو جو پہلی جنگ عظیم میں مدینہ منورہ کی آخری دم تک حفاظت کرنے کی وجہ سے تاریخ جنگ میں (شیر ترکی) کا لقب حاصل کر چکے تھے، ترکی سفیر کے طور پر کابل بھیج دیا۔ اس پر عبدالرحمن صاحب کو قصر عین العمارہ چھوڑنا پڑا۔ وہ ترکی واپس جانے تک سردار امین الدولہ کی کوٹھی میں جو دریائے کابل کے کنارے ایک پر فضا جگہ پر واقع تھی، ٹھہرے رہے۔ ہمارے افغانستان سے جدا ہونے کے بعد بھی وہ کابل میں مقیم رہے۔

جنرل فخرالدین پاشا سے قبلہ مولانا صاحب کی بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے میرے میدان ٹھل کے کارناموں کا ذکر کر کے ان سے میرا تعارف کرایا، جس سے مجھے آگے چل کر ترکی میں بہت فائدہ پہنچا۔ اس کی تفصیل واقعات کے سلسلہ میں مناسب موقع پر بیان ہو گی۔

۱۹۲۲ء کے شروع میں امیر امان اللہ خان کی حکومت نے اپنی قوم کی تعلیم پر زور دینا شروع کیا اور اس کام کے لئے برصغیر سے کچھ استاد منگوائے۔ اس سلسلہ میں ایک بنگالی ہندو جس کا نام (سیناتھ بینرجی) تھا، حبیبیہ سکول کے لئے ریاضی کا معلم بن کر آیا۔ خوشی محمد نے نئے اساتذہ کے برصغیر سے منگائے جانے سے فائدہ اٹھانا چاہا اور روسی سفارت سے مل کر ہمارے پرانے ہم جماعت غلام حسین کو حبیبیہ سکول میں استاد مقرر کرا کے اس کو کابل بلوانا چاہا۔ میں نے سردار محمد سلیمان خان سے، جو سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے چچازاد بھائی تھے اور اس وقت وزیر تعلیم افغانستان کے فرائض ادا کر رہے تھے، سفارش کر کے غلام حسین کو کابل بلوالیا۔ مگر روسی سفارت خانہ سے خوشی محمد کے اس طرح تعلقات رکھنے کو افغانی گورنمنٹ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی اور وزارت خارجہ افغانستان صرف قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خاطر خوشی محمد کے برخلاف کوئی کارروائی نہ کرتی تھی۔ اگر قبلہ مولانا صاحب مرحوم اس کے ضامن نہ ہوتے تو افغانی حکومت اس کو ملک بدر کر دیتی یا قید میں ڈال دیتی۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کابل میں ایک اردو ہندوستانی یونیورسٹی بنانے کی سکیم کے سلسلہ میں سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے عطا کردہ قلعہ علی آباد میں ایک سکول قائم کیا تھا، جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی اور جس کے اخراجات کا ذمہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنے سر لیا تھا اور جس کا انتظام میرے ہاتھ میں تھا۔ افغانوں میں بعض ایسے صاحب رسوخ اشخاص موجود تھے جو ظاہر میں تو قوم پرستی کا دم بھرا کرتے تھے لیکن اصل میں

انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے بظاہر اپنے قومی جذبہ کی وجہ سے لیکن اصل میں انگریزوں کے اشارے پر خفیہ سازشیں شروع کیں اور اس کا پروپیگنڈا کیا کہ علی آباد کا مکتب جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے، ایک روز ہندوستانی یونیورسٹی کی شکل اختیار کرے گا، اور اس طرح ہندوستانی کلچر غلبہ حاصل کر کے افغانی قومیت کو بالکل نیست و نابود کر دے گا، اور افغانستان ایک روز کم از کم علمی لحاظ سے ہندوستان کا بالکل محکوم بن جائے گا۔ کابلیوں میں ہندوستانیوں کے بر خلاف ایک اندرونی دشمنی کا جذبہ موجود ہے جس کا اظہار وہ کبھی کبھی مذاق کے طور پر اس ضرب المثل کے ذریعہ کرتے ہیں۔ "مار رابان، ہندوستانی رابکش" (یعنی سانپ کو تو چھوڑ دو لیکن ہندوستانی کو ضرور مار ڈالو)

یہ ضرب المثل کیسے کابل میں زبان زد عوام ہوئی اس کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے۔ غالباً پہلی اور دوسری انگریزی، افغانی جنگوں میں جب انگریزی فوجوں کے ساتھ ہندوستانی سپاہی بھی کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے تو شاید ان کے رویہ کی وجہ سے کابل والوں کے دلوں میں ہندوستانیوں کے بر خلاف یہ دشمنی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال ایسے لوگوں نے عبدالنبی ہیڈ ماسٹر علی آباد سکول کو ورغلایا اور اس نے اس سکول کے لڑکوں کے قومی جذبات کو ہندوستانی معلمین اور اردو زبان کے بر خلاف ابھارا۔ اس پر لڑکوں نے اردو پڑھائے جانے کے بر خلاف پروٹسٹ کیا اور سٹرائک کر کے سب کے سب مکتب سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں جب شام کو وزارت حربیہ سے علی آباد آیا تو مجھے حالات کا علم ہوا۔ میں نے اگلے روز وزیر تعلیم سردار محمد یونس خان سے ملاقات کی۔ بات چیت کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے قطغن اور بدخشاں سے واپسی تک سکول بند کر دیا جائے۔

امیر امان اللہ خان کے دربار میں بڑھتا ہوا انگریزی اثر

اس واقعہ کے چند روز بعد قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے سردار محمود بیگ طرزی وزیر خارجہ افغانستان کو اردو یونیورسٹی کا چارٹر دینے کے متعلق ان کا وعدہ یاد دلایا۔ پہلے تو وہ لیت و لعل کرتے رہے۔ مگر جب ڈوبس کے مشن سے جو معاہدہ انہوں نے کیا تھا، وہ منصوری میں ۱۹۲۱ء۔ ۱۱۔ ۲۲ تاریخ کو پکا ہو گیا اور اس کی انگریزی حکومت نے بھی تصدیق کر دی تو افغانی گورنمنٹ نے

ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر دینے انکار کر دیا۔

جب ہم ان سب واقعات کی رفتار پر غور کرتے ہیں، تو ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ علی آباد سکول کی سٹرائک اور سکول کا بند کیا جانا اور ہندوستانی یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے افغانی گورنمنٹ کا انکار کرنا یہ سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ افغانی گورنمنٹ نے برصغیر کے مسلمانوں کے خلافت ایجی ٹیشن سے فائدہ اٹھا کر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اپنی جنگ آزادی شروع کی۔ آزادی کے بعد انگریزوں سے اچھی شرطیں حاصل کرنے تک قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اردو ہندوستانی یونیورسٹی کے سبز باغ دکھلائے، اور جب سارے امور کا انگریزوں سے خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا تو اپنے وعدوں سے انکار کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈوبس مشن نے گفت و شنید کے ذیل میں افغانی گورنمنٹ سے اس کا وعدہ لے لیا ہو کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو افغانستان میں کسی سیاسی یا علمی کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

افغانی گورنمنٹ کے اردو ہندوستانی یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے انکار کرنے پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لئے صرف دو طریقے باقی رہ گئے:

(۱) افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور باقی زندگی سیاست سے کنارہ کشی کر کے بالکل بیکار گزاریں۔ یہ طریقہ کار ان کی سیاسی موت کے مترادف تھا، یا (۲) افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے بر خلاف اپنا کام جاری رکھیں۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے تقریباً کوئی ایک سال غور کیا۔ آخر قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے باوجود ان گوناگوں مشکلات کے جو ان کو دوسرا طریقہ کار اختیار کرنے کی صورت میں پیش آ سکتی تھیں، یہی فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان سے چلے جائیں اور ترکی کے اسلامی ملک میں پہنچنے کی کوشش کریں۔ ایران کے راستے پہنچنا ناممکن تھا کیونکہ وہاں اس زمانے میں انگریزوں کا رسوخ بہت زیادہ تھا۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ وہ روس کے راستے سفر کریں۔

افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کرنا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لئے ایک بہت ہی نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ ان کو شیخ الہند مرحوم نے سیاسی کام کے لئے کابل بھیجا تھا۔ ان کو ہر چہ باد اباد، وہیں رہ کر کام کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہاں اب اس کا امکان نہ رہا تھا۔ سیاسی کام تو ایک طرف، اب وہاں علمی کام کا بھی موقع نہ رہا تھا۔ اس لئے اب افغانستان میں رہنا بے سود تھا۔ قبلہ مولانا

صاحب مرحوم کو کابل چھوڑنے کا سخت قلق تھا۔ کیونکہ ان کی سات سالہ کوششوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ سب کیا کرایا برباد ہونے کو تھا۔ گذشتہ سات سال کی کارروائیوں اور آئندہ کی امیدوں پر پانی پھرنے والا تھا۔ افغانی گورنمنٹ نے اب انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے کھلم کھلا انکار کر دیا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم اب روس جانے پر مجبور تھے جہاں ایک ایسا نیا نظام قائم ہو چکا تھا جو مکمل لادینیت پر مبنی تھا۔ حالانکہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم ایک سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ ایک جید مذہبی عالم تھے۔ روس کے متعلق ان کی معلومات بالکل محدود اور کم تھیں۔ وہ ایسے تاریکی کے عالم میں داخل ہونے والے تھے جہاں سیاسی کام کی امید کی ایک شعاع بھی نظر نہ آتی تھی۔ یہ انہی کا دل و جگر تھا اور یہ انہی کا حوصلہ تھا جس کی وجہ سے وہ ساری مشکلات کو برداشت کرنے پر تیار ہو گئے۔ افغانستان جیسے اسلامی ملک میں رہنا آسان تھا۔ وہاں کم از کم چند ایک کلمہ گو ان کی باتوں کو سن سکتے اور سمجھ سکتے تھے۔ لیکن روس ایک ایسا لامذہب اور بے دین ملک تھا کہ وہاں ایک مذہبی عالم کا جا کر صرف رہنا ہی مشکل تھا۔ کیونکہ اس کو رجعت پسند (Reactionary) اور انقلاب روس کا دشمن سمجھا جانا بالکل ایک قدرتی بات تھی۔ وہاں تو ان کی جان بھی خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔

اس کے سوا، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا افغانستان سے چلا جانا، خود افغانی حکومت کے اعتبار اور افغانی قوم کی عزت کے لئے بھی اچھا نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد برصغیر کے مسلمان افغانستان کو بالکل انگریزوں کا پٹھو تصور کرنے لگیں گے اور ان کو افغانستان سے بالکل ہمدردی نہ رہے گی۔ یہ افغانستان اور برصغیر کے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں ایک امید افزا بات نہ تھی۔ مسلمانان برصغیر کی جو افغانستان سے مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے بارے میں امیدیں تھیں، ان پر بھی قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے کابل سے چلے جانے پر پانی پھر جانے کا اندیشہ تھا۔ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی، برصغیر کے مسلمانوں کے لئے افغانستان کے ساتھ دوست رہنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ افغانستان کی اس بیوفائی کی وجہ سے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا اس طرح افغانستان سے تعلق توڑنے سے مستقبل کے متعلق یہ ساری امنگیں اور امیدیں بھی ختم ہو جانے والی تھیں۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب مرحوم ان سب امور کو سوچنے کے باوجود بھی اس فیصلہ پر پہنچے کہ ان کے لئے موجودہ حالات میں افغانستان سے چلے جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ترکی جا کر وہ شاید پھر اس قسم کا موقع نکلنے کی امید رکھتے تھے

کہ زیادہ بہتر حالات کی صورت میں وہ پھر کابل واپس آجائیں گے۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے افغانوں کو انگریزوں سے لڑوانے کے لئے افغانی حکومت کو جس قسم کے وعدے دیئے تھے، اس میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے کالجیٹ (Collegiate) ساتھیوں میں سے بعض لوگ ان کے ہم خیال نہ تھے۔ لیکن افغانی امیر کو جنگ پر اکسانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی اس سکیم (Scheme) پر خان عبدالغفار خان بڑے ناراض ہوئے تھے۔ لیکن یہ تو ہر کسی کو چار و ناچار ماننا پڑے گا کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنے تدبر سے افغانستان جیسے کمزور ملک کو بھی انگریزوں جیسی ایک طاقت ور حکومت سے لڑا دیا۔ یہ انہی کا کارنامہ ہے۔ اس سے اگر اور کوئی فائدہ نہ ہوا تو یہ ضرور ہوا کہ ایک اسلامی ملک یعنی افغانستان آزاد ہو گیا۔ آج اگرچہ افغانستان احسان فراموشی کر کے پاکستان کا دشمن اور ہندوؤں اور روس کا دوست بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کو یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی آزادی کیلئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی جدوجہد اور ان کے دوست برصغیر کے باشندوں کی قربانیوں کا مرہون منت ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور انکی پارٹی کی کابل سے روس کو روانگی

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو روس کے سفر میں محمد علی (خوشی محمد) سے مدد کی امید تھی۔ کیونکہ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا اور ایک مرتبہ ماسکو جا چکا تھا قبلہ مرحوم نے کابل میں اپنی ضمانت پر اس کو ٹھیرایا تھا۔ حالانکہ وہ وہاں رہ کر ایک کیمونسٹ کی حیثیت میں روسی اغراض و مقاصد کے لئے کام کر رہا تھا، اور انگریزوں کے پہلو میں ایک خار تھا۔ کابل میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی سیاسی کارروائیوں کے ختم ہونے میں اس بات کا بھی دخل ہے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اس کی پرانی خدمات کی وجہ سے اس کی حمایت کر کے اس کے کابل میں ٹھیرے رہنے کے بارے میں بارہا کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ افغانی گورنمنٹ سے ایک دفعہ کھلم کھلا یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر محمد علی (خوشی محمد) کو افغانستان سے نکالا گیا تو وہ خود بھی افغانستان چھوڑ دیں گے۔ اب جب قبلہ مولانا صاحب خود افغانستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو محمد علی (خوشی محمد) کا وہاں رہنا ناممکن تھا۔ اس لئے وہ بھی ہمارے قافلے میں داخل ہوا اور اس نے ہمارے روس میں داخل ہونے کے لئے ویزا (VISA) لیا۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو قدرتی طور پر امید تھی کہ روس میں ان کے کاموں میں محمد علی (خوشی

محمد) ان کی مدد کرے گا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر لکھا جائے گا اس نے ان کی کوئی خاص مدد نہ کی۔

جب ہمارے افغانستان سے چلے جانے کے فیصلے کا سردار محمد ہاشم خان کو، جو اس وقت جلال آباد کی گورنری سے کابل واپس آچکا تھا، پتہ چلا، تو انہوں نے اپنے بڑے بھائی سردار سپہ سالار صاحب محمد نادر خان مرحوم کو جو اس وقت قطغن، بدخشاں کے صوبہ میں ہیئت تنظیمیہ کے رئیس کے طور پر مقرر تھے، اطلاع دی۔ انہوں نے بہ واپسی ڈاک میرے افغانستان میں ٹھیرنے پر زور دیا، لیکن میں نے اس کو نہ مانا۔ آخر سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے چاہا کہ کم از کم قبلہ مولانا صاحب مرحوم اور میں ایک آخری دفعہ ان سے مل لیں، اور اس کے لئے ہم روس کو قطغن بدخشان کے راستہ سے جائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ افغانی گورنمنٹ نے ایسے احتمال کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے سفر کے لئے ایک ایسا راستہ مقرر کیا جو صوبہ قطغن، بدخشاں کی حدود سے بالکل باہر تھا۔ اس پر سردار محمد ہاشم خان بہت مایوس ہوئے۔ انہوں روس کی قحط سالی اور وہاں ہر قسم کے نان و پوشاک کی قلت اور گرانی کو مد نظر رکھ کر مجھے تحفے کے طور پر دو سوٹوں کا کپڑا دیا۔ میں نے اپنا رخت سفر ایک پیٹی میں (لکڑی کا ایک مضبوط صندوق جس پر چمڑا منڈھا ہوتا ہے اور جس کو کابل میں یخدان کہتے ہیں) بند کیا۔ دوسرے دوستوں نے بھی جو قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ساتھ جانے والے تھے سامان بند کیا۔ اس قافلے میں جانے والے لوگ میرے سوا مندرجہ ذیل تھے۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا بھتیجا عزیز احمد، ہمارے کالجیٹ ساتھیوں میں سے خوشی محمد (محمد علی)، جماعت مجاہدین کے راستہ، ہم سے بعد کابل پہنچنے والوں میں ڈاکٹر نور محمد، تحریک ہجرت کی ذیل میں کابل آنے والوں میں سے اقبال شیدائی، عمر ظفر مسعود، عبدالرشید، عبدالعزیز، حبیبیہ سکول کے معلموں میں سبناتھ بینرجی جو صرف ایڈونچر (Adventure) (مہم جوئی) کے لئے روس جانا چاہتا تھا۔ میرے کالجیٹ ساتھیوں میں سے اللہ نواز خان ہمارے ساتھ نہ آسکا۔ کیونکہ اس نے کابل میں سابق مہتر چترال عبدالرحمٰن خان کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اس ناطے کے جڑنے میں اس کو چترالی زبان جاننے کی وجہ سے، جو اس نے اپنی چترالی ماں سے سیکھی تھی، مدد ملی تھی۔

قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کرنے پر، اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے لئے افغانی گورنمنٹ سے راہداری (پاسپورٹ) مانگا۔ افغانی حکومت نے ڈاکٹر نور محمد اور مجھے افغانستان میں رکھنا چاہا۔ لیکن ہم دونوں نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "جب ہمارے بزرگوں کو افغانستان میں سیاسی کام کی اجازت نہیں دی جاتی، تو ہم یہاں رہ کر افغانی گورنمنٹ کی ملازمت کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہم افغانستان میں تنخواہ لینے اور پیسہ کمانے نہیں آئے ہیں۔ ہم صرف اپنے ملک کی آزادی کے لئے کام کرنے کو یہاں آئے تھے"۔

راہداری حاصل کرنے پر، میں نے زاد راہ حاصل کرنے کے لئے اپنا گھوڑا اور گھر کا سامان فروخت کر دیا۔ اس فروخت سے مجھے ۵۳ اشرفیاں (انگریزی سونے کے پونڈ) حاصل ہوئیں۔ دوسرے ساتھیوں میں سے، خوشی محمد کے پاس روسیوں سے حاصل کردہ روپیہ تھا۔ ڈاکٹر نور محمد کے پاس ڈاکٹری فیس سے جمع شدہ کچھ رقم تھی۔ اقبال شیدائی اور عبدالرشید کے پاس جمال پاشا کے دفتر ترجمہ سے ملی ہوئی تنخواہ سے پس انداز کردہ کچھ پونجی موجود تھی۔ بینرجی نے بھی اپنی تنخواہ میں کچھ پیسہ بچایا ہوا تھا۔ صرف قبلہ مولانا صاحب مرحوم بے مایہ تھے۔ مگر وہ خدا کے بھروسے پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ اس نے ساری عمران کو روٹی دی تھی اور آئندہ بھی وہی ان کا رزاق تھا۔ انہوں نے تو شاید ساری عمر کبھی روپیہ جمع ہی نہ کیا تھا۔ ان کا بھتیجا عزیز احمد بھی ان کے ساتھ اسی طرح بے مایہ تھا۔ عبدالعزیز خوشی محمد کے ساتھ تھا اور اس کی مدد پر تکیہ باندھے ہوا تھا۔ عمر ظفر مسعود کا خرچ اقبال شیدائی نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔

ہمارے لئے دشوار گذار راستے کا مقرر کیا جانا

آخر قافلے کی روانگی کی تاریخ ۱۵/اکتوبر ۱۹۲۲ء مقرر ہوئی۔ سواری کے لئے ہم نے گھوڑے اور اپنا سامان لادنے کے لئے ٹٹو کرایہ پر لئے۔ ڈاکٹر نور محمد نے، جو جاڑے کے دنوں میں کابل میں میرے ہاتھ پاؤں کو سوجتا ہوا دیکھ چکے تھے، متنبہ کیا کہ روس کی سخت سردی میرے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسرے دوست بھی امید نہ رکھتے تھے کہ میرا ضعیف نحیف بدن اس سفر کی سختیاں برداشت کر سکے گا۔ لیکن میں نے ان باتوں کے باوجود بھی، قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں رہنے اور ان کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

؎ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

اب اس طرح میرا دوسرا کیریر جس کو میں نے ایک ایسے ملک میں بنایا تھا جس کی میں نہ

زبان جانتا تھا اور نہ جہاں کوئی میرا رشتہ دار یا دوست موجود تھا، ختم ہو رہا تھا۔ میں افغانستان میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک بے کس مہاجر کے طور پر آیا تھا اور محض خدا کے فضل، اپنی کوششوں اور قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی حمایت کے ذریعہ افغانستانی وزیر حرب اور سپہ سالار مرحوم نادر خان کا معتمد علیہ اور افغانی وزارت حربیہ کا ایک بارسوخ رکن بن گیا تھا۔ اس فیصلے کے بعد میں اب پھر ایک خانہ بدوش تھا جو افغانی گورنمنٹ کے اصرار اور امید دلانے کے باوجود بھی اپنے آئیڈیل (Idial) پر صداقت سے پابند رہ کر اور اپنے اصولوں کی خاطر جاہ و عزت کو چھوڑ کر ایک نئے ماحول میں قدم رکھ رہا تھا۔ جہاں مجھے اپنی دینداری کی وجہ سے کسی دوست اور ہمدرد کا ملنا دشوار تھا اور جہاں کی آب و ہوا کا میرے لئے مہلک ثابت ہونے کا احتمال تھا۔

ہمارا قافلہ ۱۵/اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اتوار کے دن علی الصباح کابل سے روانہ ہوا۔ افغانی گورنمنٹ نے قافلے کے لئے شاہراہ کی بجائے جو کابل سے افغانی ترکستان کے مرکزی شہر مزار شریف کو جاتی ہے اور جو شہر بامیان سے، جہاں آشوک کے زمانے کے بنے ہوئے مہاتما بدھ کے دو بڑے بت موجود ہیں، گزرتی ہے، ایک غیر معروف سا راستہ مقرر کیا تھا۔ یہ راستہ سمت شمالی کے ضلع سے گزرتا تھا۔ اس راستے سے ہمارے قافلے سے پہلے کبھی بھی کوئی قافلہ جس میں گھوڑے اور بار برداری کے خچر اور ٹٹو موجود ہوں، نہ گزرا تھا۔ صرف پیدل چلنے والے یا اکے دُکے مسافر یہاں سے چل کر اور کوہ ہندوکش سے گزر کر افغانی ترکستان جایا کرتے تھے۔ اس قسم کے دشوار گزار اور سنگلاخ راستے کا ہمارے لئے مقرر کئے جانے سے ہمارے دلوں میں مختلف خیالات پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس کا یقین آگیا کہ مرحوم سپہ سالار محمد نادر خان سے ہماری ملاقات کو روکنے کے لئے افغانی گورنمنٹ نے ہمارا راستہ بدل دیا ہے۔ تاکہ اگر سپہ سالار صاحب مرحوم اپنے کسی آدمی کو بھیج کر ہمیں راستہ سے مڑوا کر اپنے پاس بلائیں تو ان کا فرستادہ آدمی ہم سے نہ مل سکے۔ (روس پہنچ کر ہمیں بعد میں بعض افغانی کارندوں سے معلوم ہوا کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے اپنے اردلی کو بامیان کے راستے پر ہم سے ملنے اور ہم کو ان کے پاس لے جانے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن چونکہ ہم اس راستہ سے سفر نہ کر رہے تھے وہ ہم سے نہ مل سکا تھا۔) دوسرا خیال ہمارے دل میں یہ آیا کہ افغانی حکومت کو امید تھی کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کابل میں خاموش ہو کر بیٹھنا اور سیاسی کاموں سے دست کش ہونا منظور کر لیں گے۔ لیکن جب اس کی یہ امید نہ بر آئی تو اس نے برہم ہو کر ہمارے سفر میں ہر

طرح کی مشکلات پیدا کرنا چاہیں۔ تیسرا خیال جو ہمارے دل میں آیا، وہ یہ تھا کہ شاید راستہ بہت خطرناک ہے اور اس میں ڈر ہے کہ ڈاکو ہم پر دھاڑا ماریں اور ہمارے سامان کو لوٹ کر ہم کو بے چارگی کی حالت میں افغانستان سے پھر پناہ مانگنے اور وہیں رہنے پر راضی ہونے پر مجبور کریں۔ ماسکو پہنچ کر ہمیں بعض پرانے ہندوستانی اخبار ملے جن میں یہ خبر درج تھی کہ مزار شریف کے راستے میں ہمارے قافلہ پر ڈاکوؤں نے دھاڑا مارا اور ہمارا سامان لوٹ لیا۔ یہ خبر اگرچہ درست نہ تھی لیکن اس قسم کی خبر کے ہندوستانی اخبارات میں چھپنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ کابل میں لوگوں کے دلوں میں ایسا کچھ احتمال موجود تھا۔ بعض لوگ تو شاید اس کو یقینی سمجھتے ہوں گے اور انہوں نے ہی ایسی خبر ہندوستان پہنچا دی ہو گی۔ چوتھا خیال ہمارے دلوں میں یہ آیا کہ چونکہ ہمارے کابل کے قیام کے آخری ایام میں افغانی حکومت نے ہم سے روکھا پھیکا برتاؤ کیا تھا۔ اس سے احتمال پیدا ہوتا تھا کہ شاید افغانی گورنمنٹ خود ہم پر ایک چھاپہ ڈلوا کر ہمارا سامان لٹوا دے گی، اور مشہور کر دے گی کہ پہاڑوں میں بعض ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا۔

اگرچہ اس وقت ضلع سمت شمالی کا کمشنر احمد علی خان ڈاکٹر نور محمد کا اور میرا دوست تھا اور اس نے ہماری خاطر تواضع کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، اور اپنے علاقے سے ہم کو پوری حفاظت کے ساتھ گزار دیا تھا۔ لیکن اس دوستانہ رویہ کے باوجود بھی ہمارے دلوں میں اس کی طرف سے ڈر تھا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام ایک ایسے تنہا گھر میں کیا تھا، جو ایک ٹیلے کی چوٹی پر واقع تھا اور جس کے آس پاس اور کوئی گھر موجود نہ تھا۔ ہم دس آدمی یہاں کھانے پر بلائے گئے تھے اور قافلے کے نوکر اور سائیس وغیرہ پہاڑی کے نیچے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ دسترخوان پر ہماری خدمت کرنے والے لوگ جو احمد علی خاں کے اردلی وغیرہ تھے، پورے طور پر اسلحہ بند تھے۔ اس سے ہمیں شبہ ہوا کہ ہمارے قتل کی سازش ہے، جس کے لئے ایک ایسی جگہ چنی گئی ہے جہاں اگر ہم پر حملہ ہو تو نہ کوئی ہماری مدد کو آ سکے اور نہ ہی کوئی آہ و فغان سن سکے۔ اس قسم کے احتمال کو مدنظر رکھ کر، ڈاکٹر نور محمد، خوشی محمد اور میں نے باہم مشورہ کے بعد صاحب خانہ کی نظر سے پوشیدہ رہ کر اپنے پستول بھرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے ہم یکے بعد دیگرے رفع حاجت کے بہانے بیت الخلاء میں گئے اور پستول بھر کر گھر میں واپس آ گئے۔ لیکن بعد میں ہمارا یہ سارا اقدام غیر ضروری ثابت ہوا۔ کیونکہ ہمیں احمد علی خان اور اس کے کارندوں کے رویہ سے اطمینان ہو گیا کہ ہمارا سارا گمان بے جا ہے اور ایک وہم پر مبنی ہے۔

دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کیونکہ ہمیں بتلایا گیا تھا کہ منزل پر شام تک پہنچنا مشکل ہو گا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک تو ہم ہموار زمین پر چلتے رہے۔ مگر اس کے بعد پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں کمشنر علی احمد خان کے آدمی جو ہمیں اس کے علاقے کی سرحد تک پہنچانے کے لئے ہمارے ساتھ آئے تھے، ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد راستہ بہت تنگ اور سنگلاخ اور بڑی کٹھن چڑھائی کا تھا، جہاں سے باربرداری کے ٹٹو اور خچر بہت مشکل سے اور بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے قافلے کو اس چڑھائی اور پہاڑی کی چوٹی سے سلامتی کے ساتھ گزارنے کا فرض مجھے دیا۔ چونکہ میں افغانی فوج کے ساتھ سمت جنوبی اور سمت مشرقی میں سفر کرنے کی وجہ سے اس بارے میں کچھ تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ وہ خود باقی گھڑ چڑھے ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے کر اس چوٹی سے گزرنے کو روانہ ہو گئے۔

میں نے باربرداری کے ٹٹوؤں کو اپنے اردلی اور قافلے کے سائیسوں کے ساتھ مل کر، ایک ایک کر کے اور پیچھے سے دھکیل دھکیل کر بڑے بڑے پتھروں کے اوپر سے، جو راستہ میں پڑے ہوئے تھے، گزار کر کوئی دو گھنٹہ میں پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچایا۔ اس کے بعد اترائی شروع ہوئی جو چڑھائی سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئی۔ کیونکہ ٹٹوؤں کے پاؤں پھسلتے تھے اور ان کے لڑکھڑا کر گر جانے کا ڈر تھا۔ یہاں ایک ٹٹو کو دو آدمیوں کی مدد سے جس میں سے ایک اس کی باگ کو کوتاہ کر کے اس کا سر اوپر اٹھاتا تھا اور دوسرا اس کی دم سے پیچھے کھینچ کر اس کو ٹھوکر کھانے اور گرنے سے روکتا تھا، آہستہ آہستہ پہاڑ سے میدان میں اتارا۔ یہ اترائی تقریباً ایک گھنٹے جاری رہی۔

ہم نے پہاڑی سے اتر جانے کے بعد کچھ دور چل کر ایک جھیل دیکھی۔ اس کے نزدیک ہم اپنے ساتھیوں سے ملے جو وہاں دم لینے اور ہمارا انتظار کرنے کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ جگہ جھیل اور درختوں کی وجہ سے پرفضا معلوم ہوتی تھی لیکن آبادی اور گاؤں سے دور ہونے کی وجہ سے بھیانک سی نظر آتی تھی۔ اس کے کنارے بیٹھنے اور اس کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھونے سے ہمارے قافلے والوں کے حواس ذرا بجا ہوئے۔ گھوڑوں اور ٹٹوؤں کو چارہ اور جو کھلائے گئے جس سے انہیں اگلی پہاڑی پر چڑھنے کی سکت آ گئی۔

ہمارے پڑاؤ کا گاؤں اس دوسری پہاڑی کے پرے کہیں واقع تھا۔ کوئی چار بجے ہم نے

اس پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ دو گھنٹے میں اس کی چوٹی کے نزدیک پہنچے۔ اس کے بعد راستہ تنگ اور پتھریلا ہو گیا۔ گھوڑوں اور ٹٹوؤں کے سم اس پر اچھی طرح نہ جمتے تھے۔ راستے کے بائیں طرف سربہ فلک پہاڑ، دائیں طرف ایک وادی تھی جس کی تہ درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے نظر نہ آتی تھی۔ چوٹی کے نزدیک دو گھوڑے بھی پہلو بہ پہلو نہ چل سکتے تھے۔ یہاں سے آگے اور چوٹی سے پہلے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں راستہ اور بھی تنگ ہو گیا۔ وہاں ایک موڑ بھی تھا اور چڑھائی اور بھی سخت تھی۔ اس جگہ سے گھوڑوں کو گزرنے میں سخت مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ چند ایک ساتھی جن میں خوشی محمد بھی شامل تھا ایک ایک کر کے اس نقطہ سے گزر کر پہاڑی کی چوٹی کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس کے بعد قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا گھوڑا آگے بڑھا۔ مگر اس پتھریلی جگہ سے گزرتے ہوئے اس کا دایاں پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑانے لگا۔ لیکن خدا کے فضل سے گرنے سے بچ گیا۔ ورنہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی جان کے لالے پڑ جاتے اور ایک حادثہ واقع ہو جاتا۔ قبلہ مولانا صاحب کے پیچھے میں گھوڑے پر آ رہا تھا۔ ان کے گھوڑے کو اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ کر میرے حواس گم ہو گئے۔ کیونکہ میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ خیر خدا خدا کر کے وہ چوٹی تک پہنچ گئے۔ میں اس خطرناک جگہ سے گزرا ہی تھا کہ نوکر نے آ کر خبر دی کہ وہ ٹٹو جس پر میرا سامان لدا ہوا تھا، اس دشوار گزار جگہ پر لڑکھڑایا اور بوجھ کی وجہ سے سنبھل نہ سکا اور سامان کے ساتھ لڑھکتا ہوا ڈھلوان سے وادی میں جا پڑا۔ میں وہاں سے پیدل لوٹا اور نوکروں اور سائیسوں کو وادی میں اتارا۔ انہوں نے وادی میں ایک جگہ دیکھا کہ ٹٹو تو صدمے کی وجہ سے مر گیا ہے، مگر پالان ایک درخت کے تنے میں اٹک کر وادی کی تہ میں گرنے سے بچ گیا ہے۔ انہوں نے یہاں سے بہ مشکل اس کا پالان اور میرے سامان کے صندوقوں کو پہاڑی کی چوٹی تک کھینچا، اور یہاں ٹٹوؤں کے کرایہ داروں میں ایک کو اس کے ٹٹو سے اتار کر اس پر میرا سامان لادا اور یہ کرایہ دار پیدل قافلے کے ساتھ روانہ ہوا۔

پہاڑی کی چوٹی پر میں نے دیکھا کہ دو بڑی چٹانیں جن کے اوپر کے کنارے باہم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور نیچے کے کنارے ایک دوسرے سے دور تھے، ایک چھوٹے سے خیمے کے مانند کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کے نیچے ایک دو شخصوں کو بیٹھنے کی جگہ مل سکتی تھی۔ یہاں مجھے ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ وہ مردہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے

یہاں سے گزرتے ہوئے سردی کے موسم میں برف کے طوفان سے بچنے کے لئے ان چٹانوں کے نیچے پناہ لی تھی، اور یہاں سردی کی وجہ سے اس کا خون جم جانے کی وجہ سے وہ مر گیا، اور اسی طرح بیٹھا ہوا رہ گیا تھا۔ سردی کی وجہ سے اگر انسان کہیں اس طرح پناہ لینے پر مجبور ہو تو اس کو چاہئے کہ نیند نہ آنے دے اور اپنے کو جاگتا رکھے، اور ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا رہے۔ ورنہ نیند میں اس کا خون جم جانے کی وجہ سے موت یقینی ہوتی ہے۔

ہم اس چوٹی سے ایک ایک کر کے گزرتے تھے۔ اس لئے اس مردے کو ایک دوسرے کو نہ دکھلا سکے، اور نہ ہی مل کر اس کا معائنہ کر سکے۔ لیکن جب چوٹی سے گزر کر ہموار زمین پر پہنچے اور ایک دوسرے سے ملے تو دوسرے ساتھیوں نے بھی مجھے بتلایا کہ انہوں نے بھی مردہ آدمی کو دیکھا تھا۔

ہمارا سارا قافلہ اس چوٹی سے شام کے قریب گزرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح ہم نے اس پہاڑی سلسلے کو جس کو افغان کوتل دوشاخہ (یعنی ڈبل ہائی پاس) کہتے ہیں، صرف ایک ٹٹو کو ضائع کر کے سر کر لیا۔ لیکن ہمارا پڑاؤ یہاں بھی نظر نہ آتا تھا۔ اندھیرا ہوتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف بے درخت خشک ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان ایک ندی بہ رہی تھی اور ہم اس ندی کے کنارے ایک تنگ پہاڑی راستے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں نہ کوئی راہ رو تھا کہ اس سے پڑاؤ کا فاصلہ اور اس کی ٹھیک جگہ معلوم کریں، اور نہ ہی کسی گاؤں کا نام و نشان نظر آتا تھا۔ نہ ہی گاؤں کا پتہ دینے والی کوئی جلتی ہوئی آگ یا روشنی نظر آتی تھی۔ اندھیرے میں گھوڑوں کے لئے چلنا، اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ایک طرف تکان، دوسری طرف تاریکی، اس وجہ سے گھوڑے قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے تھے جس سے سوار کو گرنے کا خطرہ ہو جاتا تھا۔ ایک جگہ تو بینر جی گرنے سے اس قدر ڈرا کہ نزدیک تھا، رونے لگے۔ اس لئے ڈاکٹر نور محمد نے اس سے کہا گھوڑے سے اتر کر پیدل چلے۔ اس پر اس نے جواب دیا۔ ”ارے اترنے کی جگہ کہاں ہے۔ ہم لوگ کیسا اترے“۔ بینر جی بنگالی ہندو ہونے کی وجہ سے بہت ٹوٹی پھوٹی اردو بولا کرتا تھا۔ اس لئے اس کا یہ جواب ہمارے لئے، بعد کے زمانے میں، جب تک وہ ہمارے ساتھ رہا، اس کے مذاق کا ذریعہ بنا رہا۔

اس طرح اندھیرے میں کوئی ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم نے ندی کے پار اپنے بائیں ہاتھ پر

آگ کی روشنی دیکھی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے مجھے اور ڈاکٹر نور محمد کو اس کی طرف بھیجا تا کہ وہاں سے پڑاؤ کے متعلق کوئی خبر حاصل کی جائے۔ ہم دونوں بڑی مشکل سے اندھیرے میں ندی کے پار گئے، دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ چند خیمے لگے ہوئے ہیں جن میں کچھ سپاہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ افغانی سفر مینا (Sappers and Miners.) کے سپاہی ہیں جو یہاں سڑک بنانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ان کا افسر ایک ٹوبے مشر (Captain) تھا۔ ہم نے اس کو اپنا منصب (Rank) بتایا۔ ڈاکٹر نور محمد کو افغانی گورنمنٹ نے بریگیڈیئر (Brigadier) کا اور مجھے کرنل (Colonel) کا اعزازی رتبہ دیا ہوا تھا۔ اس پر اس نے ہماری خاطر تواضع کی۔ ہم نے اس سے پڑاؤ دریافت کیا۔ اس نے ہمیں کہا کہ ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد ایک گاؤں آئے گا۔ اس میں ہمارے لئے رات بسر کرنے کا انتظام ہو سکے گا۔ لیکن اس کو تعجب ہوا کہ ایک بریگیڈیئر اور ایک کرنل بغیر کسی اردلی وغیرہ کے ایسی بھیانک جگہ میں رات کو کیا کرنے آئے ہیں۔ ہم نے اس کو اپنے حالات سے کچھ خبردار نہ کیا تھا۔ وہ غالباً اس گمان میں رہا کہ ہم دفعتاً ایک دورے پر نکلے ہیں اور رات کو اچانک اس کے دستہ کی پڑتال کے لئے آئے ہیں۔ ہم وہاں سے جلدی ہی جدا ہو گئے، اور لوٹ کر اپنے قافلے سے آ ملے۔ قافلہ آخر کار گاؤں میں پہنچ گیا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ گاؤں میں سب سے آخر میں ڈاکٹر نور محمد اور میں پہنچے۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ عزیز احمد اور مسعود قافلے میں نہیں ہیں۔ گاؤں میں ان کی تلاش کی گئی لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ اس سے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو بہت اندیشہ ہوا۔ قافلے کے سب سے چھوٹے دو ممبروں کو کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہو۔ عزیز احمد قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی بہت جاں نثاری اور اطاعت شعاری سے خدمت کرتا رہا تھا۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب مرحوم اس کو بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی عدم موجودگی ان کو بہت گراں گزری۔ اس پر انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اگلے گاؤں میں جا کر ان کی تلاش کروں۔ میں وہاں سے گھوڑے پر دوسرے گاؤں گیا جو پڑاؤ سے کوئی ۱۵ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ عزیز احمد اور مسعود ایک گھر میں قافلے کا انتظار کرنے کو ٹھیرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھیرے میں اس گاؤں سے گزر کر اگلے گاؤں چلے گئے۔ میں ان کو ساتھ لے کر واپس آیا جس سے قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی پریشانی دور ہوئی اور ہم

سب کو اطمینان ہوا۔ یہاں ہمیں جو کچھ کھانے کو ملا اسی پر کفایت کر کے سو گئے۔ اگلی صبح قافلہ پھر روانہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے یہ قاعدہ بنالیا کہ ایک نوکر قافلے سے آگے چل کر اگلے پڑاؤ پر رات کے کھانے اور سونے کا انتظام کیا کرے۔

اس طرح پر ہم سات دن کے بعد شہر مزار شریف آئے وہاں سے اگلے روز ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو روسی علاقے میں داخل ہونے اور شہر پٹاکیسر جس کا تاریخی نام ترمذ ہے پہنچنے کے لئے دریائے آمو کے کنارے پر آئے۔ وہاں سے ہمیں امید تھی کہ دریا کو ایک کشتی پر پار کر کے پٹاکیسر پہنچ جائیں گے، اور وہاں سے بذریعہ ریل بخارا اور تاشقند ہوتے ہوئے ماسکو چلے جائیں گے۔ لیکن دریا پار کرنے پر معلوم ہوا کہ پٹاکیسر میں ریل نہیں ہے! کیونکہ باصماچیوں (بولشویکوں کے مخالف ترکستانی باصماچیوں) نے ریل کی پٹڑی اکھاڑ ڈالی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ صرف کرکی یا کرشی (قارشی) کے شہر میں ریل مل سکے گی، جو یہاں سے تین چار روز کے فاصلہ پر ہے اور وہاں پہنچنے کے لئے ہمیں کشتی پر جانا ہوگا۔ کیونکہ خشکی کے راستے باصماچیوں کے دھاڑے مارنے کا بہت ہی زیادہ خطرہ ہے۔ مگر کشتی کا سفر بھی اس قسم کے خطرے سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس پر ہم نے چار و ناچار کشتی پر کرشی جانے کا فیصلہ کیا۔

بارہواں باب

مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ ماسکو میں

۲۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو پٹاکیسر سے کشتی پر سامان لاد کر ہم نے تین دن کا کھانا اپنے ساتھ لیا۔ امید تھی کہ ہم چوتھے دن کرشی (جس کو قرشی اور کرکی بھی کہا جاتا ہے) پہنچ جائیں گے اور وہاں سے ریل پر سوار ہو سکیں گے۔ ہماری کشتی دریائے آمو کی دھار میں باسانی بہنے لگی۔ ہمیں چپو لگانے کی بھی چنداں ضرورت نہ پڑی مگر کبھی کبھار اگر ضرورت ہوتی تو ہم بھی چپو لگانے میں ملاحوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بولشویکوں کے مخالف ترکستانی جن کو باصماچی کہا جاتا تھا، ملک میں ڈاکے مارتے تھے۔ ان کے ڈر سے ہماری کشتی کنارے سے دور دور دریا کے بیچوں بیچ رہنے کی کوشش کرتی رہی اور رات کو کسی تنہائی کی جگہ میں کنارے سے دور لنگر انداز ہو جاتی تھی۔ دریا کے کنارے کے جنگل بالکل بھیانک اور ڈراؤنے سے معلوم ہوتے تھے جہاں سے ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ابھی ڈاکو ہم پر چھاپا ماریں گے۔ لیکن خدا کا فضل رہا کہ کوئی ایسی واردات پیش نہ آئی۔ دو دن کے سفر کے بعد ہم کو اندازہ ہوا کہ ہماری کشتی کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے ہم چوتھے دن کسی طرح بھی (کرشی) نہیں پہنچ سکیں گے اور غالباً ہم کو چھ دن لگ جائیں گے۔ بظاہر ہمارا کھانا اس وقت تک ساتھ نہ دے سکے گا۔ راستے میں نہ کوئی بستی تھی اور نہ کہیں آدم اور آدم زاد کا نشان تھا کہ اور کھانا مول لے لیا جاتا۔ اس لئے تیسرے دن کے بعد ہم نے راشن کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بھوک ایک ایسی حس ہے کہ اس پر قابو پانا آسان نہیں۔ ہم سب تعلیم یافتہ اور اپنی نازک حالت سے باخبر تھے۔ لیکن اس کے باوجود جبر نفس کر کے خود بخود کھانے کو بچا کر اور اپنی مرضی سے خوراک کم کر کے گزارہ کرنے پر تیار نہ

تھے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ کھانا اور روٹیاں ہمارے پاس رہ گئی ہیں، ان کو راشن کے طور پر کم کم کھایا جائے اور کسی کو اس کے حصے سے زیادہ کھانا نہ دیا جائے، اور ہر روز کھنے کے وقت ہر شخص کا حصہ علیحدہ علیحدہ بانٹا جائے۔ اس کام پر قبلہ مولانا صاحب نے مجھے مقرر کیا۔ مولانا صاحب کے اس فیصلے کو ہمارے سارے ساتھیوں نے اتفاق رائے سے قبول کر لیا۔ یہ کام میرے لئے کافی مشکل تھا کیونکہ سارے ساتھی میرے دوست تھے۔ ایک کو کھانا دے کر دوسرے کو آدھا بھوکا چھوڑنا میرے نزدیک ناقابل عفو جرم تھا۔ ڈاکٹر نور محمد اور خوشی محمد دراز قد اور بھاری بھر کم جسم کے تھے جن کو دوسروں کی نسبت زیادہ کھانے کی ضرورت تھی۔ میرے تعلقات بھی ان سے دوسرے ساتھیوں کی نسبت بہت زیادہ گہرے تھے۔ وہ اکثر بھوک کے مارے بہت تکلیف اٹھایا کرتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی ان کو، ان کے حق سے زیادہ کھانا نہ دیا۔ مجھے یاد ہے ایک دن تو انہوں نے بڑے اصرار سے کچھ زیادہ روٹی مانگی اور میری چاپلوسی کرنے لگے۔ لیکن میں نے انکی بات نہ مانی (مسا کو پہنچ کر کبھی کبھار جب اس واقعہ کا ذکر آتا تھا تو وہ میری کاروائی کو سراہے بغیر نہ رہتے تھے)۔

اس طرح بڑی مشکل سے خدا خدا کر کے یہ ہفتہ گزارا اور ہم ساتویں دن دوپہر کے بعد (کرشی) پہنچ گئے۔ دریا کے کنارے سے سامان ایک گھوڑا گاڑی پر لادا گیا، جس کے پہیئے ہمارے ہاں کی بیل گاڑیوں کے پہیوں سے کوئی دوگنے بڑے تھے۔ اس ملک میں ایسے بڑے پہیئے استعمال کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں دریا کے کنارے کے سرکنڈے کے جنگلوں کی زمین دلدلی ہے اور کیچڑ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر پہیئے چھوٹے ہوں تو گاڑی دلدل میں بالکل دھنس کر رہ جائے۔ پختہ سڑکیں بہت کم ہیں۔ لوگ شہر سے باہر اور گاؤں کو جاتے ہوئے کیچڑ سے بہت تکلیف اٹھاتے ہیں۔

اسٹیشن کو جاتے ہوئے اس جنگل میں ہم نے ایک روسی سپاہی دیکھا جس کی وردی بہت ہی میلی تھی اور جس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ شائد اس نے ہفتہ بھر سے منہ بھی نہ دھویا تھا۔ اس کی صورت نہایت ہی ڈراؤنی تھی۔ غالباً اس کو راشن بھی کافی نہ ملتا تھا۔ کیونکہ اس کے گال پچکے ہوئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ سپاہی اس بھیانک جنگل میں امن و امان کا ضامن تھا۔ غالباً اس کے

فوجی دستہ کا بھی حال ایسا ہی زبوں ہو گا۔ اگر کوئی بڑی اور منظم فوج اس وقت روس پر حملہ کر سکتی تو غالباً ترکستان کو، بلکہ سارے روس کو کیمونسٹوں کے پنجے سے چھڑا سکتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی یہی تھی کہ آگے چل کر کمیونسٹ روس ساری مہذب دنیا کے لئے ایک خطرہ بن جائے۔

قرشی یا کرکی یا کرشی کا اسٹیشن

آخر دو گھنٹے کے بعد ہماری گھوڑا گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچ گئی اور ہم نے سامان اتار کر اسٹیشن کے اندر پہنچانا شروع کیا۔ وہاں نہ کوئی قلی تھا اور نہ کوئی مزدور تھا جو ہمیں مدد دیتا۔ اس لئے دو دو ساتھی ایک ایک صندوق کو اٹھا کر اندر لاتے اور قبلہ مولانا صاحب کے پاس جو اسٹیشن کے اندر آ کر سامان اترنے کے انتظار میں کھڑے ہو گئے تھے، رکھ کر پھر گھوڑا گاڑی سے باقی سامان اتارنے کو چلے جاتے تھے۔ جب سارا سامان اسٹیشن کے اندر آ گیا تو ہم نے اپنے اپنے صندوقوں کی پڑتال کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ میرا صندوق ندارد ہے۔ ادھر ادھر تلاش کرنے اور آس پاس کے لوگوں سے پوچھنے کے باوجود بھی اس کا پتہ نہ چلا۔ معلوم ہوا کہ کوئی روسی یا ترکستانی چور مولانا صاحب کی آنکھ سے اوجھل رہ کر میرا صندوق اٹھا لے گیا۔ اسی صندوق میں میرا دو سوٹوں کا کپڑا بھی تھا، جو مجھے سردار محمد ہاشم خان نے (جو سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے اور ان کی پادشاہی کے زمانے میں وزیر اعظم بنے تھے) بطور تحفہ کے کابل سے چلتے وقت دیا تھا۔ روس میں اس زمانے میں ایسے واقعات بالکل عام تھے۔ کیونکہ ملک میں امن و امان بالکل نہ تھا۔ ہم روسی زبان سے ناواقف تھے۔ ہم میں سے صرف خوشی محمد ٹوٹی پھوٹی روسی بولتا تھا۔ اس لئے اپنا حال دل سمجھانے اور کسی سے مدد لینے کا ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا۔ وقت تنگ ہونے اور ٹرین کی روانگی کے سر پر پہنچنے کی وجہ سے ہم پولیس کو بھی خبر نہ دے سکے اور اس طرح صندوق کی تلاش بالکل نہ کرا سکے۔ غرض چار و ناچار میں اپنے بہت سے سامان سے ہاتھ دھو کر بادل نخواستہ

دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ ریل پر سوار ہونے پر مجبور ہوا۔ یہاں سے ہم بخارا کو روانہ ہوئے۔ میرے پاس سوائے ان کپڑوں کے جو اس وقت میرے بدن پر تھے اور کوئی پہننے والا نہ رہا تھا۔ ریل گاڑی میں ڈاکٹر نور محمد اور دوسرے دوستوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ مجھے قمیض اور پتلون دے دیں گے۔ لیکن یہ تسلی ذرا روکھی پھیکی سی تھی۔ کیونکہ ان کے کپڑے میرے بدن پر ٹھیک اور موزوں نہ آسکتے تے۔ روس میں اس زمانے میں کپڑے وغیرہ خریدنا ناممکن تھا. کیونکہ بازار میں ایسی چیزیں نہ بکتی تھیں۔ دوستوں کے جو کپڑے میرے بدن پر ٹھیک آئے. میں انہی پر گزارا کرنے پر مجبور ہوا۔

روسی ریل گاڑیاں ہندوستان یا دوسرے ملکوں کی ریل گاڑیوں سے مختلف ہیں۔ ان کا طرز ساخت بالکل علیحدہ ہے۔ لوکل ٹرین پر ہم نہ چڑھے کیونکہ ہمارا سفر لمبا تھا اور گاڑی ایک دن اور دو رات کے بعد بخارا پہنچتی تھی۔ اس لئے ہم نے سونے کی گاڑی یعنی (Sleeping Car) کا ٹکٹ لیا۔ روسی ریل کے ڈبے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کے ڈبے جہاں گدیلے موجود ہوتے ہیں روسی زبان میں (Lekhki) (نرم) کہلاتے ہیں اور ان کو فرسٹ کلاس مانا جاتا ہے، دوسری قسم کے ڈبے جن میں صرف لکڑی کے تختے ہوتے ہیں اور جن پر نہ کوئی گدیلہ اور نہ کوئی بستر ہوتا ہے (Tverdi) (سخت) کہلاتے ہیں اور سیکنڈ کلاس مانے جاتے ہیں۔

بخارا کو روانگی

کرشی (قرشی) سے لے کر ماسکو تک ہم ہندوستانی انقلابی ہونے کی وجہ سے روسی گورنمنٹ کے مہمان مانے گئے تھے۔ ہم کو سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے لئے ریل کے ساتھ کھانے کی گاڑی لگی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے دور دراز کے گزارے کے لئے ہم نے اسٹیشن سے جو کچھ کھانا مل سکا، وہی خرید کر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یہاں سے شام کو بخارا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سفر میرے لئے بالکل تلخ رہا۔

کیونکہ مجھے ہر وقت اپنی بے سروسامانی کا خیال آتا تھا اور اس سے رنج ہوتا تھا کہ میں اب دوسروں کا محتاج ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں کابل مین ان سب سے اچھی مالی حالت میں تھا۔

روسی ریل کے ڈبوں میں چار چار آدمی سوار ہوتے ہیں اور رات کو دو ایک طرف اور دو دوسری طرف اوپر اور نیچے والے بینچوں پر سو جاتے ہیں۔ میں ڈاکٹر نور محمد، عزیز احمد اور قبلہ مولانا صاحب ایک ہی ڈبے میں سوار ہوئے۔ باقی لوگ دوسرے ڈبوں میں تھے۔ یہ سفر بخیر گزرا اور ہم ایک دن اور دو رات کے سفر کے بعد بخارا پہنچ گئے جہاں ہمیں بخارا گورنمنٹ کے مہمان کے طور پر ایک کوٹھی میں جو ایک بہت بڑے باغ کے اندر تھی، جگہ دی گئی۔ اس کوٹھی میں ہم دو دن رہے۔ کیونکہ ماسکو کو جانے والی ٹرین میں جگہ ملنا مشکل تھی۔ دن کے وقت ہم نے شہر کا ایک چکر لگایا۔ بازار میں دکانوں میں مال بالکل نہ تھا۔ دیہاتی ترکمن جو لمبے لمبے چوغے اور سر پر بڑے بڑے بالوں والی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے، جن سے ان کی شکلیں بڑی ڈراوٴنی سی معلوم ہوتی تھیں کچھ کھانے پینے کی چیزیں بیچنے کے لئے بازار میں لائے ہوئے تھے۔ ان جگھوں پر بہت بھیڑ بھاڑ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے لوگ اپنی ضروریات زندگی کو انہی دیہاتیوں کی لائی ہوئی چیزوں کو خرید کر پورا کرتے ہیں۔ ہر طرف افراتفری معلوم ہوتی تھی۔ صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔

بولشویکی انقلاب کے بعد روسیوں نے کیمونسٹ اصولوں کے مطابق لوگوں کی جائیداوں گھروں، دوکانوں اور سرمایہ پر اور ان کے کارخانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کیونکہ کیمونسٹ اصول ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دیتے۔ اس طرح ہر شخص مزدور کے درجہ پر گر کر اپنی قوت لایموت کے لئے حکومت کا محتاج ہو گیا تھا۔ اس کو بولشویک سماجی مساوات (Social equality) کہا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے گھروں کی اتنی کمی ہو گئی تھی کہ ایک سارا خاندان صرف ایک کمرے میں رہنے پر مجبور تھا۔ انقلاب کے پانچ سال گزر چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہر جگہ افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کو گورنمنٹ کی طرف سے مزدوری یا کوئی اور کام مل جاتا تھا، روٹی کما سکتے تھے۔ جو شخص کوئی کام نہ کرے، اس کا بھوکا رہنا ضروری تھا۔ بوڑھے اور کمزور یا بیمار لوگ ایسی ناداری کی حالت میں تھے کہ انسان کو ان پر رحم ہی آتا تھا۔

بخارا جو ایک زمانے میں اسلامی تہذیب اور علم کا مرکز تھا، جہاں امام بخاری جیسے جید عالم پیدا ہوئے تھے اور جہاں ابن سینا اور شیخ نقشبندی جیسے فلاسفر، حکیم اور صوفی رہ چکے تھے، آج بالکل ایک ویران سا قصبہ ہو گیا تھا۔ پرانے مدرسے اور مسجدیں خراب حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔

پہلے روز شام کا کھانا کھانے کے بعد قبلہ مولانا صاحب سونے کے لئے اس کوٹھی کے شاہ نشین پر جہاں چند ایک سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پہنچا جاتا تھا، اور جو ہمارے سونے کے کمرے کے فرش سے اونچا اور علیحدہ تھا، تشریف لے گئے۔ اس جگہ سے ہمارے کمرے کے بستر نظر آتے تھے۔ سونے سے پہلے قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں محمد علی (خوشی محمد) بھی گیا، اور ان سے اس امر کے متعلق گفتگو کرنے لگا کہ آئندہ روس میں کیا سیاسی کام کیا جائے۔ یہاں اس نے جو رویہ اختیار کیا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ قبلہ مولانا صاحب کو اپنے اصولوں (یعنی کمیونسٹ طرز) پر کام کرنے اور اس کی رہنمائی میں چلنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کو یہ جتلاتا ہے کہ اگر وہ کمیونسٹوں کی تائید میں حصہ نہ لیں گے تو ان کو روس میں روٹی بھی نہ مل سکے گی۔ کیونکہ وہاں تو مذہبی پیشواؤں اور پابند مذہب لوگوں کے لئے رہنا بھی ممکن نہیں ہے۔ قبلہ مولانا صاحب کو اس کی ایسی باتوں سے سخت رنج ہوا۔ وہ شخص جس کی انہوں نے افغانستان میں سالہا سال حمایت کی تھی اور اس کے کمیونسٹ ہونے کے باوجود بھی اس کے لئے کابل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا، اور اس کی کارروائیوں کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور جو ان کا ایک زمانے میں شاگرد رہ کر ان کے سامنے زانوئے تدریس ختم کر چکا تھا، آج ان کو اپنی رہنمائی میں کام کرنے پر مجبور کر رہا تھا، اور کہتا تھا کہ ان کو روس میں روٹی بھی نہ مل سکے گی!

مجھے جب ان واقعات کا علم ہوا تو مجھے قلق ہوا کہ ہمارے مرشد جنہوں نے ہمیں دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت دی تھی، آج بے مائیگی کی وجہ سے ایسے شخص کے محتاج ہو گئے ہیں جس نے ان کے سارے احسانات کو پس پشت ڈال کر اب ان پر اپنا حکم چلانے کا ارادہ کر لیا ہے۔

اس پر میں قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو اپنی ساری پونجی یعنی باون انگریزی سونے کے پونڈوں کی رقم کو جو میں نے کابل میں رہتے ہوئے اپنی تنخواہ سے بچائی تھی، اور کابل سے چلتے وقت اپنا گھوڑا بیچ کر حاصل کی تھی، پیش کر دی اور کہا "اس رقم کو آپ جس طرح چاہیں، استعمال کریں۔ خواہ اس سے اپنی ذاتی ضروریات پورا کریں خواہ اس کو سیاسی کام پر خرچ کریں، آپ کو پورا اختیار ہے۔ میرا اب اس میں کوئی دخل نہ ہو گا"۔

میرے لئے قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں ایسی چھوٹی سی رقم پیش کرنا کوئی بڑا کارنامہ نہ تھا۔ کیونکہ قبلہ مولانا صاحب میرے استاد تھے جنہوں نے مجھے تعلیم قرآنی سے فیض پہنچایا تھا اور میرا کیرکٹر بنانے میں میری مدد کی تھی۔ میں ان کی جتنی بھی خدمت کرتا کم تھی۔ یہ چھوٹی سی خدمت میرے لئے باعث سرفرازی ہی تھی۔

قبلہ مولانا صاحب نے میری تجویز کو بڑی خوشی سے منظور کیا۔ اس طرح ان کو اطمینان ہو گیا کہ کم از کم مالی لحاظ سے تو وہ کسی کے اب محتاج نہیں رہے اور روس کے قیام کے دوران میں ان کے کھانے پینے کے لئے کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اس طرف سے ان کی تسلی ہو جانے پر، اب انہوں نے بڑی خاطر جمعی کے ساتھ اپنا آئندہ کا پروگرام سوچنا شروع کر دیا اور ان کو خوشی محمد کی باتوں سے جو دلی رنج پہنچا تھا اس سے چھٹکارا مل گیا۔

مولانا مدنی نے جو لکھا ہے کہ قبلہ مولانا صاحب کو کوسوں پیدل چلنا پڑا یا بہت لمبے فاقے کاٹنے پڑے، بالکل غلط ہے۔ وہ روس آتے ہوئے، افغانستان میں جہاں موٹر یا ریل کی سڑک نہیں ہے اور گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے، کبھی ایک قدم بھی پیدل چلنے پر مجبور نہیں ہوئے، اور نہ روس میں بھوکے رہے۔ وہ روسی گورنمنٹ کے مہمان تھے اور اس واقعہ کے بعد ان کے پاس روپیہ بھی کافی ہو گیا تھا۔ اس وقت روس میں سونے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ اس زمانے میں ایک سمور کا قیمتی کوٹ ایک سنہری اشرفی (انگریزی پونڈ) میں خریدا جا سکتا تھا۔

میں اب بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا سامان تو پہلے ہی چوری ہو چکا تھا۔ جو کچھ روپیہ میرے پاس تھا، اس کو میں نے قبلہ مولانا صاحب کی نذر کر دیا تھا اور اب خداوند کریم کے کرم و عنائت پر بھروسہ تھا۔ خدائے عز و جل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے کبھی بھی کسی کا محتاج نہیں بنایا۔

ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید نے فیصلہ کیا کہ وہ ہم سے جدا ہو کر بخارا ہی میں بس جائے۔ کیونکہ بخارا میں روس کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ مسلمان آباد تھے۔ ہمارے کوہاٹی ساتھیوں میں سے حافظ عبدالمجید، جو دوسرے مہاجرین کے ساتھ ہم سے پہلے روس چلا گیا تھا، وہ بھی بخارا ہی میں رہتا تھا۔ عبدالرشید نے بخارا میں رہنے کا فیصلہ اس سے ملنے کے بعد کیا تھا۔ ہمیں اس سے جدا ہونے پر سخت قلق ہوا کیونکہ رشید مونس اور خوش اخلاق شخص تھا۔ بعد

میں ماسکو میں رہتے ہوئے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بخارا میں گزارا نہ کر سکا اور ایران کے راستے پھر ہندوستان واپس چلا گیا۔

تاشقند میں

بخارا سے ہم تاشقند گئے اور وہاں ہم نے ماسکو جانے والی ریل گاڑی کے انتظار میں ایک روز قیام کیا۔ تاشقند میں ہمیں ایک بڑے سے گھر کی ایک منزل میں ٹھہرایا گیا۔ جو معلوم ہوتا تھا کہ پرانے زمانے میں کسی مال دار کا گھر تھا۔ یہاں بھی ہم بازار دیکھنے گئے۔ شہر کے پرانے حصے میں ترکستانی لوگ اور نئے حصے میں روسی آباد تھے۔ وسط ایشیا کے سارے بڑے بڑے شہروں میں یہی حال ہے۔ زار کے زمانے میں یہاں روسی خاندان لا کر بسا دیئے گئے تھے تا کہ آہستہ آہستہ یہاں کے لوگ روسی تہذیب اور روسی طرز معاشرت کے دلدادہ بن کر بالکل روسی ہو جائیں۔ زار روس کی اسی سیاست کو بولشویکی حکومت نے اور بھی زور سے چلایا اور یہاں کے لوگوں کو روسی بنانے کے لئے مختلف اصول اور طریقے برتنا شروع کر دیئے تھے۔ بولشویک مذہب کے دشمن تو ہیں ہی، اس لئے انہوں نے یہاں سے اسلام کا نام مٹانے کے لئے سر سے پاؤں تک زور لگا رکھا ہے۔ روسی زبان کا ان لوگوں میں رواج دینا ان کا اصلی مقصد ہے۔ ترکستانی زبانوں کو روسی حرفوں میں لکھنے کے لئے قانون بنا دیا ہے۔ حالانکہ شروع میں رومن حرفوں کو رواج دینا چاہا تھا، لیکن جب ترکی میں رومن حرف جاری ہو گئے تو روس میں ان کو بدل کر روسی حرفوں کے جاری کرنے کا حکم دے دیا گیا تا کہ روس کے مسلمان جو ترکی نسل کے ہیں، ترکی میں رہنے والے ترکوں سے کوئی رابطہ پیدا نہ کر سکیں۔ ترکستان میں مذہبی تعلیم بالکل بند کر دی گئی ہے۔ ترکستانی تاریخ کو بالکل ادل بدل کر کے لکھ دیا گیا ہے۔ روسی مہاجر بڑی تعداد میں ترکستان میں اور وسط ایشیا کے دیگر علاقوں میں بسا دیئے گئے ہیں، اور ملک میں اچھی پوزیشن بنانے اور دیسی لوگوں پر برتری حاصل کرنے کے لئے، ان کو طرح طرح کی مدد دی جاتی ہے۔ ترکستانی لوگ جو نسبتاً غریب اور ان پڑھ ہیں ان روسی مہاجروں کی بستیوں کے اندر جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ، رسم و رواج اور روایتوں کو بالکل بھول چکے ہیں۔

تاشقند میں ایک مشرقی یونیورسٹی سی تھی جہاں مختلف اقوام کے نوجوانوں کو اس وقت کمیونزم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ تو نام کی ایک یونیورسٹی تھی۔ اصل میں تو یہ ایک پروپاگنڈا کا سکول تھا۔ جہاں روسی زبان بھی سکھائی جاتی تھی اور مختلف ملکوں کے نوجوانوں کو کمیونسٹ بنا کر خفیہ طور پر ان کے ملکوں میں روسی اور کمیونسٹ پروپاگنڈا کرنے اور انقلابی خیالات پھیلانے کو بھیجا جاتا تھا۔ یہاں ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان آئے ہوئے، اور پھر وہاں کے حالات سے بددل ہو کر روس پہنچے ہوئے بعض مسلمان نوجوان بھی تھے۔ جن کو ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب کرانے کے لئے تعلیم دی جا رہی تھی۔ یہاں ہمارے کوہاٹی ساتھیوں میں سے ہمیں فقیر شاہ ملا جو دوسرے مہاجروں کے ساتھ روس چلا گیا تھا۔ وہ روسی ہوا بازی کے سکول میں داخل ہو گیا تھا اور فوجی ہوا بازی کی تعلیم لے رہا تھا۔ وہ ایک سال بعد ماسکو گیا تا کہ وہاں ہوا بازی کے اونچے سکول میں تعلیم پا کر معلم بنے۔ اس کو ماسکو میں کہا گیا کہ جب تک وہ کمیونسٹ نہ بن جائے گا اس کو زیادہ ہوا بازی نہ سکھائی جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعد میں یہ شرط قبول کر لی اور وہ اپنی تعلیم پوری کر کے روسی فوج میں ہوا بازی کا معلم بن گیا تھا۔ میں اس سے سنہ ۱۹۲۴ء کے شروع میں بھی ماسکو میں ملا تھا۔

ماسکو کو روانگی

تاشقند میں ایک دن ٹھہرنے کے بعد ہم ماسکو کی طرف روانہ ہوئے۔ اس ریل میں بھی کھانے کی گاڑی موجود نہ تھی۔ اس لئے ہمیں کھانا دستیاب کرنے میں دقت ہوتی تھی اسٹیشنوں پر ابلتا ہوا پانی مفت ملتا تھا جس سے ہم چائے بنا لیتے تھے۔ اور باجرے کی سیاہ روٹی خرید کر اس کو چھابڑی والوں کے بیچے ہوئے گھوڑے کے گوشت کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ ہماری خوراک کا خرچ اور ریل کا کرایہ روسی گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ کیونکہ ہم ہندوستانی انقلابی ہونے کی وجہ سے روسی گورنمنٹ کے مہمان مانے گئے تھے۔ راستے میں ریل کی پٹڑی کے دونوں طرف جہاں تک نظر کام کر سکتی تھی، برف ہی برف دکھائی دیتی تھی۔ ہوا اور آندھی کی لائی ہوئی برف سے ریلوے لائن کے اٹ جانے اور برف کے نیچے دب جانے کے ڈر سے لائن کے شمال کی طرف اکثر جگہوں پر تختوں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس باڑ کے پیچھے برف کے تودے جمع ہو گئے تھے۔ سارا منظر بہت ہی بھیانک اور ڈراؤنا تھا۔ راستے میں آبادیاں بہت کم

تھیں۔ جو چھوٹے چھوٹے گاؤں راستے میں تھے ان کی چھتیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور صرف کہیں کہیں وہ دھبے کی مانند نظر آتی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں نہ کوئی آدم ہے اور نہ کوئی آدم زاد! ریل کی پٹری پر سے برف صاف کرنے کے لئے خاص انتظامات کی ضرورت تھی۔

ہم ایک ہفتہ بعد، ۱۰ نومبر کو عصر کے وقت ماسکو پہنچے۔ ہم کو لکس ہوٹل (Lux Hotel) میں ٹھہرایا گیا۔ اس زمانے میں ماسکو میں ہر چیز کی قلت تھی۔ رہائش کے لئے مکان بہت مشکل سے ملتے تھے۔ ہر کام کا انتظام گورنمنٹ کے ہاتھوں میں تھا۔ کرایہ پر گھر ملنا ناممکن تھا۔ کیونکہ گھر لوگوں کی ملکیت میں نہ تھے۔ سب گورنمنٹ کا مال سمجھے جاتے تھے۔ اس کے سوا گھروں کی کمی کا یہ حال تھا کہ ایک کمرے میں ایک خاندان رہنے پر مجبور تھا۔ اس لئے ایک گھر میں کئی ایک خاندان بسے پڑے تھے، جن کا باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ مشترک ہوتا تھا۔ لکس ہوٹل میں پردیسی کمیونسٹ اور بعض غیر ملکی قوم پرست جو روسی گورنمنٹ کے مہمان تھے رہتے تھے۔ ان کے سوا روسی کمیونسٹوں کے بارسوخ لیڈروں میں سے بعض لوگ بھی یہاں مقیم تھے۔ روسی صوبوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے نمائندے جب کام پر ماسکو آتے تھے تو اکثر اوقات اسی ہوٹل میں اترتے تھے۔

اس ہوٹل میں ہم سب کو ایک بڑا کمرہ دیا گیا، جس میں ہاتھ منہ دھونے کا انتظام تو تھا لیکن اس کے اندر کوئی غسل خانہ نہ تھا۔ یہاں آنے پر رحمت علی زکریا کو بھی ہمارے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح ہماری تعداد پھر دس ہو گئی تھی۔ جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھا گیا ہے، رحمت علی زکریا کابل سے عبدالرزاق کے ساتھ بھاگ کر مزار شریف چلا گیا تھا۔ یہاں سے عبدالرزاق تو کابل واپس آگیا تھا لیکن رحمت علی ایسا منچلا نوجوان تھا کہ اس نے پھر افغانوں کی نظر بندی میں پڑنا منظور نہ کیا اور وہ وہاں سے روس میں داخل ہو گیا تھا۔ بعد میں تحریک ہجرت کے سلسلہ میں ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالحمید بھی دوسرے مہاجرین کے ساتھ تاشقند پہنچ گیا تھا اور وہاں زکریا کے ساتھ مشرقی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا۔ افغانستان کے آزاد ہونے پر، امیر امان اللہ خان نے غلام بچہ ولی محمد خان جو سنہ ۱۹۲۹ء میں امیر امان اللہ خان کے سفر یورپ کے وقت کابل میں نائب شاہ ہو کر رہا تھا، اور عبدالہادی خان شاگرد سردار محمود بیگ طرزی کی سرپرستی میں ایک وفد روس، ترکی اور یورپی ملکوں میں بھیجا تھا تاکہ ان ملکوں کے زمہ داروں کو

افغانستان کے مستقل ہونے کی خبر دیں اور ان سے سفارتی تعلقات قائم کریں۔ قبلہ مولانا صاحب نے عزیز احمد کو بھی اس وفد میں شامل کرا دیا تھا۔ وہ تاشقند پہنچا تو اس کو روسی گورنمنٹ نے دوسرے ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ مشرقی یونیورسٹی میں داخل کر دیا تھا۔ بعد میں جب یہ یونیورسٹی ماسکو منتقل کر دی گئی تو وہ رحمت علی زکریا اور عبدالحمید کے ساتھ ماسکو چلا گیا تھا۔ وہاں سے عزیز احمد تو عبدالہادی خان کے وفد کی واپسی پر کابل لوٹ آیا تھا، اور اب ہمارے قافلے میں قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ پھر ماسکو پہنچا تھا۔ عبدالحمید ماسکو کی (Communist Unversity of Eastern Toilers) (مشرقی مزدوروں کی کمیونسٹ یونیورسٹی) میں جو تاشقند کی مشرقی یونیورسٹی سے تعلیم کے لحاظ سے ذرا بلند پایہ تھی داخل ہو کر اس کے ہوسٹل میں رہنے لگا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ لکس ہوٹل میں نہیں رکھا گیا تھا۔

اس ہوٹل میں رہنے والوں کو ایک شناختی کاغذ (Indentity card) دیا جاتا تھا جس پر اس کا نام اور فوٹو اور ہوٹل میں آنے کی تاریخ لکھی ہوتی تھی، اور ہوٹل کی مہر لگی ہوتی تھی۔ ہوٹل میں داخل ہوتے وقت ہوٹل میں مقیم ہر شخص اپنا کارڈ ہوٹل کلرک کو دکھلانے پر مجبور تھا۔ اگر کوئی شخص باہر سے ہوٹل میں مقیم کسی شخص سے ملنے آئے تو پہلے اپنا نام اور پتہ ہوٹل کلرک کو لکھوا کر، جس شخص سے ہوٹل میں ملنا چاہتا تھا اس کا نام کلرک کو بتاتا تھا۔ کلرک ہوٹل میں مقیم لوگوں کی فہرست سے یہ نام ڈھونڈ کر اس شخص کو ٹیلیفون کرتا تھا اور اس کو ملنے کی آرزو رکھنے والے شخص کا نام بتاتا تھا۔ اگر ہوٹل میں مقیم مہمان اس ملاقاتی سے ملنا چاہے تو کلرک کو کہہ دیتا تھا کہ آنے والے کو اوپر اس کے کمرہ میں بھیج دیا جائے۔ تب ملاقاتی اپنا شناختی کارڈ کلرک کو دکھا کر ایک Entry Permit یعنی ہوٹل میں داخلے کا اجازت نامہ جس کو روسی زبان میں پروپسکا (Propuska) کہتے ہیں، لینے پر اور اپنا شناختی کارڈ ہوٹل کلرک کے پاس چھوڑنے پر مجبور تھا۔ اس اجازت نامہ پر ملاقاتی کے ہوٹل میں داخل ہونے کا وقت درج کیا جاتا تھا اور اس کے بعد اس کو ہوٹل میں اوپر جانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ ملاقاتی اپنے واقف سے مل کر اور بات چیت کرنے کے بعد اس سے جب جدا ہوتا تھا تو اپنے Propuska پر اس کے دستخط لے کر اس کے کمرے سے جدا ہونے کا وقت لکھواتا تھا۔ نیچے اتر کر ملاقاتی اس Propuska کو ہوٹل کلرک کو دے کر اپنا شناختی کارڈ اس سے واپس لے لیتا۔ یہ قاعدہ سارے سرکاری دفتروں میں بھی جاری تھا۔ روس میں رہنے والا ہر شخص ہر وقت اپنی جیب میں اپنا شناختی کارڈ

رکھنے پر مجبور ہے۔ پولیس دن رات جب چاہے راستے میں چلنے والے لوگوں کو گھیر کر ان کے شناختی کاغذوں کی پڑتال کر سکتی تھی۔ اگر کسی کا شناختی کاغذ اتفاق سے اس وقت اس کے پاس نہ ہو یا اس پر پولیس کو کسی قسم کا شبہ ہو تو شناختی کاغذ ہونے کے باوجود اس کو فوراً جیل بھیج دیتی تھی۔ میں نے اس کے بعد سنہ ۱۹۳۲ و ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں جب روس کا پھر سفر کیا تو اس وقت بھی اسی قاعدے کو جاری دیکھا۔ کہتے ہیں کہ اب بھی یہ قاعدہ جاری ہے۔

۱۹۲۲ء میں تو معذرت کے طور پر کہا جاتا تھا کہ روسی انقلاب کو ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور حکومت کو قدامت پسندوں کی تحریک (Reactionary Movement) کا ڈر ہے اور ملک میں ابھی امن وامان پوری طرح قائم نہیں ہوا ہے۔ اس لئے حکومت نے اس قسم کی سخت پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ لیکن سنہ ۱۹۳۷ء تک روسی انقلاب پر بیس سال گزرنے کے باوجود اس قسم کی سختیوں کا لگا رہنا، حکومت کے اپنے لوگوں سے ڈرنے اور ان پر شبہ کرنے کی دلیل ہے۔ اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بولشویکی نظام لوگوں میں ہر دل عزیز نہیں تھا، بلکہ جبراً ان سے منوایا گیا تھا۔

ماسکو میں رہنے والے ہندوستانی

جس روز ہم ماسکو پہنچے تو وہاں رہنے والے ہندوستانی ہمارے ہوٹل میں ہم سے ملنے آئے۔ ان میں ہمارا کالج کا دوست عبدالحمید بھی تھا۔ وہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے Communist university of eastern toilers- یا خلاصتہً Eastern univers ity میں پڑھ رہا تھا اور اسی کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ ہم سے ملنے والے ہندوستانیوں میں عبدالوارث بٹ بھی تھا۔ یہ نوجوان بھی ہجرت کی تحریک کے سلسلہ میں کابل آیا تھا اور وہاں سے جبل السراج (واقع افغانستان) جو مہاجرین کی قیام گاہ تھی، گیا تھا لیکن وہاں کے حالات پر صبر نہ کر سکا، اور ایک قافلہ مہاجرین میں شامل ہو کر جس کے ممبروں کی تعداد اسی نوے تھی اور جس میں محمد اکبر خان ہزاروی، فضل الٰہی قربان، شوکت علی عثمانی وغیرہ بھی داخل تھے، افغانی ترکستان اور روس کے راستہ ترکی جانے کو افغانستان سے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ قافلہ بڑی دقتوں سے روسی علاقے میں داخل ہوا تھا۔ یہاں بولشویکی روسیوں کے برخلاف لڑنے والے ترکستانیوں نے،

جن کو (باصماچی) کہا جاتا تھا، اس قافلے پر حملہ کر کے اس کا سارا سامان لوٹ لیا اور ان کو قید کر دیا تھا۔ بعد میں روسیوں نے گولہ باری کر کے باصماچیوں کو بھگا دیا اور اس قافلے کے افراد کو چھڑا لیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کرکی (کرشی یا قرشی) میں رہے۔ یہاں سے یہ قافلہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک حصہ جس میں عبدالوارث تھا، ترکی جانے کے لئے باکو کی طرف روانہ ہوا، دوسرا حصہ تاشقند چلا گیا۔ ترکی جانے والے لوگ باکو سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس لئے وہاں سے تاشقند آ کر پھر کابل واپس آ گئے۔ کابل سے عبدالوارث کے سوا دوسرے لوگ ہندوستان لوٹ گئے۔ عبدالوارث نے کابل میں جمال پاشا مرحوم کے ادارہ ترجمہ میں، جو اقبال شیدائی کے ماتحت قائم ہوا تھا، کام کرنا شروع کیا۔ جس وقت جمال پاشا کابل چھوڑ کر ماسکو روانہ ہوئے تو عبدالوارث مولانا برکت اللہ بھوپالی کے ساتھ، جو راجہ مہندر پرتاپ کے ترکی۔ جرمن وفد سے علیحدہ ہو کر اس وفد کے کابل سے واپس جرمنی جانے پر افغانستان میں رہ پڑے تھے اور اب روس جا رہے تھے، ماسکو چلا گیا تھا۔ وہ وہاں کچھ عرصہ ان کی خدمت میں مصروف رہا۔ لیکن انور پاشا کی شہادت پر جب مولانا برکت اللہ روس سے جرمنی اور وہاں سے سوئٹزرلینڈ جانے لگے تو وہ عبدالوارث کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی باضابطہ پاسپورٹ نہ تھا۔ اس کے بعد عبدالوارث ماسکو کی مشرقی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا۔

لکس ہوٹل میں ہم سے ملنے کو آنے والے لوگوں میں فضل الٰہی قربان اور صفدر دو لڑکے بھی تھے جو مشرقی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ہندوستان میں ان کی تعلیم شاید مڈل سکول تک ہی تھی۔ انہوں نے چند ایک کمیونسٹ اصول اور نظریے طوطے کی طرح یاد کر لئے تھے جن کو وہ ہمیشہ رٹتے رہتے تھے۔ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی تھے۔ فضل الٰہی قربان، صفدر سے زیادہ سمجھ دار تھا اور اس کی تعلیم غالباً صفدر سے زیادہ تھی۔

رات کو ہم بازار کی سیر کرنے کے لئے ہوٹل سے نکلا کرتے تھے۔ ماسکو میں برف ہمارے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے ہی پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ شہر میں اس وقت برف صاف کرنے کا کوئی اچھا انتظام نہ تھا۔ اس لئے برف چلنے پھرنے والوں کے پیروں کے نیچے دب دب کر پتھر کی طرح سخت (یخ) ہو گئی تھی جس پر چلنا سخت دشوار تھا۔ کیونکہ چمڑے کے جوتے کے تلوے اس پر سے بہت پھسلتے تھے۔ شروع میں ایک دو دن ہم گلی میں تین چار قدم کے بعد پھسل کر گر پڑتے تھے، جس سے ٹانگ ٹوٹنے کا اندیشہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے ہم نے ماسکو میں رہنے والے ہندوستانیوں

کے ساتھ، جن کو یخ پر چلنے کی مشق تھی، بازاروں میں ٹہلنا مناسب سمجھا تھا۔ ہم ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سنبھل سنبھل کر چلا کرتے تھے۔ روسی لوگ چمڑے کے بوٹوں کی بجائے اونی نمدے کے لمبے لمبے بوٹ پہنا کرتے ہیں، جو ٹانگوں کو گرم رکھتے ہیں اور یخ پر پھسلنے نہیں دیتے۔ روسیوں کی ٹوپیاں بھی سمور کی ہوتی ہیں جن میں کانوں، پیشانی اور گردن کو ڈھانپنے کے لئے سمور کے ٹکڑے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس شروع میں چونکہ نہ نمدے کے بوٹ اور نہ سمور دار ٹوپیاں تھیں، اس لئے ہم کو سردی میں کافی تکلیف پہنچی۔ ماسکو پہنچنے کے دو دن بعد میں نے اور ڈاکٹر نور محمد نے ماسکو کے ایک پارک میں، ایک چلتے پھرتے فوٹو گرافر سے اپنا فوٹو اتروایا۔ اپنی ہیئت کذائی کو دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی تھی۔

ہمارے ماسکو پہنچنے کے دوسرے دن ہم ہوٹل لکس کے طعام خانے میں کھانا کھانے گئے۔ کھانے کی فہرست میں پلاؤ درج تھا۔ ہم نے کابل سے نکلنے کے بعد راستے میں کہیں بھی اچھا پلاؤ نہ کھایا تھا۔ اس لئے فہرست میں پلاؤ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بیرے کو پلاؤ لانے کو کہا۔ لیکن جو کھانا ہمارے لئے پلاؤ کے نام سے آیا وہ کھچڑی کی مانند تھا۔ اس کی مقدار بھی بہت کم تھی اور اس میں مرغ کا ایک بازو تھا جس پر گوشت بہت کم تھا۔ روسی جس کو بڑے فخر کے ساتھ پلاؤ کہتے تھے وہ ہمارے ہاں کی کھچڑی سے بھی بدمزہ تھا۔ ہمیں ناحق اس کھانے کی مہنگی قیمت ادا کرنا پڑی اور بھوکے بھی رہے۔ روٹی یہاں بھی جوار کی تھی جس کا رنگ سیاہ تھی۔ دوسرا کھانا گھوڑے کے گوشت کا ایک ٹکڑا تھا جس کو پانی میں ابال کر کچھ مسالے کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔

تیرھواں باب

ماسکو یونیورسٹی میں میرا داخلہ

ماسکو آنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد روسی حکام اور بنگالی ایم۔ این رائے نے جس کا اصلی نام نریندر ناتھ بھٹا چاریہ تھا اور جو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا پریذیڈنٹ مانا جاتا تھا، خوشی محمد (محمد علی) کے ذریعے ہمارے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے چند ایک نوجوان مشرقی یونیورسٹی ماسکو میں تعلیم پانے کو داخل ہوں۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ چند ایک کالجیٹ طالب علموں کو اپنے پراپاگنڈے اور تعلیم کے ذریعے کمیونسٹ بنائیں۔ ابھی تک روسیوں کے ہاتھ ایسے کام کے لئے ہندوستانیوں میں سے جو آدمی پڑے تھے ان میں سے اکثر کم تعلیم یافتہ تھے (عبدالحمید، رحمت علی اور خوشی محمد اس سے مستثنٰی ہیں کیونکہ وہ کالجوں میں پڑھ چکے تھے۔) اس پر قبلہ مولانا صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعہ کمیونسٹوں کے اصول تعلیم اور کمیونزم کے بنیادی عقائد کا پتہ لگائیں۔ تاکہ آزاد ہندوستان میں ایسا نظام قائم کر سکیں جو کمیونزم کا توڑ ہو اور ہندوستان کے عوام اس نظام سے ایسے خوش حال بنیں کہ کمیونزم کے پروپاگنڈے پر کان نہ دھریں اور اس کے پھندے میں نہ پھنسیں۔ اس کے علاوہ ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ کمیونزم جو مذہب کا دشمن ہے، اس سے ہندوستان میں اپنے مذہب کو بچانے کے لئے کچھ تدبیریں سوچیں۔ نیز اس بارے میں بھی اپنی واقفیت بڑھائیں کہ کمیونسٹوں سے، انگریزی سامراج کو نیست و نابود کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے میں مدد لینے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

بنیر جی خود اپنی مرضی سے اس یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ اس کا مقصد کمیونزم کے اصولوں کو ٹھیک طور پر سمجھ کر اس سے ہندوازم کو بچانے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔ تیسرا شخص عبدالعزیز تھا جو

یہاں تعلیم پانے پر لگایا گیا تھا۔ لیکن سردی کے موسم میں اس کی صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ باقاعدہ تعلیم نہ پا سکا۔

اس پر ہم تینوں کو لکس ہوٹل سے یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دیا گیا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس لکس ہوٹل سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور اسی سڑک پر واقع تھا جس پر ہوٹل تھا۔ تعلیم کے لئے جو عمارت تھی وہ بھی بورڈنگ ہاؤس کی عمارت کے نزدیک اسی سڑک کے دوسرے کنارے پر چوک میں تھی۔ دونوں عمارتیں پرانے زمانے کی تین منزلہ اور اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ یہ عمارتیں پتھر کی تھیں۔ یہاں سردی کے موسم میں کمروں کو گرم کرنے کے لئے بخاری کی بجائے Central heating کا انتظام تھا۔ اس کے لئے نیچے کی منزل میں ایک بڑا بائلر Boiler لگا ہوا تھا۔ جس میں پتھر کے کوئلے سے پانی گرم کیا جاتا تھا اور یہ گرم پانی نلوں کے ذریعے کمروں میں لگے ہوئے Radiators میں آتا تھا، جس سے کمروں کی ہوا کی حرارت بڑھ جاتی تھی۔ ماسکو کی سب بڑی بڑی عمارتیں اور ہوٹل اسی اصول سے گرم کئے جاتے تھے، لیکن چھوٹی عمارتوں میں اس مہنگے اصول کی بجائے چینی کی بڑی بڑی بخاریاں (یا انگیٹھیاں) دیوار کے کنارے ایک کونے میں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ ایک دفعہ جب لکڑیاں ان کے اندر بھر کر جلا دی جائیں تو آہستہ آہستہ بخاریوں کی دیواروں کو جو آس پاس کے کمروں کی بھی دیواریں ہوتی ہیں، گرم کر دیتی ہیں اور اس طرح ان کمروں کی ہوا اتنی گرم ہو جاتی ہے کہ ان کے اندر آرام سے رہائش ہو سکتی ہے۔ یہ حرارت کمروں میں ۲۴ گھنٹے قائم رہ سکتی ہے۔ اگلے روز بخاری میں پھر لکڑیاں بھر کر آگ سلگا دی جاتی ہے۔ لکڑیوں کے آہستہ آہستہ جلنے کا انتظام کرنے کے لئے بخاری کی چمنی میں ایک ڈھکنا لگا ہوتا ہے جس کو کھلا رکھ کر یا بند کر کے بخاری کی لکڑیوں کا زیادہ یا کم جلنے اور اس طرح کمروں کی حرارت کو بڑھانے یا گھٹانے کا امکان ہو سکتا ہے۔ چمنی کی دیواریں حرارت کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ چمنی کی دیواروں کی بیرونی سطح پر چینی کی پتلی پتلی اینٹیں (Tiles) لگی ہوتی ہیں جو حرارت کو کمرے میں اچھی طرح نشر کرتی ہیں اور کمروں کی خوبصورتی کو بھی بڑھاتی ہیں۔ اس قسم کی بخاریوں (انگیٹھیوں) کو روسی زبان میں پیچکا .Pechka یا پیچ Pech کہا جاتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں ماسکو کی ایسٹرن یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کے بارے میں کچھ لکھوں، مناسب سمجھتا ہوں کہ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا کچھ خاکہ کھینچوں۔ بورڈنگ ہاؤس کی جس Dormitory میں ہمیں جگہ دی گئی تھی وہ اس عمارت کے بیچ کی منزل میں تھی۔ یہاں ایک

بڑا ہال اور دو چھوٹے کمرے تھے۔ چھوٹے کمرے بھی ڈارمیٹری کا کام دیتے تھے۔ ان میں بھی پانچ پانچ چھ چھ طالب علم رہتے تھے۔ اس ساری منزل میں تقریباً ۴۰ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس منزل میں ایک طرف ہاتھ منہ دھونے کی جگہ اور اس سے ذرا آگے رفع حاجت کے لئے انتظام تھا، لیکن درمیان میں نہ کوئی دیوار تھی اور نہ کوئی پردہ تھا اور نہ دروازہ موجود تھا۔ اور خلوت کا کوئی انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں تو قضائے حاجت کے لئے نیچے کی منزل میں جو نوکروں کے لئے تھی اور جہاں تنہائی اور پردہ ایک حد تک ممکن تھے، چلا جایا کرتا تھا۔ اس بورڈنگ ہاؤس میں استنجا کرنے یا غسل کرنے کا بھی انتظام نہ تھا۔ غسل کرنے کے لئے جب ہم کو یونیورسٹی کی طرف سے ٹکٹ ملتا تو عام حمام میں جانا پڑتا تھا جہاں لوگ بالکل مادر زاد ننگے نہایا کرتے ہیں۔ میں تو دھوتی کے طور پر ایک کپڑا اپنی کمر میں باندھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے باقی نہانے والے مجھے بڑی حیرانی سے دیکھا کرتے تھے۔ چونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ مجھے کوئی جنسی بیماری (Venereal disease) لگی ہوئی ہے۔ صرف وہ لوگ جن کو ایسا مرض ہو روس میں اس طرح دھوتی باندھ کر عام حمام میں غسل کیا کرتے تھے۔

ہماری جماعت میں امریکہ سے خفیہ طور پر روس آیا ہوا ایک کنوارا امریکی یہودی اور ایک شادی شدہ یہودی اور اس کی بیوی بھی شامل تھے اور چند ایک چینی طالب علم بھی تھے۔ قربان، صفدر، وارث اور عبدالحمید جیسے ہندوستانی جو پہلے سے ماسکو میں تھے اور مدت سے اس یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے، ان کی روسی زبان کی قابلیت ہم سے زیادہ تھی۔ اس لئے ان کو ایک علیحدہ جماعت میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ہماری جماعت کو انگریزی میں سبق پڑھانے اور لکچر دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

بورڈنگ ہاؤس میں کچھ مدت رہنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ تیسری منزل پر ترکی اور ایرانی طالب علم بھی رہتے ہیں جن میں سے بعض اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور حقیقی کمیونسٹ تھے۔ مثلاً ان میں سے ترکی طالب علم ناظم حکمت اور نورالدین والا سے بعد میں میری واقفیت ہو گئی تھی۔ ناظم حکمت شاعر بھی تھا اور بڑا کٹر کمیونسٹ تھا۔ بعد میں میں نے اس کو ایک دفعہ استانبول میں بھی دیکھا تھا۔ لیکن جب ترکی میں کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو وہ بھاگ کر بلغاریہ اور روس وغیرہ کمیونسٹ ملکوں میں چلا گیا تھا۔ وہاں بہت دھکے کھاتا رہا اور روسیوں

کے ہاتھ میں کھلونا بنا رہا۔ آخر کار ۱۹۶۳ء میں بیمار ہو کر مر گیا۔ روسیوں نے اس کو ترکی کے برخلاف پروپاگنڈا کرنے کے لئے ایک کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ نورالدین والا معلوم ہوتا ہے کہ ترکی واپس آنے پر کمیونزم سے منحرف ہو گیا، اور آج کل اخبار نویسی کرتا ہے۔ مگر روس کی محبت ابھی تک اس کے دل میں جاگزیں معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بعد میں جب میں سنہ ۱۹۳۳ء میں روس کے راستے افغانستان گیا اور پھر سنہ ۱۹۳۷ء میں ترکی آیا اور استانبول میں اتفاق سے ایک روز راستے میں اس سے ملا تو اس نے روس کے بارے میں مجھ سے باتیں پوچھیں اور روس کے متعلق میری رائے سے اتفاق نہ کر کے، روس کو سراہا۔

بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے کمروں میں کوریا، منگولیا اور مشرقی روس کے علاقوں کے (ترکستان وغیرہ کے) طالب علم رہا کرتے تھے۔ طالب علموں کے کھانے کے کمرے اور باورچی خانہ یونیورسٹی کی دوسری عمارت میں نیچے کی منزل میں تھے۔ اس عمارت کی بیچ کی منزل میں سبق کے کمرے (لیکچر روم) اور لائبریری وغیرہ تھی۔ باورچی خانہ میں ہمیں باری باری ۲۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یہاں ترکاریاں صاف کرنا، گوشت کاٹنا، میز لگانا، آرے سے لکڑیاں چیرنا، کھانے کے بعد برتن دھونا اور ایسے ہی دوسرے کاموں میں نوکروں کو مدد دینا ہوتی تھی۔ چند ایک روسی باورچی اور ان کے ساتھ چند ایک خدمت گار عورتیں بھی باورچی خانہ میں نوکر تھیں۔ باورچی خانہ میں اس طرح خدمت کرنا مجھ پر بہت گراں گزرتا تھا۔ کیونکہ میں اس سے پہلے افغانستان میں اپنے لئے ایک پوزیشن بنا چکا تھا، جہاں مجھے اچھی خاصی عزت حاصل تھی اور ایسے کاموں کے لئے میرے پاس نوکر موجود تھے۔ میں یہاں ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا جن کی تعلیم و تربیت بہت ناقص اور جن کا چلن بہت گرا ہوا تھا۔ ان امریکن یہودی طالب علموں کی بدتمیزی کے ایک واقعہ کا یہاں ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا۔

ایک روز عبدالوارث نے کہیں سے کچھ مسالے حاصل کئے اور ہم نے اس سے بھنا ہوا گوشت تیار کیا جس میں سے کچھ بوٹیاں ان امریکیوں کو بھی دیں۔ جب مرچوں سے ان کے منہ جلے تو انہوں نے ہمیں برا بھلا کہنا شروع کیا، اور کہا "کہ مہذب آدمی ایسا کھانا نہیں کھاتے ہیں"۔ ہمیں اس پر غصہ تو آیا لیکن ہم نے خاموشی اختیار کی۔ چند روز کے بعد ہم نے پھر اسی طرح پر گوشت پکایا۔ مسالے کی خوشبو سے یہ امریکن لڑکے ہمارے ارد گرد پھرنے لگے اور آخر کار صبر نہ کر سکے، اور ہمارے ہاتھ سے گوشت چھین کر کھانے لگے۔ باوجودیکہ ان کی آنکھوں

سے آنسو بہہ رہے تھے، انہوں نے اس گوشت کو کھانے سے ہاتھ نہ کھینچا۔

مشرقی یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

ہمیں اس یونیورسٹی میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے تھے۔

۱ مختلف یورپین ملکوں کی مزدور تحریکوں (Labour movements) کی تاریخ۔ اس سلسلے میں روسی مزدوروں کی تحریک کے مفصل حالات۔

۲ مختلف یورپی ملکوں کی ٹریڈ یونینوں کی تحریک۔ اس مضمون کی تعلیم کی اثنا میں یہ بات کہ یوروپی ٹریڈ یونینوں کے لیڈر مزدوروں کی حمایت کرنے کی بجائے وہاں کے سرمایہ داروں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے مزدوروں سے غداری کر رہے ہیں، خاص طور پر واضح کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں یورپ کی مختلف سوشلسٹ پارٹیوں پر بھی لے دے ہوا کرتی تھی۔

۳ روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ اور اس کا روس میں مزدوروں کی مطلق العنان حکومت (Dictatorship of the proletariate) قائم کرنا۔

۴ پہلی، دوسری اور تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تحریک کی تاریخ۔

۵ کارل مارکس کی کتاب کیپٹل میں مندرج کمیونسٹ عقائد اور اصولوں کی تعلیم اور لامذہبیت کی تلقین۔

ان سبقوں کے پڑھانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ طالب علموں کو کمیونزم کا گرویدہ بنایا جائے، اور جب وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں تو وہاں روسی اصولوں پر ٹریڈ یونین بنانے کا کام کریں۔ کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈالیں اور جب موقع ملے تو ہڑتالوں اور سازشوں کے ذریعہ انقلاب پیدا کر کے ملکی حکومت کا تختہ الٹیں۔ ملک کے سارے اداروں پر قبضہ کر کے روسی طریقہ پر مزدوروں کی مطلق العنان حکومت قائم کریں، اور اس حکومت کو روسی کمیونسٹ حکومت میں مدغم کر دیں۔

کتاب کیپٹل Capital اور لامذہبیت کی تعلیم

مشرقی یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کے کمیونسٹ عقائد اور

اصولوں کی تعلیم ہمارے لئے سب سے زیادہ مضر تھی۔ اس لئے اس کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے میں یہاں کارل مارکس کے عقیدوں پر ذرا مفصل بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کارل مارکس ایک جرمن یہودی نژاد سوشلسٹ تھا جو سنہ ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں لندن میں مرا۔ دنیا میں اس نے سب سے پہلے کیمونزم کا نظریہ باقاعدہ طور پر پیش کیا۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "ذرائع پیداوار یعنی زمین، کارخانے، دھات کی کانیں نیز آمدورفت کے ذرائع غرض جو چیزیں بھی دولت پیدا کرنے میں ایک واسطہ ہو سکتی ہیں، وہ کسی ایک شخص یا کمپنی کا مال نہیں ہو سکتیں، اور اس کی ملکیت نہیں مانی جا سکتی۔ ان ذرائع کی مالک، ان سے دولت اور ثروت پیدا کرنے والی معاشی جماعت (سنگت) جس کو انگریزی میں Social class کہتے ہیں، ہونی چاہئے۔ یا اس کلاس کی نمائندہ حکومت کا ان ذرائع پر قبضہ اور قابو ہونا چاہئے۔ زمین نہ کسان کی اور نہ زمیندار کی ملکیت ہو، بلکہ حکومت کا مال ہونا چاہئے۔ کارخانوں، کانوں اور ذرائع آمدورفت کو، وہاں کام کرنے والے مزدوروں کا مال سمجھا جانا چاہئے۔ کیونکہ وہ خام اشیاء سے مصنوعات پیدا کرتے ہیں اور خام اجناس اور مصنوعات کی قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ مزدوروں کی ان کاموں میں لگائی ہوئی محنت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مصنوعات کی فروخت سے جو نفع حاصل ہوتا ہے، وہ انہی کی محنت کا پھل ہے اور اس لئے انہی کو ملنا چاہئے۔ کارخانوں کے مالک طفیلی اور مفت خور ہیں، جو مزدوروں کی محنت کا ثمرہ اسی طرح کھاتے ہیں جس طرح ایک جونک انسان کے جسم سے اس کا خون چوس لیا کرتی ہے"۔

کارل مارکس کے اس نظریہ کے مطابق جب دولت، اس کو پیدا کرنے والے مزدوروں اور کسانوں ہی کی ہے تو حکومت بھی انہی کے نمائندوں کی کونسلوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ جن کو روس میں سوویٹ soviet کہا جاتا ہے۔ مزدور اور کسانوں کو ملکی حکومت اپنے قبضے میں لینے کے لئے قانونی چارہ جوئی (Constitutional means) کی بجائے خونی انقلاب کے ذریعہ، ملک میں قائم شدہ تنظیم کا تختہ الٹ دینا چاہئے۔

روسی مزدوروں کے لیڈر لینن (Lenin) اور ٹراسکی (Trotski) نے کارل مارکس کے ان نظریوں کو اپنا کر، خفیہ طریقے سے روس میں کیمونسٹ پارٹی قائم کی اور سنہ ۱۹۰۵ء میں

روس جاپان کی لڑائی سے فائدہ اٹھا کر زار روس کے خلاف بغاوت کرائی تھی۔ مگر یہ بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد روسی کمیونسٹ پارٹی میں اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔ پارٹی کا وہ حصہ، جو اکثریت میں تھا اور ہمیشہ انقلاب کا حامی سمجھا جاتا تھا، (اس کو بولشویک کہا جاتا تھا) اقلیت میں ہونے والے حصے کو جو قانونی طور پر ملکی حکومت کو اپنے قبضے میں لانے کا طرف دار تھا، مینشویک (Menshevik) کہا کرتے تھے۔ پارٹی کے ان دو حصوں میں اس کے بعد کبھی بھی سمجھوتا نہیں ہوا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب زار کی فوجوں کو مختلف محاذوں پر شکستیں ہوئیں، تو مینشویکوں نے جو بولشویکوں کی نسبت ذرا کم انتہا پسند تھے، لوگوں کی بے اطمینانی اور ناراضگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو زار کی حکومت کے خلاف ابھارا اور سنہ ۱۹۱۷ء میں کرنسکی (Kerens ki) کے زیر قیادت زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور جمہوری حکومت جس میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ زمیندار، کارخانہ دار اور مال دار لوگ بھی شامل تھے، قائم کر کے جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کر دیا اور زار کے خاندان کو قید کر کے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا۔

لیکن ملک میں بے چینی اتنی پھیلی ہوئی تھی اور لوگ جنگ سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ انہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں (جو خفیہ طور پر جرمنی سے روس میں داخل ہو گئے تھے) کرنسکی کی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا اور ماسکو اور سینٹ پیٹرسبرگ (پٹروگراڈ) پر، جس کو اب لینن گراڈ کہتے ہیں قبضہ کر کے سپاہیوں اور مزدوروں کی کونسلیں یعنی سوویٹس (Soviets) بنا دیں، اور ان کے ذریعے ملکی اداروں کو چلانے کی کوشش کی اور جرمنوں سے (Brest Litosk) کے شہر میں علیحدہ صلح کر لی۔ اس طرح پر روس میں کیمونسٹ حکومت قائم ہو گئی۔ یہ حکومت کارل مارکس کے تمام نظریات کو روس میں عملی جامہ پہنا کر ساری دنیا میں مزدوروں کی مطلق العنان حکومت (Dictatorship of The Proletariate) قائم کرنا چاہتی ہے۔

میں ہر روز شام کے وقت، یونیورسٹی کے لیکچر ختم ہونے پر ہوٹل لکس میں جا کر اس روز کے پڑھے ہوئے سبقوں کا خلاصہ قبلہ مولانا صاحب کو سنایا کرتا تھا جس سے ان کو کیمونسٹ نظریوں، کیمونسٹ اصول حکومت، مزدوروں کی تحریک (Labour movement) اور کیمونسٹ انٹرنیشنل یعنی تھرڈ انٹرنیشنل جس کو مختصراً کومینٹرن (Comintern) کہا جاتا تھا، کے بارے میں آہستہ آہستہ کافی سے زیادہ معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ یہ

معلومات ان کے لئے دو سال بعد جب انہوں نے استنبول میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لئے پروگرام بنایا اور آزاد ہندوستانی فیڈرل گورنمنٹ کا خاکہ کھینچ کر اس کو ایک رسالے کی شکل میں استانبول میں سنہ ۱۹۲۴ء میں چھاپ کر خفیہ طور پر ہندوستان بھیجا، بہت مفید ثابت ہوئیں۔ (یہ رسالہ ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے ضبط کر لیا گیا تھا۔ میں اس کا حال آگے چل کر مفصل لکھوں گا)۔

اس سلسلے میں کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو جو اسلامی احکام اور عقائد کے خلاف تھے وہ بھی قبلہ مولانا صاحب پر واضح ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اس مضر تعلیم کی وجہ سے اسلام کے بارے میں جو شک و شبہ اور ذہنی تشویش پیدا ہو سکتی تھی، میں اس کو قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ان سے اس کا شافی اور اطمینان بخش جواب اور صورت حل پوچھ لیا کرتا تھا۔ اس لئے خداوند کریم کے فضل سے میرے ایمان میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا۔

کمیونسٹ اور مذہب

کمیونسٹوں کا مذہب کے بارے میں ایک مشہور مقولہ ہے جو انہوں نے کارل مارکس کی تعلیم سے لیا ہے۔ اس مقولہ کو روسیوں نے ماسکو کے سرخ میدان میں ایک نمایاں جگہ پر کندہ بھی کرا دیا ہے۔ مقولہ یہ ہے "Religion is the opium of the people" (یعنی مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مذہبی عقیدے لوگوں پر ایسی غشی طاری کر دیتے ہیں کہ وہ غاصبوں سے اپنے حقوق طلب کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ مذہب ذاتی ملکیت رکھنے کو جائز قرار دینے کی وجہ سے (کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق) مالداروں کی حمایت کرتا ہے، اور ان کے مال پر غریبوں اور ناداروں کو دست درازی کرنے سے روکتا ہے، اور اس طرح ان لوگوں کو اپنے حقوق طلب کرنے سے منع کرتا ہے۔

قبلہ مولانا صاحب نے اس زہریلے نظریہ کو رد کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اسلامی قانون وراثت، دولت کو صرف چند ایک لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہونے نہیں دیتا۔ زکوٰۃ مالداروں پر ایک ایسا ٹیکس ہے کہ جس کے ذریعے سوسائٹی کے محتاجوں کو مدد دی جاتی ہے۔

ایک روز ہمیں یونیورسٹی میں پڑھایا گیا کہ ذاتی ملکیت کو جو مذہب بھی جائز سمجھے، وہ قدامت

پسند ہے۔ کیونکہ وہ غریبوں کو مال داروں کا غلام بناتا ہے اور ان کا استحصال (Exploitation) کراتا ہے۔ اس لئے ایسے مذہب کا قلع قمع ہونا چاہئے۔

ہندومت میں ذاتی ملکیت کھلم کھلا موجود ہے۔ اس لئے بنیرجی اس سبق کے بعد کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ کیونکہ وہ اب ہندومت کی کبھی تائید اور حمایت نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر اس نے اسلام پر حملہ کرنا چاہا اور اس غرض سے مجھ سے پوچھا: "کیا اسلام ذاتی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔" میں نے جواب دیا: "ہاں دیتا ہے"۔ اس پر اس نے اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینے کو بڑے اطمینان سے کہا: "پھر تو ہم کو ہندوستان سے ہندوازم کے ساتھ اسلام کو بھی مٹا دینا ہو گا"۔

میں اس وقت اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ چونکہ اس سے میرے دل میں اسلام کے متعلق ذرا شبہ پیدا ہو گیا۔ شام کے وقت اپنی عادت کے مطابق ہوٹل لکس جا کر میں قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بنیرجی کا اعتراض اور اسلام پر جو اس نے حملہ کیا تھا اس کو ان کی خدمت میں عرض کیا اور اس کا جواب ان سے پوچھا۔

انہوں نے فرمایا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(عربی) ان اللہ اشتریٰ من المومنین اموالھم وانفسھم بان لھم الجنۃ

یعنی "اللہ نے مومنوں کے مال کو اور ان کی جانوں کو ان سے جنت کے بدلے خرید لیا ہے"۔ اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کو اپنی جان اور ذاتی مال سے دست بردار ہونا پڑے گا، اور ان کو خداوند کریم آخرت میں اس کے عوض جنت دے گا۔ یعنی اسلام میں ذاتی ملکیت کا اصول ضرورت کے وقت بالکل اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب نہیں جس میں ذاتی ملکیت کے اصول کا ہمیشہ قائم رکھا جانا ضروری ہو۔ اگر ضرورت پیش آئے اور زمانے کا حال ایسا ہو جائے کہ اس میں ذاتی ملکیت قائم رکھنے کی وجہ سے مسلمان اپنے مذہب کو اور اپنے ایمان کو خطرے میں دیکھیں، تو ذاتی ملکیت کے اصول سے دست بردار ہو سکتے ہیں، اور اس اصول کو بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام ایک قدامت پسند مذہب نہیں جو مالداروں کو ناداروں کے استحصال کی اجازت دے یا اس کا موقع دے۔

قبلہ مولانا صاحب کی اس تفسیر سے مجھے بہت اطمینان ہوا اور میرا اسلام پر ایمان اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اس سے بنیرجی کو ایک ایسا جواب ملا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔

ایک روز ہمارے پروفیسر نے کہا کہ "سوویٹ نظام حکومت قائم کرتے ہوئے ہمیں سب سے زیادہ مخالفت کسانوں کی طرف سے پیش آئی۔ کیونکہ وہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر رکھنا چاہتے تھے اور زراعتی کومیون (یعنی مشترک ملکیت والی زراعتی کواوپارتیف) بنانا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی مذہب ان کو اس خیال سے ہٹانے کے لئے مذہبی احکام پیش نہیں کرتا۔ اس لئے سارے مذاہب رجعت پسند ہیں۔ لہٰذا صفحہ ہستی سے مٹائے جانے کے لائق ہیں"۔

سبق کے بعد شام کو ہوٹل لکس میں جا کر میں نے پروفیسر کے اس نظریہ کا قبلہ مولانا صاحب سے ذکر کیا اور پوچھا۔ "کیا اسلام بھی زمین کی ملکیت منفرد اشخاص کو دینا چاہتا ہے"۔

اس پر انہوں نے فرمایا کہ "نہیں! اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ایران فتح کیا تو عرب فاتحین نے ایران کی زمینوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر ان پر قبضہ کرنا چاہا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی قوت بازو سے ان کو حاصل کیا تھا۔ لیکن حضرت عمر نے ان کو ایسی اجازت نہ دی اور ساری زمینوں کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور فاتحین کو صرف ان زمینوں کی کاشت کا حق عطا فرمایا"۔

میں نے اگلے روز یونیورسٹی میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا اور اس اسلامی قانون کا ذکر اپنے اسی پروفیسر سے کیا۔ اس پر وہ بہت اچنبھے میں پڑا اور کہنے لگا۔"اگر کوئی شخص ہم کو اسلام کے یہ احکام پہلے بتلاتا، تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا اور ہم کسانوں کو اپنی انقلابی صفوں میں بڑی آسانی سے داخل کر لیتے اور ہماری حکومت ان کی مخالفت سے بچی رہتی"۔

بعض ساتھیوں کے حالات

رحمت علی اور تلاوت قرآن

یونیورسٹی کے سبق کے بعد میں ایک روز شام کو اپنی عادت کے مطابق ہوٹل میں گیا تو وہاں قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ رہنے والوں نے مندرجہ ذیل واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا "کل رات ہم سب ہوٹل کے اس کمرے میں حسب معمول سو گئے تھے کہ آدھی رات کے بعد تقریباً ۳ بجے ایک آواز سے دفعتاً بیدار ہو گئے۔ ہم نے کان لگا کر سننا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص بڑی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کر رہا ہے۔ ہم نے اس کی

آواز سے فوراً پہچان لیا کہ یہ رحمت علی زکریا ہے جو تلاوت قرآن شریف میں مصروف ہے۔ ہم بالکل خاموشی سے سنتے رہے اور ہم نے اس کی تلاوت قرآن میں دخل نہ دیا۔ آخر جب وہ چپ ہو گیا تو ہم نے بجلی جلائی۔ ہم نے دیکھا کہ رحمت علی اپنی چارپائی پر دوزانو بیٹھا ہوا ہے۔ ہم سب کو اس پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک طرف تو وہ اپنے کو کمیونسٹ کہتا ہے اور سرمایہ داروں اور مذہب کے طرف داروں کو اپنا مخالف مانتا ہے اور دوسری طرف قرآن شریف کی اتنے انہماک سے تلاوت کرتا ہے کہ رات کی تاریکی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اور اس کو اتنا ڈر نہیں رہتا کہ روسی کمیونسٹ جن کا وہ دوست بنا ہوا ہے، اس کی اس حرکت پر اس کو کیا کہیں گے۔ بجلی روشن ہونے پر کمرے میں رہنے والے سب لوگوں نے جن کا کمیونزم سے کوئی تعلق نہ تھا، رحمت علی سے اس کی اس حرکت کا سبب پوچھا اور کہا کہ "ایک طرف تم اپنے کو کمیونسٹ کہتے ہو اور دوسری طرف قرآن شریف کی تلاوت ایک پکے مسلمان کی طرح بڑے خشوع کے ساتھ کرتے ہو"۔ اس نے جواب دیا: "میرا پولیٹیکل اور سوشل عقیدہ تو کمیونزم کا عقیدہ ہے لیکن میں مذہبی طور پر قرآن شریف کا دلدادہ ہوں اور اس کی خوبیوں کا قائل ہوں"۔

جب میں نے اپنے دوستوں سے یہ واقعہ سنا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ ظاہر ہے کہ رحمت علی کا یہ جواب کمیونسٹوں کے لئے تو بالکل اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک کمیونسٹ ایک مذہبی کتاب کا کبھی بھی دلدادہ نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے لادین ہونا بلکہ مذہب کا دشمن ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص رحمت علی کی اس حرکت کو ہندوستانی کمیونسٹوں کے لیڈر (M.N.Roy) کو بتا دیتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ رحمت علی کی روسی کمیونسٹوں سے شکایت کر کے اس کا خاتمہ کرا دیتا۔

ہمیں تو اس کے بعد یقین آ گیا کہ رحمت علی زکریا زبانی طور پر کمیونسٹ ہے، لیکن دلی طور پر مسلمان ہے۔ مگر اس کی طبیعت ایسی متلون، متذبذب اور ڈانواں ڈول واقع ہوئی ہے کہ وہ کبھی بھی ایک اصول کی جرأت کے ساتھ حمایت یا پابندی نہیں کرتا تھا اور نہ میری طرح اس کا اعلان کر سکتا تھا کہ وہ پکا مسلمان ہے۔ اس کو افغانستان کے انگریزوں سے صلح کرنے اور قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ سے پھر جانے کا سخت رنج تھا اور اس لئے وہ افغانستان سے، اور نتیجہ کے طور پر سب مسلمانوں سے بددل ہو گیا تھا۔ ماسکو میں رہنے پر مجبور ہونے کی وجہ سے کمیونسٹوں کو خوش کرنے کے لئے خود کو کمیونسٹ کہا کرتا تھا۔ لیکن قرآن شریف کا اس کے دل

پر اتنا گہرا اثر تھا کہ چھپ چھپ کر اس کی تلاوت کیا کرتا اور اپنے دل کی بے چینی کو اس طرح رفع کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

غلام حسین کا رویّہ

سنہ ۱۹۲۲ء کے شروع میں جب ہم کابل میں تھے، امیر امان اللہ خان کی حکومت نے اپنی قوم کی تعلیم پر زور دیا تھا اور اس کام کے لئے برصغیر ہندو پاکستان سے کچھ استاد منگوائے تھے اس سلسلہ میں سبناتھ بنیرجی معلم ریاضی (حبیبیہ کالج) مقرر ہوا تھا۔ خوشی محمد نے نئے اساتذہ کی ملازمت سے فائدہ اٹھا کر روسی سفارت کے مشورہ سے ہمارے پرانے ہم جماعت اکنامکس کے پروفیسر غلام حسین کو حبیبیہ کالج میں استاد مقرر کرانا اور اس طرح پر اس کو کابل بلوانا چاہا۔ میں، اس کا اس کارروائی سے جو حقیقی مقصد تھا، اس کو سمجھ نہ سکا۔ اس لئے اس کے کہنے پر میں نے سردار محمد سلیمان خان سے جو سردار سپہ سالار محمد نادر خان کے چچازاد بھائی تھے اور اس وقت وزیر معارف افغانستان کے فرائض ادا کر رہے تھے، سفارش کر کے غلام حسین کو کابل بلوایا۔ خوشی محمد کا حقیقی مقصد غلام حسین کو کابل بلوانے میں یہ تھا کہ اس کو کمیونزم کے اصولوں سے واقف کرے اور پھر اس کے ذریعہ پنجاب میں کمیونسٹ خیالات کا ایک اخبار جاری کرائے۔ غلام حسین کے کابل آنے پر اس کو خوشی محمد کی طرف سے ضروری ہدایات دی گئیں اور اخبار جاری کرنے کے لئے اس کو روسی سفارت خانہ کابل سے روپیہ دلوایا گیا۔ کابل میں کچھ ماہ رہنے اور کالج میں سبق پڑھانے کے بعد غلام حسین نے اپنی صحت کی خرابی کا بہانہ کر کے ٹیچری سے استعفا دے دیا اور پنجاب واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے ایک ہفتہ وار اخبار "انقلاب" نکالا جو جلد ہی انگریزی حکومت کے عتاب کا نشانہ بن گیا اور اس کو کچھ دن بعد بند کر دیا گیا۔

اس کی اطلاع ہم کو ماسکو پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ملی۔ یہاں ہمیں خوشی محمد کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ایم این رائے کے قول کے مطابق غلام حسین کو جو روپیہ اخبار کے چلانے کے لئے روسیوں نے دیا تھا، اس کو غبن کرنے کے لئے اس نے حد سے زیادہ انتہا پسندانہ آرٹیکل لکھے، جو اس اخبار کے بند کئے جانے کا سبب بنے۔ ایم۔ این رائے کے قول کے مطابق غلام حسین نے یہ

راستہ جان بوجھ کر اختیار کیا اور جب انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے اس پر مقدمہ چلایا گیا، تو اس نے معافی مانگ لی اور اس طرح پر امانت میں خیانت کر کے، روسی سفارت کے دیئے ہوئے روپے کو غبن کر لیا۔ ایم۔ این۔ رائے کا یہ خیال اور قیاس کس حد تک درست ہے۔ مجھے اس کی تحقیق کا آج تک موقع نہیں ملا! اگرچہ میں جب ۳۴ سالہ جلاوطنی کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں اپنے زادبوم گیا، تو لاہور میں غلام حسین سے بھی ملا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایم۔ این۔ رائے کا یہ قیاس اور خیال بالکل غلط ہی ہو اور اس نے خوشی محمد کے رسوخ کو روس میں نقصان پہنچانے کے لئے ایسی بات گھڑی ہو۔ کیونکہ غلام حسین کو خوشی محمد نے اس کام پر بھیجا تھا اور ایم۔ این رائے محمد علی (خوشی محمد) کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی میں اپنا رقیب سمجھتا تھا۔

اقبال شیدائی کی ترکی روانگی

سنہ ۱۹۲۳ء کے موسم گرما کے شروع میں اقبال شیدائی اور ظفر عمر مسعود نے فیصلہ کیا کہ وہ روس سے ترکی چلے جائیں۔ کیونکہ وہ نہ تو محمد علی کی طرح کمیونسٹ بن سکتے تھے، اور نہ قبلہ مولانا صاحب کی خاطر میری طرح کمیونسٹ عقیدوں کی تحقیق اور تدقیق کی غرض سے ماسکو کی مشرقی یونیورسٹی میں داخل ہونے پر تیار تھے۔ اس لئے ایک روز شیدائی ترکی سفارت خانہ واقع ماسکو میں گیا اور وہاں ترکی سفیر احمد مختار بک سے ملا۔ سفیر صاحب ترکی اتحاد و ترقی پارٹی کے پرانے ممبر اور جمہوریت ترکی کے سب سے پہلے وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ ان کے دل میں مسلمان آزادی خواہوں کی بڑی قدر تھی۔ وہ ایسے لوگوں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شیدائی نے ان سے قبلہ مولانا صاحب کا، ان کی کابل کی کارروائیوں کا، جمال پاشا سے اپنے تعلقات کا اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا ذکر کیا۔ اس لئے سفیر صاحب نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا اور قبلہ مولانا صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اور شیدائی اور ظفر عمر مسعود کو ترکی جانے کے لئے ویزا دینے کا وعدہ کیا۔ قبلہ مولانا صاحب سفیر صاحب سے ایک روز ملنے گئے۔ اس وقت اتفاق سے سفیر صاحب کا چھوٹا بھائی اور خان تحسین بک جو بہت اچھی انگریزی بولتا تھا، ماسکو میں ان کا مہمان تھا۔ اس ملاقات میں اس نے اور میں نے مولانا صاحب کی ترجمانی کی تھی۔ اس کے بعد شیدائی اور ظفر عمر مسعود نے اپنے سفر کی تیاری شروع کی۔ سفر کے

لئے ان کو (ان کے قول کے مطابق) سفر خرچ کی ضرورت تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ معاملہ قبلہ مولانا صاحب کے سامنے پیش کیا، اور ان سے مالی مدد مانگی۔

جب ڈاکٹر نور محمد اور خوشی محمد کو شیدائی کے اس مطلب کا پتہ چلا کہ وہ سفر کے لئے قبلہ مولانا صاحب سے روپیہ مانگتا ہے، تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ شیدائی کے پاس کافی روپیہ موجود ہے۔ اس پر انہوں نے ایک روز جبکہ شیدائی اور ظفر عمر مسعود ہوٹل لکس سے باہر گئے ہوئے تھے، ایک چابی لگا کر ان کا سوٹ کیس کھول لیا۔ اس کی پڑتال سے ان کو معلوم ہوا کہ اس کے پاس سولہ اشرفیاں (انگریزی طلائی پونڈ) موجود ہیں۔ انہوں نے اس کا ذکر قبلہ مولانا صاحب سے کیا اور کہا کہ وہ اس روپے کو شیدائی کے سوٹ کیس سے اڑانا چاہتے ہیں۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب نے ان کو اس اقدام سے روک دیا۔ انہوں نے قبلہ مولانا صاحب کی بات مان کر یہ روپیہ پھر شیدائی کے سوٹ کیس میں رکھ کر اس کا قفل لگا دیا۔

میں جب شام کو یونیورسٹی کے سبق کے بعد اپنی عادت کے مطابق ہوٹل لکس گیا تو ڈاکٹر نور محمد اور خوشی محمد نے اس واقعہ کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا کہ "شیدائی سفر کے بہانے سے مولانا صاحب سے روپیہ اینٹھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس کافی روپیہ موجود ہے، جس سے وہ ترکی میں کچھ مدت گزار سکتا ہے"۔

اگر شیدائی کا اس طرح پردہ فاش نہ ہوتا تو میرا خیال ہے کہ قبلہ مولانا صاحب ضرور اس کو کچھ روپیہ دے دیتے اور خود تنگی میں رہنے پر راضی ہو جاتے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انہوں نے شیدائی کو کچھ نہیں دیا اور شیدائی اس کے چند روز بعد ظفر عمر مسعود کے ساتھ ماسکو سے ترکی روانہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ شیدائی کو اس کا علم نہیں ہوا کہ ڈاکٹر نور محمد اور خوشی محمد نے اس کا سوٹ کیس کھول کر اس کی ساری پونجی کو دیکھ لیا تھا۔ خوشی محمد اور ڈاکٹر نور محمد اس کے بعد ہمیشہ پس پشت شیدائی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

میرا لینن گراڈ کا سفر

مشرقی یونیورسٹی کا تعلیمی سال ختم ہونے کے قریب اپریل ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں ہماری جماعت کو لینن گراڈ کی سیر کو بھیجا گیا۔ لینن گراڈ اور ماسکو کے درمیان جو ریل کی سڑک ہے اس کو زار روس کے حکم سے ایک سیدھی لکیر کی طرح بنایا گیا تھا۔ جس میں نہ کوئی موڑ ہے اور نہ

اترائی اور چڑھائی۔ اس وجہ سے ان دو شہروں کا درمیانی فاصلہ کم سے کم رہ گیا قبلہ مولانا صاحب سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو لینن گراڈ کی سیر کو جا سکتے ہیں۔ اس پر انہوں نے بھی عزیز احمد کو ساتھ لے کر ہمارے گروپ کے ہمراہ لینن گراڈ جانے کا ارادہ کر لیا اور روسی وزارت خارجہ کو میرے ذریعے مسٹر رائسنر (Reisner) کے ہاتھ جو ایک زمانے میں کابل کے روسی سفارت خانہ میں اپنے بہنوئی روسی سفیر رسکو لینکوف (Raskolnikov) کا فرسٹ سیکرٹری رہ چکا تھا اور اب روسی وزارت خارجہ کے شعبہ مشرق قریب میں کام کرتا تھا، خبر بھیج دی کہ وہ لینن گراڈ میں روسی مہمان خانہ کی بجائے روسی مسلمانوں کے مذہبی لیڈر موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر مہمان ہوں گے۔ موسیٰ جار اللہ صاحب ایک بڑے جید عالم اور خدا پرست سیاسی لیڈر تھے جن کی قدر و منزلت نہ صرف روسی مسلمانوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھی بلکہ سارا عالم اسلام ان کو جانتا تھا۔ انہوں نے شروع میں بولشویکوں کے ہاتھوں کافی ایذائیں اٹھائی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ بولشویکوں کی سیاست میں دخل نہ دیتے تھے، اس لئے ان کو قید سے رہا کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان کو حج پر جانے کی بھی اجازت مل گئی تھی اور اس طرح ان کو اپنے ضمیر کے مطابق کام کرنے کا پھر موقع مل گیا۔ وہ حج پر غالباً سنہ ۱۹۳۰ء میں قبلہ مولانا صاحب سے حجاز میں ملے تھے اور ان کے حلقہ درس سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ میں نے سنا کہ بعد میں وہ حیدر آباد دکن بھی گئے۔ لیکن ان کو انگریزوں نے وہاں آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ پھر وہ ترکی آئے۔ میں ان سے استانبول میں اس وقت ملا تھا۔ وہ بیمار تھے اور ان میں کام کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ وہ بعد میں ترکی سے مصر چلے گئے تھے اور وہیں انہوں نے وفات پائی۔

لینن گراڈ میں قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ میں بھی موسیٰ جار اللہ صاحب کا ایک ہفتے مہمان رہا۔ لینن گراڈ چونکہ روس کے شمالی حصہ میں واقع ہے اور ہمارے قیام کے وقت گرمی کا موسم بھی شروع ہو چکا تھا، یہاں دن بہت لمبا ہوتا ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس لئے ہمیں کوئی ۲۱ گھنٹے کا روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ افطار کر کے آرام کی نوبت بھی نہ آتی تھی کہ عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے کوئی دو گھنٹہ بعد (یعنی غروب سے کوئی تین گھنٹے پیچھے) صبح صادق کی سپیدی نظر آنے لگتی تھی۔

اگر آپ اور زیادہ شمال کی طرف جائیں تو وہاں تو گرمی کے مہینوں میں سورج غروب ہی

نہیں ہوتا۔ ایک روز موسیٰ جار اللہ صاحب نے ایسے ملکوں میں روزہ رکھنے کا مسئلہ قبلہ مولانا صاحب سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "ایسے ملکوں میں بارہ گھنٹے روزہ رکھنا اور بارہ گھنٹے آزادی سے کھانا پینا چاہئے اور نماز پنج وقتہ بھی اسی اصول پر ادا کی جانی چاہئے۔ اسلامی احکام ساری دنیا کے لئے ہیں۔ وہ پوری طرح دنیا کے ان حصوں کے لوگوں پر جاری ہو سکتے ہیں جو ایسی جگہوں میں آباد ہیں جہاں قوانین فطرت اوسط درجہ پر چلتے ہیں۔ بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی کے ملکوں میں جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے وہاں صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا ناممکن ہے"۔

لینن گراڈ میں موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر رہتے ہوئے مجھے نماز بالکل آزادی سے پڑھنا نصیب ہوئی۔ ماسکو یونیورسٹی میں تو نماز روزے کا نام لینا بھی ممکن نہ تھا۔ میں بڑی مشکل سے چارپائی پر لیٹ کر اور سر کے اشارے سے نماز ادا کیا کرتا تھا اور کبھی کبھار اگر موقع مل جائے تو فضل الٰہی قربان سے جس کو یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا کمرہ علیحدہ ملا ہوا تھا، اجازت لے کر اس کے کمرے میں نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ماسکو جیسے دشمن مذہب شہر میں، فضل الٰہی قربان کا جو اپنے کو کمیونسٹ کہا کرتا تھا مجھے نماز پڑھنے کے لئے اپنے کمرے میں موقع دے دینا ایک بڑی جرات کا کام تھا۔ کیونکہ اگر کسی کمیونسٹ کو اس کا پتہ چل جاتا تو نہ صرف فضل الٰہی قربان کی پوزیشن خراب ہو جاتی بلکہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس نے مجھے کبھی کبھی ایسا موقع دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا تھا۔

لینن گراڈ کی سیر کو ہم سب ہم جماعت اکٹھے جایا کرتے تھے۔ مگر قبلہ مولانا صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تھے۔ وہ موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر سے زیادہ باہر نہ نکلتے تھے۔ لینن گراڈ ایک خوبصورت شہر ہے جس کو بنانے پر پیٹر اعظم زار روس نے کروڑوں روپے خرچ کئے تھے۔ یہ شہر دریائے نیوا (Neva) کے کنارے پر واقع ہے اور آس پاس کی دلدلوں کو مٹی سے پر کر کے جو سخت زمین بنائی گئی تھی، اس پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں ہزاروں مزدوروں نے، جن کو بہت کم مزدوری پر ان دلدلوں میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا تھا، اپنی جانیں دی تھیں۔ یہاں اس شہر کا مفصل ذکر تو لمبا ہو جائے گا، اس لئے میں اس سے در گزر کر کے اس کی صرف چند ایک خوبیاں اور خصوصیتیں یہاں بیان کرتا ہوں۔

اس شہر میں روس کے مشہور شعراء اور ادبا کے مجسمے بنے ہوئے ہیں جو روسی قوم کی علم

دوستی اور عالموں کی قدردانی کا ثبوت مانے جا سکتے ہیں۔ شاہی محل جس کا نام زار کے زمانے میں SummerPalace (یعنی محل صیف) تھا اور جس کو اب بولشویکوں نے Detski dom (یعنی خانہ اطفال) کہنا شروع کر دیا ہے، ایک بڑی شاندار عمارت ہے۔ یا یوں کہئے کہ شاندار عمارتوں کا مجموعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے لمبے لمبے ایک پارہ پتھر کے ستون فن لینڈ سے لائے گئے تھے۔ اس زمانے میں جبکہ فن لینڈ اور روس کے درمیان ریل نہ تھی ایسے ستونوں کو اتنی دور سے کیسے لایا گیا، ایک قابل تدقیق و تحقیق امر ہے۔ خدا جانے ان کے لانے میں کتنے آدمیوں اور جانوروں نے جان دی ہو گی۔ اب یہ محل عجائب گھر بن گیا ہے، جہاں زار کے زمانے کی چیزیں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ اس محل کو ملکہ کیتھرین (Catherine) نے ۱۷۶۳ء میں بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس محل کے ایک ہزار پچاس (۱۰۵۰) کمرے ہیں۔ کیتھرین نے ۱۷۷۵ء میں اس کے ارد گرد اور روس کے ایک اور بادشاہ نے ۱۸۳۹ء میں اس کے پاس اور محلات بنوائے، جن کو ہرمی ٹیج (Hermitage) کہا جاتا ہے۔ اب ان محلات کے سارے کمروں کی تعداد دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) بتائی جاتی ہے، جہاں دنیا کی نایاب اور بے بہا صنعت کی چیزیں اور تصویریں موجود ہیں۔ نامور یورپین مصوروں کی شاہکار تصویریں جو ان محلات میں لٹکی ہوئی ہیں ان کی تعداد چودہ ہزار (۱۴۰۰۰) بتائی جاتی ہے۔

شہر کی سڑکیں بہت چوڑی اور سیدھی ہیں۔ گلی کوچے بھی تنگ نہیں ہیں۔ بولشویکی انقلاب کی دستبرد کے باوجود شہر کی عمارات اچھی حالت میں تھیں۔ لیکن لوگ سخت غربت میں مبتلا تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زار کے زمانے میں میونسپلٹی کا انتظام بہت ہی اچھا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ گلی کوچوں کے نام اور گھروں کے نمبر بہت ہی باقاعدہ ہیں۔ ہر گھر کے دروازے پر ایک گلوب والا بڑا سا برقی لیمپ لگا ہوتا ہے۔ گلوب پر گلی کا نام اور گھر کا نمبر درج ہوتا ہے۔ اس طرح پر دن اور رات کو ہر وقت گھر کا نمبر اور گلی کا نام آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں میں بھی اسی قسم کا انتظام ہے لیکن اتنا باقاعدہ میں نے دوسرے ملکوں کے شہروں میں کم دیکھا ہے۔

لینن گراڈ سے واپسی پر رحمت علی نے قبلہ مولانا صاحب کو بتایا کہ وہ کتاب جس میں حکومت موقتہ ہند کی روئیداد لکھی ہوئی تھی اور جو قبلہ مولانا صاحب کابل سے اپنے ساتھ ماسکو لائے تھے اور لینن گراڈ جاتے ہوئے رحمت علی کے پاس چھوڑ گئے تھے، ہوٹل لکس کے کمرے

سے اس کے بکس میں سے نکال کر چرائی گئی۔ اس کا ہمیں بہت رنج ہوا کیونکہ یہ ایک تاریخی دستاویز تھی۔ اس سے روسیوں کو قبلہ مولانا صاحب کی کابل کی خفیہ کارروائیوں کا پتہ لگ گیا۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب نے کسی سے اس کی شکایت نہیں کی کیونکہ روسیوں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایسے کاغذات کو ضرور چرالیا کرتے ہیں۔

لینن گراڈ سے واپس آکر ہماری جماعت کو یونیورسٹی کی طرف سے کریملین (Kremlin) کو دیکھنے کا موقعہ دیا گیا۔ کریملین ایک قلعہ ہے جس کے اندر شاہی محلات اور بہت سے مشہور گرجے موجود ہیں۔ اس قلعہ کے اندر بولشویکی روس کے ارباب حل و عقد یعنی گورنمنٹ کے رکن اور کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے ممبر رہتے ہیں۔ لیکن ان محلات میں وہ عظمت اور احتشام نہیں ہے جو لینن گراڈ کے محلات میں دیکھا جاتا ہے۔

چودھواں باب

مولانا کی روسی وزیر خارجہ چچرن (Chechiren) سے ملاقاتیں

قبلہ مولانا صاحب کی روسی وزیر خارجہ چچرن سے ملاقات کیوں اور کیسے عمل میں آئی؟ اس کے سمجھنے کے لئے روس کے اس وقت کے سیاسی حالات کا جاننا ضروری ہے۔ روسی کمیونسٹوں کا مقصد ساری دنیا میں کمیونسٹ انقلاب کرانا ہے اور سب ملکوں میں مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ قائم کر کے ان کو ماسکو کے مرکزی ادارے کے تحت ایک ہی نظام میں منسلک کرنا ہے۔ اس کام کے لئے انہوں نے روسی کمیونسٹ پارٹی کے ماتحت جو روس میں موجودہ prolitarian dictatorship (یعنی مزدوروں کی مطلق العنان حکومت) قائم کر چکی ہے، کمیونسٹ انٹرنیشنل (communist international) یا مختصراً کومنٹرن (comintern) کی تنظیم بنائی۔ جس میں ساری دنیا کے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیاں داخل تھیں، اور اپنے اپنے ملک میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی ہدایات کے مطابق کمیونسٹ اصولوں پر انقلاب کرا کے وہاں بھی مزدوروں کی مطلق العنان حکومت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ اس کام میں ان کو مالی اور اخلاقی مدد روسی کمیونسٹ پارٹی سے ملتی تھی۔ اگرچہ روسی گورنمنٹ روسی کمیونسٹ پارٹی کی ایک آلہ کار ہے۔ لیکن حکومت ہونے کی وجہ سے کھلم کھلا دنیا میں انقلاب پھیلانے میں حصہ نہیں لیتی ہے اور دوسری حکومتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور تجارتی روابط پیدا کرنا چاہتی ہے۔

روس میں ہر شخص فوج میں خدمت کرنے پر مجبور ہے۔ یعنی یہاں Conscription

(جبری فوجی خدمت) کا اصول جاری ہے۔ اس اصول کی وجہ سے حکومت کے ملازم، یونیورسٹیوں اور سکولوں کے طالب علم، کارخانوں کے مزدور اور سب دہقان بھی ملٹری ٹریننگ (فوجی تعلیم و تربیت) حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے خاص کر وزارت امور خارجہ اور وزارت تجارت خارجہ کے ملازمین کو فنون عسکریہ کی بہت مفصل تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ جب باہر کے ملکوں میں کسی پوسٹ پر مقرر ہوتے ہیں تو وہاں کی فوجی طاقت اور عسکری ترقیات کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں اور وہاں کی خارجہ پالیسی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ان دونوں وزارتوں کے ملازمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ روسی زبان کے ساتھ ساتھ ایک یورپین اور ایک ایشیائی زبان بھی سیکھیں۔ چنانچہ بعض ہندوستانی انقلابیوں سے جو ماسکو میں موجود تھے یہ کام لیا جاتا تھا کہ وہ روسی افسروں کو اور وزارت خارجہ کے ملازمین میں سے بعض لوگوں کو اردو پڑھایا کریں۔ - اس کام کے عوض ان کو کچھ تنخواہ اور رہائش کے لئے ایک کمرہ دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں میں مولوی ابو سعید عربی بھی تھا جو اصل میں رنگون کا رہنے والا تھا اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک زمانے میں قاہرہ آیا تھا، اور وہاں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں استنبول پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس نے جنگ کے دنوں میں (جہان اسلام) نامی ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کے اس جنگ میں مغلوب ہونے پر وہ روس چلا گیا تھا۔ دوسرا شخص ہمارے ساتھیوں میں سے رحمت علی زکریا تھا۔ تیسرا آدمی وفا نامی ایک شخص تھا جس کا اصلی نام حبیب احمد تھا اور جو لدھیانہ کا رہنے والا تھا اور تحریک ہجرت کے سلسلہ میں روس چلا گیا تھا۔ میں چونکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس لئے مجھے سرکاری طور پر اس کا موقع نہ مل سکا کہ میں روسی افسروں کو اردو پڑھاؤں۔ لیکن میں نجی طور پر ایک روسی عورت کو جو فوجی سکول میں اردو پڑھایا کرتی تھی، بعض مشکل سبقوں کے سمجھنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ جس سے اس کو اپنی جماعت کو اردو پڑھانے میں آسانی ہوتی تھی۔

مولانا اور چچران کی ملاقات کے لئے میری کوشش

روسی وزارت خارجہ کا ایک ملازم رائسنر (Reisner) نامی بھی جس سے میری ملاقات کابل میں ہو چکی تھی جہاں وہ روسی سفارت میں فرسٹ سیکرٹری تھا، ماسکو میں اردو سیکھ رہا تھا۔ میں اس کو اردو کا پرائیویٹ سبق دینے کے لئے ہفتہ میں

دو دفعہ رات کے وقت اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ ٹیوشن کے بدلے میں رائسنر سے کوئی فیس نہ لیتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس سے آہستہ آہستہ میری دوستی بڑھ گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے ایک روز اس کو قبلہ مولانا صاحب کے بارے میں کہا کہ "روس میں ایک ایسا ہندوستانی لیڈر مدت سے آیا ہوا ہے جس کا رسوخ نہ صرف اپنے ہم وطنوں میں بہت زیادہ ہے بلکہ جس نے افغانستان کو انگریزوں سے لڑا دیا تھا۔ اور جس کے افغانستان میں آج بھی جنرل نادر خان جیسے بڑے بڑے سردار دوست ہیں اور جو آل انڈیا نیشنل کانگرس کی کابل کمیٹی کا پریزیڈنٹ اور حکومت موقتہ ہند کا وزیر داخلہ رہ چکا ہے۔ تو کیا روسی گورنمنٹ ایسے شخص کے ساتھ تعاون کر کے انگریزوں کے خلاف روسی بولشویک حکومت کے دشمن جان ہیں اور جنہوں نے اس حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے جنرل کولچک (Kolchak) اور جنرل ڈینکن (Denikin) جیسے سفید روسی کمانڈروں کی مدد دی تھی، کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتی؟

"آج روسیوں کو ایک ایسا موقع نصیب ہوا ہے کہ اس کی نظیر بھی نہیں مل سکتی۔ M.N.Roy جو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر ہے ابھی تک ہندوستان میں کوئی انقلابی تحریک پیدا نہیں کر سکا۔ حالانکہ قبلہ مولانا صاحب جو ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے ذاتی دوست ہیں، ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بہت کام کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ روسی حکومت ان کو مدد دینے کو تیار ہو"۔

رائسنر پر میری باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے افسر اور وزارت خارجہ کے وسط ایشیائی شعبہ کے مدیر سوکرمان (Sukerman) سے اس کا ذکر کیا اور اس کو قائل کر دیا کہ وہ وزیر خارجہ روس چچرن سے اس کا ذکر کر کے قبلہ مولانا صاحب کی اس سے ملاقات کرا دے۔

چنانچہ ایک ہفتہ بعد جون سنہ ۱۹۲۳ء کے پہلے ہفتہ میں قبلہ مولانا صاحب کی چچرن سے ملاقات کے لئے انتظام ہوا۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد اس ملاقات کے لئے وقت مقرر کیا گیا۔ قبلہ مولانا صاحب، رائسنر اور میں مقررہ وقت پر روسی وزارت خارجہ کے دروازے پر پہنچے۔ یہ ایک پانچ منزلہ اور پتھر کی بنی ہوئی پرانی اور بہت بڑی عمارت تھی۔ دروازے پر ایک گارڈ (پہرہ دار) بندوق اور برچھی لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس نے ہم سے ہمارے ورق شناخت

(Identity card) مانگے۔ رائسنر نے اپنا کارڈ دکھلایا، جس سے گارڈ اور اس کے افسر کو اطمینان ہو گیا۔ چونکہ رائسنر کا دفتر اسی عمارت میں تھا، اور وہاں وہ ہر روز کام کرتا تھا، اس لئے اس کو ہمیں عمارت کے اندر لے جانے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گارڈ کے افسروں کو بھی یہ اطلاع ملی ہوئی تھی کہ رات کو کچھ اشخاص وزارت خارجہ آئیں گے۔

روس میں اس زمانے میں دفتروں کے وقت صبح دس بجے سے تین بجے بعد دوپہر تک اور پھر پانچ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک ہوتے تھے۔ دوپہر کا کھانا یہ لوگ بہت دیر سے کھایا کرتے تھے، اس لئے شام کے بعد بھی دفتروں میں کام کیا کرتے تھے اور دفتر صبح دیر سے کھلتے تھے۔

وزارت خارجہ کی عمارت میں داخل ہونے پر ہم کو دوسری منزل لے جایا گیا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ کوریڈور یعنی بر آمدے میں بھی پہرہ لگا ہوا ہے۔ اس پہرہ دار نے بھی ہم سے ورق شناخت (Identity card) مانگے۔ رائسنر نے اس کو بھی مطمئن کیا۔ ہم آگے بڑھے۔ کوریڈور کے آخر میں دائیں ہاتھ پر ایک دروازہ نظر آیا۔ یہاں بھی ایک ہتھیار بند گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی ہمارے ورق شناخت دیکھے اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہم کو اس دروازے سے اندر جانے کی اجازت دی۔ معلوم ہوا کہ چچرن کے دفتر میں داخل ہونے کا دروازہ یہی ہے۔ اس دروازے سے ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ہمیں ایک سیکرٹری ملا۔ اس نے رائسنر کو پہچانا اور اندر کی طرف کا ایک دروازہ کھولا اور یہاں سے جاکر چچرن کو ہمارے آنے کی خبر دی۔ اس کے بعد ہم کو اندر کے کمرے میں داخل کر دیا گیا۔

روس میں اس زمانے میں (اور غالباً اب بھی) اعلیٰ افسروں کے دفتر میں آنے جانے پر جو اتنی سخت پابندیاں لگی ہوئی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دو دفعہ لینن کو مار ڈالنے کی بعض لوگوں نے کوششیں کی تھیں۔ ایک دفعہ تو وہ بہت سخت زخمی ہوا تھا۔ بولشویکی گورنمنٹ کے دشمن ملک میں بہت تھے۔ اس لئے وزارتوں اور سرکاری دفتروں اور اداروں میں داخلے پر اس قسم کی سخت پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔

اس کمرے میں چھت میں ایک بڑا فانوس لٹک رہا تھا جس میں بہت سے برقی چراغ جل رہے تھے۔ اس کی دیواروں پر کارل مارکس، لینن اور اینگلز کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کا فرنیچر یعنی میز، کرسی وغیرہ زار کے زمانے کا تھا۔ دروازے کے بائیں طرف، دیوار کے پاس چچرن ایک بڑی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر قبلہ مولانا صاحب کا استقبال

کیا، اور اپنے سامنے میز کی دوسری طرف تین کرسیاں دکھلائیں۔ ان میں سے بیچ کی کرسی پر قبلہ مولانا صاحب، دائیں جانب کی کرسی پر رائسنر اور بائیں طرف کی کرسی پر میں بیٹھا۔ رائسنر چچرن کی باتوں کو روسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کرنے اور میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر مقرر ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد جو گفتگو پون گھنٹے کی ملاقات کے دوران ہوئی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

قبلہ مولانا صاحب نے، انڈین نیشنل کانگرس سے جو ان کا تعلق بحیثیت پریزیڈنٹ کانگرس کمیٹی کابل تھا اس کا ذکر کر کے چچرن سے کہا کہ وہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کا قلع قمع کرنے کے لئے روس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ تعاون روسی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پارٹی کی بجائے روسی گورنمنٹ سے اس بارے میں گفتگو کر کے ایک سمجھوتے پر پہنچنا ان کا مقصد زندگی ہے۔ چچرن کو اس پر کچھ تعجب ہوا کیونکہ روس میں کوئی سرکاری کام پارٹی کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن قبلہ مولانا صاحب نے یہ بات بہت ہی کھلے الفاظ میں چچرن پر واضح کر دی کہ وہ بحیثیت انڈین نیشنل کانگرس کے ایک ممبر کے روسی کمیونسٹ پارٹی سے کوئی لین دین نہیں کر سکتے، اور چونکہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا روسی گورنمنٹ کے مفاد میں ہے اور اس کا مطمح نظر مانا جاتا ہے اس لئے روسی گورنمنٹ کو انڈین نیشنل کانگرس سے سمجھوتہ کرنا چاہئے اور اس سمجھوتے کی گفتگو میں روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔

چچرن، اپنے ملک کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اس خیال سے کہ روس کو جو خانہ جنگی کے پنجے سے صرف کچھ عرصہ پہلے چھوٹا تھا اور قحط سالی کی مصیبتوں میں ابھی تک مبتلا تھا انگریزوں کے برخلاف ہر ممکن موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے، مولانا صاحب کی اس تجویز کو روسی کیبنٹ میں پیش کرنے پر راضی ہو گیا۔

یہ قبلہ مولانا صاحب کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی۔ کیونکہ روسی کمیونسٹ جب تک کسی نو آبادی اور غلام ملک سے کمیونسٹ پروگرام پوری طرح نہ منوالیں اس کو اس کی قومی آزادی کی لڑائی میں مدد دینے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ قومی گورنمنٹیں بھی آخر کار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آ جایا کرتی ہیں۔ وہ بھی امپریلسٹوں (سامراجیوں) کی طرح اقتصادی اور سماجی اصلاحات کی مخالف ہوا کرتی ہیں۔ وہ کمیونسٹوں کو اپنے ملک میں پنپنے کی اجازت نہیں دیا کرتیں اور آخر میں ضرور روس کی مخالف بن جایا کرتی ہیں۔

روس نے اب تک صرف غازی مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کی قومی گورنمنٹ کو انگریزوں اور یونانیوں کے خلاف بلا قید و شرط مدد دی تھی۔ اس کے سوا، روس اور کسی کو کمیونسٹ اصولوں کو منظور کرائے بغیر مدد دینے کو تیار نہ تھا۔ اس ملاقات کے دوران چچرن نے منظور کیا کہ وہ اس مسئلہ کو روسی حکومت کے سامنے پیش کر کے ایک ہفتے بعد اس کا جواب دے گا۔

ملاقات کے ختم ہونے پر میں اور قبلہ مولانا صاحب ہوٹل لکس واپس آئے۔ لیکن چونکہ یہ ملاقات اور یہ مسائل ہم نے اپنے دوسرے دوستوں سے بالکل پوشیدہ رکھے تھے، اس لئے ہم نے ہوٹل آکر بھی اس کا آپس میں ذکر نہ کیا۔ مگر ہمارے دلوں میں یہ سوال ضرور آتا تھا کہ آیا روسی گورنمنٹ ایک ایسی تجویز کو جس میں ہم روسی کمیونسٹ پارٹی کی دخل اندازی کو منظور نہ کرتے تھے، مانے گی یا نہیں۔ ہوٹل سے میں رات کو یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاوس میں آکر سو گیا۔

خدا خدا کر کے ایک ہفتہ گزرا اور رائسنر نے ہمیں خبر دی کہ چچرن مولانا صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اس سے ہمیں امید ہوئی کہ روسی گورنمنٹ نے مولانا کی تجویز کو غالباً اصول کے طور پر تو مان لیا ہے۔ چنانچہ ہم پھر رائسنر کے ساتھ رات کے آٹھ بجے کے بعد روسی وزارت خارجہ کو گئے اور وہاں پھر سنتریوں سے گزر کر چچرن کے سیکرٹری سے ملے اور اس نے ہمیں چچرن کے کمرے میں داخل کر دیا، جہاں مولانا صاحب کی اس سے دوسری ملاقات ہوئی۔

اس ملاقات کے دوران چچرن نے مولانا کو بتایا کہ روسی گورنمنٹ ہندوستانی قومی تحریک میں مدد دینے پر تیار ہے۔ مگر اس بارے میں مولانا صاحب سے پوچھنا چاہتی ہے کہ یہ مدد مالی ہو گی یا ہتھیاروں کی شکل میں ہوگی، اور اس کو ہندوستان کیسے پہنچایا جائے گا۔

مولانا صاحب نے اس کا جواب یوں دیا "انڈین نیشنل کانگرس کا اصول پُرامن عدم تعاون ہے۔ اس لئے ہتھیاروں کی مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مدد صرف روپے کی صورت میں ہونی چاہئے اور اس کے لئے فی الحال انڈین نیشنل کانگرس کو ایک کروڑ روپیہ دیا جانا چاہئے، جس کو ہندوستان قرض سمجھے گا، اور آزاد ہونے پر اسے روس کو واپس ادا کر دے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ضروری ہے کہ افغانستان بھی روس کے ساتھ مل کر کام کرے۔ کیونکہ

روس کے لئے ہندوستان سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو برقرار رکھنے کا سب سے زیادہ محفوظ راستہ افغانستان ہی کا راستہ ہے۔ افغانستان کی اس کام میں شرکت حاصل کرنے کے لئے میرا (قبلہ مولانا صاحب کا) کابل جانا ضروری ہے اور افغانستان کو جو اس وقت ایک نئی حکومت قائم کرنے میں لگا ہوا ہے، ایک کروڑ روپیہ، ہندوستان سے تعلق بنانے اور اس کو قائم رکھنے کے لئے روس کو راستہ دینے کے عوض بھیجنا چاہئے"۔

چچرن نے اس تجویز کے پہلے حصے پر یعنی ہندوستان کو ایک کروڑ روپیہ بطور قرض دے کر ہندوستان کی آزادی میں مدد دینے پر تو کوئی اعتراض نہ کیا لیکن افغانستان کو مالی مدد دینے کے بارے میں پوچھا کہ "اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ افغانستان اس مدد کے بعد بھی انگریزوں سے پھر نہ مل جائے گا اور آپ کو پھر ملک بدر نہ کر دے گا"۔

اس پر مولانا نے جواب دیا کہ "اس کے ضامن سردار سپہ سالار صاحب محمد نادر خان ہوں گے۔ وہ اس قسم کی مالی مدد ہمارے ذریعہ حاصل کرنے کے بعد اس قدر طاقت ور اور بارسوخ ہو جائیں گے کہ امیر امان اللہ خان ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھا نہ سکے گا۔ اور سردار صاحب موصوف افغانستان کو کبھی بھی انگریزوں سے دوستی کا ایک معاہدہ کرنے نہ دیں گے۔"

چچرن نے یہ باتیں سننے کے بعد اگلے ہفتے کی ملاقات میں ان کا جواب دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔

مولانا صاحب کا چچرن سے سمجھوتا

اس کے بعد قبلہ مولانا صاحب کی چچرن سے تیسری ملاقات بھی وزارت خارجہ روس کی اسی عمارت میں ہوئی اور ویسی ہی احتیاطوں اور پابندیوں کے ساتھ عمل میں آئی جیسی کہ پہلی اور دوسری ملاقات کے وقت مدنظر رکھی گئی تھی۔ اس تیسری ملاقات میں چچرن نے مولانا صاحب کو مطلع کیا کہ سوویٹ گورنمنٹ نے ان کی ساری تجویزیں مان لی ہیں، اور وہ ہندوستان کو اس کی قومی تحریک میں مالی مدد دینے کے ساتھ ساتھ، افغانستان کو بھی

روپے کی کمک بھیجنے پر تیار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مدد ہندوستان اور افغانستان کو کیسے پہنچائی جائے۔ روسی گورنمنٹ اس بارے میں مولانا صاحب کے خیالات معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ "میں ترکی جانا چاہتا ہوں اور وہاں کسی کانگرسی لیڈر کو بلا کر یا کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعے کانگرسی لیڈروں کو خبر بھیج کر ان کو یہ پیغام دوں گا کہ روسی گورنمنٹ ہندوستانی قومی تحریک کو ایک کروڑ روپیہ تک مالی مدد دینے کو تیار ہے۔ ہندوستانی لیڈروں کو اس پیغام کے پہنچنے کے بعد، میں انڈین نیشنل کانگرس اور روسی گورنمنٹ کے درمیان ایک معاہدہ کراؤں گا۔ مدد صرف اس قسم کا معاہدہ ہو جانے کے بعد کانگرس کو دی جائے گی۔ معاہدے کے بغیر یہ رقم یا اس کا کوئی حصہ کسی کانگرسی لیڈر کو حتیٰ کہ خود مجھ کو بھی نہیں دیا جائے گا۔ افغانستان کو مالی مدد دینے سے پہلے ضروری ہے کہ میں سردار محمد نادر خان سے خط و کتابت کر کے افغانستان کے ماحول کو تیار کروں۔ تاکہ افغانستان اس کے بعد کبھی بھی اپنے وعدے سے نہ پھرے اور جیسا کہ اس نے سنہ ۱۹۱۹ء کی جنگ انگریز و افغان میں، اور بعد میں سنہ ۱۹۲۱ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے ہندوستان کو اکیلا چھوڑ دیا تھا، پھر کبھی بھی ہمارے ملک کو اکیلا چھوڑ کر انگریزوں کا دوست نہ بنے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہو گا کہ میں اور میرے ساتھ کام کرنے والے اشخاص، جن کو میرے ساتھ سنہ ۱۹۲۲ء میں افغانستان چھوڑنا پڑا تھا، پھر کابل واپس جائیں، اگر یہ کام میں ترکی میں رہ کر نہ کر سکا تو ضروری ہو گا کہ میں حجاز جاؤں اور وہاں حج پر آنے والے اپنے دوستوں سے مل کر ان کے ذریعے یہ پیغام ہندوستان بھیجوں اور افغانستان کے ساتھ اپنے تعلقات از سر نو قائم کروں"۔

بچرن نے یہ جواب سن کر اس نے اپنی گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنے کا وعدہ کیا اور ایک ہفتہ بعد ایک اور ملاقات کا وقت مقرر کیا۔

چوتھی ملاقات میں بچرن نے مولانا صاحب کو اطلاع دی کہ روسی گورنمنٹ نے ان کی دونوں تجویزوں کو منظور کر لیا ہے اور وہ ترکی جا کر ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کام شروع کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ان کو سفر خرچ دیا جائے گا اور ترکی پہنچنے پر ان کو اس کام کے سر

انجام دینے کے لئے جتنے روپے کی ضرورت وقتاً فوقتاً ہو گی، وہ ان کو استانبول کے روسی قونصل خانہ کے لوگوں کے ذریعہ دیا جائے گا۔

مولانا صاحب کی ترکی کو روانگی

ان ملاقاتوں کے بعد، مولانا صاحب نے ترکی جانے کی تیاری شروع کی۔ وہ جولائی ۱۹۲۳ء کے وسط میں عزیز احمد کو ساتھ لے کر ترکی روانہ ہو گئے۔ ان دنوں انگریزی فوجیں استانبول میں تھیں۔ اس لئے ان کے لئے استانبول جانا ممکن نہیں تھا۔ ان کا جہاز بحر اسود کی ترکی بندر گاہ (اینہ بولی) بندر گاہ پر لنگر انداز ہوا۔ مولانا یہاں سرزمین ترکی پر اترے اور یہاں سے انقرہ گئے، وہ انقرہ میں تقریباً چار ماہ رہے اور جب ۶ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو ترکی فوجوں نے پھر استانبول پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کے کوئی دو ہفتے بعد استانبول آ گئے۔

قبلہ مولانا صاحب کی جدائی مجھ پر سخت گراں گزری۔ کیونکہ میں ہمیشہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں سے مستفید ہوتا رہتا تھا۔ روس جیسے لامذہب ملک میں ان کے بغیر میرا رہنا بہت دشوار تھا۔ لیکن کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ کیونکہ روسیوں نے مجھے اس وقت ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی تھی۔ پروگرام یہی تھا کہ مولانا صاحب ترکی جا کر ہندوستان سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں اور جب اس میں کامیابی نظر آئے تو میں بھی ترکی جا کر ان کے ساتھ کام پر لگ جاؤں۔

پندرہواں باب

مولانا صاحب کے بعد میرا روس میں قیام اور پھر ترکیہ پہنچنا

میرا روسی زبان سیکھنا

میں نے روس کی سرزمین میں داخل ہوتے ہی، روسی زبان کو اس کے صرف و نحو کے قواعد کے ساتھ سیکھنا شروع کر دیا تھا اور ماسکو کی یونیورسٹی میں داخلے پر باقاعدہ پرائیویٹ سبق لینے لگا تھا جس سے تقریباً ایک سال میں روسی زبان میں یونیورسٹی کے لیکچروں کو ذرا سمجھنے لگا تھا۔ روسی زبان یوروپین زبانوں میں (پولش polish زبان مستثنیٰ) سب سے زیادہ مشکل زبان مانی جاتی ہے اور اس کی بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو کسی اور دوسری زبان میں موجود نہیں ہیں۔ اس وجہ سے غیر روسی لوگوں کو اس کے پوری طرح سیکھنے میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں۔ اول تو اس کے حروف رومن حروف نہیں ہیں، جیسے انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ کے ہیں۔ دوسرے ہر اسم کا خاتمہ سخت یا نرم طور پر ہوتا ہے۔ اور اس خاتمہ کے مطابق ہر اسم کے آخر میں ایک حرف اضافہ کیا جاتا ہے۔ بولشویکی انقلاب سے پہلے اس قاعدے کی سختی سے پابندی ہوتی تھی۔ جس سے خود روسی بچوں کو بھی صحیح املا لکھنے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ بولشویکوں نے سخت طور پر ختم ہونے والے اسموں کے آخر میں جو حرف لکھا جاتا تھا، اس کو حذف کر دیا ہے اور صرف نرم خاتمے کو ظاہر کرنے والے حرف کا لکھنا برقرار رکھا ہے، جس سے بچوں کو لکھنے پڑھنے میں ذرا آسانی ہو گئی ہے۔

اس زبان میں تیسری مشکل اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں اسموں کے مذکر، مونث اور

بے جنس (Neuter) ہونے کے ساتھ ساتھ صفتوں کا بھی اور بعض حالتوں میں فعلوں کا بھی مذکر، مونث اور بے جنس ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یعنی مذکر اسم کی صفت کا مذکر، مونث اسم کی صفت کا مونث اور بے جنس اسم کی صفت کا بے جنس ہونا ضروری ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ حروف جر کی وجہ سے ہر اسم اور صفت کی شکل بدل جاتی ہے۔ جس سے ایک نو آموز کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ کیونکہ وہ لفظ کی اصلی املا کو بہ آسانی معلوم کر کے اس کو ڈکشنری میں تلاش نہیں کر سکتا۔

چوتھی مشکل یہ ہوتی ہے کہ فعلوں کی Prefix بدلنے سے ان کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ جیسے کہ انگریزی میں فعل کے بعد آنے والے حرف جر کے بدلنے سے ہوتا ہے۔ مثلاً Put on پہننا Put of ملتوی کرنا، Put out بجھا دینا۔

اس کے سوا Accent کے مختلف Syllable پر لگائے جانے سے بھی لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ انگریزی میں بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے لیکن روسی زبان میں یہ تبدیلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ روسی زبان کی نحو بھی غیر ملکی، نو آموزوں کے لئے باعث مشکلات بنتی ہے۔

ڈاکٹر نور محمد مولانا صاحب کے ماسکو سے جانے سے کچھ پہلے روس سے جرمنی اور وہاں سے فرانس چلا گیا تھا۔ کیونکہ اس کو روس میں نہ کوئی قومی سیاسی کام کرنے کی امید تھی اور نہ وہ خوشی محمد کی طرح کمیونسٹ بن کر روسیوں کے ساتھ نباہ کر سکتا تھا، اور نہ ڈاکٹری کی پریکٹس کر کے وہاں اپنا گزارہ کر سکتا تھا۔ وہاں تو سب ڈاکٹر گورنمنٹ کے ملازم ہوتے ہیں، اور جب تک روسی گورنمنٹ کے سیاسی عقائد کے پابند نہ ہوں، ان کو کوئی نوکری نہیں مل سکتی۔ فرانس میں ڈاکٹر نور محمد سردار سپہ سالار محمد نادر خان سے ملا جو امیر امان اللہ خاں کے عتاب کا نشانہ بن کر وزارت حربیہ سے جدا ہو چکے تھے، اور پیرس میں افغانی سفیر تھے۔ ان کی پیرس کی سفارت پر تقرری ایک قسم کی جلاوطنی تھی۔ انہوں نے بعد میں اس عہدے سے بھی استعفاد دے دیا تھا، اور جیسا کہ میں آگے چل کر واقعات کے سلسلہ میں ذکر کروں گا، فرانس کے شہر Menton (منتون) میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ نور محمد فرانس سے سردار سپہ سالار محمد نادر خان کی کوشش اور مدد سے پھر ہندوستان چلا گیا تھا، جہاں اس نے ڈاکٹری کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔

خوشی محمد کو روسیوں نے متعدد دفعہ خفیہ طور پر سیاسی کام کے لئے جرمنی اور فرانس بھیجا۔

اس وجہ سے وہ زیادہ مدت ہمارے ساتھ ماسکو میں نہ رہ سکا۔ کبھی چند ہفتے کے لئے ماسکو آ جاتا تھا، اور پھر جرمنی اور فرانس چلا جاتا تھا۔ اس کے سفر کا کیا مقصد ہوتا تھا، اور روسی اس کو کس کام پر جرمنی اور فرانس بھیجا کرتے تھے اس کا مجھے کبھی علم نہ ہوا۔ اس نے پیرس میں غالباً سنہ ۱۹۲۷ء میں یوگوسلاویہ کی رہنے والی فاطمہ نامی ایک ترکی لڑکی سے جو فرانس میں زیر تعلیم تھی، شادی کر لی تھی اور بعد میں میاں بیوی ماسکو آ کر رہنے لگے تھے۔

میں نے آخری مرتبہ خوشی محمد کو سنہ ۱۹۳۶ء میں ماسکو میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل لکس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام اس نے یاسمین رکھا تھا۔ (۱۲) اس نے مجھے اس ملاقات میں بتایا کہ وہ (غالباً سنہ ۱۹۳۳ء میں) ایک دفعہ کمیونسٹ پارٹی بنانے کے لئے خفیہ طور پر مدراس بھیجا گیا تھا، جہاں اس کو انگریزوں کے ہاتھ پڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس خطرے سے بچ کر ماسکو واپس پہنچ گیا تھا۔ مجھے سنہ ۱۹۵۱ء میں معلوم ہوا کہ سٹالین نے اس کو سنہ ۱۹۳۸ء میں یا سنہ ۱۹۳۹ء میں مروا دیا تھا۔ ڈاکٹر نور محمد اور خوشی محمد کے ساتھ میرا آخری فوٹو جو ماسکو میں لیا گیا تھا یہاں لگایا جاتا ہے۔

(۱۳)

رحمت علی بھی قبلہ مولانا صاحب کی ماسکو سے روانگی کے بعد زیادہ عرصہ وہاں نہیں رہا اور فرانس چلا گیا۔ اس کو کمیونسٹ پارٹی نے کس کام پر وہاں بھیجا، اس کا مجھے علم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ماسکو سے نکلنے کے لئے اس کام کو ذریعہ بنایا تھا۔ کیونکہ مجھے چند سال کے بعد پتہ لگا کہ اس نے پیرس میں بڑی محنت اور جان فشانی کر کے فرانسیسی زبان سیکھی اور فرانسیسی ادبیات کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے طرح طرح کی مشکلات جھیلیں۔ لیکن ان سب کٹھن منزلوں کے باوجود اس کے عزم میں تزلزل نہ آیا، اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ اس پڑھائی کے زمانے میں اس نے سخت غربت کے دن بھی کاٹے۔ اس کے بعد وہ فرانس ہی میں رہنے لگا اور وہیں اس نے شادی بھی کر لی۔ میں نے اس کو ماسکو کے بعد، سنہ ۱۹۴۹ء میں جب میں پاکستان بننے پر لاہور گیا تھا، اتفاق سے جنرل پوسٹ آفس کے پاس دیکھا تھا۔ اس سے وہاں جو باتیں ہوئیں ان سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آنے سے خوش نہ تھا۔ کیونکہ اس کو اس کی خواہش کے مطابق کوئی سرکاری کام نہ دیا گیا تھا۔ وہ صرف فرانسیسی زبان پڑھانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ بعد میں میں نے سنا کہ وہ پھر فرانس چلا گیا۔ جب میں سنہ ۱۹۵۸ء میں ٹرکش فوجی کنٹنجنٹ (contingent)

اور جنیزری بینڈ(Jinissary Band) کے ساتھ یوم جمہوریت پاکستان کی تقریب پر دو ... کراچی اور وہاں سے لاہور گیا. تو مجھے وہاں اس کے بھائی سے اس کا پیرس کا پتہ ملا۔ میں نے ... کو اس پتے پر ایک خط لکھا جس کا جواب دیتے ہوئے اس نے مجھے اپنے ذاتی حالات لکھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اس کے. اس کی فرانسیسی بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ اس کے بعد مجھے اس سے اور خط و کتابت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

میرا یونیورسٹی میں مقالہ لکھنا

تعلیمی سال کے ختم ہونے پر مجھے اور بنیرجی کو مشرقی یونیورسٹی کی طرف سے ایک Thesis لکھنے کو ... یا۔ بنیرجی تو بیماری کا بہانہ کر کے اس سے گریز کر گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک ایسا لمبا چوڑا مضمون جس کے لکھنے کے لئے بہت سی کتابوں کا مطالعہ ضروری تھا اور بڑی محنت کرنا لازمی تھی. تیار کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ لیکن میں نے Indian national movement for freedom (ہندوستانی کی آزادی کی قومی تحریک) پر ایک مقالہ لکھا۔

اس کام کے لئے جن کتابوں کی مجھے ضرورت ہوئی وہ ماسکو میں دستیاب ہو گئیں۔ اس مقالے میں میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی جنگ آزادی صرف مزدوروں اور کسانوں کے ذریعہ سر نہیں ہو سکتی جیسا کہ ... چاہتے ہیں اور کہتے ہیں. بلکہ اس میں کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ درمیانی طبقہ (Bourgeoisie) سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ طبقہ (intelligensia) وغیرہ آبادی کے ہر حصے کا شامل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ انگریز ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔ میرا یہ نظریہ اگرچہ کمیونسٹوں کے نظریہ کے بالکل خلاف تھا لیکن اس جلسے میں جہاں میں نے یہ مقالہ پڑھا اور جس میں میرے سارے استاد اور کومنٹرن کے دو نمائندے تیبل Tibel اور روزنبرگ Rosenberg بھی شامل تھے. مجھے داد دی گئی اور استادوں نے یہ کہا کہ "اگرچہ ہم کو آپ کی رائے سے اتفاق نہیں لیکن مضمون بہت محنت سے اور علمی طور پر تیار کیا گیا ہے"۔ بنیرجی اس جلسے میں شریک نہ ہوا۔ اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ اگرچہ اس کو صرف ذرا سا کام ہی تھا۔

اس جلسے میں کومنٹرن کے نمائندوں نے کہا "کاش کہ ظفر کمیونسٹ ہوتا تو وہ ہمارے آئیڈیل کی بہت خدمت کر سکتا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ کہنے پر اس لئے مجبور ہوئے کہ باقی ہندوستانی طالب علموں میں کوئی اور (بنیرجی اور عبدالحمید مستثنیٰ) میری طرح کالج کا تعلیم یافتہ نہ تھا۔

تعلیمی سال ختم ہونے پر بنیرجی کو ماسکو سے جرمنی بھیج دیا گیا۔ کیونکہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی چاہتی تھی کہ ماسکو کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو آہستہ آہستہ خفیہ طور پر ہندستان بھیج دیا جائے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بنیرجی بھی ہندستان واپس جانے میں کامیاب ہو گیا۔

عبدالحمید کو روسیوں نے کچھ اور ہندوستانیوں کے ساتھ سنہ ۱۹۲۲ء کے وسط میں ہمارے روس پہنچنے سے پہلے ایک مرتبہ پامیر کے راستے ہندستان بھیجا تھا. لیکن وہ پامیر سے افغانی علاقے میں داخل ہو جانے کی وجہ سے وہاں پکڑا گیا تھا۔ بعد میں وہ وہاں سے رہا ہو کر پھر ماسکو پہنچا اور میں نے اس کو ماسکو میں دیکھا تھا۔ میرے ماسکو چھوڑنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کو پھر ہندستان بھیجا گیا۔ میں نے ہندستانی اخبارات میں پڑھا کہ وہ سمندر کے راستے ہندستان میں ایک بناوٹی پاسپورٹ پر داخل ہوا مگر کراچی میں پکڑا گیا اور اس پر پشاور میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی۔

وارث، قربان، صفدر بھی یکے بعد دیگرے خفیہ طور پر اور میرے روس سے روانہ ہونے کے بعد سمندر کے راستے ہندستان پہنچے تھے۔

قربان غالباً سنہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا نمائندہ بن کر استانبول آیا اور اتفاقاً مجھے ایک روز راستے میں ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بلغاریہ اور روس کے قونصلوں سے ملنا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے مزدور پارٹی اور ٹریڈ یونین کے لئے کچھ مدد حاصل کرنے کو استانبول آیا تھا۔ میں نے اس کو منع کیا کہ ان لوگوں سے ملنے کی کوشش نہ کرے، ورنہ اس کو ترکی پولیس قید کر دے گی۔ اس نے ظاہر میں تو مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ان لوگوں سے نہ ملے گا۔ بلکہ پاکستان واپس چلا جائے گا۔

لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہا اور اس نے خفیہ طور پر بلغاری قونصل (قراگوزوف) سے ملاقات کی اور اس کے ذریعے روسی قونصل سے ملنے کی کوشش کی۔ قراگوزوف نے جو خفیہ

طور پر ترکی گورنمنٹ سے ملا ہوا تھا اور دل میں بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے خلاف تھا، اس ملاقات کی خبر ترکی حکومت کو دے دی اور قربان سے جو کچھ اس کی گفتگو ہوئی تھی، وہ بھی ترکی حکومت کو بتائی۔ اس کے بعد قربان استانبول سے واپس پاکستان چلا گیا۔ شاید اس کو ترکی پولیس سے ڈر لگا تھا۔ قراگوزوف نے بھی کچھ مدت بعد بلغاری قونصل خانہ سے بھاگ کر ترکی حکومت کے پاس پناہ لی۔ اس نے بلغاری قونصل خانہ کے سارے راز ترکی گورنمنٹ کو بتائے۔ وہ بعد میں استنبول سے امریکہ چلا گیا۔

فوجی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش

مجھے کالج کے زمانے ہی سے یہ شوق تھا کہ میں فوجی تعلیم حاصل کر کے افسر بنوں۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کو فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا تھا اور وہ انگریزوں کی طرح افسر نہیں بن سکتے تھے۔ وہ تو صرف حوالدار، جمعدار، صوبہ دار بن کر انگریزی فوج میں خدمت کیا کرتے تھے۔ جن کی عزت اتنی کم ہوتی تھی کہ ایک انگریزی رنگروٹ بھی ان کا حکم نہ مانتا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں تو میری یہ آرزو پوری ہو نہیں سکتی تھی۔ افغانستان آ کر میں نے پھر یہی چاہا کہ فوج میں باقاعدہ افسر بنوں۔ لیکن افغانی فوجی کالج اتنے اونچے درجے کا نہ تھا کہ میں اس کی تعلیم سے فائدہ اٹھاؤں۔ اگرچہ میں افغانی وزارت حربیہ میں ملازم تھا، لیکن فوجی تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔ تحریک ہجرت کے بعد جو ہندستانی مہاجر افغانستان آئے ان میں سے سلطان مرزا نامی جیسے چند ایک نوجوانوں کو کابل کے ملٹری سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد افغانی فوج میں افسر بننے کا موقع دیا گیا تھا۔ لیکن اس سکول کی فوجی تعلیم ناقص اور عام تعلیم مڈل سکول کے درجے سے زیادہ نہ تھی۔

روس آ کر میں نے فوج میں بھرتی ہونے اور فوجی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمارے کوہاٹی ساتھیوں میں سے فقیر شاہ روس میں ہوابازی کی تعلیم لے کر روسی ہوائی بیڑے میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے فوجی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ملنے کے لئے M.N.Roy صدر کمیونسٹ پارٹی ہند کی سفارش کی ضرورت تھی۔ روسیوں نے اس کے ذریعہ مجھ سے پوچھا کہ فوجی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کیوں پیدا ہوئی ہے؟ میں نے اس کا جواب یوں دیا تھا۔ "انگریز ہندوستان کو بغیر لڑائی کے کبھی نہ چھوڑیں گے۔ اس جنگ آزادی میں ہندوستان کو

افسروں کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ فنون حرب سیکھوں اور ہندستانیوں کو انگریزوں کے خلاف لڑاؤں اور جب ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے تو میں خود بھی مورچہ بنا کر اور Barricade لگا کر ان سے لڑوں"۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ M.N.Roy اپنی پرانی ہندو ذہنیت کی وجہ سے کالج کے تعلیم یافتہ ایک ہندستانی مسلمان کے فنون حرب سیکھنے کو شبہ سے دیکھتا تھا اور اس کو ڈر لگتا تھا کہ اگر ہندستان میں انگریزوں سے حقیقی لڑائی ہو جانے کی حالت میں ایک مسلمان اس میں کمانڈر بن گیا تو پھر ہندستان پر مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے فوج میں داخل ہونے میں میری مدد نہ کی۔

قبلہ مولانا صاحب کے ماسکو سے چلے جانے کے بعد میری مالی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ اس زمانے میں ماسکو میں چوروں کی کثرت کی وجہ سے بورڈنگ ہاؤس سے ایک دفعہ میرے فل بوٹ (Longboots) اور دوسری دفعہ میرا اوور کوٹ بھی چوری ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ بمبئی کرانیکل میں روس کے حالات کے متعلق ہفتہ وار ایک خط شائع کراؤں اور وہاں سے جو کچھ پیسہ ملے اس سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کیا کروں۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے روسی حکومت سے اجازت لینا ضروری تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں روس کے اندرونی حالات کے متعلق کوئی نامہ نگار ایسی اجازت لئے بغیر باہر کے اخبارات میں کچھ نہ لکھ سکتا تھا۔ اسی طرح غیر ملکی اخبارات بھی کسی شخص کے نام باہر سے نہ آ سکتے تھے۔ جو اخبار باہر سے روس میں آتے تھے وہ روسی وزارت خارجہ کے نام آتے تھے اور اس کے کتب خانہ یا قرائت خانہ (ReadingRoom) میں رکھے جاتے تھے۔ ان کو پڑھنے کی بھی ہر شخص کو اجازت نہ ہوتی تھی۔ بعض انگریزی دانوں کو ان کے پڑھنے کی حکومت کی طرف سے اجازت دی گئی تھی۔ چنانچہ مجھے بھی ایسی اجازت مل گئی تھی، اور میں کبھی کبھی وہاں جا کر انگریزی اخبار پڑھ لیا کرتا تھا۔

مجھے بمبئی کرانیکل میں آرٹیکل لکھنے کی اجازت رائٹرز اور بعض واقفوں کے ذریعہ کمینٹرن اور وزارت خارجہ سے مل گئی۔ کمینٹرن نے یہ شرط لگائی کہ میرے آرٹیکلوں کو کمنٹرن کا ملازم روزنبرگ سنسر کیا کرے گا۔ اور صرف اس کی منظوری کے بعد یہ مقالات روس سے باہر بھیجے جا سکیں گے۔ میں نے چار و ناچار یہ شرط منظور کر لی۔ روسیوں نے مجھے بمبئی کرانیکل کو آرٹیکل

بھیجنے کی اجازت صرف اس خیال سے دی تھی کہ ان کے پسند کردہ مضامین ہندستان میں شائع ہوں گے اور اس طرح روس کے خلاف جو پروپاگنڈا انگریز وہاں کیا کرتے تھے اس کا کچھ نہ کچھ توڑ ہوتا رہے گا۔

اس کے بعد میں نے سید عبداللہ بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل کو ایک خط لکھا اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ میرا ہفتہ میں ایک خط اپنے اخبار میں چھاپے اور اس کے عوض مجھے جو کچھ رقم دے سکے اس کو میرے لئے ماسکو بھیج دیا کرے۔ اس نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اس پر میں ہر ہفتہ روس کے حالات کے بارے میں ایک آرٹیکل لکھ کر روزنبرگ کو دکھلاتا اور اس کی منظوری کے بعد اس کو بمبئی کرانیکل کو بھیج دیا کرتا تھا۔ روزنبرگ میرے آرٹیکلوں میں کافی کانٹ چھانٹ کیا کرتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء کے شروع میں لینن مرا جس سے روسی کمیونسٹ پارٹی اور روسی حکومت کی بنیادوں کے ہل جانے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اس پر روسی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے اور لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنے کیلئے (Slogan) کے طور پر ایک گیت بنایا جسکے سب سے اہم مصرعے کے معنی یہ تھے "لینن اگرچہ تو مر گیا ہے لیکن (تیری بنائی ہوئی) کمیونسٹ پارٹی زندہ ہے" اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں پر واضح کیا جائے کہ لینن کی موت سے ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اس لئے ان کو گھبرانا یا بددل نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کی بنائی ہوئی کمیونسٹ پارٹی زندہ ہے اور اس کے پروگرام کو چلاتی رہے گی۔

میں نے لینن کی وفات پر جو آرٹیکل لکھا اس میں یہ بات واضح کی کہ کمیونسٹ پارٹی اپنا پروپاگنڈا کرنے میں اتنی ہوشیار واقع ہوئی ہے کہ لینن کی موت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور اس کی موت کو روسی لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنے کے لئے ایک آلہ کار بنانا چاہتی ہے۔ جب اس آرٹیکل کو میں نے روزنبرگ کو دکھلایا تو وہ بڑا سیخ پا ہوا اور کہنے لگا کہ "آپ ہماری مصیبت کے زمانے میں جب کہ ہماری پارٹی اور حکومت کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، ہمارے متعلق لکھتے ہیں کہ روسی لینن کی موت کو اپنا پروپاگنڈا پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے ہیں"۔ اس نے میرے آرٹیکل کا یہ حصہ بالکل حذف کر دیا اور باقی ماندہ مضمون کے بھیجنے کی اجازت دے دی۔

لینن کے جنازے پر ماسکو کے لوگ جوق در جوق (Redsquare) (سرخ میدان) کے

ارد گرد جہاں اس کی لاش دفن کی جانے والی تھی، جمع ہو گئے تھے۔ اس روز ماسکو میں سخت سردی تھی۔ کہتے ہیں کہ ماسکو میں اتنی سردی صرف ۱۸۰۹ء میں نپولین کے ماسکو پر حملہ آور ہونے کے دنوں میں پڑی تھی۔ روسی عام طور پر سخت سردی برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن اس روز میں نے دیکھا کہ گلیوں میں اور سرخ میدان میں پہرہ داروں کو آگ جلانے اور اس پر ہاتھ سینکنے کی ضرورت پڑی۔

سرخ میدان کے ارد گرد اس وقت لوہے کا جنگلا لگایا گیا تھا تاکہ لوگ بدانتظامی سے میدان میں نہ بھر جائیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی اس جنگلے پر چڑھ کر میدان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے مگر سردی کی وجہ سے لوہے کی سلاخیں اتنی ٹھنڈی ہو گئی تھیں کہ اس لڑکی کے ہاتھ جنگلے کو چپک کر رہ گئے اور لڑکی درد سے بے ہوش ہو گئی۔

میرے آرٹیکل کوئی چھ ماہ تک بمبئی کرانیکل میں چھپتے رہے۔ آخر میں میں نے سید عبداللہ بریلوی سے اپنے آرٹیکلوں کا معاوضہ مانگا۔ اس نے مجھے صرف پانچ پونڈ بھیجے۔ یہ رقم میرے کام کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ جس سے مجھے اپنی ضروریات کے پورا کرنے میں کوئی بڑی مدد نہ مل سکتی تھی۔ اس لئے میں نے آرٹیکل لکھنے بند کر دیئے۔

انہی دنوں سردار محمد ہاشم خان برادر خورد سردار سپہ سالار محمد نادر خان ماسکو میں افغانی سفیر مقرر ہو کر آئے۔ وہ چونکہ میرے پرانے مہربان اور دوست تھے، میں مہینے میں ایک دو دفعہ افغانی سفارت خانہ میں جا کر ان سے مل آیا کرتا تھا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے رائسنر (Reisner) کے ذریعے روسی وزارت خارجہ کو ضرور اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ کیونکہ روس میں غیر ملکی سفارت خانے سخت شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے کارکن جاسوس سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے ان سے لوگوں کے ملنے ملانے کو روسی گورنمنٹ اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ ہر سفارت خانے کے سامنے روسی سنتری موجود ہوتا تھا، جو ظاہر میں تو سفارت خانے کی حفاظت کے لئے تھا، مگر اصل میں سفارت خانہ میں آنے جانے والوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ سفارت خانے کے روسی ملازم، نوکر اور نوکرانیاں وغیرہ سفارت خانہ میں جو کچھ دیکھتیں، اس کے متعلق روسی پولیس کو اطلاع دینے اور سفارت خانہ میں آنے جانے والوں کے بارے میں رپورٹ لکھنے پر مجبور تھے۔

روسیوں کو غیر ملکی سفارت خانہ کے کارکنوں کا. باہر سے روس میں کھانے پینے کی چیزیں

لانا اور پر تکلف دعوتیں دینا اور پیٹ بھر کر کھانا کھانا بھی بہت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں بعض اوقات کنایہ سے کہہ دیتے تھے کہ "روسی لوگ تو فاقہ کشی میں ہیں لیکن خارجی لوگ ہمارے ملک میں رہ کر دعوتیں اور ضیافتیں کرتے رہتے ہیں اور مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں"۔

روسیوں کی یہ شکایت بالکل بے معنی تھی کیونکہ غیر ملکی لوگ اپنے پیسے سے کھانے کی چیزیں دوسرے ملکوں سے یا اپنے وطن سے خرید کر روس میں لاتے تھے اور وہاں گزارہ کرتے تھے۔ روس میں کھانے کی قلت تھی اور اچھی خوراک بہم نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ لیکن اس میں غیر ملکی لوگوں کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ اس قحط سالی کی وجہ روسی انقلاب اور اس کے بعد کی خانہ جنگی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ افغانی سفارت خانہ کے روسی ملازمین نے میرے بارے میں بھی رپورٹ دی کہ میں سفارت خانہ میں پلاؤ، گوشت اور نفیس کھانے کھاتا ہوں۔ یہ شبہ میرے دل میں اس لئے پیدا ہوا کہ ایک دن رائسنر نے کچھ مذاق میں اور کچھ سنجیدگی سے کہا کہ "افغانی سفارت خانہ میں جا کر پلاؤ کھانے سے اب آپ کے چہرے پر سرخی آگئی ہے"۔ رائسنر جانتا تھا کہ میں مقوی دوا کے انجکشن لے رہا ہوں۔ اس کے باوجود بھی اس کو یہی شبہ تھا کہ میں افغانی سفارت خانہ میں اکثر جاتا ہوں اور وہاں باقاعدہ طور پر کھانا کھاتا ہوں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ رائسنر جیسا آدمی بھی جس کو میں مفت اردو سبق پڑھایا کرتا تھا اور جس کو اس وجہ سے میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا، یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ میں افغانی سفارت خانہ میں آیا جایا کروں۔

قبلہ مولانا صاحب سے خط و کتابت۔

قبلہ مولانا صاحب کے استنبول پہنچنے پر عزیز احمد نے مجھے خط لکھ کر ان کا استنبول کا پتہ بتایا۔ اس کے بعد میری ان کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی لیکن میرے خطوط کا جواب عزیز احمد کے قلم سے ہوتا تھا۔ ان خطوط سے معلوم ہوا کہ ترکی پہنچنے پر مولانا صاحب پہلے تو انقرہ گئے تھے اور وہاں عصمت پاشا وزیر اعظم ترکی سے ملے تھے۔ لیکن یہ ملاقات چنداں کامیاب نہیں

کہی جا سکتی، کیونکہ مولانا صاحب اور عزیز احمد انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور انقرہ میں اس زمانے میں کوئی اردو دان ترک نہ ملتا تھا۔ مولانا صاحب عصمت پاشا سے صرف ایک عربی بولنے والے ترجمان کے واسطے سے گفتگو کر سکے۔ ترجمان کی عربی کچھ اچھی نہ تھی اور مولانا صاحب بھی اس زمانے میں عربی اچھی طرح نہیں بول سکتے تھے۔ اس وجہ سے قبلہ مولانا صاحب اپنے ترکی آنے کے مقصد کو عصمت پاشا پر اچھی طرح واضح نہ کر سکے، اور نہ اس ملاقات میں سیاسی امور پر چنداں بحث ہو سکی۔ اس ملاقات کا فائدہ صرف اتنا ہوا کہ ترکی حکومت نے مولانا صاحب کو استنبول میں آرام سے رہنے کی اجازت دے دی۔ لیکن کسی قسم کی مالی مدد نہ دی۔

اس خط و کتابت کے سلسلے میں میں نے قبلہ مولانا صاحب کو اپنا ایک فوٹو ماسکو سے بھیجا تھا۔ اس فوٹو کے پیچھے میں نے یہ عبارت لکھی تھی۔

"ہو اللہ۔ اپنے محترم اور مکرم کی خدمت عالی میں بطور اظہار اخلاص کیشی تقدیم کرتا ہوں۔ ماسکو ۱۴ جون سنہ ۱۹۲۴ء ظفر حسن"

اس کے جواب میں عزیز احمد نے بھی قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ جولائی ۱۹۲۴ء میں کھنچوایا ہوا اپنا فوٹو مجھے بھیجا تھا۔ (۱۴)

میرا فوٹو گرافی سیکھنا۔

یونیورسٹی میں دوسرے تعلیمی سال کے خاتمہ کے نزدیک ہماری جماعت کے طالب علموں کو فوٹو گرافی، چھاپے خانے (Printing press) کا کام اور موٹر رانی جیسے چھوٹے چھوٹے پیشے سیکھنے کے لئے کہا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے پیشے سیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ جب ماسکو کی مشرقی یونیورسٹی کے طالب علم اپنے اپنے ملک میں خفیہ طور پر جا کر کمیونسٹ اصولوں پر کام کریں تو اپنی شخصیت اور ہیئت کو چھپانے اور وہاں اپنا گزارہ کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں کوئی معصومانہ پیشہ ہو، اور وہ اس بہروپ سے خفیہ خفیہ کمیونسٹ پروپاگنڈا پھیلاتے رہیں اور ٹریڈ یونین بناتے رہیں۔ میں نے اپنے چند ایک ہم جماعتوں کے ساتھ فوٹو گرافی سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے ایک فوٹو گرافر ہمارے لئے استاد کے طور پر مقرر ہوا۔ کچھ مدت کی مشق کے بعد اس نے ہمیں تصویر اتارنے اور نیگٹو فلموں یا شیشوں کو ڈیویلپ کرنے کی اجازت دے دی اور اس کام کے لئے جتنے کیمیکل مادے ضروری تھے، وہ بھی فراہم کر دئے۔

ڈاچا (گرمی میں رہنے کا بنگلہ)

زار کے زمانے میں روس کے مالدار اور شریف لوگوں کے شہر سے باہر کسی دریا یا جھیل یا سمندر کے کنارے یا ملک کے اندرونی حصہ میں Pine (چلغوزہ) کے درختوں کے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بنگلے ہوتے تھے جہاں وہ روس کی آٹھ یا نو ماہ چلنے والی سخت سردیوں کے بعد دھوپ اور کھلی ہوا سے فائدہ اٹھانے کے لئے گرمی کے دنوں میں رہا کرتے تھے۔ ان بنگلوں کو روسی زبان میں ڈاچا کہتے ہیں۔ بولشویکی انقلاب کے بعد مال دار لوگوں کے شہر کے اندر کے گھر، کارخانے، جائدادیں اور زمینیں اور ڈاچے وغیرہ حکومت کی طرف سے ضبط کر لئے گئے تھے اور ان کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ زار کے سارے خاندان کو سائبیریا کے شہر Ekatenberg میں تہ تیغ کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ماسکو کے بہت سے مال داروں کو عین موسم سرما میں جب کہ دریائے ماسکو کا پانی جما ہوا تھا، دریا میں برچھیوں کے زور سے دھکیل کر ڈبو دیا گیا تھا۔ اب حکومت کے ملازمین کو باری باری گرمی کے دنوں میں کچھ تھوڑے سے کرایہ پر حکومت کی طرف سے یہ ڈاچے (بنگلے) عارضی طور پر رہنے کو دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ یہاں دو تین ماہ تفریح سے وقت بسر کر سکیں۔

رائسنر کے باپ کو جو ایک پروفیسر تھا ایسا ہی ڈاچا جو دریائے ماسکو کے نزدیک ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا، گرمی کے دن گزارنے کے لئے دیا گیا۔ میں بھی وہاں ایک دو مرتبہ اتوار کے دن گیا۔ ایک روز رائسنر نے کہا کہ "دریائے ماسکو میں نہانے کے لئے چلیں"۔ میرے پاس تیرنے اور دریا میں نہانے کو کپڑے (Bathingsuit) نہ تھے۔ اس لئے میں نے تو عذر کیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس قسم کے کپڑوں کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ رائسنر اور اس کے باپ نے بے تکلف کپڑے اتارنے شروع کر دیئے اور دونوں کے دونوں مادر زاد ننگے ہو گئے۔ اس سے مجھے تو بڑی شرم آئی اور ان کی طرف نہ دیکھ سکا۔ لیکن وہ بالکل بے تکلف باہم باتیں کرتے ہوئے دریا میں نہانے چلے گئے اور نہانے کے بعد ریت پر لیٹ گئے اور وہاں بھی اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر کپڑے پہن کر گھر آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ دریائے ماسکو میں ایک طرف سینکڑوں عورتیں اور ذرا دور دوسری طرف سینکڑوں مرد ننگے دھڑنگے نہا رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

روسیوں میں اس طرح دریا اور سمندر میں بالکل ننگے ہو کر نہانا اور پھر دریا یا سمندر کے کنارے ریتلی زمین (Beach) پر دھوپ میں لیٹ جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس کے چند ماہ بعد جب میں ترکی آنے کے وقت، بحر اسود کی بندرگاہ (اڈیسہ) میں آیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں تو عورتیں اور مرد اکٹھے ہو کر بالکل ننگے دھڑنگے مل جل کر سمندر میں نہاتے تھے اور Beach کی ریتلی زمین پر لیٹ کر اپنے بدن کو دھوپ میں سینکتے تھے۔ سرد ملکوں کے رہنے والے لوگ جن کو ۸ یا ۹ ماہ سردی کے موسم میں سورج کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا اسی طرح دھوپ میں لیٹا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

روسی لیڈروں میں نفاق۔

لینن کی موت کے بعد، اس کی جانشینی اور پارٹی کی سرداری کے بارے میں روسی کمیونسٹ لیڈروں میں باہمی رقابت شروع ہوئی جو آگے چل کر نفاق اور خونین کشمکش کا باعث بنی۔ ظاہر میں تو یہ رقابت کمیونسٹ اصولوں اور لینن کے طرز عمل کی تفسیر کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کا اصل مقصد روسی گورنمنٹ کو اپنے قبضہ میں کرنا تھا۔

روس میں اس وقت دو رقیب کمیونسٹ فریق موجود تھے۔ ان میں سے ایک فریق کا لیڈر ٹروٹسکی (Trotsky) تھا جو روسی انقلاب کے شروع سے آخر تک لینن کا دایاں ہاتھ بنا رہا۔ دوسرے فریق کا لیڈر سٹالین (Stalin) تھا جو لینن کے مرض فالج میں مبتلا ہونے پر روسی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری بن گیا تھا۔

ٹروٹسکی اور اس کے طرف داروں کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک جرمنی، فرانس، انگلستان اور امریکہ جیسے دنیا کے بڑے بڑے صنعتی اور ترقی یافتہ ملکوں میں کمیونسٹ اصولوں پر انقلاب نہ ہو جائے اس وقت تک روس میں کمیونسٹ انقلاب کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ روس میں کسان تعداد میں مزدوروں سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ حالانکہ کمیونسٹ انقلاب صرف مزدوروں کے بل بوتے پر قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے صنعت و حرفت کے لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں، جہاں کارخانوں کے مزدور تعداد میں زیادہ اور ٹریڈ یونینوں میں منسلک ہونے کی وجہ سے قوی تر ہیں، کمیونسٹ انقلاب کرانا چاہئے اور روس کے لئے ضروری ہے کہ اس کام کے لئے

ان ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو ہر طرح کی مدد دے کر ان ملکوں کی سرمایہ دار حکومتوں کا خاتمہ کرائے اور وہاں پولیٹریٹ کی ڈکٹیٹر شپ یعنی مزدوروں کی مطلق العنان حکومت قائم کر دے. تاکہ روس میں موجودہ کمیونسٹ انقلاب کی جڑیں مضبوط ہو سکیں۔

اس کے بر خلاف سٹالین اور اس کے طرف داروں کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک روس میں کمیونسٹ اصولوں پر قائم شدہ حکومت بطور نمونہ دنیا کے سامنے نہ آئے اس وقت تک باہر کے ملکوں میں کمیونسٹ انقلاب پیدا کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے ان کے خیال میں سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ روس میں کمیونسٹ انقلاب کو مضبوط بنایا جائے اور یہاں کمیونسٹ اصولوں کو پوری طرح جاری کیا جائے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر روس ایک بڑی طاقت نہ بنا, تو وہ دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ انقلاب پیدا نہیں کرا سکتا۔ سٹالین کا یہ نظریہ ہنگری میں Bellakun اور جرمنی میں Spartacus کے کمیونسٹ انقلاب کے ناکام رہنے پر اور بھی زور پکڑ گیا۔ اس پر سٹالین نے روسی کمیونسٹ پارٹی کی ساری تنظیم پر آہستہ آہستہ مگر بڑی چالاکی سے قبضہ کر لیا اور ٹروٹسکی اور اس کے طرف داروں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ ٹروٹسکی روس سے نکل کر استانبول میں پناہ گزیں ہوا جہاں سے وہ پیرس اور اس کے بعد میکسیکو چلا گیا۔ لیکن اس کو وہاں سٹالین کے ایک طرف دار نے قتل کر دیا۔ روس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈر جن میں روس کا وزیر اعظم Rykov اور کومنٹرن کا صدر Zinoviev اور ماسکو کی مجلس کا پریزیڈنٹ Kaminov بھی شامل تھا سٹالین کی طرف سے. پارٹی کے ساتھ خیانت کرنے کے جرم میں تہ تیغ کرا دیئے گئے تھے۔ یہ مقابلہ سنہ ۱۹۳۰ء تک جاری رہا جس کے بعد سٹالین روس کا بے رقیب اور مطلق العنان لیڈر بن گیا۔

میری ترکی کو روانگی

ماسکو کے اس سیاسی ماحول کی وجہ سے اور روس کی لا مذہب حکومت کے ماتحت دو سال رہنے سے میری طبیعت بہت تنگ آ گئی تھی اور میرے دل میں ایک ایسے ملک کی فضا میں زندگی بسر کرنے کی تمنا روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی جہاں ضمیر کی آزادی ہو اور جہاں انسان اپنے مذہبی اور سیاسی عقائد پر کھلم کھلا عمل کر سکے اور ان کا اظہار بھی کر سکے۔ لیکن روس سے نکلنے کے لئے مجھے

اس وقت کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس وجہ سے میری بے چینی ہر روز بڑھتی جاتی تھی۔ خدا کی شان کہ انہی دنوں میں, عزیز احمد کے خطوط سے معلوم ہوا کہ قبلہ مولانا صاحب ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالنے, اس پارٹی کا پروگرام بنانے اور آزاد ہندستان کے لئے ایک نظام اساسی (Constitution) تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ عزیز احمد کے خطوط سے قبلہ مولانا صاحب کی ان کوششوں کے بارے میں کچھ تفصیلات بھی معلوم ہوئیں اور جو پارٹی پروگرام انہوں نے بنانے کا ارادہ کیا تھا, اس کا خلاصہ بھی ان خطوط میں موجود تھا۔ مجھے یہ پروگرام ذرا قدامت پسندانہ نظر آیا۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک روز اس مسئلے کا ذکر رائنسر سے کیا اور اس کو کہا کہ ”اگر میں مولانا صاحب کے ساتھ ہوتا تو یہ پروگرام بہت تجدد پسند اور ریڈیکل ہو سکتا تھا۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ وہ اس پروگرام کو چھپوا کر شائع کریں, یہ ضروری ہے کہ میں استانبول جا کر ان سے بات کروں اور اس پروگرام کو دنیا کے موجودہ حالات کے مطابق بنانے کے لئے اس میں کچھ تبدیلیاں کراؤں۔

رائنسر کو میری یہ تجویز پسند آ گئی۔ اس نے اگلے دن ہی روسی وزارت خارجہ سے میرے استانبول جانے کی اجازت لے لی۔

میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ میرے پاس روزمرہ کے استعمال سے زیادہ جو کچھ پہننے کا سامان رہ گیا تھا, اس کو دو بکسوں میں بند کر کے سردار محمد ہاشم خاں سفیر افغانی مقیم ماسکو کے حوالے کیا, اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو کسی مناسب ذریعہ سے مجھے استانبول بھیج دیں۔ انہوں نے دو ماہ بعد یہ سامان ایک ترکی کوریئر (سیاسی ڈاکیہ) کے ہاتھ مجھے استانبول بھجوا دیا۔ استانبول جانے کے لئے ترکی سفیر مقیم ماسکو احمد مختار بے نے جن سے مولانا صاحب کے قیام ماسکو کے دوران میری ملاقات ہو چکی تھی مجھے ویزا (visa) بآسانی دے دیا۔

رسکولنیکوف نے, جو روسی کمیونسٹ پارٹی کا ایک اہم رکن تھا اور جو مولانا صاحب کے قیام کابل کے زمانے میں افغانستان میں روسی سفیر رہ چکا تھا, اور جس سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے مولانا صاحب کے نام ایک پیغام مجھے دیا جس میں اس نے اس کی سیاسی کامیابی کی تمنا کی اور ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

ماسکو سے میں ۵/ اگست سنہ ۱۹۲۴ء کو اوڈیسہ روانہ ہوا جو بحر اسود پر روس کی سب سے

بڑی بندر گاہ ہے۔ میں نے اپنی عمر میں سمندر اور بحری جہاز پہلی دفعہ یہیں دیکھا۔ سمندر میں اس روز طوفان آیا ہوا تھا۔ ہوا بڑے زور سے چل رہی تھی جس سے سمندر کی موجیں سر بہ فلک چڑھتی نظر آتی تھیں۔ سمندر کا یہ حال دیکھ کر مجھے بہت ڈر لگا۔ بندر گاہ میں جتنے جہاز تھے، وہ سب موجوں کی وجہ سے ڈگمگا رہے تھے۔ ایسی حالت میں اس جہاز کی روانگی بھی جس پر میں استانبول جانے والا تھا، ناممکن تھی۔ اس لئے میں اوڈیسہ میں تین دن ٹھہرنے پر مجبور ہوا۔

اوڈیسہ کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے روسی کمیونسٹ پارٹی کا ایک ممبر ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ماسکو سے میرے متعلق کوئی پیغام پہنچا تھا۔ یہ شخص میرا مہمان دار بنا۔ اس نے مجھے نام مستعار کے ساتھ ایک گھر میں مہمان کیا اور میرے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں ایک بڑے ضروری اور خفیہ کام پر ترکی جا رہا ہوں۔

قیام اوڈیسہ سے فائدہ اٹھا کر میں ذرا بازار کی سیر کو نکلا۔ دکانوں میں مال تو تقریباً ندارد تھا۔ لیکن ایک فوٹو گرافر کی دکان پر مجھے چند ایک تصویریں نظر آئیں۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو گرافر اپنے فن کا استاد ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ روس کی آخری یادگار کے طور پر اس سے اپنا ایک فوٹو اتروائوں۔ اس فوٹو گرافر نے جو میری تصویر کھینچی تھی اس کی ایک نقل اس کتاب میں لگی ہوئی ہے۔ (۱۵)

میرے پاس مولوی محمد علی لاہوری کے انگریزی ترجمہ والا قرآن شریف موجود تھا جو میں کابل سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ساتھ ترکی لے جاؤں۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر کسٹمز (Customs) یعنی چونگی کے دفتر میں میرا بکس کھولا گیا تو قرآن شریف اور اس کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر میرا میزبان اور کسٹمز میں کام کرنے والے دوسرے کمیونسٹ میرے ایک مذہبی آدمی ہونے سے خبردار ہو جائیں گے اور مجھ پر شبہ کرنے لگیں گے اور شاید میرے روس سے نکلنے میں بھی رکاوٹ ڈالیں گے۔ اس لئے میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ میرا سامان کسٹمز میں نہ کھولا جائے، ورنہ ترکی جانے میں جو میرا راز ہے وہ فاش ہو جائے گا۔ وہ قائل ہو گیا اور چونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا اوڈیسہ میں ایک بارسوخ رکن تھا، اس نے میرے بکس کو کسٹمز میں کھولنے نہ دیا۔ لیکن اس نے میری دوربین جو میں افغانستان سے اپنے ساتھ لایا تھا یہ کہہ کر مجھ سے لے لی کہ روس سے دوربینیں باہر نہیں لے جائی جا سکتیں۔ میں نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ کیونکہ میں جلد از جلد اور بغیر کسی رکاوٹ کے روس سے نکلنا چاہتا تھا۔

اپنی روانگی سے ایک دن پہلے میں نے کہا مجھے ماسکو سے جو زادِ راہ کے طور پر ۵۰ پونڈ دیئے گئے تھے وہ میرے لئے کافی نہ ہوں گے، اس لئے مجھے کچھ اور روپیہ دیا جائے۔ اس پر اس نے مجھے ۲۵ پونڈ اور دے دئے۔ لیکن اس کے عوض میں مجھ سے میرا فونٹین پن یہ کہہ کر لے لیا کہ یہ قلم اس کے پاس میری ایک یادگار کے طور پر رہے گا۔

اس زمانے میں روس میں ایسے قلم بالکل نایاب تھے۔ میں نے اس پر بھی اعتراض نہ کیا اور اگلے دن خیریت سے جہاز پر سوار ہو کر استانبول کو روانہ ہو گیا۔

میرا ترکی پہنچنا

اوڈیسہ سے ہمارے جہاز کی روانگی کے وقت طوفان ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے اس سمندری سفر میں جو میری زندگی میں سب سے پہلا جہاز کا سفر تھا کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ جہاز ۴۸ گھنٹے کے بعد بحر اسود سے بوسفورس (Bosphorus) میں داخل ہوا۔ یہ آبنائے، بحر اسود اور بحیرہ مرمرہ کے درمیان ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر سبز سبز پہاڑیاں ہیں جن پر جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ اور سرخ کھپریل کی چھتوں والے بنگلے موجود ہیں۔ نیچے بے لہر سمندر کا نیلا پانی اور اوپر بے ابر نیلا آسمان نظر آتا تھا۔ سبز، سرخ رنگوں کی باہمی آمیزش نے اس نظارے کو بہت ہی روح افزا بنا دیا تھا۔ یہ آبنائے کوئی ۲۵ میل لمبی ہے لیکن اس کے کنارے کی پہاڑیاں کئی جگہ سمندر میں چلی گئی ہیں۔ اس وجہ سے یہ آبنائے ایک لمبی نہر سے زیادہ، متعدد جھیلوں کا مجموعہ سا معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا جہاز اس دل افروز منظر میں کوئی دو گھنٹے چلنے کے بعد آبنائے کے ایک کھلے حصے میں پہنچا جہاں سے استانبول کا شہر، اس کے تاریخی شاہی محلات، مسجدوں کے سر بہ فلک اور فن معماری کے شاہکار مینارے، جن کی نظیر ترکی کے سوا اور کسی اسلامی ملک کی مسجدوں میں نہیں ملتی، نظر آنے لگے۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا کہ اس کو دیکھ کر میں مسرت کے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ آج میری وہ دیرینہ تمنا جو میرے دل میں استانبول دیکھنے کے لئے مولانا شبلی مرحوم کے سفرنامہ ترکی اور سر عبدالقادر مرحوم کے ماہ نامہ رسالہ (مخزن) کو پڑھ کر لڑکپن کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی، پوری ہو رہی تھی۔ خدا نے مجھے دنیا کے خوبصورت ترین قدرتی مناظر کے بیچ میں بسے ہوئے اس شہر میں آنے کا موقع دیا، جس کی فتح کی خوشخبری مسلمانوں کو رسول اللہ (صلعم) نے

(عربی)

لَتَفْتَحَنَّ الْقُسْطُنْطِنِيَّةَ فَلَنِعْمَ الْأَمِيرُ أَمِيرُهَا وَلَنِعْمَ الْجَيْشُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ

(ترجمہ) "تم فتح کرو گے قسطنطنیہ کو، پس مبارک ہے وہ امیر جو شہر کا امیر ہوگا اور مبارک ہے وہ لشکر جو اس کا لشکر ہوگا"

کے الفاظ میں دی تھی۔ جو چار سو سال مقام خلافت اسلامیہ رہ چکا تھا اور جس کو نہ صرف ترکی قوم بلکہ اس قوم کے سب مسلمان دوست اپنے لئے ایک عزیز ترین امانت سمجھتے ہیں اور جو یورپ اور ایشیا کے دو براعظموں کی سرزمین پر واقع ہونے کی وجہ سے دنیا میں ایک بے مثل شہر مانا جاتا ہے۔

ہمارا جہاز بندر گاہ میں ایسی جگہ لنگر انداز ہوا جہاں سے دائیں طرف یوروپین ساحل پر شہر کے پرانے حصہ میں قصر طوپ قاپو، جامع مسجد سلیمانیہ، نیلی جامع مسجد (یعنی جامع سلطان احمد) جامع مسجد ایا صوفیہ اور برج بایزید وغیرہ اور شہر کے نئے حصہ میں قصر دولما باغیچہ اور برج غلطہ وغیرہ اور ان دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی شاخ زریں (Golden horn) کی خلیج نظر آتی تھی اور بائیں ہاتھ کو ایشیائی ساحل پر اسکدار (سقوطری) قلعہ سیلمیہ حیدر پاشا کا ریلوے اسٹیشن جو ایشیائی ریلوے کا ٹرمینس ہے اور قاضی کوئی، شہر کے ایشیائی حصے دکھائی دیتے تھے۔

میں جہاز سے یوروپین ساحل پر اترا اور محلہ سرکہ جی میں جو شہر کے پرانے حصہ میں ہے، ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ٹھہرا۔ یہ اسٹیشن یوروپین ملکوں سے آنے والی ریلوے لائن کا ٹرمینس ہے۔ یہاں سے میں قبلہ مولانا صاحب سے ملنے کے لئے محلہ آق سرائے گیا۔

ہندوستانی خانقاہ

قبلہ مولانا صاحب محلہ آقسرائے میں ہندوستانی خانقاہ کی پہلی منزل پر ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اسی منزل پر دوسرے کمرے میں عزیز احمد صاحب کا بستر لگا ہوا تھا۔ خانقاہ کی اوپر کی

☆ یہ خانقاہ آقسرائے کے محلے میں حرجادہ سی گھر نمبر ۶۵ میں ہے۔

منزل میں متولی (مجاور) اور اس کے اہل و عیال رہتے تھے۔ یہ شخص ایک سن رسیدہ افغان تھا۔

یہ خانقاہ دو منزلہ ہے اور اس کے اردگرد ایک چھوٹا سا باغ اور ایک قبرستان ہے۔ اس کے احاطے کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد ہے (یہ مسجد اب گر گئی ہے)۔ گو یہ عمارت بہت ہی معمولی نظر آتی ہے لیکن اس کی تاریخی قیمت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یہاں سلطان ٹیپو مرحوم کا ایک کمانڈر مدفون ہے، جس کی قبر پر سر کی طرف ایک پتھر پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

(یہاں کتبہ اس کی موجود ترتیب کے مطابق نقل کیا جاتا ہے)

هوالخالق الباقی

مرحوم و مغفور

محمد امام سردار

عسکر ایلچی ٹیپو سلطان

ھندروحنہ فاتحہ

سنہ ۱۲۰۲ ہجری

مرحوم محمد امام اس وفد کے ساتھ دار الخلافہ استانبول میں آئے تھے جو سنہ ۱۷۸۷ء میں سلطان ٹیپو مرحوم نے سید غلام علی کی سرکردگی میں سلطان ترکی عبد الحمید خان اول کی خدمت میں (جو سنہ ۱۷۷۴ء سے لے کر سنہ ۱۷۸۹ء تک سریر آرائے سلطنت رہے تھے) بھیجا تھا۔ یہ وفد سلطان ٹیپو مرحوم کے خطوط کے ساتھ بہت سے تحفے تحائف بھی لایا تھا۔ اس وفد میں سیاسی نمائندوں کے ساتھ پیادہ سپاہی اور سوار بھی تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے خدمت گار بھی تھے۔ ان سب کی تعداد محمود بنگلوری نے اپنی کتاب موسومہ بہ صحیفہ سلطان ٹیپو صفحہ ۳۰۰ پر (۵۰۱) لکھی ہے۔ اس وفد میں سردار محمد امام کے زیر کمان (۱۰۰) پیادہ سپاہی تھے۔ اس وفد نے جو خطوط سلطان عبد الحمید خان اول اور صدر اعظم کی خدمت میں پیش کئے تھے، وہ استنبول میں صدارت عظمیٰ کی Archives (خزینہ اوراق) میں نویں رجسٹر (دفتر نامہ نہم) کے صفحے ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۹، ۲۲۰ پر درج ہیں۔ میں نے یہ خطوط صدارت عظمیٰ کے خزینہ اوراق میں خود دیکھے ہیں۔

اس وفد کو اس وقت کے ترکی صدر اعظم قوجا یوسف پاشا نے استانبول کے قصر سعد آباد کی

سیر گاہ میں ۱۰ محرم ۱۲۰۲ھ (۲۳ اکتوبر ۱۷۸۷ء) کے دن باریابی بخشی تھی۔ اس وفد کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف اتحاد کرنا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان ٹیپو نے سلطان عبدالحمید خان اول کو یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ وہ بصرہ کی بندر گاہ کو ہندوستانی تاجروں کے لئے کرایہ پر دے دیں، جہاں وہ تجارتی منڈیاں کھول سکیں۔ اس کے عوض سلطان ٹیپو ترکوں کو تجارتی منڈیاں کھولنے کے لئے بنگلور کی بندر گاہ کرایہ پر دینے کو تیار ہے۔ سلطان ٹیپو نے نجف اشرف میں شیعہ زائرین کے لئے ایک نہر بنانے کے لئے بھی سلطان ترکی سے اجازت مانگی تھی۔

اس زمانے میں فرانس نپولین بوناپارٹ کے ماتحت انگریزوں کے خلاف یورپ میں بر سر پیکار تھا اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے سلطان ٹیپو سے اتحاد کر چکا تھا۔ لیکن نپولین کے مصر پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے اس کی سلطنت عثمانیہ سے دشمنی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسی سال سلطنت عثمانیہ کے تعلقات روس اور آسٹریا کے ساتھ بگڑے ہوئے تھے، اور لڑائی کی نوبت آرہی تھی۔ اس لئے سلطان ٹیپو کے وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

وفد کے قیام استانبول کے دوران وفد کے ممبروں میں طاعون پھیلا۔ غالباً محمد امام صاحب اس مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے اور ہندوستانی خانقاہ کے باغ میں دفن کئے گئے۔ جہاں ان کی قبر ابھی تک موجود ہے۔

عبدالرحمٰن ریاض بابر

اس وقت ہندوستانی خانقاہ کا (جس کو قبلہ مولانا "ہندوستانی منزل" کہا کرتے تھے) مجاور (متولی) ایک افغان تھا۔ اس کے خلاف عبدالرحمٰن ریاض بابر (بہار کے رہنے والے ایک ہندوستانی مذہبی عالم) نے مقدمہ چلایا ہوا تھا کہ ہندوستانی خانقاہ کا متولی ایک ہندوستانی ہونا چاہئے۔ عبدالرحمٰن ریاض نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی اور پہلی جنگ عظیم سے پیشتر بیت المقدس کے زاویہ ہندی (ہندوستانی خانقاہ) کے (متولی) شیخ مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کے خلاف ترکی فوجوں کی مدد میں بڑے کارنامے کئے تھے۔ جب بیت المقدس ترک فوجوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ استانبول آ گئے۔ استانبول پر

انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کا سنہ ۱۹۲۰ء میں قبضہ ہو جانے پر ان کو انگریزوں نے پکڑ کر قید میں ڈال دیا اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں۔ جب سنہ ۱۹۲۲ء میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کے زیر کمان ترکی فوجوں نے یونانیوں کو شکست دے کر استانبول پر دوبارہ قبضہ کر لیا، تو ترکی حکومت نے عبدالرحمٰن ریاض کی بڑی قدر و منزلت کی۔ ان کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور ان کو جائداد دی۔ بعد میں وہ ترکی جنرل ہیڈ کوارٹرز (ادارہ ارکان حربیہ عمومیہ) میں کام کرنے لگے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستانی خانقاہ کی متولیت ان کو ملنا چاہئے کیونکہ وہ بیت المقدس میں زاویہ ہندی کے شیخ تھے اور بیت المقدس ترکوں کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد استانبول کی ہندوستانی خانقاہ کا متولی بننا ان کا حق ہے۔ یہ مقدمہ مدتوں چلتا رہا۔ آخر کار افغانی متولی کی وفات کے بعد ان کو ہندوستانی خانقاہ کا شیخ (متولی) یعنی مجاور مقرر کر دیا گیا۔ (۱۶)

قبلہ مولانا صاحب کی استانبول میں رہائش

قبلہ مولانا صاحب نے اپنے ذاتی اخراجات کے لئے کبھی کسی شخص کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا تھا۔ ان کو ہمیشہ اپنے خدا کے خزانہ غیب سے مدد ملنے کا یقین تھا۔ خداوند کریم بھی ان کے گزارے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دیتا تھا۔ ترکی میں رہتے ہوئے ترکی حکومت کی طرف سے کوئی وظیفہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ اپنا گزارا اسی روپے پر کر رہے تھے جو ان کے پاس روس میں موجود تھا۔ استنبول آکر میں نے وہ تھوڑی سی رقم جو میرے پاس تھی، ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس لئے ان کو کچھ تنگی پیش نہ آئی۔ اس وقت استنبول میں زندگی سستی تھی۔ قارئین کو اس زمانے کی قیمتوں کا اندازہ کرنے میں مدد دینے کے لئے یہ واقعہ ذکر کرتا ہوں۔

میرے استنبول آنے کے دو دن بعد عزیز احمد نے مجھے محلہ سرکہ جی کے ایک رسٹورانٹ میں کھانے کی دعوت دی۔ یہاں ہم نے شوربا، گوشت اور پلاؤ کا آرڈر دیا۔ ان تین قسم کے کھانوں کے لئے انہوں نے ۴۰ قروش ادا کئے، یعنی فی آدمی ۲۰ قروش کھانے پر لگے۔ شام کا کھانا بھی اسی طرح ۲۰ قروش میں کھایا جا سکتا تھا۔ صبح کا ناشتہ ۱۰ قروش کا ہوتا تھا۔ یعنی اس طرح ۵۰ قروش یعنی نصف ترکی لیرے میں ایک دن گزارہ ہو سکتا تھا۔ (اس زمانے میں ایک انگریزی

پونڈ ۶،۵ ترکی لیرے کے مساوی تھا اور ہندوستان میں اس کی قیمت ۱۳ روپے تھے۔ یعنی ایک لیرا دو روپے کے مساوی تھا۔ اس زمانے میں اگر گھر میں کھانا پکایا جائے تو اس سے بھی کم داموں پر گزارہ کیا جاسکتا تھا۔ قبلہ مولانا صاحب کا کھانا، ایک ہندستانی مہاجر جس کا نام فتح محمد تھا، گھر پر ہی پکایا کرتا تھا۔ عزیز احمد قبلہ مولانا صاحب کی دوسری خدمات سرانجام دیتے تھے۔ (آج ساری دنیا میں جس طرح گرانی ہوگئی ہے اسی طرح ترکی میں بھی ہر چیز مہنگی ہے۔ اس وقت جو ایک وقت کا کھانا ۵۰ قروش یعنی نصف ترکی لیرے میں خریدا جاسکتا تھا، آج اسی قسم کے کھانے پر ۲۵ لیرے لگتے ہیں یعنی زندگی اب ۵۰ گنا مہنگی ہوگئی ہے۔ ☆

☆ یہ ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ اب وہی کھانا (۱۹۸۸ء میں) پندرہ سو اور دو ہزار لیرے کے قریب ملتا ہے، افراط زر کا چکر ہنوز جاری ہے۔

سولھواں باب

استانبول کے قیام کے دوران ہماری سیاسی سرگرمیاں

میرے استانبول میں آنے کے چار روز بعد مولانا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے مکان کے نزدیک کسی ہوٹل میں رہوں تاکہ ان کے ہاں پیدل آنے جانے میں اور ان سے اکثر اوقات ملنے میں آسانی ہو۔ اس پر میں سرکہ جی سے محلہ فاتح کے رشادیہ ہوٹل میں چلا آیا جو ہندوستانی خانقاہ سے پیدل کوئی دس منٹ کے فاصلہ پر تھا۔ قبلہ مولانا صاحب سے اس پروگرام پر جو وہ ہندوستان کی پوری آزادی حاصل کرنے والی پارٹی کے لئے اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لئے بطور ایک آئین (Constitution) کے لکھ رہے تھے میری اب ہر روز گفتگو ہوتی تھی۔ بعض اوقات گرما گرم بحث تک نوبت آجاتی تھی۔ ان مباحث کے نتیجہ میں اس پروگرام میں ترمیمیں کی گئیں۔ یہ سلسلہ کوئی ایک ماہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس پروگرام نے جو آخری شکل اختیار کی اس کا ذکر تفصیل سے میں آگے چل کر کروں گا۔

لاجپت رائے کا استانبول آنا

قبلہ مولانا سے گفتگو کے درمیان مجھے معلوم ہوا کہ میرے ترکی آنے سے پہلے لاجپت رائے استانبول آیا تھا۔ اس سے مولانا صاحب نے چچرن سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور اس کو بتایا تھا کہ آئندہ ہندوستان کی آزادی کے لئے افغانستان کے راستے انڈین نیشنل کانگرس کو روسی مدد پہنچائی جائے گی۔ لاجپت رائے افغانستان کا نام سن کر بہت پیچ پا ہوا۔ قبلہ مولانا نے مجھے بتایا کہ ان کے خیال میں لاجپت رائے نے ہندوستان جاکر یہ خبر اپنے سیاسی گرو مدن موہن مالوی کو پہنچائی جس

سے ہندوستان میں ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم تعلقات سخت خراب ہو گئے۔ ان تعلقات کے خراب ہونے میں لاجپت رائے کا کتنا دخل تھا اس کو آج پوری طرح معلوم کرنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لاجپت رائے اور دوسرے ہندو، ہندوستان کی تحریک آزادی میں کسی اسلامی ملک کا اور خاص کر افغانستان کا دخل اور تعاون کبھی بھی برداشت نہ کرتے تھے حقیقتاً ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم اتحاد ایک بڑے امتحان سے گزرا تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی کا استانبول آنا

قبلہ مولانا سے باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے ترکی آنے سے پہلے عبدالرحمٰن صدیقی ۱۹۲۴ء کے شروع میں استانبول آئے تھے۔ صدیقی صاحب پاکستان بننے کے بعد ایک وقت مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تھے اور جنگ بلقان کے زمانے (۱۹۱۲ء) میں انصاری طبی مشن کے ساتھ استانبول کے مضافات میں (چتالجہ) کے محاذ پر رہ چکے تھے۔ مولانا صاحب نے ان سے اپنی روس کی کارروائیوں اور بچرن سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا اور ان کو بتایا تھا کہ بچرن سے تحریک آزادی ہند کے بارے میں ایک سمجھوتا ہو گیا ہے۔ قبلہ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ انھوں نے صدیقی صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ ساری کیفیت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بتا دیں۔ قبلہ مولانا نے صدیقی صاحب کو اس کام کے لئے بطور سفر خرچ (۱۰۰) پونڈ دیئے جو انھوں نے اس کام کے لئے روسی قونصل خانہ سے عزیز احمد کے ذریعے حاصل کئے تھے (قبلہ مولانا نے اپنی ذاتی ضروریات کے لئے کبھی روسیوں سے پیسہ نہیں لیا تھا لیکن سیاسی مقاصد کے لئے اس دفعہ اور اس کے بعد دو مرتبہ اور ان سے مدد لی تھی) افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن صدیقی نے یہ پیغام ڈاکٹر انصاری کو نہیں پہنچایا۔ اس کا پتہ ہمیں ڈاکٹر انصاری کے استانبول آنے پر اور اس مسئلہ کے متعلق ان سے پوچھنے پر لگا۔

ڈاکٹر انصاری کا استانبول پہنچنا

میرے استانبول آنے کے کوئی ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۵ء کے ماہ اگست کے آخر میں ڈاکٹر انصاری یورپ سے خلافت کمیٹی ہند کے نمائندے کی حیثیت سے استانبول آئے۔ قبلہ مولانا

صاحب عبدالرحمٰن ریاض، عزیز احمد اور میں نے ترکی زعما کے ساتھ ان کا (سرکہ جی) کے ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا۔ وہ بوسفورس کے کنارے طرابیہ کے مشہور ہوٹل میں جمعیت ہلال احمر ترکی کے مہمان ہو کر رہے۔ ان کے ترکی آنے کا مقصد یہ تھا کہ ترکی ارباب حکومت سے مل کر خلافت اسلامیہ کو کسی دوسری شکل میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ اپنے اس مقصد کو سمجھانے کے لئے ترکی وزیر اعظم عصمت پاشا سے انقرہ جا کر ملے لیکن ان کو اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

قبلہ مولانا نے ڈاکٹر انصاری سے پوچھا کہ آیا عبدالرحمٰن صدیقی نے ان کی سیاسی کارروائیوں اور روس کے ساتھ ان کے سمجھوتے کی خبر ان کو پہنچائی تھی یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ "ان کو کوئی ایسی خبر نہیں دی گئی ہے اور وہ عبدالرحمٰن صدیقی سے اس زمانے میں کبھی نہیں ملے ہیں"۔ اس پر قبلہ مولانا کو بڑا تعجب ہوا اور مایوسی بھی ہوئی کہ عبدالرحمٰن صدیقی جیسا شخص اپنے وعدے کو پورا کرنے سے قاصر رہا اور جو روپیہ ان کو اس کام کے لئے دیا گیا تھا وہ بھی انھوں نے ہضم کر لیا۔ ہمیں کبھی بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ عبدالرحمٰن صدیقی نے کیوں یہ خبر ڈاکٹر انصاری کو نہ پہنچائی۔

عبدالرحمٰن پشاوری

قبلہ مولانا کی استانبول کی سیاسی کارروائیوں کے ذیل میں ان کی اور عبدالرحمٰن پشاوری کی باہمی گفتگو اور ملاقاتوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ عبدالرحمٰن پشاوری کابل کی ترکی سفارت سے واپس آکر رؤف بک کے ہاں رہا کرتے تھے جو جنگ بلقان میں حمیدیہ کروزر کے کمانڈر کی حیثیت سے، یونانی جنگی اور تجارتی بیڑے کو تارپیڈو کے ذریعہ تتر بتر کر کے ایک ترکی سورما کے درجے کو پہنچ گئے تھے اور جنگ استقلال ترکی کے بعد وزیر اعظم جمہوریت ترکی بنے تھے۔ روف بک کی والدہ نے ان کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ قبلہ مولانا کے ۱۹۲۳ میں استانبول آنے سے پہلے، ترکوں نے انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کو استانبول سے نکال کر اس شہر پر ۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پھر قبضہ کر لیا تھا۔ وحیدالدین سلطان (انگریزوں کا طرفدار) اس سے پہلے ہی ۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو استنبول سے بھاگ کر انگریزی جنگی جہاز میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔ اس طرح پر سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی تھی اور ملک میں اس کی جگہ جمہوری نظام قائم ہو گیا تھا جس کے صدر غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک

چنے گئے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد صرف خلافت باقی رہ گئی تھی اور عبدالمجید خان خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے تھے۔

لیکن پہلی جنگ عظیم میں عربوں کا شریف حسین والئ مکہ مکرمہ کے ماتحت ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے انگریزوں سے مل جانا اور ترکوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کو مدد دے کر، آخر کار حجاز، فلسطین، اور شام کے صوبوں کا ترکوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا سبب بننا، دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں کا خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خان مرحوم کے ۱۹۱۵ء میں شائع کردہ فتوئ جہاد پر کان نہ دھرنا اور ہندوستانی مسلمان فوجوں کا عراق اور فلسطین کے محاذوں پر ترکوں کے خلاف لڑنا، ایسے واقعات تھے کہ جن کی وجہ سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتا ترک، جنھوں نے سلطنت عثمانیہ کی پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد اس کے کھنڈروں پر نئی اور آزاد ترکی جمہوری حکومت کی بنیادیں رکھی تھیں، مسلمانان عالم کی اس بیوفائی اور لاپروائی سے سخت دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی نئی حکومت کو اتنا طاقتور نہ سمجھتے تھے کہ غلام مسلمان ملکوں کی حمایت کر کے اپنے ملک کو امپریالسٹوں کے غیظ و غضب کا پھر نشانہ بنائیں۔ اس لئے انھوں نے ترکی سے خلافت اسلامیہ کو اٹھا دیا اور خلیفہ عبدالمجید خان کو ۳ مارچ ۱۹۲۴ء میں ترکی سے دیس بدر کر دیا۔

لوزان کے معاہدہ صلح پر دستخط ہو جانے کے بعد ۱۹۲۴ء میں ترکی داخلی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ رؤف بک کی بجائے عصمت پاشا صدر اعظم بنے۔ ملک میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی بنائی ہوئی جمہوری خلق پارٹی کے مقابلے میں جمہوری ترقی پرور پارٹی بنی جس کے لیڈر رؤف بک اور جنرل کاظم قرہ بک پاشا تھے۔ یہ پارٹی پرانی ترکی روایات کو قائم رکھنے کی طرفدار تھی۔ اگرچہ بہ ظاہر اس نے خلافت اسلامیہ کے ترکی سے اٹھا دیئے جانے کو منظور کر لیا تھا لیکن ان تمام اصلاحات کے برخلاف تھی جو جمہوری خلق پارٹی ملک میں ہر روز جاری کر رہی تھی۔ اس لئے جمہوری ترقی پرور پارٹی پر قدامت پسندی کا الزام لگایا جاتا تھا۔

عبدالرحمٰن پشاوری قبلہ مولانا کو ترکی کی داخلی سیاست اور دونوں پارٹیوں کی باہمی رقابتوں اور جھگڑوں کا حال سنانے اکثر ہندوستانی خانقاہ میں آیا کرتے تھے۔ قبلہ مولانا ترکی سے خلافت اسلامیہ کے مٹ جانے کے بعد اس کوشش میں تھے کہ کم از کم ترکی میں ایک بین المسلمین یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے کے لئے موجودہ ترکی جمہوری حکومت ان کو اجازت دیدے تاکہ وہ اس

طرح پر اسلامی شیرازے کو ایک حد تک پھر قائم کر دیں۔ اس لئے انھوں نے رؤف بک سے ملنا چاہا اور عبدالرحمٰن پشاوری سے اس ملاقات کا انتظام کرنے کو کہا۔ (۱۷)

قبلہ مولانا کے ساتھ اس ملاقات میں ترجمانی کرنے کے لئے میں ان کے ساتھ رؤف بک مرحوم کے گھر گیا۔ رؤف بک بہت شستہ انگریزی بولتے تھے۔ اس ملاقات کے دوران میں جنرل کاظم قرہ بک پاشا بھی موجود تھے۔

گفتگو کے دوران قبلہ مولانا نے رؤف بک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی پارٹی کے پروگرام میں استانبول میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کو بھی داخل کر لیں۔ روف بک نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ایسی تجویز انھوں نے اپنے پارٹی پروگرام میں داخل کی تو جمہوری خلق پارٹی جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے، ان پر اتحاد اسلام اور پرانی رواتیوں کو پھر زندہ کرنے کی تہمت لگائیگی اور اس طرح ان کی پارٹی کو ترکی کے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہ سے گرادے گی۔

قبلہ مولانا نے یہ جواب سن کر اس ملاقات کو اور طول دینا مناسب نہ سمجھا اور رؤف بک سے رخصت لے کر ہندوستانی خانقاہ کو واپس آگئے۔ لیکن ان کو رؤف بک کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی کہ میں نے عمر بھر کبھی ان کو اتنا ناامید نہ دیکھا تھا۔ ان کی مسلمانوں کو پھر ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اس لئے ان کی بے چینی کی انتہا نہ رہی تھی۔ میں ان سے جدا ہو کر شام کو ہوٹل کو چلا گیا اور رات بھی اسی سوچ میں لگا رہا کہ قبلہ مولانا کو میں کس طرح تسلی دوں۔ لیکن اگلے روز جب میں پھر ان سے ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کی طبیعت میں ذرا سکون آگیا ہے اور انھوں نے اپنے خدائے لایزال کے کرم سے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کوئی نیا راستہ پانے کی امید پر سہارا لگا لیا ہے۔

ترکی ارباب قلم سے میرا تعارف

میرے استانبول آنے کے چند روز بعد عزیز احمد نے میری ملاقات اخبار سبیل الرشاد کے اڈیٹر اشرف ادیب بک سے کرائی۔ یہ شخص ترکی Law College کا تعلیم یافتہ ہے اور مذہبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف ہے۔ اخبار سبیل الرشاد میں زیادہ تر مذہبی مقالات نکلتے تھے۔ اس شخص نے بعد میں (کتب خانہ آثار علمیہ) کے نام سے ایک بک ہاؤس کھولا تھا جس میں ترکی مذہبی کتابوں کے علاوہ مختلف غیر زبانوں سے مذہبی کتابوں کے ترکی ترجمے چھاپے

جاتے تھے۔ اس شخص کے دفتر میں میری ملاقات محمد عاکف بک سے ہوئی تھی جو ترکی کے مشہور قومی شاعر تھے۔ انھوں نے ترکی قومی ترانہ لکھا تھا اور ترکی کی جنگ آزادی کے سخت مایوس کن زمانے ۲۲۔ ۱۹۲۱ء میں ترکی قوم کے دل میں فتح و نصرت کی امنگ ابھاری تھی۔

اس دفتر میں، میں سلیمان نظیف بک سے بھی ملا، جو ترکی کے مشہور ہجو گو شاعر اور ایک زمانے میں جب عراق ترکی کے ہاتھ میں تھا بغداد میں گورنر رہ چکے تھے۔ یہیں خلیل خالد بک سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانے میں بمبئی میں ترکی قونصل جنرل رہ چکے تھے اور لنڈن کی یونیورسٹی میں ترکی ادبیات کے پروفیسر تھے۔

اخبار "وقت" کا ایڈیٹوریل اسٹاف

اخبار "وقت" کے دفتر میں جو اس زمانے میں ترکی کا ایک مشہور روزنامہ تھا، اخبار کے اڈیٹر عاصم بک اور ان کے بھائی حقی طارق بک سے میری ملاقات میرے استانبول آنے کے کچھ ہی دن بعد ہو گئی تھی۔ حقی طارق بک اس زمانے میں ترکی قومی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور اخبار "وقت" میں مقالے بھی لکھا کرتے تھے۔ اسی اخبار میں راسم بک بھی جو عاصم بک کا چھوٹا بھائی ہے، کام کرتا تھا۔ اخبار کے منتظم رفیق احمد بک نامی ایک ادیب تھے وہ اس کے بعد ترکی ریڈیو کے ادارے میں مدیر نشریات بنے تھے۔

اس اخبار میں مزاحیہ مضامین حقی سہا بک جو ترکی زبان کے معلم بھی تھے اور نور الدین آرتام بک معلم ادبیات ترکی لکھا کرتے تھے۔ نور الدین بک اصل میں ایک وزیرستانی پٹھان (ملا) کی اولاد سے تھے۔ آپ کی خانقاہ استانبول کے مضافات میں (چنگل کوئی) میں تھی جہاں اکثر جمعہ کی نماز کے بعد (جب تک خانقاہیں قانوناً کھلی ہوئی تھیں) سماع کی محفل لگتی تھی۔ اس محفل میں مثنوی مولانا روم علیہ الرحمتہ کے اشعار ترنم سے پڑھے جاتے تھے اور اس کے ساتھ بانسری بجائی جاتی تھی۔ مولوی درویش (یعنی مولانا روم علیہ الرحمتہ کی طریقت کے پیرو) وجد کی حالت میں آ کر محفل میں رقص کیا کرتے تھے۔

سماع کی یہ محفلیں، جب تک ترکی میں خانقاہیں مسکین لوگوں اور مفت خوروں کی پناہ گاہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۲۷ء میں بند نہ کی گئیں جاری رہیں۔ آج کل مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمتہ کے مزار پر شہر قونیہ میں صرف ان کی برسی کے موقع پر دسمبر کے مہینے میں ایسی محفلیں منعقد

ہوتی ہیں۔

نور الدین آرتام بک اپنے والد کی وفات پر اپنی خانقاہ کے، جس کو (افغانی تکیہ) کہا جاتا تھا مجاور مقرر ہو گئے۔ ترکی میں مجاور یا متولی کے لئے شیخ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں خانقاہیں قانوناً بند ہو جانے کے بعد ان کو یہ لقب بھی چھوڑنا پڑا۔ (۱۸)

نور الدین آرتام بک نے ٹیگور کی دو تین کتابیں اور کپلنگ Kipling کی کتاب موسومہ Jungle book کا ترکی میں ترجمہ کیا تھا۔ اخبار وقت کے لئے انگریزی اخبار سے مقالات اور خبروں کا ترجمہ عمر رضا دوغرول بک کیا کرتے تھے۔ وہ وسط اناطولیہ کے ایک ترکی خاندان سے تھے مگر مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے عربی اور انگریزی سیکھی تھی۔ وہ اخبار وقت کے علاوہ ولید ابو ضیا بک کے اخبار توحید افکار میں سیاسی مقالات بھی لکھا کرتے تھے۔

ان کو ترکی زبان کے علاوہ عربی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس لئے وہ ترکی زبان میں ان غیر زبانوں سے ترجمہ کرنے والے بہترین ادیب تھے۔ وہ مذہبی عالم بھی تھے۔ انھوں نے رسول اللہ (صلعم) کی سیرت کے متعلق عربی اور انگریزی سے متعدد کتابیں ترکی میں ترجمہ کی تھیں۔ انھوں نے ایک زمانے میں سلامت نام کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا جس میں قسط وار علامہ اقبال کے لیکچروں Reconstruction of religious Thought in Islam کا ترکی میں ترجمہ شائع کیا تھا۔ بعد میں وہ اخبار جمہوریت میں سیاسی مضامین پر مقالے لکھنے لگے۔ بر صغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی پر انھوں نے بہت سے مقالے لکھے تھے۔ پاکستان بننے پر وہ مؤتمر اسلامی میں شریک ہونے کے لئے ترکی نمائندے کے طور پر کراچی بھی گئے تھے۔ وہ ترکی کے قومی شاعر عاکف بک کے داماد تھے۔

اس زمانے میں میں نے اخبار وقت کے اڈیٹوریل سٹاف میں سے جواد فہمی باشقوت بک کو انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ نوجوان چونکہ ترکی میں میرا پہلا شاگرد تھا۔ میں نے اس سے فیس نہیں لی۔ جواد فہمی بک آگے چل کر اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے موجودہ ترکی کے سب سے بڑے ڈرامانویس کے درجے پر پہنچے۔ وہ ہر سال استانبول شہر کے میونسپل تھیٹر کے لئے ایک نیا ڈرامہ لکھتے تھے جو ترکی کے دوسروں شہروں میں بھی دکھلایا جاتا ہے۔ لوگ ان ڈراموں کو جو بڑے سبق آموز ہوتے ہیں بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کا ایک ڈراما (یونان) میں بھی سٹیج پر دکھایا گیا۔ وہ اس کے علاوہ ایک ہفتہ وار اخبار میں بھی اخلاقی مضامین لکھتے تھے۔ مدتوں اخبار

جمہوریت کے منتظم رہ چکے تھے اس کے علاوہ استنبول کی اکادمی صحافت میں معلم تھے۔ چالیس سال میرے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رہے۔

اخبار وقت کے سٹاف ممبروں سے اکرم بک اور سلیم راغب بک بھی مجھ سے انگریزی پڑھنے لگے تھے اور مجھے فیس دیا کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان سب لوگوں نے انگریزی باقاعدہ طور پر نہ پڑھی جس سے وہ کچھ زیادہ انگریزی نہ سیکھ سکے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے انھوں نے کچھ مدت بعد سبق چھوڑ دیا۔ اکرم بک اور سلیم بک نے بعد میں اخبار وقت سے جدا ہو کر اپنا صون ساعت نام ایک روزنامہ نکالا۔ اکرم بک کی وفات کے بعد اس اخبار کو سلیم بک نے کچھ مدت چلایا۔ وہ بعد میں ترکی پارلیمنٹ کا ممبر بھی بنا لیکن ۱۹۶۰ء کے انقلاب کے زمانے میں قید کر دیا گیا تھا۔ بعد میں بیماری کی وجہ سے اس کو رہا کر دیا گیا۔

تیجا سنگھ آزاد اکالی کے حالات

میرے استانبول پہنچنے کے بعد پہلی اتوار کو ہندوستانی خانقاہ میں میری ملاقات تیجا سنگھ نام ایک اکالی نوجوان سے ہوئی جو ترکی کیڈٹ (ملٹری کالج کے طالب علم) کی وردی پہنے ہوئے تھا۔

ملاقات کے دوران معلوم ہوا کہ تیجا سنگھ کو اکالی تحریک کے لیڈروں نے خفیہ طور پر کابل پہنچایا تھا۔ وہاں اس کو ترکی سفیر جنرل فخر الدین ترک قان پاشا کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی۔ جنرل موصوف ان ترکی سورماؤں میں سے تھے جنھوں نے پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کے مقابلہ میں بہادری دکھا کر اپنا نام جریدہ عالم پر ثبت کر دیا تھا۔ جنرل فخر الدین ترک قان پاشا کا لقب محافظ مدینہ منورہ ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں جب شریف مکہ مکرمہ (حسین) نے ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت کرائی، ایک مٹھی بھر ترکی فوج کے ساتھ مدینہ منورہ کی باغی عربوں کے مقابلے میں حفاظت کی تھی اور جنگ ختم ہونے کے باوجود مدینہ منورہ کو شریف حسین کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پاشا مرحوم اکالیوں کی، انگریزوں کے مقابلے میں جان بازانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بہت قدر کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے تیجا سنگھ کو ترکی میں فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے استانبول بھیج دیا تھا۔ تیجا سنگھ نے استانبول آکر آزاد لقب اختیار کر لیا اور وہ ملٹری کالج میں اسی نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ ایک جوشیلا اکالی نوجوان تھا، اور سکھوں کی ہیت کذائی میں لمبی ڈاڑھی اور کیس کے ساتھ ترکی ملٹری کالج میں پڑھ رہا تھا حالانکہ اس کے

سب ہم جماعت سر کے بال کٹواتے اور ڈاڑھی منڈوایا کرتے تھے۔ (۱۹)

ملٹری کالج کے طالب علموں کو سنیچر کے دن دوپہر کے بعد سے لے کر اتوار کی شام تک چھٹی ملتی تھی۔ جن طالب علموں کے رشتہ دار استانبول میں رہتے تھے وہ سنیچر اور اتوار کی درمیانی رات کو ان کے پاس گزار سکتے تھے لیکن باقی اور سب طالب علم سنیچر اور اتوار کی درمیانی رات کو بھی ملٹری کالج میں واپس آکر وہاں سونے پر مجبور تھے۔ اس وجہ سے تیجا سنگھ بھی یہ رات کالج ہی میں بسر کرتا تھا۔ اس کو امریکہ کی غدر پارٹی سے کچھ مالی مدد ملا کرتی تھی۔ لیکن یہ مدد بہت تھوڑی تھی اس لئے وہ بڑی کفایت شعاری سے گزارہ کرنے پر مجبور تھا یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے پاس ٹراموے کا ٹکٹ لینے کے لئے بھی پیسہ نہیں ہوتا تھا اور وہ چھٹی کے دن ملٹری کالج سے جو استانبول کے نئے حصہ (محلہ حربیہ) میں واقع تھا، پیدل دس میل چل کر ہندوستانی خانقاہ آیا کرتا تھا اور وہاں اپنے کیس دھویا کرتا تھا۔ اس زمانے میں استانبول کے نئے اور پرانے حصوں کے درمیانی پل پر سے جس کو پل غلطہ کہتے ہیں گزرنے والوں سے ایک قروش ٹیکس لیا جاتا تھا۔ تیجا سنگھ کے پاس کبھی کبھی اس پل پر سے آنے جانے کے لئے دو قروش بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ یہ پیسے کسی ترکی یا ہندوستانی دوست سے قرض لینے پر مجبور ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کی ہمت کبھی بھی نہ ٹوٹی اور وہ باوجود ایسی مشکلات کے باقاعدہ سکول آتا جاتا رہا۔ تیجا سنگھ نے اس زمانے میں جو فوٹو قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ساتھ اور عزیز احمد اور میرے ساتھ اتروائے تھے یہاں لگائے جاتے ہیں۔ (۲۰)

قبلہ مولانا صاحب کا مرتب کردہ سیاسی پروگرام

قبلہ مولانا صاحب نے بحث و مباحثہ کے بعد ترمیم کر کے، ہندستان کی آزادی اور آزاد ہندستان کی حکومت کے لئے جو پروگرام مرتب کیا تھا اس کے اہم مواد کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

یہ پروگرام ذیل کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا

(۱) ہندستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندستان میں ایک وفاقی Federal نظام حکومت قائم کرنا۔

(۲) ہندستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

(۳) ہندستان میں محنت کش طبقہ کی (یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی) اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کے سبز باغ دیکھ کر لوگ دھوکہ نہ کھائیں۔

(۴) امپیریالزم (سامراج) کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

سروراجیہ پارٹی

ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے والی پارٹی کا نام قبلہ مولانا نے سروراجیہ پارٹی رکھا تھا۔ (سرو کے معنی ہندی میں "سب کے" ہیں۔) اس لئے اس پارٹی کے نام کے معنی سب کا راج قائم کرنے والی پارٹی ہے، جو سب لوگوں کی، رنگ، مذہب، مال و دولت کے فرق کے بغیر حکومت قائم کرے گی۔

یہاں پروگرام کے اردو ایڈیشن کا سرورق اور آخری صفحہ نقل کیا جاتا ہے۔

چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

☆

نیشنل کانگریس میں تحریک آزادی ہند

کا دوسرا دور

یعنی

کانگریس کمیٹی کابل کا سروراجی نظام

اور

مہا بھارت سروراجیہ پارٹی کا پروگرام

۱۳۰۳ھ

۱۹۲۴ء

ہو کے بے خوف بڑھیں راہ روان دہلی

استنبول

محمود بک مطبعہ سی

پروگرام کے اردو ایڈیشن کا آخری صفحہ

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ہندوستانی منزل	عبید اللہ	ظفر حسن
آق سرائے، استانبول	پریذیڈنٹ کانگرس	سیکرٹری

سرواراجیہ کمیٹی کابل سروراجیہ کمیٹی کابل کانگرس سروراجیہ کمیٹی کابل

۲ میزان ۱۳۰۳ھ، ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء

اس سے کمیونسٹوں کے پروگرام کا شروع ہی سے توڑ ہو جاتا ہے کیونکہ کمیونسٹ صرف مزدوروں (Prolitariats) کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں زمینداروں، سوداگروں اور کارخانہ داروں کو نمائندگی کا حق نہیں ہوتا۔

پارٹی ممبر شپ

سروراجیہ پارٹی کے ممبروں کے لئے قبلہ مولانا صاحب نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ اپنے طرز زندگی کو ملک کے کسانوں کے درجہ زندگی سے بلند نہ کریں گے یعنی اتنی ہی آمدنی پر گزارہ کریں

گے جتنی کہ ایک اوسط درجے کے کسان کی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ جو ان کی آمدنی یا جائداد ہوگی اسے وہ پارٹی کو دیدیں گے۔

نظام توافق

پارٹی ہندستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی مانے گی۔ بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا؛

جغرافیائی حیثیت سے ہندستان شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک جمہوری ملک قرار دیا جائے گا جس کی جمہوری حکومت کو معاملات خارجہ، معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام امور پر اختیار حاصل ہو گا (مثلاً اس طرح شمال مغربی ہندوستان (مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور گجرات) جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ مشرقی اور جنوبی ہندوستان بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومت ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم و رواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر خود ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک وفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں باہم مل کر، مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

مجلس قانون سازی

ان جمہورتیوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا۔ لیکن ہر اجتماعی طبقہ Social Class یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ، تاجر اور کارخانہ دار مجلس قانون سازی میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقے سے نمائندے چنے گا۔ اس

طرح ان جمہورتیوں کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہوگی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول

فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دیدیئے جائیں گے۔ انفرادی اور ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی معین حد سے زیادہ جائداد اور مال قومی ملکیت ہو گا)۔

مال داروں پر متزائد ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فی صدی ہوگی۔

ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا (ان جمہورتیوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی پارٹی، فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابو حنیفہ کے فیصلہ کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی)

ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔

سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا اور محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باق کر دیئے جائیں گے۔

قومی ملکیت میں دیئے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصہ دیا جائے گا۔

محنت کش طبقہ کو مفت طبی امداد دی جائے گی اور اس کے لئے ستھرے گھر مہیا کئے جائیں گے۔

ابتدائی اور مڈل سکولوں کی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔

داخلی تجارت کواپریٹو سوسائٹیں کے ہاتھوں میں ہوگی لیکن سوداگران کواپریٹو سوسائٹیں میں داخل ہو کر ان کے ممبر بن سکیں گے۔

خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگی۔

ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا سٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ مذہب پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریت ہند

Central Govt. of the Federated Republics of India

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں۔

مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کریں گی۔

بین الممالک تعلقات

امپیریالزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لئے ایشیاٹک فیڈریشن بنائی جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔

(اس زمانے میں روس نے اپنی موجودہ امپیریالسٹ سیاست قائم نہ کی تھی اگرچہ اس نے استبدادی حکومتوں کا قلع قمع کرنے کے بہانے سے بخارا اور خیوہ پر اپنے پٹھو مسلمان کمیونسٹوں کے ذریعہ قبضہ کر لیا تھا لیکن ان کو اور آذر بائیجان اور ترکستان کی جمہوریتوں کو خارجی ملکوں میں سفیر بھیجنے کا اختیار دے رکھا تھا)

روس کو ایشیاٹک فیڈریشن میں شامل کرنے میں یہ مقصد مدنظر تھا کہ اس سے انگریزی امپیریالزم کے خلاف مدد لی جائے اور اس کو آزادی کے بعد ہندوستان کے معاملات میں، محنت کشوں کی حمایت کے بہانے سے دخل اندازی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

مندرجہ بالا خلاصے سے قارئین کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پروگرام کے ذریعہ، مذہبی سوال کو درمیان میں لائے بغیر ہندستان میں رہنے والی اقلیتوں کی ہستی کو محفوظ کرنا اور ہندستان کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک جگہ جمع کرنا اور ان علاقوں میں اسلام کو سرکاری مذہب بنانا اور مسلمانوں کا ہندستان کے اندر رہ کر اپنی ہستی اور اپنی تہذیب کو محفوظ رکھنا ممکن تھا۔

۱۹۲۴ء میں جب یہ پروگرام مرتب کیا گیا تھا ہندستان کی فضا اور ہندو مسلم تعلقات اتنے خراب نہ تھے جیسے کہ ۱۹۳۰ء میں اور بعد میں نئی اصلاحات ملنے پر ۱۹۳۷ء میں ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل جدا ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود، قبلہ مولانا صاحب نے دور اندیشی سے ۱۹۲۴ء ہی میں ہندستان کے لئے ایک ایسا وفاقی نظام Federal System تجویز کیا تھا جس میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی

جمہوریتوں کو باہم مل کر اور ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو کر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شامل ہونے کا موقع ملتا اور اس طرح وہ اپنی ہستی اور اپنی تہذیب قائم رکھ سکتے۔ نیز ان کو مرکزی حکومت میں ان کی سیاسی اور فوجی اہمیت اور تناسب آبادی کے مطابق نمائندگی کا حق دینا تجویز کیا گیا تھا۔

پروگرام کا چھپوانا

اس پروگرام کو اردو میں مرتب کرنے کے بعد، ہم نے اس کو استنبول میں چھپوایا۔ لیکن چونکہ ترکی زبان میں (ٹ) (ڈ) (ڑ) اور (یای مجہول) کے حرف نہیں ہیں، اس لئے ان حرفوں کے بجائے علی الترتیب (ت) (د) (ر) اور یای معروف) استعمال کی گئی جس سے اس پروگرام کے پڑھنے میں اردو دانوں کو ذرا مشکل ہوتی ہے۔ میں نے پروگرام کا ترجمہ انگریزی میں کر کے احمد مختار بک کو جو ماسکو کی ترکی سفارت کے کام سے سبکدوش ہو کر استانبول آ گئے تھے، دیا۔ انھوں نے اس کا ترکی میں ترجمہ اپنے بھائی اور خان تحسین بک سے جس کو میں نے ماسکو میں ان کے پاس دیکھا تھا، کرایا۔ یہ ترکی ترجمہ ہم نے احمد مختار بک کے ذریعہ وزارت خارجہ ترکی کو بھجوایا تاکہ ترکی گورنمنٹ کو قبلہ مولانا صاحب کے سیاسی اصول کا پتہ چل جائے اور اس کو ہماری طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ہم ترکی کے داخلی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں اور صرف اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔

پروگرام کا ہندوستان بھیجا جانا

پروگرام چھپ جانے کے بعد اس کا ہندوستانی لیڈروں تک اور دوسرے سیاسی کارکنوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس کو ہندوستان بھیجنے کے لئے صرف دو طریقے ہو سکتے تھے:

(۱) ترکی آنے جانے والے قابل اعتماد ہندوستانیوں کے ہاتھ اس کو خفیہ طور پر ہندوستانی لیڈروں کو پہنچایا جائے اور پروگرام کے پہنچانے والوں کے اخراجات ان کو دیئے جائیں۔

(۲) ڈاک کے ذریعہ ان کی کاپیاں مختلف لوگوں کو بھیجی جائیں۔

اس وقت نہ قبلہ مولانا صاحب کے پاس نہ میرے پاس اتنا پیسہ تھا کہ اس پروگرام کو کسی قابل اعتماد آدمی کے ہاتھ خفیہ طور پر ہندوستان بھیج سکیں۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب نے مجبور

ہو کر عزیز احمد کے ذریعہ روسی قونصل خانہ سے ۱۰۰ پونڈ حاصل کئے۔ یہ روپیہ سو پونڈ کے ایک انگریزی نوٹ کی صورت میں تھا۔ عزیز احمد نے اپنے بکس میں بند کر کے ہندستانی خانقاہ کے اس کمرے میں رکھ دیا جس میں قبلہ مولانا صاحب رہا کرتے تھے۔

چوری:

اس کے دو روز بعد قبلہ مولانا صاحب، عزیز احمد اور میں شام کو ہوا خوری کے لئے باہر گئے۔ واپسی پر ہم نے دیکھا کہ قبلہ مولانا کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اس سے ہمیں شبہ ہوا کہ کوئی شخص کھڑکی کھول کر کمرے میں چوری کی غرض سے داخل ہوا ہے۔ جب عزیز احمد نے اپنا بکس اٹھایا تو دیکھا کہ اس کا قفل ٹوٹا ہوا ہے اور اندر سے سو پونڈ کا نوٹ غائب ہے۔ ہم کو اس سے سخت صدمہ ہوا کیونکہ اب پروگرام کو خفیہ طور پر ہندستان بھیجنے کے ذرائع سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم پولیس کو اس کی اطلاع نہ دے سکتے تھے۔ کیونکہ قبلہ مولانا صاحب کے غریبانہ طرز زندگی سے کوئی اس کا یقین نہ کر سکتا تھا کہ ان کے پاس سو پونڈ جیسی ایک بڑی رقم موجود ہوگی۔ پولیس کو اس کا یقین دلانے کے لئے کہ ان کے پاس ایسی رقم موجود تھی ضروری تھا کہ اس کو بتایا جائے کہ یہ روپیہ پروگرام کو خفیہ طور پر ہندستان بھیجنے کے لئے روسی قونصل خانہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن قبلہ مولانا پولیس کو اس قسم کی اطلاع دینے کو اپنی مصلحت کے بالکل بر خلاف سمجھتے تھے۔ اس لئے چارو ناچار انھوں نے خاموشی اختیار کرلی۔

اس چوری کا شبہ ہمیں محمود نام ایک ہندوستانی پر ہوا جو اصل میں شہر سورت کا رہنے والا تھا لیکن جنگ عظیم میں عراق کے محاذ سے انگریزی فوج سے بھاگ کر ترکوں سے مل گیا تھا اور استانبول میں محلّہ آقسرائے میں رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر ہمارے ہاں ہندستانی خانقاہ میں آیا جایا کرتا تھا۔ اس کا گزارہ اس فیس پر ہوتا تھا جو وہ سیاحوں کو استانبول کی سیر کرا کے اور ان کہ قابل دید مساجد، اور عجایب گھر دکھلا کر ان سے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس کی مالی حالت خراب ہی رہتی تھی۔ اس چوری کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس نے اچھے لباس بنوائے اور عمدہ طور پر زندگی بسر کرنے لگا۔ اس وجہ سے ہمارا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا کہ یہ چوری اسی کا کام تھی۔

اس واقعہ کے بعد قبلہ مولانا نے ہندوستانی خانقاہ میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کی صحت بھی

خراب تھی اور ان کو تپ دق ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی صحت افزا جگہ پر رہیں۔ لیکن ہمارے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ کسی اچھی ہوادار جگہ پر کوئی گھر کرایہ پر لے لیں۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب نے ڈاکٹر منیر بک سے جو افغانستان میں ہمارے زمانے میں سول ہسپتال کے چیف سرجن تھے اور اب وہاں سے پنشن لے کر اپنے وطن استانبول میں آئے تھے ۲۰۰ لیرے ترکی (تقریباً ۳۰ پونڈ) قرض لئے۔ یہ روپیہ میں نے ترکی رعایا بننے اور ۱۹۳۰ء میں فوجی کمیشن لے کر ترکی افسر ہو جانے کے بعد اپنی تنخواہ سے ڈاکٹر صاحب کو ادا کر دیا تھا۔ اس روپے سے ہم نے استانبول کے مضافات میں Beylerbeyi کے قصبے کے محلّہ کو بلیجہ میں ایک گھر کرایہ پر لیا۔ یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی تھی اور گھر کے ساتھ ایک باغ بھی تھا جس میں تفریح کے لئے چہل قدمی کی جاسکتی تھی۔ ۱۹۲۵ء کی سرگرمیاں ہم نے یہاں گزاریں۔ یہاں کی آب و ہوا کا قبلہ مولانا کی صحت پر بہت اچھا اثر ہوا، جس سے ان کی کھانسی بہت کم ہو گئی۔

ہمارے پروگرام کی ہندوستان میں ضبطی

ہمارے پاس پروگرام کو خفیہ طور پر ہندوستان بھیجنے کے لئے روپیہ نہ رہنے کی وجہ سے ہم نے مجبوراً اس کو ڈاک کے ذریعے آہستہ آہستہ مختلف ہندستانی لیڈروں کے نام بھیجنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاپیاں ساری کی ساری یا ان میں سے کچھ، انگریزی بحری سنسر (Censor) کے ہاتھ پڑیں۔ چنانچہ اس پروگرام کی ہندوستان میں ضبطی ہو گئی اور اس کا داخلہ ہندوستان میں بند کر دیا گیا۔ (دیکھو ذیل میں اخبار "زمیندار" مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۵ء اور اخبار "سیاست"۔ مورخہ ۱۸/ مئی ۱۹۲۵ء کے تراشے کی نقل)

(اس امتناعی حکم میں "سوراجیہ" پارٹی کو غلطی سے "سوراج پارٹی" لکھا گیا ہے)

"زمیندار" ۱۸ مئی ۱۹۲۵ء

ایک رسالہ کے داخلہ کا امتناع

شملہ ۱۵/ مئی۔ قانون محاصل بحری کی رو سے حکومت نے اردو کے ایک رسالہ،

اس رسالہ کے تراجم کا داخلہ برطانی ہندوستان میں ممنوع قرار دیا ہے۔ اس رسالہ کا نام "نیشنل کانگرس میں آزادی ہند کی تحریک کی دوسری صورت" یا "کابل میں کانگرس کمیٹی کا قیام" اور "مہابھارت سوراجیہ پارٹی کا لائحہ عمل" ہے۔ یہ رسالہ (مولوی) عبید اللہ اور ظفر حسن نے لکھا اور قسطنطنیہ کے "محمود بے مطبع" نے ۱۹۲۴ء طبع کیا۔ متذکرہ الصدر اصحاب کانگرس کمیٹی کابل کے صدر اور معتمد ہیں۔

"سیاست" ۱۸ مئی ۱۹۲۵ء

قسطنطنیہ کی مطبوعہ
عبید اللہ کی تصنیف کا داخلہ بند ہو گیا

شملہ ۱۵ مئی۔ قانون محصولات بحری رو سے حکومت ہند نے ایک رسالہ کا داخلہ ہندوستان میں بند کر دیا ہے خواہ وہ اردو زبان میں ہو یا کسی اور زبان میں ہو۔ رسالہ کا عنوان ہے کانگرس میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا دور ثانی یا کابل میں کانگرس کمیٹی کا قیام اور مہاراشٹر کی سوراج پارٹی کا لائحہ عمل۔ یہ کتاب قسطنطنیہ کے محمود بے پریس میں ۱۹۲۴ء میں چھپی تھی۔ اور اس پر عبید اللہ اور ظفر حسن کے کمیٹی کے صدر اور معتمد (علی الترتیب) کی حیثیت سے دستخط ثبت ہیں۔

اس پروگرام کی ہندوستان میں ضبطی کے بعد میں نے قبلہ مولانا کے حکم سے اس میں کچھ تھوڑی سی تبدیلیاں کر کے اس کا انگریزی میں پھر ترجمہ کیا تاکہ جب اس کو چھپوا کر ہندوستان بھیجیں تو وہ اس امتناعی حکم کے ماتحت ممنوع قرار نہ دیا جاسکے۔

ہم نے ۱۹۲۶ء میں اس پروگرام کو انگریزی میں چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ہمارے پاس اس کے لئے پیسہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے کوشش کی کہ اپنے بھائی صاحب سے کچھ رقم

منگواؤں۔ مگر اس میں خطرہ تھا کہ انگریزی حکومت براہ راست میرے نام چیک بھیجنے کی اجازت نہ دے گی۔ اس لئے میں نے اپنا ایک نام مستعار بنایا اور بھائی صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس نام مستعار پر ۲۵ پونڈ کا ایک چیک بھیج دیں۔ یہ روپیہ کوئی دو ماہ بعد آگیا اور عمر رضا دو عزول بک کی گواہی اور ضمانت پر (Ottoman Bank) نے مجھے دے دیا۔ ہم نے اپنے پروگرام کو انگریزی میں چھپوا کر اس کو آہستہ آہستہ، ترکی آنے جانے والے قابل اعتماد ہندوستانیوں کے ذریعہ خفیہ طور پر ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔ اس انگریزی نسخے کی ہندوستان میں انگریزوں کی طرف سے ضبطی کے بارے میں ہمیں آج تک کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ اس انگریزی پروگرام کی ہماری طرف سے خفیہ طور پر ہندوستان بھیجی ہوئی کاپیاں کس کس کو پہنچیں اس کا بھی ہمیں کبھی پتہ نہیں چلا۔☆

۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال (مرحوم) نے مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے شمال مغرب میں اپنے لئے ایک مستقل وطن بنانے کا خیال ظاہر کیا تھا اس میں مولانا صاحب کے پروگرام کا کتنا اثر اور دخل ہے اس کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ علامہ موصوف نے یہ پروگرام پڑھا تھا یا نہیں۔ اگر نہ بھی پڑھا ہو اور فرض کیا جائے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء کے ملکی حالات کو مدنظر رکھ کر پاکستان بنانے کی تجویز مستقل طور پر سوچ کر پیش کی تھی تو کم از کم یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہستی اور تہذیب کو ہندوستان میں محفوظ رکھنے کی تجویز سب سے پہلے قبلہ مولانا کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں (اس وقت کے حالات کے مطابق) ہندوستان کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ قبلہ مولانا اور علامہ اقبال جیسے دو ہندستانی مسلمان مفکروں نے علیحدہ علیحدہ سوچ بچار کر کے ہندستانی مسلمانوں کی ہستی اور تہذیب کو ملک میں محفوظ کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے تقریبا ایک ہی جیسی تجویزیں پیش کی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ قبلہ مولانا نے ۱۹۲۴ء کے حالات کے مطابق مسلمانان ہند کو ایک داخلاً مستقل جمہوریت کے طور پر ہند فیڈریشن میں شامل ہونے کی تجویز کی تھی اور علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے حالات کو مدنظر رکھ کر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ اور مستقل وطن بنانے کا خیال پیش کیا تھا۔

☆اس انگریزی نسخے کی عکسی نقل کتاب کے آخر میں (اشاریہ کے بعد) دی گئی ہے تاکہ حوالے کے طور پر کام آسکے۔ یہ نسخہ راقم کو ظفر حسن ایبک مرحوم نے عنایت فرمایا تھا

(مرتب)

اخبار "مسلمان" کلکتہ کی نامہ نگاری

انھی دنوں، میں ہفتہ وار اخبار "مسلمان" کلکتہ کا جو مجیب الرحمٰن (مرحوم) کی ادارت میں نکلتا تھا، ترکی کا نامہ نگار بن گیا تھا۔ لیکن اس نامہ نگاری سے مجھے کوئی مالی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ جدید ترکی کے حالات مسلمانان ہند کو بتاؤں اور بعض آرٹیکل ہندوستانی مسائل پر لکھ کر قبلہ مولانا صاحب کا اور اپنا نقطہ نظر ہندوستانی پبلک تک پہنچاؤں۔ اس سلسلہ میں، میں نے ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لئے وہی نظریہ جو قبلہ مولانا نے، ہندوستان میں وفاقی نظام تجویز کرتے ہوئے اپنے پروگرام میں پیش کیا تھا، ان مقالات میں بہ تفصیل لکھا اور اس کی اشاعت کی کہ ہندوستان کے موجودہ بڑے بڑے صوبوں کو زبان، رسم و رواج اور تمدن کی وحدت کی بنا پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے ان کو اپنی مستقل ہستی اور تہذیب کو قائم رکھنے اور ہندستان کی متوافق جمہوری حکومت میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس طرح پر مذہب کا سوال درمیان میں آئے بغیر ہندو مسلم مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور ہر مذہبی اقلیت اپنی ہستی قائم رکھتے ہوئے ایک واحد قومیت کی بجائے ایک وفاقی قومیت کے اصول پر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شریک ہو سکتی ہے۔

میری یہ نامہ نگاری کوئی دو سال تک جاری رہی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے خالی وقت میں قبلہ مولانا کے لئے ایم این رائے کی کتاب India in Transition کا اردو میں ترجمہ کر کے اس کی رائے اور اس کے خیالات کو انھیں بتایا۔ اس کتاب میں ایم این رائے نے ہندستانی تاریخ پر مارکسٹ نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس میں بھی اپنے ہندو تعصب کو دکھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کتاب میں اس نے مارکس کے نظریہ کے مطابق یہ لکھا تھا کہ جب مسلمانوں نے ہندستان پر قبضہ کیا تو وہاں سوداگر طبقہ Commercial Class جو سماجی ارتقا کے لحاظ سے زمیندار طبقہ کی نسبت مارکس کے خیال میں زیادہ ترقی یافتہ ہے، زوروں پر تھا اور ہندوستان آہستہ آہستہ سماجی طور پر ارتقا کرتے کرتے سرمایہ داری Capitalism کے نظام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مسلمان فاتحین نے اس ترقی کو روک دیا اور ملک میں جاگیرداری کا نظام بڑے پیمانے پر قائم کر کے ملک کے سماجی ارتقا کو اور بھی پیچھے ہٹا دیا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا راج ہندوستان میں تجدد پسندی کو ترقی دینے کی بجائے قدامت

پسندی Reaction کے دوبارہ قائم ہونے کا باعث بنا۔ حالانکہ ایم این رائے کی اس رائے کے خلاف، یورپین مصنف یہ لکھتے ہیں کہ مسلمان ہندستان میں ایک نیا تمدن لائے جو ہندوستانیوں کی اس وقت کی تہذیب سے بہت بلند تھا۔

اس مصروفیت کے علاوہ میں پرائیویٹ طور پر انگریزی سبق بھی پڑھایا کرتا تھا لیکن یہ ہمارے گزارے کے لئے کافی نہ تھا۔ کیونکہ اکرم بک اور سلیم راغب بک نے انگریزی پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور میں صرف اپنے محلہ میں فخری بک نام ایک نوجوان کو انگریزی کا سبق دیا کرتا تھا اور وہ بھی مجھے کچھ زیادہ Tuition Fee نہ دیتا تھا۔

قبلہ مولانا کی اسعد فواد بک سے ملاقات

عبدالرحمٰن بک پشاوری (کو ہیلیجہ) میں بھی قبلہ مولانا سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انھوں نے اسعد فواد بک نام ایک بڑے محترم ترک سے مولانا صاحب کے ملنے کا انتظام کیا۔ میں اس ملاقات میں قبلہ مولانا کے ساتھ ترجمان ہو کر گیا۔ اسعد فواد بک مشہور ترکی مارشل فواد پاشا مرحوم کے فرزند ہیں۔ مارشل مرحوم سلطان عبدالحمید خان ثانی مرحوم کے زمانے میں مختلف جنگوں میں دلاوری دکھلانے کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے تھے۔ جتنی لڑائیوں میں وہ شریک ہوئے ان میں ہمیشہ اپنی فوج کے آگے شمشیر بکف دشمن پر حملہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے لوگ ان کو من چلا فواد کہنے لگے تھے۔ اسعد فواد بک، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر، عبدالرحمٰن صدیقی کے گہرے دوست تھے اور ڈاکٹر انصاری اور عبدالرحمٰن صدیقی سے جنگ بلقان میں ہندستانی وفد ہلال احمر کے سلسلہ میں مل چکے تھے۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ ایک زمانے میں تو استانبول کے امریکن رابرٹ کالج میں تاریخ اسلام پر اعزازی طور پر لکچر دیا کرتے تھے۔ انھوں نے دو سال ہوئے رسول اکرم (صلعم) کی سیرت پر انگریزی میں ایک بڑی کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کی بیوی پرنس زیبا ایک مصری شہزادی تھیں جن کی مصر میں بہت زیادہ جائداد تھی۔ اسعد فواد بک خود بھی عالم و فاضل ہیں اور علم دوست بھی ہیں اور ممکن طور پر عالموں کی سرپرستی کرتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ کا مصر میں سب سے پہلے

---

(۱) ظفر ایک یہ تحریر ۶۰ ویں دہائی میں لکھ رہے تھے۔ (مرتب)

عبدالرحمٰن بک پشاوری کی شہادت:

۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں ایک روز ہم نے اخبار میں یہ سانحہ پڑھا کہ عبدالرحمٰن بک پشاوری پر جب وہ رات کو دیر سے استانبول کے محلہ اخلامور سے گزر کر اپنے گھر (روف بک مرحوم کے گھر) واقع محلہ نشانطاشی کو آرہے تھے کسی نے فائر کیا اور وہ زخمی ہو کر بیہوش ہو گئے۔ یہاں وہ کئی گھنٹے پڑے رہے اور ان کا خون بہتا رہا۔ آخر کار محلہ کے چوکیدار نے اپنے دورہ کے وقت ان کو دیکھا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ان کو شفاخانہ لایا گیا جہاں ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن گولی لگنے سے ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس سے ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں نے اگلے روز ہسپتال جا کر ان کو دیکھا۔ اس وقت ان کے ہوش بجا تھے لیکن کمر سے نیچے کا حصہ بالکل حرکت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ان کو دیکھنے کے لئے ہر روز ہسپتال جایا کرتا تھا، جس سے ان کی طبیعت ذرا بہل جایا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیم مفلوج ہونے کے باوجود ان کے اچھے ہو جانے کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں نے ان کے پاس ہر روز جانا ضروری نہ سمجھا اور ایک روز درمیان جانے لگا۔ لیکن آخری دفعہ شفاخانہ جانے پر میں نے ان کو حالت نزع میں پایا اور وہ اسی روز فوت ہو گئے۔ ان کو (ماچقہ) کے قبرستان میں دفن کیا گیا اور ان کے مزار پر اسعد فواد بک نے مندرجہ ذیل کتبہ کندہ کرا دیا۔

"بلقان حرب ندہ ہند ہلال احمر ایلہ
استانبولہ گلہ رک بلقان و
استقلال حربلرندہ تورکیہ ایچون
قانی آقتیان و ۱۳۴۱ھ دہ مجہول
بر شخص طرفندن شہید ایدیلن
اسبق تورکیہ افغان ممثلی عبدالرحمٰن
غلام صمدانی بک روحنہ فاتحہ"

(ترجمہ: عبدالرحمٰن غلام صمدانی بک کی روح پر جو جنگ بلقان کے زمانے میں ہلال احمر ہند کے ساتھ استانبول آئے اور جنہوں نے جنگ بلقان اور جنگ آزادی ترکی میں ترکی کے لئے اپنا خون بہایا اور جو ۱۹۲۵ء میں ایک نامعلوم شخص کی طرف سے شہید کر دیئے گئے اور جو افغانستان میں ترکی نمائندہ ہو کر رہ چکے تھے، فاتحہ)

تعارف پرنس زیبا ہی نے کرایا تھا اور جب خلافت کے وفد کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر سوئٹزرلینڈ گئے تھے تو ان کی جمعیت اقوام کے سربر آوردہ لیڈروں سے اسعد فواد بک ہی نے ملاقات کرائی تھی۔ اسعد فواد بک کا ایک فوٹو جو انھوں نے حال ہی میں مجھے دیا ہے یہاں نیچے شامل کرتا ہوں۔ (۲۱)

قبلہ مولانا کی اسعد فواد بک سے اس موقع پر زیادہ تر تاریخ اسلام پر باتیں ہوئیں کوئی سیاسی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا۔ اسعد فواد بک اس ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔ بعد میں ہمیں عبدالرحمٰن بک پشاوری سے معلوم ہوا کہ اسعد فواد بک قبلہ مولانا کی علمی قابلیت اور تاریخی معلومات کے بڑے قائل ہو گئے ہیں۔

میں اس زمانے میں افغانی رعایا تھا اس لئے ترکی میں غیر ملکی مانا جاتا تھا۔ غیر ملکیوں کے لئے ترکی میں سرکاری ملازمت حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے سوا میں اس زمانے میں ترکی بھی اچھی طرح نہ بول سکتا تھا۔ اس لئے کسی پرائیویٹ کمپنی میں بھی نوکری نہ کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میرے لئے، انگریزی پڑھا کر گزارہ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس کا بھی موقع کم تھا۔ اس لئے قبلہ مولانا مجبور ہوئے کہ عبدالرحمٰن بک پشاوری کے ذریعہ اسعد فواد بک سے ۳۰۰ لیرے (تقریباً ۴۵ پونڈ) قرض لیں (میں نے یہ قرض بھی بعد میں ترکی افسر بننے پر اپنی تنخواہ سے ادا کر دیا تھا)۔ لیکن ہماری کوئی باقاعدہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح آئے دن قرض لے کر گزارہ کرنا زیادہ دیر تک ممکن نہ تھا۔ ہمارا گمان ہے کہ عبدالرحمٰن بک پشاوری نے قبلہ مولانا کی مالی حالت کا اسعد فواد بک سے ذکر کیا ہو گا اور انھوں نے اسی وجہ سے اپنی بیوی کی مصر کی جائداد کی آمدنی کے اس حصہ میں سے جو علمی خدمات اور عالموں کی مدد کے لئے رکھا ہوا تھا قبلہ مولانا صاحب کو ماہوار ۵۰ لیرے (۱۰۰ روپیہ) دینا شروع کر دیئے۔ دو تین ماہ بعد اس فنڈ میں سے اسعد فواد بک عمر رضا دوغرل بک کو ۳۰ لیرے اور مجھے ۲۰ لیرے دینے لگے۔ ان کی یہ مالی معاونت ہمارے لئے اس وقت درگاہ الٰہی سے آئی ہوئی ایک غیبی مدد ثابت ہوئی، ورنہ ہم شاید فاقہ کشی کرتے۔ ان کی یہ حمیت اسلامی بہت ہی قابل داد ہے۔ میں تو جب تک زندہ ہوں ان کا مرہون احسان رہوں گا۔ ہمارے لئے یہ مدد قبلہ مولانا کے ترکی میں رہنے تک جاری رہی۔ اس کے بعد میں نے کام کر کے اپنے گزارے کا انتظام کر لیا۔ اسی فنڈ میں سے اسعد فواد بک نے عبدالرحمٰن ریاض بابر کو بھی مدتوں وظیفہ دیا تھا۔

ان کی موت کی وجہ سے ہم ایک وفادار دوست کی ہستی سے محروم ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خداوند کریم ان کو بخشے۔

اس قتل پر بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ وہ مخالف پارٹی کے، جس کے لیڈر روف بک تھے ایک سرگرم رکن اور روف بک کے دست وبازو تھے، اس لئے ان کو جمہوریت خلق پارٹی نے جو اس وقت ترکی میں برسراقتدار تھی قتل کروایا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ان دنوں خود روف بک یا ان کے شریک کار لوگوں میں سے کسی اور پر بھی حملہ ہوتا اور اس کو قتل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ حالانکہ ایسا کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا۔

اخبار میں اس قتل کا سبب لوٹ کا لالچ بتایا گیا تھا۔ محلہ اخلامور سے جہاں یہ قتل کا واقعہ ہوا تھا نشانطاشی کو آنے والا راستہ اس زمانے میں بالکل بھیانک سا تھا اور وہاں رات کو بالکل آمدورفت نہ ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ کسی لچے نے ایک اچھے لباس کے آدمی کو وہاں سے اکیلا گزرتے ہوئے دیکھ کر روپے کے لالچ سے اس پر حملہ کیا ہو اور ہاتھا پائی کی نوبت پہنچنے پر ان کو گولی ماری ہو۔ لیکن چونکہ عبدالرحمن بک پشاوری کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی غالباً لٹیرے کے ہاتھ کوئی بڑی رقم نہ لگی ہوگی۔

تیجاسنگھ آزاد کا ملٹری کالج سے نکالا جانا.

۱۹۲۵ء میں جب تیجاسنگھ آزاد ملٹری کالج کی دوسری جماعت میں تھا، ترکی وزیر جنگ رجب پیکر بک کالج کی تفتیش اور پڑتال کے لئے استانبول آئے۔ انھوں نے طالب علموں کے درمیان سیاہ فام لمبی ڈاڑھی اور لمبے بالوں والے ایک طالب علم کو دیکھ کر اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ کیونکہ ترکی ملٹری کالج کے طالب علموں کو ڈاڑھی اور لمبے بال رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ تیجاسنگھ کے خلاف اس کے ہم جماعتوں نے بھی پہلے سے کچھ شکایت کی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے ایک روز کہیں اپنے کسی ہم جماعت سے بحث مباحثہ میں سکھ فوجوں کی بہادری اور ترکی فوجوں سے ان کے برتر ہونے کے بارے میں ڈینگ ماردی تھی۔ سبب خواہ کچھ بھی ہو مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی وزیر جنگ نے اس کے ملٹری کالج سے نکالے جانے کا حکم دے دیا۔

کالج سے نکالے جانے کے بعد تیجاسنگھ آزاد ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ ہمارے پڑوسیوں میں اس کی لمبی ڈاڑھی اور لمبے کیس اور پگڑی کی وجہ سے چہ میگوئیاں رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ

نوجوان لڑکیاں اس کی ہیئت کذائی سے ڈر کر ہمارے گھر کے نزدیک سے بھی نہیں گزرا کرتی تھیں۔ اس کے ہمارے ہاں رہنے سے محلہ والے ہم کو بھی عجیب نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں، ترکی میں، پگڑی اور ترکی ٹوپی کا پہننا ممنوع قرار دیدیا گیا تھا اور ہر شخص ہیٹ لگانے پر مجبور تھا۔ ترکی میں اس زمانے میں ہندوستانیوں کو جب تک ترکی خفیہ پولیس کو ان کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہ ہو جائے بہت ہی شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا سبب مندرجہ ذیل واقعہ ہے:

۱۹۲۱ء میں جبکہ ترکی فوجیں غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کی قیادت میں اناطولیہ میں یونانیوں کے خلاف برسرپیکار تھیں تو مصطفیٰ صغیر نامی ایک ہندستانی جس کا خاندان پرانے زمانے میں ایران سے آکر مراد آباد (یو، پی) میں آبسا تھا، بظاہر تو انگریزوں سے چھپ کر لیکن اصل میں ان کی مدد سے استانبول آیا تھا۔ وہ اپنے کو خلافت کمیٹی ہند کا نمائندہ بتاتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ ترکی قومی تحریک کے لئے مالی مدد مہیا کرنے آیا ہے۔ ترک اس کو بڑے اعزاز سے خفیہ طور پر استانبول سے جہاں اس وقت انگریزی فوجیں قبضہ کئے ہوئے تھیں، انقرہ لے گئے۔ وہاں اس کو غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے شرف باریابی بخشا اور اس کو سرکاری مہمان بنایا۔ اس کا میزبان محمد عباس بک نامی ایک ہندوستانی مقرر کیا گیا جو پہلی جنگ عظیم کے دوران عراق کے محاذ پر انگریزی فوج سے بھاگ کر ترکوں سے آملا تھا۔ اس کو ۱۹۲۷ء میں ترکی وزارت خارجہ میں ملازمت دے دی گئی تھی اور کابل کی سفارت ترکی میں ترجمان کے طور پر مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ میں اس کو ۱۹۳۳ء میں کابل میں ملا تھا جب میں ایک ترکی افسر توپخانہ کی حیثیت سے افغانی ملٹری کالج میں معلم ہو کر دوبارہ افغانستان گیا تھا۔ وہاں عباس بک نے مجھے مصطفےٰ صغیر کے متعلق مندرجہ ذیل تفصیلات سنائی تھیں:

”میں مصطفیٰ صغیر کا میزبان تھا اور اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ مصطفیٰ صغیر ہر رات دیر تک خط لکھتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود صبح کو مجھے جو خط استانبول کو ڈاک میں بھیجنے کے لئے دیتا ہے وہ صرف ایک دو صفحے کا ہوتا ہے جس پر چند سطروں کے سوا اور کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس کے ایک چھوٹا سا خط لکھنے کے لئے تین چار گھنٹے لگانے کا سبب کیا ہے۔ اس سے میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ وہ کسی خاص قسم کی سیاہی استعمال کرتا ہے جس سے تحریر شدہ الفاظ بہ ظاہر نظر نہیں آتے لیکن باقی خط کو معمولی سیاہی سے لکھتا ہے، جو پڑھا جا

سکتا ہے۔ اس لئے وہ ہر رات کئی گھنٹے خطوط لکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس پر میں نے اس کی رپورٹ اپنے افسروں سے کی۔ انھوں نے اس کے خطوط کا معائنہ کیا اور بظاہر نظر نہ آنے والے الفاظ کو کسی کیمیاوی مادہ کے ذریعہ نمایاں کر کے پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصطفٰی صغیر انقرہ کے سیاسی حالات کے متعلق استانبول کے انگریزی کمانڈر جنرل ہیر نگٹن (Harrington) کو باقاعدہ خبریں پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی خفیہ پولیس نے یہ بھی معلوم کیا کہ وہ غازی مصطفٰے کمال پاشا اتاترک کو قتل کرنے کے لئے سازش بھی کر رہا ہے۔ اس لئے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے اپنی ذات کی اہمیت کو بڑھانے کے لئے عدالت کے سامنے یہ بھی کہا کہ اس نے امیر افغانستان حبیب اللہ خان کو قتل کیا تھا (حالانکہ جیسا اس کتاب کے شروع میں ثابت کیا گیا ہے، یہ سفید جھوٹ تھا) مقدمہ کے بعد اس کا جرم ثابت ہونے پر اس کو پھانسی دے دی گئی۔"

ترکی اخبارات نے یہ واقعہ اس وقت بڑی تفصیل سے شائع کیا تھا۔ بعد میں بھی جب ان کو موقع ملتا تھا وہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو بہت شبہ کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ اس واقعہ کا ترکی قوم پر اتنا برا اثر پڑا تھا کہ جب کبھی کوئی ترک کسی ہندوستانی سے ملتا تو وہ ضرور اس واقعہ کا ذکر اس سے کرتا اور اس کو شبہ کی نگاہ سے بھانپنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کا خمیازہ مجھے بھی اٹھانا پڑا۔ میں جب آگے چل کر ۱۹۲۸ء میں ترکی رعایا بن کر ملٹری کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فوجی کمیشن لے کر، فوجی خدمت کے لئے مختلف گیریزنوں میں مقرر ہو کر گیا، تو میرے افسر مجھے ضرور میرے پرانے حالات پوچھا کرتے تھے تا کہ میری صداقت اور وفاداری کو جانچیں۔ مجھے ان کو اطمینان دینے کے لئے ہمیشہ اپنی زندگی کے حالات اول سے آخر تک سنانا پڑتے تھے کہ میں انگریزوں کے مقابلہ میں افغانی فوج میں رضا کار کے طور پر ٹھل کے میدان پر لڑ چکا ہوں اور ترکی فوج میں جنرل فخرالدین ترک قان پاشا محافظ مدینہ منورہ کی سفارش پر اور مارشل فوزی چقماق پاشا کمانڈر ان چیف افواج ترکی کی منظوری سے داخل ہوا ہوں، اس لئے میرا انگریزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

باب سترہواں

قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی حجاز کو روانگی

قبلہ مولانا کی صحت اچھی ہو جانے کے بعد ہم اسی قصبہ کے محلہ بوستانجی باشی میں کوچہ عبداللہ آغا میں ایک سستا گھر کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگے۔ ہم نے ۲۶۔ ۱۹۲۵ء کی سردیاں یہاں گزاریں۔ ۱۹۲۶ء کے موسم بہار میں ہندوستانی اخبارات سے جو ہمیں استانبول کے اخبار "وقت" کے دفتر سے مل جایا کرتے تھے، معلوم ہوا کہ موتمر اسلامی اس سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والی ہے جس میں دنیائے اسلام کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے بھی شریک ہونے کی توقع ہے۔ قبلہ مولانا نے سوچا کہ اگر کسی طرح اس سال حج کے موقع پر حجاز پہنچ جائیں تو حج کے لئے آنے والے لوگوں سے مل کر، ان کے ذریعہ اپنے ہندوستانی دوستوں اور لیڈروں کو اپنے پروگرام کے متعلق پیغام بھیج سکیں گے۔

لیکن یہاں سے ان کا حجاز جانا ناممکن تھا کیونکہ اس زمانے میں کوئی ترکی یا غیر ملکی جہاز استانبول سے براہ راست حجاز نہ جاتا تھا۔ استانبول سے حجاز جانے والے لوگوں کو اسکندریہ یا پورٹ سعید میں جہاز بدلنا پڑتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز مصر پر پوری طرح سے قابض ہو چکے تھے۔ اس لئے قبلہ مولانا صاحب کے لئے مصر کی سرزمین پر قدم رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ انگریز ان کو وہاں فوراً گرفتار کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس بارے میں موسولینی سے جو اس وقت اٹلی کا وزیر اعظم اور حاکم مطلق بنا ہوا تھا اور انگریزوں کا مخالف مانا جاتا تھا، مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر اقبال شیدائی کے ذریعے جو فاشسٹ پارٹی اور موسولینی کے آدمیوں سے اچھے تعلقات رکھتا تھا اٹلی جانے کے لئے ایطالوی حکومت سے ویزا لیا گیا۔ قبلہ مولانا صاحب

کو امید تھی کہ کوئی ایطالوی جہاز براہ راست جدہ جانے کے لئے مل جائے گا۔

سفر خرچ کے لئے قبلہ مولانا نے، تیسری اور آخری دفعہ عزیز احمد کے ذریعے روسی قونصل خانہ سے روپیہ لیا، اور ۵ جون ۱۹۲۶ء کو عزیز احمد کو ساتھ لے کر ریل پر استانبول سے اٹلی کو روانہ ہو گئے۔

انھوں نے استنبول سے چلتے ہوئے مجھے اپنا ایک فوٹو دستخط کر کے دیا تھا۔ یہ فوٹو یہاں شامل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جو الفاظ میرے حق میں اس فوٹو پر لکھے ہیں ان کو میں اپنی ناچیز خدمات کا بہترین صلہ مانتا ہوں۔ (۲۲)

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اٹلی میں اقبال شیدائی کے ذریعہ جواہر لعل نہرو سے جو اس وقت یورپ سے ہندوستان کو لوٹتے ہوئے فاشزم کا مطالعہ کرنے کو چند روز کے لئے اٹلی میں ٹھیرا ہوا تھا، ملاقات کی، اور اس کو ہندوستان کی آزادی اور آئندہ کی آزاد ہندوستانی حکومت کے بارے میں اپنے خیالات بتائے۔

اٹلی میں قبلہ مولانا کو معلوم ہوا کہ کوئی ایطالوی جہاز براہ راست وہاں سے جدہ نہیں جاتا۔ اس لئے وہ مجبوراً وہاں سے ایک اٹالین جہاز پر ایطالوی کالونی اری ٹیریا کی بندر گاہ مساوہ (Massawa) گئے اور وہاں سے ۱۵ دن کے انتظار کے بعد ایک ایطالوی جہاز پر جدہ پہنچے۔ لیکن ان کو راستے میں اتنی دیر لگ گئی کہ وہ ۱۹۲۶ء کے حج کے موقع پر حجاز نہ پہنچ سکے اور موتمر میں شریک نہ ہو سکے۔ ہندوستانی حاجی اس وقت ہندوستان لوٹ چکے تھے۔ اس لئے ان کو ان لوگوں کے ذریعہ اپنا پیغام ہندوستان بھیجنے کا اس سال کوئی موقع نہ ملا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

قبلہ مولانا کے بعد استانبول میں میری سرگرمیاں
ٹیگور کا استانبول آنا

۱۹۲۶ء کی خزاں کا موسم تھا کہ ترکی اخبارات میں یہ خبر نکلی کہ رابندر ناتھ ٹیگور رومانیہ سے استانبول آنے والا ہے۔ ٹیگور ۲۳/ نومبر کو جہاز پر استانبول آیا۔ لیکن خشکی پر نہیں اترا۔ کیونکہ

اس کو گلہ تھا کہ استانبول کی یونیورسٹی نے اس کو کوئی بلاوا نہ بھیجا تھا اور نہ کسی کو اس کے استقبال کے لئے مقرر کیا تھا۔ ٹیگور اپنی قابلیت اور بین الملل شہرت کے باوجود اس وقت ترکی میں سیاسی لحاظ سے ایک معتدل خیالات کا آدمی مانا جاتا تھا جس نے اپنے ملک کی تحریک آزادی میں دوسرے ہندستانی لیڈروں کی طرح جان فشانی نہ دکھلائی تھی۔ اس لئے وہ ترکی میں ہر دلعزیز نہ تھا۔ اس زمانے میں انگریز دوست لوگوں کی ترکی میں کوئی قدر نہ تھی۔

میں ان سے ملنے جہاز پر گیا۔ اس کی نوجوان اور خوبصورت سیکرٹری نے مجھے اس سے ملایا۔ اس کی لمبی سفید داڑھی، بلند قد اور سن رسیدگی کے باوجود چمکنے والی آنکھیں ملنے والوں پر بہت گہرا اثر ڈالتی تھیں۔ اس سے میری ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں جو اس وقت خاص کر بنگال میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے، بہت خراب ہو گئے تھے، گفتگو ہوئی۔ اس زمانے میں بنگال میں بڑے بڑے زمیندار ہندو اور ان کے کاشتکار مسلمان ہوتے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں ٹیگور نے جو رویہ اختیار کیا اور جن خیالات کا اظہار کیا، اس پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”کاشتکار غنڈے ہیں جو ہمیشہ فساد پھیلاتے رہتے ہیں“۔

ٹیگور جیسے فلاسفر، ادیب اور تجربہ کار شخص کا ان غریب مسلمان کاشتکاروں کو غنڈا اور فسادی کہنا اس کے مذہبی تعصب اور مالداروں سے محبت رکھنے کا نتیجہ تھا۔ یہ غریب کاشتکار تو صرف اپنی محنت کے پھل کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی جرم نہ تھا۔ ان کو غنڈا اور فسادی کہنا بالکل بے جا تھا۔ ٹیگور جیسے دور اندیش اور جہاں دیدہ شخص کو سمجھنا چاہئے تھا کہ دنیا سے زمینداری اٹھتی جا رہی ہے اور کاشتکار سب ملکوں میں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

تیجا سنگھ کا پھر ملٹری کالج میں داخل ہونا

۱۹۲۶ء کی خزاں کے دنوں میں جنرل فخر الدین ترک قان پاشا کابل کی سفارت سے سبکدوش ہو کر استانبول واپس آئے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ وہ مجھ پر میرے افغانی فوجوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی وجہ سے مہربان تھے اور مجھے اپنا گود لیا بیٹا کہا کرتے

تھے۔ میں نے انکوتیجاسنگھ کے ملٹری کالج سے نکال دئے جانے کا واقعہ سنایا۔ اس سے ان کو بہت رنج ہوا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اس کو پھر ملٹری کالج میں داخل ہونے اور اپنی ملٹری تعلیم پوری کرنے کا موقع دیا جائے۔ انہوں نے مارشل فوزی چقماق پاشا کمانڈران چیف افواج ترکی سے عرض کر کے اس کے داخلے کی منظوری لے لی. لیکن شرط یہ رکھی گئی کہ وہ اپنے کیس کٹوادے گا اور ڈاڑھی بھی منڈوادے گا۔ اس نے یہ شرط پوری کر دی۔ اس پر وہ ملٹری کالج کی دوسری جماعت میں داخل ہو گیا۔ اس کو ۱۹۲۷ء کے آخر میں فوجی کمیشن ملا اور وہ افسر بن گیا۔ اس نے کیس کٹوانے اور ڈاڑھی منڈوانے کے بعد جو فوٹو اتروایا اور مجھے شکریہ کے طور پر دیا تھا. یہاں دیا جاتا ہے۔ (۲۳)

میری ملازمت

قبلہ مولانا صاحب کے استانبول سے چلے جانے کے بعد میں نے عبدالرحمٰن ریاض بابر کے ذریعہ توفیق بک ایکسپورٹ اور امپورٹ کمپنی کی انگریزی خط و کتابت کا کام اپنے ذمہ لے لیا جس سے مجھے کچھ تنخواہ ملنے لگی۔ میں یہاں ملازم تھا کہ ایک روز ظفر عمر مسعود جو اقبال شیدائی کے ساتھ روس سے استانبول آیا تھا اور جس کو اقبال شیدائی روم جاتے ہوئے ترکی ہی میں چھوڑ گیا تھا. میرے دفتر میں آیا اور کہنے لگا۔ میں پولینڈ جا رہا ہوں اور اگر راستہ ملا تو وہاں سے ہندوستان چلا جاؤں گا۔ کیونکہ ترکی میں رہ کر میں اپنے گزارے کا کچھ بھی انتظام نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ پولینڈ بڑا ٹھنڈا ملک ہے اور میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ اس لئے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا گرم اوور کوٹ مجھے دے دیں اور میں اس کے عوض آپ کے لئے اپنا ہلکا اوور کوٹ اپنے گھر پر چھوڑ جاؤں گا۔ آپ اسے وہاں سے لے لیں"

میں نے اس کو مدد دینے کی غرض سے اس کی یہ تجویز منظور کر لی اور اپنا اونی اوور کوٹ اتار کر اس کو دے دیا۔ وہ اسی دن ترکی سے چلا گیا۔ میں جب اگلے روز اس کی جگہ پر جہاں وہ رہتا تھا. گیا تو دیکھا کہ میرے لئے وہ ہلکے اوور کوٹ کی بجائے آسام سلک کا ایک کوٹ چھوڑ گیا جس کو سردی میں استعمال کرنا بالکل بے فائدہ تھا۔ میں کچھ اس پر خفا ہوا کہ وہ مجھے دھوکہ دے کر میرا

اوور کوٹ لے گیا اور کچھ اپنی بے وقوفانہ نیک نیتی کی وجہ سے خود اپنے پر رنجیدہ ہوا۔ لیکن اب ایسے غصے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

توفیق بک کمپنی کا کاروبار کچھ اچھا نہ تھا جس کی وجہ سے وہ مجھے باقاعدہ تنخواہ نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے میں یہاں سے علیحدہ ہو گیا اور پھر عبدالرحمٰن ریاض بابر کی معرفت جواد رفعت کمپنی کے ایکسپورٹ امپورٹ شعبہ کی انگریزی خط و کتابت کا کام کرنے لگا۔ اس کمپنی نے ہندوستان سے چاء، سن کی بوریاں اور رنگا ہوا چمڑا منگانے کی کوشش کی۔ میں نے چمڑے کی تجارت کے لئے مولوی عبدالقادر قصوری (مرحوم) کے بیٹے مولوی محمد علی سے جو ایک زمانے میں کابل کے حبیبیہ کالج میں معلم رہنے کی وجہ سے مجھے جانتے تھے اور جو اس زمانے میں بمبئی میں چمڑے کی تجارت کا کام کر رہے تھے، خط و کتابت کی، لیکن یہ کاروبار بھی نہ چل سکا۔

مولانا شبلی مرحوم کی کتابوں کا ترجمہ

میں نے عمر رضا دوغرول بک سے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف کا ترجمہ کر کے ترکی میں چھپوانے کے امکانات پر گفتگو کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان کتابوں کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کروں اور عمر رضا دوغرول بک اس انگریزی مسودے کا ترکی میں ترجمہ کریں (میں اس زمانے میں ترکی نہ جانتا تھا) اور یہ ترکی ترجمہ کتب خانہ آثار علمیہ کی طرف سے استانبول میں چھاپا جائے۔ اس سے میرے گزارے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

میں نے بھائی صاحب کو کرنال لکھ کر ان سے الفاروق، سیرت النبی کی چاروں جلدیں اور عبداللہ منہاس مرحوم کی تصنیف کردہ پیام امین جیسی مذہبی کتابیں بھیجنے کی درخواست کی، کتابیں آنے پر میں نے سب سے پہلے الفاروق کا انگریزی ترجمہ کیا۔ عمر رضا دوغرول بک نے اس ترجمے سے کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کو ۱۰/مارچ ۱۹۲۷ء کو چھپنے کے لئے کتب خانہ آثار علمیہ کو دے دیا۔ یہ کتاب ترکی میں حضرت عمرؓ کے عنوان سے چھپی اور بہت مقبول عام ہوئی۔

میں نے اس ترجمے کے معاوضے میں پیسہ لینا نہ چاہا اور ترکی میں اپنی سب سے پہلی علمی

خدمت کو کتب خانہ آثار علمیہ کو بطور ہدیہ پیش کر دیا۔ اس کتاب کی فروخت سے کتب خانہ کے مالک اشرف ادیب بک کو یقین ہو گیا کہ ایسے ترجموں سے اس کو کافی نفع ہو گا۔

میرا حج کے لئے مکہ مکرمہ جانا

میں ترجمے کے ذریعے اپنے لئے کچھ آمدنی بہم پہنچانے کے منصوبوں میں لگا ہوا تھا کہ ۱۹۲۷ء کے حج کے موسم سے کوئی ایک ماہ پہلے مجھے والدہ صاحبہ کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اس سال حج پر جا رہی ہیں اس لئے مجھے بھی چاہئے کہ حج کو آوں۔ تاکہ وہ مجھ سے حجاز میں مل کر میری جدائی کی حسرت کو جو سالہا سال سے بھگت رہی ہیں، کچھ کم کر سکیں۔

لیکن میرے لئے حجاز جانے میں وہی مشکلات حائل تھیں جو قبلہ مولانا کے سفر حجاز میں مانع تھیں۔ یعنی استانبول سے کوئی جہاز سیدھا حجاز نہ جاتا تھا۔ اس لئے میں نے ان کو لکھ دیا کہ میرا حجاز آنا ناممکن ہے۔ اس سے ان کو بہت سخت مایوسی ہوئی۔ لہذا انہوں نے مجھے دوبارہ اصرار سے لکھا کہ جس طرح ہو سکے مجھے حجاز پہنچنا چاہئے۔ خدا کی شان کہ اس کے چند روز بعد ترکی اخبارات میں یہ خبر نکلی کہ ایک ترکی جہاز جس کا نام روم ایلی تھا استانبول سے ترکی حاجیوں کو حجاز لے جائے گا۔

اس خبر کو پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ خدائے مسبب الاسباب نے ایک ایسا ذریعہ پیدا کر دیا جس سے فائدہ اٹھا کر میں نہ صرف والدہ صاحبہ (مرحومہ) کی خدمت میں حاضر ہو سکوں گا بلکہ حج کا ثواب بھی حاصل کر لوں گا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد روم ایلی جہاز سے پہلے کوئی ترکی جہاز استانبول سے حجاز نہ گیا تھا۔ اور بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ اس کے بعد بھی سالہا سال تک کوئی ترکی جہاز استانبول سے حجاز نہ گیا۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ خدا نے روم ایلی جہاز کے اس سال حجاز جانے کا انتظام میری والدہ کی دعاؤں کو قبول کر کے صرف میرے لئے کر دیا تھا۔ لیکن اب سفر خرچ کا سوال پیش آیا۔ میرے پاس اتنا روپیہ نہ تھا اور کسی سے قرض لے کر میں اس سفر پر جانا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے سردار محمد نادر خان سابق وزیر حربیہ

افغانستان کو جو پیرس کی افغانی سفارت سے استعفا دے کر اب فرانس میں جلا وطنی کے دن گزار رہے تھے، اور جن سے میری خط و کتابت اردو میں ہوتی رہتی تھی (دیکھئے ذیل میں ان کا ایک خط) ایک چٹھی لکھ کر ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے کچھ روپیہ بھیجیں تاکہ میں حجاز جا کر اپنی والدہ کا آخری مرتبہ دیدار کر سکوں۔

۱۹۲۵/۳۰/مارچ Menton

پیارے بھائی ظفر، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے پاک ارادوں میں ظفر نصیب کرے۔ آپ کا خط مورخہ ۲۳/مارچ موصول ہوا جس کے مطالعہ سے نہایت ممنون اور مسرور ہوں۔ خدائے کریم نے مجھ پر رحم فرما کر عمر دوبارہ نصیب کی۔ ورنہ میں کہاں اور آپ کو مکتوب لکھنا کہاں مگر جب تک قضا مقرر نہیں ہوئی، ساری آفات اور بلیات سے نجات اور جب قضا آئی تو کوئی اس کا علاج اور چارہ نہیں۔ اسی میں ملاحظہ کیجئے تینوں ارا کین سلطنت یورپ اور ایک مہاجر ہندوستانی ارجمند محمد افضل کو قریبا ایک جیسی بیماری میں مبتلا ہو کر اپریشن کرانا پڑا۔ ان تین رجال جلیل القدر کے معالجہ کے لئے کیا سامان اور کیسے جراح اور کس قسم کی تیمار داری ہوئی ہو گی اور اس بیچارہ، بے کس تنہا مہاجر کو سوم درجہ سرجنوں نے شاید کس لاپروائی سے علاج کیا ہو گا۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔ صدر اعظم جرمنی، لارڈ کرزن، لارڈ رابنسن سپہ سالار افواج ہند تینوں زیر خاک ہیں اور ہمارے صادق بھائی افضل (مانتون) میں بحرہ روم کے کنارہ پر ہر صبح و شام ہوا خوری کے مزے اڑا رہے ہیں اور اکثر یہ میرے پاس آ کر مجھ کو اپنی صحبت سے مسرور کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے جو مشیت ایزدی میں ہے اور مقدر میں لکھا ہے، وہی ہو کر رہے گا۔

الحمد للہ اب میری صحت بہت کچھ اچھی ہو گئی ہے اور مرض قریبا ۲۵ دن سے رفع دفع ہو گیا ہے۔ خدا اس منحوس کا منہ پھر نہ دکھائے۔ دو سال سے میں گرداب امراض میں مبتلا رہا۔ اب خدا محفوظ رکھے، آمین۔ اور آپ کا نہایت خوش نما فوٹو پہنچا جسے دیکھ کر مجھ کو پیارا ظفر ٹھل کے میدان میں مع بندوق کے جو کاندھے میں

ہمیشہ حمائل رہتی تھی، نظر آتا ہے اور ان صحبتوں کو جو آپ کے ساتھ گزاری ہیں یاد کر کے ہمیشہ دعائے خیر آپ کے لئے کیا کرتا ہوں ۔ مجھ کو اپنا دوست سمجھیں۔ اگرچہ مجھ سے آپ کی ان خدمات کا جو آپ نے افغانستان کے لئے کیں اور میری معاونت میں مصروف رہے، اس کے صلہ اور معاوضہ میں شرمندہ ہوں ۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ مگر خداوند کریم سے اس کے معاوضے کے لئے درخواست ہے۔ انشاء اللہ امید ہے خدا ملاقات نصیب کرے (یار زندہ صحبت باقی)

اپنا فوٹو گراف عنقریب آپ کے لئے روانہ کروں گا کیونکہ یہاں کوئی اچھی فوٹو نہ تھی، ورنہ اسی ڈاک سے روانہ کرتا۔ جناب مولانا صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ فقط آپ کا سچا دوست (۲۴)

محمد نادر

سردار سپہ سالار صاحب مرحوم میرے ایسے محسن، مہربان اور قدردان ثابت ہوئے کہ باوجودیکہ وہ خود جلا وطنی کی حالت میں اپنا گزارہ بڑی مشکل سے کیا کرتے تھے، انہوں نے مجھے فوراً سفر خرچ بھیج دیا اور میں نے روم ایلی جہاز پر حجاز جانے کے لئے ٹکٹ لے لیا۔ اس کار خیر کی وجہ سے میں ان کا ہمیشہ احسان مند رہا اور انہوں نے میری والدہ صاحبہ کی دلی دعائیں لیں۔

ہمیں معلوم ہوا کہ حج کو جانے والے جہازوں کے نہر سویز سے گزرنے سے پہلے انگریز جو اس وقت مصر پر حکمران تھے مسافروں کو ٹیکہ وغیرہ لگانے کے لئے خشکی پر اتارا کرتے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر میں مصر کی سرزمین پر قدم رکھوں تو شاید انگریز مجھے پکڑ لیں گے۔ اس لئے عبد الرحمن ریاض بابر نے اپنے دوست ترکی تجارتی بیڑے کے افسر سعد اللہ بک کو مرا حال بتایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ علی بک کپتان جہاز رومی ایلی کو کہہ دے کہ وہ انگریزوں کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ مجھے خشکی پر اترنے کو مجبور کر سکیں۔ میں کپتان علی بک سے ملا اور اس کو اپنا حال مفصل بتایا۔ اس پر اس نے مجھے اپنی Crew List (جہاز کے عملہ کی فہرست) میں جہاز کا ترجمان بنا

کر درج کر دیا۔ نہر سویز سے گزرتے ہوئے، کپتان، اس کا نائب، انجینئر اور ترجمان کے لئے خشکی پر اترانا مجبوری نہ تھا، باقی ملاح اور مسافروں کو اترنا پڑتا تھا۔ اس طرح میں خیریت سے جہاز پر حجاز پہنچ گیا اور وہاں قبلہ مولانا صاحب اور عزیز احمد سے اور اس کے بعد والدہ صاحبہ سے جو میرے چچا حافظ ابراہیم صاحب کے ساتھ حج پر آئی تھیں ملا۔ والدہ صاحبہ نے مجھے کہا کہ "میں ہر روز نماز کے بعد خدا سے دعا مانگا کرتی تھی کہ مجھے آپ سے زندگی میں ایک دفعہ ملا دے ۔ کوئی ڈیڑھ ماہ کی بات ہے کہ میں نے ایک رات خواب میں رسول اللہ صلعم کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے یہ خوشخبری دی تھی کہ اگر میں حج پر چلی جاؤں تو آپ سے ضرور مل لوں گی۔ مجھے اس خوشخبری سے بہت ہی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ مجھے یقین آگیا کہ میرا خواب ضرور سچا نکلے گا۔ اس پر میں نے حج کی تیاریاں شروع کیں اور آپ کو لکھا کہ آپ حج پر آئیں اور مجھے وہاں ملیں۔ لیکن جب آپ نے مجھے یہ جواب بھیجا کہ راستہ بند ہونے کی وجہ سے آپ نہ آسکیں گے تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ میرا خواب جھوٹا نکلا۔ اس کے بعد جب آپ کا دوسرا خط آیا کہ آپ کو جہاز مل گیا ہے اور آپ حج پر پہنچ جائیں گے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آج خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری یہ آرزو پوری ہو گئی"۔

قبلہ مولانا صاحب نے مجھے مولوی عبدالقادر قصوری (مرحوم) سے ملایا۔ ان کے خیالات کو میں نے چنداں انقلابی نہ پایا۔ قبلہ مولانا بھی، مولوی عبد القادر قصوری اور حج پر آنے والے دوسرے ہندوستانی لیڈروں کے رویہ سے چنداں امید نہ رکھتے تھے کہ وہ ان کے پروگرام کے چلانے میں کچھ مدد دیں گے۔

حج سے میری واپسی:

میں نے والدہ صاحبہ کے ساتھ حج کیا اور ان سے رخصت ہوتے ہوئے اپنا دودھ بخشوایا۔ وہ کہنے لگیں: "میں بڑی خوش قسمت ہوں کہ آپ سے اس دنیا میں پھر مل گئی۔ اس کے لئے خدا کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ اب اگر میں مر بھی جاؤں اور آپ

کو پھر نہ دیکھوں تو مجھے بالکل افسوس نہ ہو گا"۔

حجاز سے ترکی واپس آنے کے لئے مجھے بحیثیت ایک افغانی رعایا کے ویزا لینا تھا۔ میرے پاس جو افغانی پاسپورٹ تھا اس کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ حجاز میں اس زمانے میں کوئی افغانی نمائندہ بھی نہ تھا کہ اس سے نیا پاسپورٹ لوں۔ لیکن اس زمانے میں ترکی اور افغانستان کے باہمی سمجھوتے کی وجہ سے ترکی سفیر حجاز میں افغانی رعایا کے کاموں کو سرانجام دیا کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بعض جگھوں میں افغانی سفیر ترکی رعایا کے امور کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اس لئے میں عزیز احمد کے ساتھ ترکی نمائندے سے ملنے گیا اور اس سے ویزا مانگا۔ میری درخواست پر اس نے مجھے عارضی طور پر ترکی پاسپورٹ دے کر اس میں میرا افغانی رعایا ہونا درج کر دیا اور ترکی واپس جانے کے لئے ویزا دے دیا لیکن اس پاسپورٹ میں میری پیدائش کا سال غلطی سے ١٨٩٥ء کی بجائے ١٨٩٩ء لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلرک نے ٥ کو ٩ سمجھا۔ یہ غلطی آگے چل کر جب میں ترکی رعایا بنا اور ترکی ملٹری کالج میں داخل ہوا، میرے بہت کام آئی کیونکہ میری عمر اس طرح ٣٢ سال کی بجائے ٢٨ سال بن گئی۔ جس سے ملٹری کالج میں میرا داخلہ ہو گیا اور بعد میں کیپٹن کے مرتبہ تک پہنچنا ممکن ہو گیا۔

راستہ کی مشکلات

ویزے کا مسئلہ اس طرح پر حل ہونے کے بعد، میں قبلہ مولانا سے رخصت ہوا اور روم ایلی جہاز پر ترکی کو روانہ ہو گیا۔ قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ، جن کی ذات ستودہ صفات سے میں نے مذہبی تعلیم اور سیاسی تربیت حاصل کر کے، ایسا فیض اٹھایا تھا کہ اس سے ساری عمر بہرہ اندوز ہوتا رہا۔ میری یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ خداوند کریم ان کو جنت اعلیٰ میں جگہ دے، آمین۔

واپسی کے لئے جہاز پر سوار ہونے پر معلوم ہوا کہ نہر سویز سے گزرتے ہوئے کپتان اور اس کے نائب اور انجینئر کے سوا سب ملاحوں اور مسافروں کو قرنطینہ کی وجہ سے خشکی پر اترنا پڑتا ہے اور وہاں ان کو ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ میں جہاز کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس دفعہ مجھے بھی اترنا پڑے گا۔ میں نے کپتان علی بک کو پھر اپنا حال بتایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے خشکی

پر اترنے نہ دے، ورنہ مجھے انگریز پکڑ لیں گے۔ اس دفعہ اس خدا کے بندے نے نئی (Crewlist) بنائی اور اس میں مجھے انجینئر لکھا۔ چنانچہ میں جہاز پر ہی ٹھہرا رہا اور میری جگہ اصل انجینئر قرنطینہ کو گیا۔ اس کے بعد میں خیریت سے استانبول پہنچ گیا۔ اس کے صلے میں میرے پاس جتنا روپیہ باقی رہ گیا تھا، سب کا سب میں نے کپتان علی بک کو دیدیا۔

استانبول میں جہاز کنارے سے ذرا دور لنگر انداز ہوا۔ ڈاکٹر نے آکر حاجیوں کا معائنہ کیا۔ چونگی (Customs) کے افسران نے بھی جہاز کی پڑتال کی کہ آیا کوئی چونگی کا مال جہاز پر ہے یا نہیں تیجا سنگھ آزاد ایک چھوٹی سے کشتی پر سوار ہو کر مجھے خوش آمدید کہنے کو جہاز تک آیا۔ چونکہ ابھی تک جہاز کے مسافروں کو ڈاکٹر نے کسی سے ملنے کی اجازت نہ دی تھی اس لئے میں اس سے صرف دور سے بات چیت کر سکا۔ اس کے بعد حاجیوں کو جہاز سے اترنے کی اجازت دینے سے پہلے پولیس نے ان کے پاسپورٹ دیکھے اور ترکی حاجیوں کو اترنے کی اجازت دے دی۔ لیکن میرا پاسپورٹ ان کو عجیب سا معلوم ہوا۔ کیونکہ پاسپورٹ ترکی تھا اور میں افغانی رعایا تھا۔ اس پر پولیس نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور مجھے جہاز سے اترنے کی اجازت نہ دی۔

شام کو ہمارا جہاز یہاں سے لنگر اٹھا کر شاخ زریں (Golden horn) کے اندر گودی میں چلا گیا، اور میں رات بھر اور اگلے روز شام تک ایک پولیس مین (Policeman) کی نگرانی میں جہاز پر رہا۔ شام کو جہاز عمومی معائنہ اور مرمت کے لئے جہاز سازی کے کارخانے واقع استینیا (Istiniye) بوسفورس کو روانہ ہو گیا۔ سپاہی مجھے جہاز سے اتار کر تھانے لے جانے لگا۔ خوش قسمتی سے میرے آنے کی اطلاع مولا بخش نام ایک ہندوستانی مہاجر کو جو پہلی جنگ عظیم کے دوران بغداد میں کسی کارخانہ میں نوکر تھا اور پھر وہاں سے اپنی بیوی کو لے کر ترکی فوج کے ساتھ استانبول آگیا تھا، مل گئی تھی اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے جہاز پر آگیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ تھانے گیا اور وہاں اس نے اپنا ترکی شناختی کارڈ پولیس کو دکھلایا۔ وہ ترکی رعایا کی حیثیت سے میرا ضامن بنا۔ اس طرح اس نے مجھے پولیس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور میں رات کو اپنے گھر چلا گیا۔

تیجا سنگھ کی ترکی سٹاف کالج میں داخلہ کی ناکام کوشش

تیجا سنگھ نے ١٩٢٧ء میں ملٹری کالج سے کمیشن لینے کے بعد جنرل فخرالدین ترک قان پاشا

سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے ترکی جنرل سٹاف کالج میں داخلہ کی اجازت حاصل کریں۔ ترکی فوجی قانون کے ماتحت صرف کیپٹن کے درجے کے افسر سٹاف کالج میں داخل ہو سکتے ہیں اور کیپٹن کا درجہ ترکی فوج میں نو سال خدمت کرنے کے بعد ملتا ہے۔ اس لئے قاعدہ کے لحاظ سے تیجا سنگھ کا حق نہ تھا کہ وہ سٹاف کالج میں داخل ہو سکے۔ لیکن بہ حیثیت ایک غیر ملکی کے اس کو رعایت کے طور پر یہ حق مل سکتا تھا کہ وہ بطور ایک سامع یعنی (Private Student Listner) کے سٹاف کالج کے سب سبقوں کو دوسرے ترکی افسروں کے ساتھ پڑھ سکے۔ اس قسم کی اجازت صرف ترکی کے کمانڈر ان چیف فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا کی طرف سے دی جا سکتی تھی۔ جنرل فخرالدین ترک قان پاشا نے فیلڈ مارشل موصوف کی خدمت میں عرض کر کے تیجا سنگھ کے لئے اس قسم کی اجازت لینی چاہی۔ ابھی اس کوشش کا نتیجہ نہ نکلا تھا کہ تیجا سنگھ کی حرکات اور چال چلن سے مجھ پر بہت برا اثر پڑا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ترکی لڑکی سے جس کو اس سے محبت ہے، شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ لڑکی ہمارے محلہ عبداللہ آغا میں ایک ہمارے پڑوسی کی نوکرانی ہے اور اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ مجھے تیجا سنگھ کا ایک بے کس نوجوان مسلمان لڑکی سے معاشقہ کرنا ناگوار گزرا۔ انہی دنوں میں، میں نے ہندوستانی اخبارات میں پڑھا تھا کہ ایک سکھ عورت کے ایک مسلمان سے پنجاب میں شادی کرنے پر سکھوں اور مسلمانوں میں سخت فساد ہو گیا۔ چنانچہ میں نے تیجا سنگھ کو اس شادی سے روک دیا۔ وہ میری بات تو مان گیا لیکن مجھے بہت تنگ نظر اور متعصب خیال کرنے لگا۔

اس واقعہ کے علاوہ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں ترکوں کے متعلق ایسے خیالات ظاہر کئے جن کا اظہار ایک ایسے شخص کی طرف سے جس نے ترکوں کی مہربانی اور مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا کر فوجی تعلیم حاصل کی تھی، نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس وجہ سے میں نے اس کا ترکی سٹاف کالج میں جہاں ترکی فوجی جارحانہ اور مدافعانہ کارروائیوں کے بارے میں افسروں کو راز کی باتیں بتائی جاتی ہیں، داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے میں، عبدالرحمن ریاض بابر کے ذریعہ جس کے فیلڈ مارشل موصوف کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے، ان سے ملا اور ان کی خدمت میں مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات کا مفصل ذکر کر کے ان سے درخواست کی کہ "ایک سکھ کو ترکی رازوں سے واقف کرنا ترکی کے لئے خلاف مصلحت ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے

آگے چل کر مضر ثابت ہو گا۔ اگر مقصد یہ ہے کہ آئندہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کام کرنے کے لئے ہندوستانی نوجوانوں کو فوجی تعلیم دی جائے تو پہلے تو مسلمان نوجوانوں کو اس کا موقع ملنا چاہئے اور اس کے لئے ہندوستان سے مسلمان نوجوان بلائے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں خود بھی اگرچہ میری عمر ۱۹ سال سے زیادہ ہے جو ملٹری کالج میں داخلہ کے لئے آخری حد مانی جاتی ہے، فوجی تعلیم حاصل کرنے کو تیار ہوں۔"

فیلڈ مارشل موصوف پر میری باتوں کا بہت اچھا اثر ہوا اور انھوں نے تیجا سنگھ کو ترکی سٹاف کالج میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اس کے بعد تیجا سنگھ ترکی چھوڑ کر فرانس چلا گیا۔ اگرچہ اس نے اس زمانے میں جب کہ اس کو ترکی کے ملٹری کالج سے نکال دیا گیا تھا اور وہ ملٹری کالج میں دوبارہ داخل ہونے کے انتظار میں بیکار وقت کاٹ رہا تھا فرانسیسی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ فرانس کے سٹاف کالج میں داخل ہو کر اپنی فوجی تعلیم کو پورا نہ کر سکا۔ بعد میں میں نے سنا کہ وہ فرانس سے روس پہنچا اور وہاں کمیونسٹ خیالات کے زیر اثر آیا اور اس کو کچھ مدت بعد روسیوں نے خفیہ طور پر ہندوستان بھیج دیا۔ وہاں جا کر اس پر کیا بنی اس کا مجھے آج تک کوئی پتہ نہیں چلا۔

میرا سیرت النبیؐ کا ترجمہ کرنا

حج سے واپس آکر میں نے پیام امین کا جو عبداللہ منہاس صاحب نے قرآن شریف کے اعجاز کے بارے میں لکھی تھی اور جس میں قرآن شریف کے متعلق مشاہیر عالم کی رائیں درج تھیں، انگریزی میں ترجمہ کیا اور عمر رضا دوغرول بک نے اس میں چند ایک باب نزول قرآن وغیرہ کے متعلق اضافہ کر کے (قرآن نہ در؟) (یعنی قرآن شریف کیا ہے؟) کے عنوان سے ۱۰/نومبر ۱۹۲۷ء میں اس کو ترکی زبان میں (کتب خانہ آثار علمیہ) کے ذریعہ استانبول میں چھپوایا۔ ان کتابوں کے مقبول عام ہونے سے (کتب خانہ آثار علمیہ) کے مالک اشرف ادیب بک کو کافی نفع ہوا۔ اس لئے اس نے ایسے ترجموں کی چھپائی پر کمر باندھ لی۔ اس کام سے میرے گزارے کا بھی راستہ نکل آیا اور عمر رضا کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہ ایک کار خیر بھی تھا۔ اس لئے ہم سب اس میں بڑی تندہی سے مصروف ہو گئے۔

اس کے بعد سیرت النبیؐ کی تین جلدوں کا ترجمہ کرنے میں مجھے تقریباً ایک سال

لگا جس سے مجھے اتنی آمدنی ہوتی رہی کہ نہ صرف میں اپنا گزارہ کر سکا بلکہ بعض ہندوستانی مسلمان غریب مہاجروں کی بھی مدد کرتا رہا۔

سیرت النبیؐ کی تین جلدوں کا ترکی ترجمہ عصر سعادت کے نام سے اور چار جلدوں کی صورت میں یکم دسمبر ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ ترکی میں اس کتاب کو سب علماء نے بہت ہی پسند کیا اور اس کے متعلق اخبارات میں بہت سے مقالے لکھے۔ یہ ساری کتابیں پرانے ترکی حرفوں (عربی حرفوں) میں چھپی تھیں۔ صرف عصر سعادت النبیؐ کی آخری جلد کو پرانے ترکی حرفوں (یعنی عربی رسم الخط) میں چھپوانے میں ذرا مشکلات پیش آئیں کیونکہ اس زمانے میں ترکی میں عربی حرفوں کی بجائے رومن حروف کے استعمال کے بارے میں قانون بن گیا تھا اور نومبر ۱۹۲۸ء کے مہینے کے بعد کوئی کتاب یا اخبار عربی حرفوں میں نہ چھپ سکتا تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر بہ تفصیل بیان کیا جائے گا میں ترکی رعایا بننے کے بعد یکم اگست ۱۹۲۸ء کو ترکی فوج میں داخل ہو گیا تھا اور چھاؤنی میں یعنی فوجی بارک میں رہنے لگا تھا جہاں اس قسم کا ترجمہ وغیرہ کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے میں مختلف بہانے کر کے فوج سے تقریباً ہر روز چند گھنٹے کی چھٹی لیا کرتا اور چھاؤنی سے باہر جا کر ایک دوست کے گھر میں کتاب کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے میں نے یہ ترجمہ ستمبر کے آخر تک ختم کیا اور عمر رضا دوغرول بک نے ترکی ترجمہ اکتوبر میں پورا کیا اور کتاب کا آخری حصہ نومبر کے شروع میں پریس میں دیدیا گیا جس سے کتاب بروقت مقررہ عربی حرفوں میں چھپ کر تیار ہو گئی۔

ترکی میں عربی حرفوں کی بجائے رومن حرفوں کی منظوری جس کو یہاں انقلاب حروف کہتے ہیں، کس وجہ سے عمل میں آئی اور کن اسباب نے ترکوں کو اس پر مجبور کیا، اس کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ترکی میں اس زمانے میں جو سیاسی اور سماجی (سوشل) اصلاحات ہو رہی تھیں، ان پر یہاں مختصر طور پر نظر ڈالی جائے۔

باب اٹھارواں

ترکی میں اصلاحات اور کمالسٹ انقلاب

سلطنت عثمانیہ ۱۳۰۰ء میں ترکی سلطان عثمان خان غازی کی طرف سے قائم کی گئی تھی۔ یہ سلطنت ۱۹۲۲ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی جمہوریت قائم ہونے پر ختم ہو گئی۔ ان چھ صدیوں میں جتنے سلطان (آخری دو سلطان مستثنیٰ) تخت پر بیٹھے سب کے سب مطلق العنان بادشاہ تھے جن کی کوئی مجلس مشاورت نہ تھی۔ حالانکہ اسلام "شاورھم فی الامر" حکومت کے کاموں میں ان سے مشورہ کرو کا حکم دیتا ہے۔ سلطان مراد خاں ثانی (۱۴۵۱_۱۴۲۱ء) کے زمانے میں باب یشخنت کے نام سے شیخ الاسلام کا محکمہ قائم ہوا اور پہلا قاضی جس کو شیخ الاسلام کا درجہ ملا، ملا شمس الدین تھا۔ شیخ الاسلام کو مذہبی مسائل کے بارے میں فتویٰ دینے کا اختیار تھا اور اگر کبھی سلطان کی بد انتظامی کی وجہ سے لوگوں میں اور فوج میں اس کے خلاف بغاوت ہو تو شیخ الاسلام سلطان کو تخت سے اتارنے کے لئے مذہبی احکام کی بنا پر فتویٰ دے دیا کرتا تھا۔ ترکی میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں شرعی قوانین حنفی فقہ کے مطابق مجلہ قوانین شرعیہ کے نام سے مرتب کئے گئے اور شرعی عدالتوں میں قاضیوں کے ذریعے نافذ کئے جاتے تھے۔

یہاں بعض احکام دینی کی پابندی تو بڑی سختی سے ہوتی تھی لیکن بعض احکام سے لاپرواہی برتی جاتی تھی۔ بعض احکام کی سخت پابندی کی ایک مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص علانیہ رمضان کے مہینے میں کھائے پئے یا سگرٹ نوشی کرے تو اس کو سزا کے طور پر کوڑے لگائے جاتے تھے۔ لیکن اس کے خلاف لوگوں میں شراب نوشی کی عادت بہت زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ بعض سلطان خود بھی شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ سلطان، اس کے امراء اور مال دار لوگ چار منکوحہ بیویاں

رکھتے تھے۔ حالانکہ اسلام صرف بعض خاص حالات میں اور بیویوں میں عدل و انصاف قائم رکھنے کی شرط پر تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے۔

(عربی سورہ نساء آیت ۱۷) اگر انصاف وعدل کا قیام ممکن نہ ہو (کہ بشر کے لئے پورا عدل کرنا ناممکن ہے) تو فقط ایک بیوی کی اجازت ہے۔ اس کے سوا امیروں کے گھروں میں باندیاں بھی ہوتی تھیں جن کو غلاموں کے بازار سے خرید کر وہ اپنی داشتہ بنا لیتے تھے۔ یہ بھی سراسر ایک غیر اسلامی رواج ہے۔ کیونکہ باندی صرف جنگی قیدیوں میں سے ہونی چاہئے۔ ملک میں مذہبی تعصب اتنا تھا کہ علماء نے قرآن شریف کا ترکی میں ترجمہ کرنا ناجائز قرار دے دیا تھا۔ حالانکہ ہندستان میں قرآن شریف کا فارسی ترجمہ اٹھارویں صدی عیسوی میں چھپا اور اس کے بعد اردو میں متعدد ترجمے کئے گئے تھے۔ ترکی میں قرآن شریف کا ترکی ترجمہ صرف بیسویں صدی عیسوی میں چھپا اور اس کی بھی ملاؤں نے بہت مخالفت کی۔

یورپ میں ۱۴۵۰ء میں جرمنی میں (Gotenberg Johannes) کے اصول پر چھاپا خانہ ایجاد کیا لیکن ترکی میں جس کا آدھا ملک یورپ کی (Typography) سرزمین میں تھا اور جس کو اس ایجاد سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہئے تھا، علماء نے اس چھاپہ خانے کے کھولنے کی مخالفت کی۔

دنیائے اسلام کے عالموں نے اجتہاد کا دروازہ تو پہلے ہی بند کر دیا تھا جس سے مسلمانوں میں زمانے کی رفتار کے مطابق نئے خیالات اور نئے فلسفے جاری ہونے اور احکام میں زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا امکان باقی نہ رہا تھا۔ اسی سبب سے عالم اسلام پر ایک جمود طاری ہو گیا اور یہی جمود ترقی کی دوڑ میں ان کے دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کا باعث بنا۔

ترکی کے علماء کے تجدد اور ترقی روکنے والے رویہ نے، نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف بہت برے خیالات پیدا کر دیئے۔ افسوس ہے کہ ترکی میں شاہ ولی اللہ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی کے پائے کا کوئی جید عالم پیدا نہیں ہوا۔

ترکی میں وقتاً فوقتاً نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں نے سلطان کے مطلق العنان اختیارات کو ذرا کم کرنے اور ملک میں دستوری حکومت بنانے کی کوششیں کیں۔ مثلاً ۱۸۷۶ء میں وزیر اعظم مدحت پاشا نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کو پارلیمنٹ

بنانے پر مجبور کیا لیکن اس نے جلدی ہی پارلیمنٹ توڑ دی اور مدحت پاشا کو مکہ معظمہ کے نزدیک طائف میں جلاوطن کر دیا۔ آخر کار نوجوان ترکوں نے جن کے لیڈر طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا تھے جمعیت اتحاد و ترقی قائم کی اور ۲۴/جولائی ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی کو دستوری حکومت بنانے پر مجبور کیا۔ لیکن ۳۱/مارچ ۱۹۰۹ء کو ملاؤں نے لوگوں کو بھڑکایا اور پارلیمنٹ کے توڑنے کا مطالبہ کیا۔ جمعیت اتحاد و ترقی نے اس بغاوت کو فرو کر کے سلطان کو تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ سلطان محمد رشاد خان کو ایک دستوری بادشاہ (Constitutional monarch) کے طور پر تخت پر بیٹھا دیا۔ لیکن سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ملک خارجی قرضوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ قرضے اتنے زیادہ تھے کہ ان کی ادائیگی باقاعدہ نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے حکومت ملک کے مختلف ذرائع آمدنی کو مثلاً کسٹمز کے محصول کو یورپین قرض خواہ حکومتوں کو رہن کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ غیر ملکی لوگوں کو اتنی رعایات دی گئی تھیں کہ ان کے مجرموں کے مقدمے بھی ایسی خاص عدالتوں میں چلتے تھے جن کے جج غیر ملکی ہوتے تھے اور قانون بھی غیر ملکی نافذ کیا جاتا تھا۔ غرض غیر ملک کے باشندوں کو جو ترکی میں رہتے تھے ایسے حقوق اور امتیازات حاصل تھے کہ ترک اپنے ملک کے مالک بھی نہ سمجھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے ترکی کو یورپ کا "مرد بیمار" کہا جاتا تھا جس کی موت کا سارا یورپ منتظر اور اس کی میراث کو لوٹنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس شروع ہو گئی اور اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ جنگ بہ مشکل ختم ہوئی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی اور بلقانی قوموں نے زار روس اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور باغیوں کی ہمت افزائی کرنے کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کے خلاف سر اٹھایا۔ اس جنگ میں ترکی کا تقریباً سارا یورپین حصہ سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کے بعد ترکی نے اپنی فوج کو جرمن افسروں کی مدد سے نئے سرے سے منظم کیا۔ لیکن یہ کام ابھی بہ مشکل پورا ہوا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور جرمنوں نے ترکوں کو اس جنگ میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد چار سال تک ترکوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے اپنا خون بہایا۔ ایک طرف درہ دانیال میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑوں کو جو یہاں سے گزر کر استانبول پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگے تھے۔ ۱۸/مارچ ۱۹۱۵ء کو شکست دی اور ۱۹۱۶ء میں گیلی پولی میں انگریزی فوجوں کو جو خشکی کے راستے استانبول تک پہنچنا چاہتی تھیں پسپائی پر مجبور کیا۔ دوسری

طرف عراق میں قوطہ العمارہ کے مقام پر ۱۹۱۶ء میں انگریزی فوجوں کو محاصرہ میں لے کر ان کے کمانڈر جنرل ٹاؤنسند (Townshend) کے ساتھ سب کو پکڑ لیا۔ جنوب میں انہوں نے سینا کے صحرا سے گزر کر غزہ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی اور نہر سویز کو عبور کر کے مصر کی سرزمین پر پاؤں رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن ان کے رسل و رسائل کے راستے بہت لمبے ہو گئے اور ان کو بے آب و دانہ صحرا میں سے گزرنا پڑا۔ اس وجہ سے ان کو بر وقت نہ رسد کا سامان پہنچ سکا اور نہ امداد بر وقت مل سکی۔ اس لئے ان کو مصر سے لوٹنا پڑا۔ مشرق میں روس کے خلاف قفقاس کے برف پوش پہاڑوں میں لڑائیں لڑیں اور روسی فوجوں کو (کوہ اللہ اکبر میں) شکست دی۔ یورپین محاذ پر آسٹرین فوجوں کی مدد کے لئے جو روسیوں کے حملوں کی وجہ سے کوہ کار پتھین Carpathian میں پاؤں نہ جما سکی تھیں، ایک ترکی ڈویژن بھیجا گیا جس نے وہاں پہنچ کر آسٹرین فوجوں کی پسپائی کو پیش قدمی میں بدل دیا۔

غرض ترک اس طرح چار سال تک مختلف محاذوں پر انگریزوں، فرانسیسیوں اور روسیوں جیسے طاقتور دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہے جن کے پاس ہندوستان، شمالی افریقہ اور ترکستان کے خزانے اور بے انتہا انسانی ذرائع موجود تھے۔ آخر کار ایک طرف شریف مکہ اور شام کے عربوں کی بغاوت اور دوسری طرف آسٹریا اور بلغاریہ کے عارضی صلح کر لینے پر ترک بھی جرمنی کی طرح ۱۹۱۸ء میں صلح پر مجبور ہو گئے۔ جس کے باعث اماکن مقدسہ ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور ان پر سیورے کے معاہدہ کے مطابق ایسی شرطیں لگائی گئیں کہ ۶۰۰ سالہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کا الزام یہاں جمعیت اتحاد و ترقی پر لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے جرمنی کی وجہ سے ملک کو لڑائی کی آگ میں دھکیل دیا تھا اور ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک کے زمانے میں اپنے خراب ادارے کی وجہ سے ترکی قوم کی ہستی کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔

جمعیت اتحاد و ترقی کی ناکامی کی وجوہ صرف اس کے ادارے کی خرابی ہی نہیں۔ اس کے طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا جیسے لیڈر نہایت ہی مخلص، دیانت دار، نیک نیت اور وطن پرست تھے لیکن ان کا میدان سیاست میں ناتجربہ کار ہونا اور انگریزوں، فرانسیسیوں اور زار روس کا ترکی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے سازشیں کرنا، انیسویں صدی میں سلطانوں کی تن پرستی اور فضول خرچی کی وجہ سے ملک کا مالی طور پر کمزور ہو جانا، ایسے اسباب تھے کہ یہ جاں نثار لوگ اپنی نیک نیتی کے باوجود ملک کو تباہی سے نہ بچا سکے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ میں جنگ کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے ۱۶/ مارچ ۱۹۱۹ء کو استانبول پر قبضہ کر لیا اور یونانیوں کو سلطنت بزنطین (Byzantine) دوبارہ زندہ کرنے کا وعدہ دے کر بندر گاہ سمرنا (ازمیر) پر اترنے اور اناطولیہ (ایشیائے کوچک) پر حملہ آور ہونے پر راضی کر لیا۔ فرانس اور اٹلی نے ترکی کے جنوبی علاقوں پر قونیہ تک قبضہ کیا اور شمال میں ارمینوں نے قفقاس سے نیچے اتر کر ترکی کے قارص اور اردھان کے دو صوبوں کو ہتھیا لیا۔

غرض ۱۹۱۹ء میں ترکی اس ناگفتہ بہ حالت میں تھا کہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک آزادی کا علم بلند کرنے کے لئے ۱۹/ مئی ۱۹۱۹ء کو بحر اسود کے کنارے اناطولیہ کی بندر گاہ (Samsun) صامسون پر اترے۔ ان کے پاس نہ باقاعدہ فوج تھی اور نہ ہتھیار اور نہ توپ خانہ۔ ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں کی دستبرد سے لوگ بے زار ہو چکے تھے۔ خلیفۃ المسلمین سلطان وحید الدین جو ۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمہ سے پہلے سلطان محمد رشاد خان کی وفات پر تخت پر بیٹھا تھا، استانبول میں انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کو باغی قرار دے کر اس کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے ۱۹۲۰ء میں فوج خلافت روانہ کی تھی۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے اس بے سرو سامانی کے باوجود تین سال اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف اپنا سینہ سپر کیا اور آخر کار ۳۰/ اگست ۱۹۲۲ء کو یونانی فوجوں کو دوملو پنار کے میدان جنگ میں ایسی شکست فاش دی کہ ان کے لئے سرزمین اناطولیہ کو چھوڑ کر بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ ان کا کمانڈر ان چیف جنرل ٹریکوپوس بھی ترکوں کے ہاتھ جنگی قیدی بنا اور ۹/ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترکی فوجیں سمرنا (ازمیر) میں داخل ہو گئیں۔

اس پر خلیفۃ المسلمین سلطان وحید الدین نے ۱۷/ نومبر ۱۹۲۲ء کو انگریزی جنگی جہاز (ملایا) پر پناہ لی اور ترکی سے فرار ہو گیا۔ اس طرح اس نے اپنے آباؤ اجداد کے نام پر جنھوں نے یورپ کے کئی ملکوں کے شہزادوں اور بادشاہوں کو اپنے زمانے میں تاج و تخت بخشے تھے، انگریزوں کے پاس پناہ لے کر ایک ایسا دھبا لگایا جس کا ذکر کرتے ہوئے آج بھی مسلمانوں کو شرم آتی ہے۔

ترکوں کی بڑھتی طاقت کو دیکھ کر انگریز اور ان کے اتحادی ۲/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو استانبول کو خالی کرنے پر مجبور ہو گئے اور ۶/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی فوجوں نے استانبول پر پھر قبضہ کر لیا۔

اس فتح کے ذریعہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے ملک کو غیروں کے پنجے سے تو چھڑالیا لیکن اب ان کو ایسے عظیم اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا حل پرانے اصولوں پر ناممکن تھا۔ وہ اب ترکی کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش چلانے پر مجبور ہوئے۔ ورنہ جنگی فتح کے باوجود ملک مالی اور اقتصادی طور پر غیروں کا غلام بن جاتا۔ اس لئے انھوں نے ملک کے سب اداروں میں جزری (Radical) اصلاحات کا جاری کرنا ضروری سمجھا۔

انھوں نے سب سے پہلے ۔ ا۔ ترکی میں مذہبی دستوری بادشاہت Theocratic Constitutional monarachy کی بجائے جمہوری نظام قائم کیا جس میں سیاست کو مذہب سے بالکل جدا کر دیا گیا۔ یعنی ایک لادینی حکومت قائم کی گئی جس میں لوگوں کو مذہبی آزادی دے دی گئی اور حکومت کو لوگوں کے عقائد میں دخل دینے سے روک دیا گیا۔ اس جمہوریت کے پہلے صدر غازی مصطفےٰ کمال پاشا چنے گئے۔ (۲۹/اکتوبر ۱۹۲۳ء)

۲ ـــ مذہبی امور کے لئے صدارت عظمیٰ کے ماتحت ادارہ امور شرعیہ کے نام سے ایک الگ ادارہ بنایا اور جدید خیال کے علماء پیدا کرنے کے لئے یونیورسٹی استانبول میں الٰہیات فیکلٹی (Faculty of Theology) قائم کی۔ جہاں سے تعلیم یافتہ لوگوں کو ڈی ڈی یعنی (Doctor of Divinty) کی ڈگری ملتی تھی۔ لیکن اس میں غلطی یہ ہوئی کہ اس فیکلٹی کے پاس شدہ عالموں کو اتنی تنخواہیں نہ دی گئیں جتنی کہ یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کے پاس ہونے والوں کو ملتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کی الٰہیات فیکلٹی کے لئے رغبت نہ رہی اور اس وجہ سے یہ فیکلٹی آخر کار بند ہو گئی۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ لوگوں کو مذہبی تعلیم دینے کے لئے اچھے تعلیم یافتہ اور روشن خیال عالم نہ ملے۔ وہی دقیانوسی خیالات کے ملاشر اور گاؤں میں لوگوں کو طرح طرح کی بدعتیں اسلامی احکام کے نام سے سکھاتے رہے۔ اس وجہ سے حکومت کے خلاف متعدد جگہ بغاوتیں ہوئیں اور جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھوں گا مشرقی ترکی میں شیخ سعید نے کردوں کو حکومت کے خلاف ابھار اور بغاوت کا جھنڈا بلند کیا (اب الٰہیات فیکلٹی پھر کھل گئی ہے)۔

۳۔ محکمہ تعلیم کو بالکل جدید اصولوں پر منظم کیا اور پرانے اصولوں کے مدرسے بند کر دیئے۔

۴۔ تعدد ازدواج کو خلاف قانون قرار دیا۔

۵۔ عورتوں کو مردوں کی طرح پارلیمنٹ کے نمائندے انتخاب کرنے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا حق دیا گیا۔ ان کو مردوں کے برابر تعلیم، کام اور نوکری حاصل کرنے کا موقع دیا جس سے کنبے کی آمدنی بڑھی۔

۶۔ شرعی محکموں کی بجائے دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کی طرح سول عدالتیں قائم کیں۔

۷۔ مجلہ قوانین شرعیہ کی بجائے ملک میں سوئٹزرلینڈ کا سول قانون جاری کیا۔ لیکن اس میں غلطی یہ ہوئی کہ اس کے احکام کو ملک کی ضروریات اور قوم کی صلاحیتوں کے مطابق بنانے کے لئے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی (بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں)۔

۸۔ یورپین لباس کا پہننا اور ترکی ٹوپی (فس) کی بجائے ہیٹ لگانا لازم کر دیا۔

۹۔ قوم کی تعلیمی پس ماندگی کو جلد از جلد دور کرنے کے لئے اور ان پڑھ لوگوں کو جلد پڑھا لکھا بنانے کے لئے ترکی حروف یعنی عربی رسم الخط کی بجائے رومن حروف کا استعمال منظور کیا۔

۱۰۔ خلیفہ کا استانبول میں پرانی شان اور دبدبہ دکھلانے کی وجہ سے ملک میں افراتفری کے ڈر سے (دو بادشاہ در یک اقلیمے نمی گنجند یعنی ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے) کے قول کے مطابق خلیفہ عبدالمجید خان کو ملک بدر کر دیا اور خلافت توڑ دی۔ (۳/مارچ ۱۹۲۴ء)

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے جب خلافت توڑ دی تو ۱۹۲۵ء کی گرمیوں کے آخر میں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ڈاکٹر انصاری ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے ان کے لئے یہ پیغام لائے کہ وہ خلافت کو بالکل نہ توڑیں بلکہ خود خلیفہ بن جائیں۔ لیکن انھوں نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ، پہلی جنگ عظیم میں عربوں کی بغاوت اور ہندوستانی اور روسی مسلمان فوجوں کے انگریزوں اور روسیوں کے زیر کمان ترکوں کے خلاف لڑنے کی وجہ سے اور جہاد کے فتوے کا جو ۱۹۱۵ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خان نے دیا تھا، عالم اسلام پر اثر نہ ہونے سے اس کے قائل ہو گئے تھے کہ خلافت ترکی کے لئے فائدے کی بجائے نقصان کا ذریعہ ہے۔ اس کے سوا ان کو یہ ڈر تھا کہ یورپین طاقتیں، ترکوں کے عالم اسلام کا اخلاقی لیڈر ہونے سے ان کی پھر دشمن بن جائیں گی۔

۱۱۔ اس نئے نظام کو چلانے کے لئے جس کے ذریعہ ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور مہذب ملک بنانا منظور تھا ایک سیاسی پارٹی جمہوری خلق پارٹی یعنی (Peoples, Republican Party) قائم کی گئی اس کی لیڈری خود غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے اپنے ذمہ لی۔ ان اصلاحات میں سے جن کو یہاں کمالسٹ انقلاب کہا جاتا ہے، ترکی رسم الخط کا بدلا جانا ایک بہت ہی اہم تبدیلی تھی۔ اس لئے اس پر یہاں ذرا تفصیل سے بحث کرنا مناسب ہو گا۔

ترکی رسم الخط بدلنے کی وجوہ

ترکی زبان ۱۹۲۸ء تک عربی حرفوں میں لکھی جاتی تھی۔ ترکوں نے ان حرفوں کو خوش خط لکھنے میں اتنی ترقی کی تھی کہ کسی اور اسلامی ملک میں عربی حروف اتنی دل افروز شکل میں نہ لکھے جاتے تھے۔ میں نے عربی ملکوں میں دیکھا کہ خود عرب بھی اپنے حرفوں کو اتنی خوش خطی سے نہیں لکھتے جتنے کہ ٹرک لکھتے ہیں۔ ترکوں نے محمد اسعد یساری، طغرا کش حقی، احمد شوقی، اور حافظ عثمان جیسے نامور خوش نویس پیدا کئے جنھوں نے نستعلیق، نسخ اور ثلث جیسے مختلف خطاطی کے طریقوں میں ید طولیٰ حاصل کیا اور جن کے لکھے ہوئے لوحے (یعنی جلی حرفوں میں کاغذ پر تحریر شدہ اور چوکھٹے میں جڑی ہوئی آیات قرآنی، حدیث نبوی اور مشہور بیت وغیرہ) آج بھی ترک گھروں کے کمروں اور بیٹھکوں میں لٹکائے جاتے ہیں اور ترکوں کی مذہبی عقیدت کا ثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جبکہ یہاں کمروں میں فوٹو گراف لٹکانا مذہباً ناجائز مانا جاتا تھا یہ لوحے کمروں کی سجاوٹ کے لئے بھی کام آتے تھے۔

ترکوں نے نہ صرف پتھر کے چھاپے خانوں (Lithography) کے لئے عربی حرفوں کی نستعلیق خطاطی کو ترقی دی بلکہ Typography کے لئے بھی جو حروف نسخ کے اصول خطاطی کے مطابق ڈھلوائے وہ بھی نہایت ہی حسین تھے۔ اسی طرح ان کے Typewriter کے حروف بھی ایسے موزوں تھے کہ ابھی تک کسی دوسرے اسلامی ملک میں جس نے عربی حرفوں کے ٹائپ رائٹر بنوائے ہیں، ایسے خوبصورت حرف نہیں دیکھے گئے ہیں۔

مگر ان خوبیوں کے باوجود اردو کی طرح ترکی زبان میں بھی لفظوں کے ساتھ زیر، زبر اور

پیش نہ لکھے جانے کی وجہ سے بچوں اور نو آموز بالغوں کے لئے لفظوں کا صحیح تلفظ سیکھنا محال ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر کشتی کا لفظ لیجئے اس کو (کَشتی) اور (کُشتی) دونو طرح پڑھایا جاسکتا ہے۔ مرد کو مَرد اور مُرد یعنی مر گیا اور مردم کو مَردم اور مُردم (میں مر گیا) اور محرم کو مُحَرّم اور (مَحرم) یعنی خفیہ مکرم کو مُکَرم اور مُکرّم اور ظفر کو ظَفر یا ظُفر یعنی پنجر اور دور کو دُور یا دَور یعنی چکر پڑھا جاسکتا ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان الفاظ کو مختلف طور پر پڑھنے سے ان کے فقرے کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ اس وجہ سے نو آموزوں کے لئے لکھنا پڑھنا سیکھنا بہت محال ہو جاتا ہے۔

ان حرفوں میں دوسری مشکل یہ ہے کہ (TYPOGRAPHY) میں ہر حرف کی، لفظ کے شروع میں، بیچ میں اور آخر میں آنے کے مطابق علیحدہ علیحدہ شکلیں بن جاتی ہیں اس سے بچوں کو ہر حرف کی تین تین شکلیں جدا جدا یاد کرنا پڑتی ہیں اور چھاپے خانے میں حرفوں کو ترتیب دینا یعنی (COMPOSE) کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

ان مشکلات کی وجہ سے ترکی میں سلاطین کے زمانے میں لکھنا پڑھنا جاننے والوں کی تعداد صرف ۱۰ فی صد تھی۔ حالانکہ ترکی کے لئے زندگی کی جدوجہد اور ترقی کی دوڑ میں دوسری یورپین قوموں کے ساتھ دوش بہ دوش رہنے کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو جلد از جلد لکھنا پڑھنا سکھلایا جائے اور تعلیم کو عام کیا جائے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں سپاہیوں کو لکھنا پڑھنا آسانی سے سکھلانے کے لئے انور پاشا نے یہ تجویز کی تھی کہ عربی حرفوں کو یورپین زبانوں کی طرح الگ الگ کر کے لکھا جائے جس سے صرف ان کی ایک ہی شکل کو سیکھنا نو آموزوں کے لئے ضروری ہو گا اور زیر، زبر، پیش کی بجائے ان کو ایک حرف کی شکل میں داخل کر دیا جائے جیسا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں رومن حروف میں لکھے ہوئے الفاظ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس تجویز کے لئے جتنی علمی تیاری ضروری تھی وہ نہ کی گئی اور فوجی احکام اس اصول پر لکھنے شروع کر دئے گئے جن کو کوئی کمانڈر بہ آسانی نہ پڑھ سکا۔ اس وجہ سے اس اصول سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچا اور یہ تجویز طاق نسیاں پر رکھ دی گئی۔

آخر کار ۱۹۲۸ء کے آخر میں ترکی میں عربی حرفوں کی بجائے رومن حرفوں کا استعمال شروع ہوا۔ اس سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ بچوں اور ان پڑھ بالغوں نے جلد لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ دوسری یہ آسانی ہوئی کہ طالب علم الجبرا، فزکس، کیمسٹری کے فارمولوں کو یورپین

ملکوں کی طرح یورپی زبانوں میں لکھی ہوئی ریاضی اور سائنس کی کتابوں سے بہ آسانی پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ چھاپے خانوں میں (TELEPRINTER) مشینیں لگ گئیں، ترکی اخبارات باہر سے (TELEX) کے ذریعہ بہ آسانی خبریں لینے لگے۔ یورپ کے بنے ہوئے ٹائپ رائٹروں میں چند ایک ترکی حرف اضافہ کر کے ان کو کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر اور بعینہ ترکی زبان کو ٹائپ کرنے کے لئے بہ آسانی استعمال میں لایا گیا۔

حرفوں کی تبدیلی کا لوگوں کی جہالت دور کرنے میں اتنا زیادہ اور جلد اثر ہوا کہ ملک میں ایک دو سال کے اندر لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد ۶۰ فی صد ہو گئی۔ لیکن میں یہاں یہ بھی لکھنے پر مجبور ہوں کہ اس تبدیلی کے فائدے کے ساتھ یہاں ایک ایسی غلطی ہوئی جس کا نقصان اور خمیازہ ابھی تک اٹھایا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل عربی حروف بالکل نہیں جانتی۔ اس لئے ان نایاب ادبی اور علمی خزانوں سے جو ترکی میں قلمی کتابوں کی صورت میں موجود ہیں کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتی اس کے علاوہ گھروں، زمینوں اور جائدادوں کی ملکیت کے متعلق جتنی پرانے حرفوں میں لکھی ہوئی دستاویزات ہیں ان کو بھی نئی نسل کے لوگ نہیں پڑھ سکتے۔ ان کاغذات کو پڑھنے والے لوگ روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر حروف کی تبدیلی کے بعد یونیورسٹیوں میں پرانے حرف سکھلائے جاتے تو یہ مشکلات پیدا نہ ہوتیں۔ اب پرانے حرف صرف ادبیات فیکلٹی (FacultyofArts) اور مکاتب امام و خطیب میں پڑھائے جاتے ہیں۔

کردوں کی بغاوت

ترکی میں ان اصلاحات اور انقلابات کا ردعمل ضرور ہوا اور بعض قدیم خیال لوگوں، ملاؤں اور قبیلوں کے سرداروں نے حکومت کے خلاف وقتاً فوقتاً سر اٹھایا۔ ان میں شیخ سعید کی بغاوت جو کردستان میں ۲۶ ـــ ۱۹۲۵ء میں ہوئی، سب سے زیادہ اہم تھی۔

کردوں کا سب سے بڑا قبیلہ گوتی (Guti) تورانی (ترکی) نسل سے ہے (دیکھو انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام اور جریدہ اسلامک ریویو (Islamic Review) لنڈن مورخہ اپریل ۱۹۶۵ء میں (B.A Misri) کا مقالہ بہ عنوان "کردوں کی داخلی آزادی کے لئے جدوجہد")۔ لیکن کردوں کی زبان ترکی نہیں ہے ان کی زبان فارسی، ترکی، عربی وغیرہ الفاظ سے مرکب ایک Indo Iranian dialect (ہند۔ ایرانی لہجہ) ہے۔ کردوں کے

بعض قبیلے ایران کے مغربی اور شمال مغربی حصہ میں اور کچھ قبیلے عراق کے شمال میں موصل کے علاقے میں اور باقی ترکی کے مشرقی صوبوں میں آباد ہیں۔

کردوں میں اس صدی کے شروع میں ایک آزاد کردستان بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس میں انگریزوں اور روسیوں کی ریشہ دوانی کا بڑا حصہ ہے اور ایک حد تک پرانی سلطنت عثمانیہ کے کمزور اور خراب ادارے اور طرز حکومت کا بھی دخل ہے۔ آج کل عراق کے کردوں نے ملا مصطفٰے برزانی کی سرکردگی میں اپنی حکومت کے خلاف سر اٹھایا ہوا ہے۔ مصطفٰے برزانی مدتوں روس میں رہ چکا ہے اور بولشویکوں نے اس کو جرنیل کا رتبہ دیا ہوا ہے (نئی عراقی حکومت نے یہ گتھی کسی حد تک سلجھا دی ہے)

ترکی کا مشرقی علاقہ جہاں کرد آباد ہیں بہت دشوار گزار ہے۔ یہاں اونچے اونچے پہاڑ اور تنگ اور بہت کم زرخیز وادیاں ہیں جہاں لوگ زیادہ تر بکریاں اور بھیڑیں پال کر اور کھیتی باڑی کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہت غریب ہیں اور لکھنے پڑھنے سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کا علاقہ ترکی کا سرد ترین حصہ ہے اور دشوار گزار ہونے کی وجہ سے حکومت کے کارکنوں کا یہاں اثر نسبتاً کم ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے آخری زمانے میں کردوں نے متعدد دفعہ بغاوتیں کی تھیں۔ حکومت وقت ان کی شکاتیں دور کرنے کی بجائے ان کے سرداروں کو رعایات دے کر ان کو خاموش کر دیتی تھی جیسا کہ انگریز برصغیر پاک و ہند میں شمال مغربی سرحدی قبائل کو پیسہ دے کر خاموش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس وقت کردوں کے علاقے میں سڑکیں بہت کم تھیں۔ اس لئے ان کے لئے اپنی پیداوار کو شہروں کی منڈیوں میں لا کر بیچنا دشوار تھا۔ مہذب دنیا سے ان کا تعلق بہت کم تھا۔ ترکوں کے دشمن ان بے چارے سادہ لوح لوگوں کو ان کے خلاف بہ آسانی اکسا دیتے تھے۔

ترکی جمہوریت بننے پر یہاں انگریزوں وغیرہ نے اور بھی زیادہ سازشیں شروع کیں۔ کیونکہ اب ان کو ڈر تھا کہ نئی ترکی جمہوریت اس علاقے میں بھی دوسرے ترکی علاقوں کی طرح ترقی کے سامان بہم پہنچانا شروع کر دے گی اور یہاں اپنا اثر پوری طرح جما لے گی۔ اس لئے انھوں نے اسلام کے نام سے شیخ سعید کی قیادت میں ترکی جمہوریت کے خلاف ۱۳/ فروری ۱۹۲۵ء کو بغاوت کرا دی اور گولہ اور بارود اور ہتھیاروں سے ان کو مدد دی گئی۔ ترکی کے دشمنوں کو امید تھی کہ ترکی جمہوریت جو ابھی نئی نئی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی ہے اس بغاوت

کو فرونہ کر سکے گی۔ اور ان کا وہ مقصد جو وہ اپنے پٹھو یونانیوں کے ترکی پر حملہ آور ہونے کے باوجود بھی حاصل نہ کر سکے تھے، اب خانہ جنگی کے ذریعہ حاصل کر کے ترکی کے پرخچے بخرے کر دیں گے۔ انہوں نے نئی ترکی کو بھی "یورپ کے مرد مریض"
کے مانند سمجھا تھا۔ حالانکہ اب ترکی قوم میں، جس نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں یونانیوں اور ان کے حامی انگریزوں، فرانسیسیوں اور اطالویوں کو شکست دی تھی ایک ایسی روح پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان سرکش قبیلوں کو بہ آسانی راہ راست پر لا سکتی تھی۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے میں اس زمانے میں ہفتہ وار اخبار مسلمان کلکتہ کا ترکی نامہ نگار تھا۔ اس لئے اس بغاوت کے متعلق بھی یہاں سے اس اخبار کو خبریں بھیجا کرتا تھا۔ میں نے بغاوت کے متعلق جو آخری آرٹیکل لکھا تھا اس میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ترکی فوجیں اب ایسے پہاڑی مقامات پر قابض ہو گئی ہیں کہ وہاں سے ایک ماہ کے اندر باغیوں کا قلع قمع کر سکیں گی۔ میری پیشین گوئی بالکل صحیح نکلی اور اس آرٹیکل کے پورے ایک ماہ بعد شیخ سعید نے ۱۵/ اپریل ۱۹۲۵ء کو ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کے خلاف سازش

جون ۱۹۲۶ء میں ترکی پولیس نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو قتل کرنے کا ارادہ رکھنے والے چند ایک ممبران پارلیمنٹ ترکی اور پرانی جمعیت اتحاد و ترقی کے بعض لیڈروں کو گرفتار کیا۔ ان لوگوں نے ضیا خورشید نام ممبر پارلیمنٹ کی سرکردگی میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو جب وہ انقرہ سے ازمیر (سمرنا) جانے والے تھے مارنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ لوگ کسی خاص ایسے اصول کے دھنی تو نہ تھے جس کی خاطر اپنی جان پر کھیل کر غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ تو جاہ پرست تھے اور ملک کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے یا ایسے لوگ تھے جو جمعیت اتحاد و ترقی کو، جس نے سلطنت عثمانیہ کو پہلی جنگ عظیم میں داخل کیا تھا اور جو جنگ میں ناکام رہنے کی وجہ سے ترکی قوم کی ہستی کو بھی خطرہ میں ڈال کر قوم کی ہمدردی کو بالکل کھو بیٹھی تھی، پھر زندہ کرنا چاہتے

تھے۔

گرفتار شدہ لوگوں میں جنرل کاظم قرہ بکر پاشا بھی شامل تھے جو ترقی پرست جمہوری پارٹی کے لیڈر اور رؤف بک مرحوم کے دوست تھے اور قارص، اردھان، ارض روم جیسے مشرقی ترکی صوبہ جات کو ارمینوں اور روسیوں کے ہاتھ سے چھڑا کر قوم میں بہت ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ اخبارات میں جو اس مقدمے کے بارے میں خبریں نکلیں اور مجرمین نے جو بیانات دیئے اور ضیا خورشید کے بھائی فائق بک ممبر پارلیمنٹ ترکی نے جو انکشافات اور اعترافات کیے، ان سے اس سازش کی موجودگی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مجرموں کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رؤف بک کو بھی اس سازش کے بارے میں کچھ علم تھا۔ انھوں نے ان سازشیوں کو اس نفرت انگیز جرم سے منع کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ یورپ چلے گئے تھے۔

مقدمے کے آخر میں جنرل کاظم قرہ بکر پاشا اور فائق بک بری ہو گئے اور باقی لوگوں کو سزائے موت دی گئی اور ترقی پرست جمہوری پارٹی توڑ دی گئی۔

میرا ترکی رعایا بننا

۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں افغانی سفیر غلام جیلانی خاں انقرہ سے استانبول آیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے نیا افغانی پاسپورٹ دیدے کیونکہ میں اس پاسپورٹ پر جو ترکی سفیر نے حجاز سے چلتے ہوئے مجھے دیا تھا، زیادہ مدت ترکی میں نہ رہ سکتا تھا۔ اس نے اس بارے میں اپنی حکومت کو لکھا۔ وہاں سے جواب آنے میں کئی مہینے لگے۔ آخر کار اس نے مجھے بتایا کہ افغانی وزارت خارجہ نے مجھے افغانی پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس سے مجھے بہت رنج ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ افغانی گورنمنٹ ہمارے انگریزوں کے خلاف کام کرنے کے لئے نیا پروگرام بنانے اور اسی قسم کی دوسری کارروائیوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی رعایا رکھنا اپنے سیاسی مقاصد و اغراض کے خلاف سمجھتی تھی اور ڈرتی تھی کہ کہیں انگریز میری کارروائیوں کے باعث کوئی پروٹسٹ نہ کریں۔ میں اب ایسی حالت میں تھا کہ موجودہ پاسپورٹ پر ترکی میں دیر تک

نہ رہ سکتا تھا اور نہ اس پاسپورٹ کے ساتھ کسی دوسرے ملک میں جہاں انگریزوں کا رسوخ ہو۔ جا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ترکی رعایا بن جاؤں۔ لیکن ترکی قوانین کے بموجب صرف وہی غیر ملکی ترکی رعایا بن سکتا تھا جو ترکی میں پانچ سال رہ چکا ہو۔ مجھے ترکی آئے ہوئے ساڑھے تین سال ہوئے تھے۔ اس لئے قانونی طور پر مجھے اس کا حق نہ تھا کہ میں ترکی رعایا بن سکوں۔ میں نے مختار بک کے ذریعہ جن سے میں ماسکو میں جہاں وہ ترکی سفیر تھے۔ مل چکا تھا اور جو اب اس عہدے سے سبکدوش ہو کر استانبول آ گئے تھے۔ ترکی حکومت کو درخواست دی کہ مجھے رعایت کے طور پر ترکی رعایا بنا لے۔ مختار بک نے جو میری سیاسی زندگی اور سوانح سے واقف تھے۔ میری سفارش کی۔ ترکی حکومت نے قانونی پانچ سالہ مدت کے ختم ہونے سے پہلے مجھے ترکی رعایا بنانا منظور کر لیا۔ یہ رعایت میرے لئے ایک بڑی نعمت تھی۔ ترکی حکومت اور ترکی قوم نے ایک سخت نازک وقت میں مجھے اپنی آغوش شفقت میں جگہ دے کر مجھ پر ایسا احسان کیا کہ میں جب تک زندہ ہوں اس کو نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ اس وقت دنیا بہ ہمہ وسعت خود میرے لئے اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ میں کہیں بھی آ جا نہیں سکتا تھا۔ اور کوئی ملک بھی مجھے انگریزوں کے پنجے سے اور ان کی دسترس سے بچانے کا ذمہ لینا نہ چاہتا تھا۔ ترکی حکومت نے مجھے اپنی رعایا بنا کر مجھے اس کا موقع دے دیا کہ میں اس کے ملک میں اطمینان سے رہوں۔

انیسواں باب

ترکی فوج میں میرا داخلہ

ترکی فوج میں خدمت کے لئے میرا طبّی معائنہ

ترکی میں لازمی فوجی خدمت کا قانون جاری ہے جس کے مطابق ہر ترکی مرد ایک مقررہ مدت کے لئے فوج میں خدمت کرنے پر مجبور ہے۔ ہائی سکولوں اور یونیورسٹی کے پاس شدہ مرد اس وقت فوجی تعلیم لینے کے بعد ریزرو آفیسر بنا کرتے تھے۔ اب صرف یونیورسٹی کے پاس شدہ مردوں کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ اس تعلیم سے کم تعلیم یافتہ لوگ رنگروٹ کے طور پر فوج میں کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اب ہائی سکول کے پاس شدہ نوجوان فوج میں بھرتی ہو کر گاؤں کے مدرسوں میں استادوں کے طور پر کام کرتے ہیں۔

ترکی رعایا بننے پر مجھے بھی اسی قانون کے ماتحت فوج میں خدمت کرنا تھی۔ ریکروٹنگ آفیسر نے مجھ سے میری تعلیم کے بارے میں سرٹیفکیٹ مانگا۔ میں نے اس بارے میں بھائی صاحب کو لکھا۔ میری خوش قسمتی سے اس وقت ان کے پاس (F.Sc) کا سرٹیفکیٹ موجود تھا۔ انہوں نے مجھے وہ بھیج دیا۔ میں نے اس کا ایک سرکاری دفتر میں ترکی میں ترجمہ کرا کے ریکروٹنگ افسر کو دیا۔ اس نے وزارت تعلیم ترکی سے پوچھا کہ یہ سرٹیفکیٹ مجھے ریزرو آفیسر بننے کا حق دیتا ہے یا نہیں۔ وہاں سے مثبت جواب آنے پر اس نے میرا نام اپنے رجسٹر میں ریزرو افسر کے طور پر خدمت کے لئے درج کر لیا۔ اس کے بعد میرا طبّی معائنہ ہوا میں بالکل تندرست اور فٹ نکلا۔ اس لئے مجھے ہتھیار بند ہو کر خدمت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اگر میں (Un—fit) ان فٹ نکلتا تو میں بے

ہتھیار فوجی خدمت کرتا، اور میری فوجی خدمت کی مدت ہتھیار بند ہو کر فوجی خدمت کرنے والوں سے ذرا کم ہوتی۔

ترکی فوجی قانون کے مطابق جو لوگ ہتھیار بند ہو کر فوجی خدمت پر مجبور ہوتے ہیں وہ پہلے تو ایک فوجی کیمپ میں ابتدائی قواعد سیکھتے ہیں اور پھر ۶ ماہ (Reserve Officers Training College) میں فوجی سبق پڑھتے ہیں، اور اس کے بعد ڈیڑھ سال فوج میں افسر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو افسر بننے کا حق نہیں ملتا، وہ معمولی سپاہی کے طور پر دو سال فوج میں خدمت کرتے ہیں۔

اس قانون سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ صلح کے زمانے میں ترکی نوجوانوں کو فوجی تعلیم و تربیت مل جاتی ہے جس سے وہ بندوق کے ساتھ نشانہ بازی کر سکتے ہیں اور فوج کے مختلف رجمنٹوں میں رہ کر صنوف حربیہ مثلاً پیدل فوج، توپخانہ، رسالہ، خبر رسانی، ٹینک اور بکتر بند فوج توپ طیارہ شکن وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور جب جنگ کے وقت ان کو فوجی بلاوا ملتا ہے تو وہ اپنے فوجی دستے میں آکر شامل ہو جایا کرتے ہیں۔

کاش ایسا ہی قانون پاکستان میں بھی جاری ہوتا۔ جس سے وہاں کے نوجوان صلح کے زمانے یں فوجی ہنر سیکھ لیتے اور ایسے آڑے وقتوں میں جیسے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے ناگہانی اور بزدلانہ حملہ کی وجہ سے پاکستان کو دیکھنے پڑے پہلے ہی سے تیار ہوتے۔ امید ہے کہ اس واقعہ سے سبق لے کر پاکستان کی حکومت کوئی ایسا قانون بنا دے گی جس سے اس کے نوجوانوں کو صلح کے زمانے میں جنگ کے لئے تیاری کا موقع ملے گا اور ان کے جان نثاری اور قربانی کے جذبات جو اسلامی تعلیم کی وجہ سے ان کے دلوں میں لہریں مارتے ہیں، فوجی تعلیم کے ذریعہ اور بھی پختہ ہوں گے۔

ترکی فوجی قانون کے مطابق ایک ایسے شخص کو جو نیا ترکی رعایا بنا ہو، فوج میں لئے جانے سے پہلے دو سال مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ ملک میں اپنا ٹھکانہ بنا لے اور اگر ترکی زبان نہ جانتا ہو تو زبان بھی سیکھ لے، مجھے بھی اس قانون کے مطابق یہ رعائت ملی اور میں دو سال تک فوجی خدمت سے معاف کر دیا گیا۔

ترکی رعایا بننے کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور میں اب از سر نو اپنا کیریر

(Career) بنانے پر مجبور تھا۔ مجھے ابھی ترکی زبان اتنی اچھی نہ آتی تھی کہ صحافت کے میدان میں قدم رکھوں۔ بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجینئر کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کم از کم چار پانچ سال کی تعلیم کی ضرورت تھی۔ اس قسم کی تعلیم کے زمانے میں میرا گزارہ کیسے ہو گا اور تعلیم کا خرچ کہاں سے ادا کیا جائے گا۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب میرے پاس کچھ نہ تھا۔ انگریزی زبان کا ٹیچر بن کر کسی سرکاری سکول میں نوکری حاصل کرنے سے پہلے میرے لئے ٹریننگ کالج کا ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے بھی خرچ کی ضرورت تھی۔ پرائیویٹ انگریزی ٹیچر سے آمدنی اتنی نہ ہو سکتی تھی کہ میں اچھی طرح گزارہ کر سکوں۔ اس کے سوا برصغیر ہند و پاک کو چھوڑنے سے میرا مقصد تو یہ تھا کہ کسی دن مجھے اس کا موقع ملے کہ وطن کی آزادی کی جنگ میں شریک ہو کر قوم کی خدمت کروں۔ ترکی میں مجھے ایسا موقع سب سے اچھی طرح مل سکتا تھا۔ ان سب امور کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ترکی میں فوجی تعلیم حاصل کروں جس سے میں ایک پیشہ سیکھ جاؤں گا، جو نہ صرف آئندہ چل کر (اگر خدا کو منظور ہوا) وطن کی آزادی کے حصول میں میرے کام آئے گا بلکہ جو اس وقت بھی میری مالی مشکلات کے حل کا ذریعہ بنے گا۔ کیونکہ ترکی میں فوجی طالب علموں کے سارے اخراجات ترکی گورنمنٹ برداشت کرتی ہے اور اس کے علاوہ ان کو کچھ وظیفہ بھی دیتی ہے۔ لیکن میری عمر اس وقت (۲۳) سال کی تھی۔ حالانکہ ترکی ملٹری کالج میں صرف ۱۸ یا ۱۹ سالہ نوجوان لئے جاتے تھے۔ اس لئے میں نے جنرل فخرالدین ترک قان پاشا (مرحوم) سے جولائی ۱۹۲۸ء کے شروع میں درخواست کی کہ وہ مجھے رعائت کے طور پر ترکی کیڈٹ کالج میں داخل کرا دیں۔ انہوں نے میری درخواست ترکی کمانڈر ان چیف فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا (مرحوم) کی خدمت میں بھیجی اور یہ سفارش کی کہ باوجود عمر کی زیادتی کے مجھے ترکی کیڈٹ یعنی فوجی طالب علم کے طور پر لیا جائے۔ میری یہ درخواست منظور ہو گئی لیکن شرط یہ لگائی گئی کہ میں داخلہ کا امتحان دوں۔ اس کے لئے مجھے دو ہفتہ کی مہلت دی گئی تاکہ میں امتحان کی تیاری کر سکوں۔

میں نے کیڈٹ کالج میں کرنل عابدین بک (مرحوم) پرنسپل کالج کی موجودگی میں ہائی سکول کے سبقوں کا امتحان دیا جس میں ترکی زبان پوری طرح نہ جاننے کے باوجود بھی خدا کے فضل و کرم سے کامیاب ہو گیا۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں امتحان کا نتیجہ مجھے سنا دیا گیا اور مجھے حکم ملا کہ استنبول کے فوجی کمانڈروں کے ہاں حاضری دوں۔

قلعہ سلیمیہ

میں یکم اگست ۱۹۲۹ء کو پہلی ڈویژن کے کمانڈر کی خدمت میں قلعہ سلیمیہ میں حاضر ہوا۔ یہ قلعہ استانبول کے ایشیائی حصہ میں واقع ہے۔ اس کو سلطان سلیم خان ثالث نے اس زمانے میں بنایا تھا جب وہ ترکی فوج کو نئے اصولوں پر از سر نو منظم کر رہا تھا (یعنی ۱۸۰۷ء۔ ۱۸۰۴ء میں)۔ یہ قلعہ ایک بڑی چھاؤنی کی طرح استعمال ہوتا تھا اور اس وقت اس میں ۳ رجمنٹ پیدل اور ایک رجمنٹ توپ خانہ کی رہتی تھی۔ ڈویژن کمانڈر نے مجھے یہاں توپخانے کے ترکی کیڈٹوں کے ساتھ ابتدائی فوجی قواعد سیکھنے کا حکم دیا۔ اس لئے میں آرٹلری رجمنٹ میں داخل ہوا، جہاں مجھ سے پہلے ۵۹ کیڈٹ اور فوجی تعلیم سیکھ رہے تھے۔ وہ رجمنٹ میں یکم مئی کو یعنی مجھ سے تین ماہ پہلے داخل ہوئے تھے اور رجمنٹ کی مختلف (Batteries) میں قواعد سیکھنے کے لئے تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ مجھے تیسری بیٹری (Battery) میں پانچ اور طالب علموں کے ساتھ مقرر کر دیا گیا۔ یہاں مجھے دوگنی محنت کرنی پڑتی تھی کیونکہ روزمرہ کے لئے نئے سبقوں کے ساتھ میں دوسرے طالب علموں کے پرانے سبقوں کو بھی یاد کرنے پر مجبور تھا۔ اس کام میں میرے ہم جماعتوں نے بڑے خلوص دل سے میری مدد کی اور اپنے سبقوں کے نوٹوں اور کاپیوں کو مجھے دیدیا۔ اس سے میں جلد از جلد ان کے درجہ پر پہنچ گیا۔ ان نوجوانوں کی اس مہربانی کا نقش آج تک میرے دل پر باقی ہے۔

ہم ہر روز صبح سے دوپہر تک توپوں سے شست لگانے کا کام سیکھا کرتے تھے اور اس کے لئے توپوں میں گھوڑے جوت کر قلعہ سے باہر اور شہر سے دور کے میدانوں اور پہاڑیوں میں لے جایا کرتے تھے۔ توپ خانے کے گھوڑے بڑے قوی اور جسیم تھے۔ اسی طرح (Battery Observation Corps) یعنی دستہ ترصد کے گھوڑے بھی طاقت ور اور بلند قد تھے۔ ہر سوار کے لئے ان گھوڑوں کو قابو میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

ہم نمبروار ایک دن توپ خانہ میں اور ایک دن دستہ ترصد میں کام کیا کرتے تھے۔ میں چونکہ اپنے ہم جماعتوں سے تین ماہ بعد فوج میں داخل ہوا تھا اس لئے میں گھوڑے کی سواری کے اصول نہ سیکھ سکا تھا۔ مجھے صرف جنگ آزادی افغانستان کے دوران میں جب میں ٹھل کے

میدان میں انگریزوں سے لڑنے گیا تھا، گھوڑے کی سواری کا کچھ عملی تجربہ تھا، جوان قوی ترکی گھوڑوں کو قابو میں رکھنے کے لئے کافی نہ تھا۔ ایک دن جب میری باری آئی اور دستہ ترصد میں کام کرنے کے لئے گھوڑے پر چڑھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑا بھانپ گیا تھا کہ میں ایک اناڑی سا سوار ہوں۔ اس پر اس نے قلعہ سے نکلتے ہی سڑک پر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے ہم جماعتوں کو اندیشہ ہوا کہ میں گھوڑے کی پیٹھ پر نہ ٹک سکوں گا۔ اور ضرور زمین پر گر جاؤں گا۔ اس کے علاوہ سڑک چونکہ پکی تھی اور اس پر پتھر بچھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں گھوڑے کا پیر نہ پھسل جائے لیکن خدا کے فضل سے میرے حواس بجا رہے اور میں نے لگام کھینچ کھینچ کر گھوڑے کو قابو میں لے لیا۔ ورنہ اگر میں گرتا تو ضرور میرا سر پتھروں سے ٹکرا کر پھٹ جاتا۔ دوپہر کے بعد ہم روزانہ قلعہ کے باہر کے میدان میں توپ سے نشان بازی کیا کرتے تھے۔

رات کو سونے کے لئے ہمیں ایک بڑا کمرہ (Dormatory) کے طور پر ملا ہوا تھا جس میں ۳۰ عدد دو منزلہ لوہے کی چارپائیاں موجود تھیں۔ ان پر ہم دو طالب علم سویا کرتے تھے ایک نیچے کے بستر پر اور دوسرا اوپر کے بستر پر۔ یہاں جن چھاؤنیوں میں جگہ کی کمی ہو وہاں اس قسم کی دو منزلہ چارپائیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ بعض موقع پر تو تین منزلہ چارپائیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔ قلعہ سلیمیہ اگرچہ اتنا بڑا قلعہ تھا کہ اس میں چار رجمنٹیں رہتی تھیں۔ لیکن ہمارے لئے علیحدہ سونے کے کمرے کا انتظام ضروری تھا۔ ہم وہاں صرف ۶ ماہ کے لئے آئے تھے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ عارضی انتظام کر دیا گیا تھا۔

صبح کی حاضری سے لے کر شام کے کھانے کے وقت تک جو دو گھنٹے خالی ہوتے تھے اس میں بعض طالب علم تو فٹ بال کھیلا کرتے تھے اور بعض آپس میں مل جل کر خوش گپیوں میں وقت گزارا کرتے تھے۔ ہم توپ خانہ کے طالب علموں کے علاوہ اس قلعہ میں پیدل فوج میں ہماری طرح قواعد سیکھنے کے لئے آئے ہوئے اور بہت سے کیڈٹ بھی موجود تھے۔ ایک روز شام کے وقت میں قلعہ کی اوپر کی منزل کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ نیچے سے ایک شخص کے گانے کی آواز میرے کان میں پڑی۔ میں نے جھک کر دیکھا کہ قلعہ کے صحن میں کچھ (Cadets) بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک فرانسیسی گیت گا رہا ہے۔ اس کی خوش الحانی نے میرا دل موہ لیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس طالب علم کا نام محمد کامل آفندی ہے جو (بروسہ) کے فوجی سکول سے

کیڈٹ کالج استانبول میں داخلہ کے لئے آیا ہے اور پیدل رجمنٹ میں قواعد سیکھ رہا ہے۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا: "......... کاش کہ یہ جوان تلاوت قرآن شریف بھی اس وقت خوش الحانی سے کر سکے"۔ خدا کی شان ہے کہ جب ہم سب قلعہ سلیمیہ سے ابتدائی فوجی تعلیم ختم کر کے کیڈٹ کالج میں گئے تو میں نے ایک روز کالج کی مسجد میں محمد کامل آفندی کو دیکھا کہ قرآن شریف کی لحن داؤدی سے قرأت کر رہا ہے۔ میں نے اس کو قلعہ سلیمیہ کا واقعہ یاد دلایا اور اپنی تمنا کے پورے ہونے پر اظہار مسرت کیا۔ اس سے وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس نے کئی مرتبہ کیڈٹ کالج کی مسجد میں ہماری امامت کی۔

مجھے قلعہ سلیمیہ میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ ہماری جماعت کا دوسرا دوماہی امتحان ہوا۔ میں خدا کے فضل سے اس امتحان میں کامیاب رہا اور باقی ہم جماعتوں کے ساتھ حوالدار بنا دیا گیا یعنی اب ہم میں سے ہر ایک کو ایک توپ کے سپاہیوں کو قواعد سکھلانے کا اختیار مل گیا۔

ہم قلعہ سلیمیہ میں دو ماہ اور زیر تعلیم رہے اور آخری امتحان پاس کر کے وہاں سے کیڈٹ کالج واقع محلہ حربیہ استانبول آگئے۔

ترکی کیڈٹ ملٹری کالج میں میرا تعلیم پانا

نصاب تعلیم

ترکی کیڈٹ کالج میں جو فوجی طالب علم لئے جاتے تھے وہ ترکی کے مختلف فوجی سکولوں کے پاس شدہ اور فوج کے مختلف دستوں میں قواعد سیکھے ہوئے نوجوان ہوتے تھے۔ یہ طالب علم فوج میں قواعد سیکھنے کے لئے مختلف دستوں میں جانے سے پہلے ملٹری سکول کے آخری امتحان کے نمبروں کے لحاظ سے مختلف صنوف حربیہ میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ سب سے اچھے نمبر لینے والوں کو توپ خانہ صنف مخابرہ (Communication) اور صنف استحکام سفر مینا (Sappers and miners) میں داخل کیا جاتا تھا کیونکہ ان صنوف حربیہ کے مدارس اختصاص (Specialization School) میں زیادہ مشکل مضامین پڑھائے

جاتے تھے۔ اور وہاں ریاضی کے مسائل کے جاننے کی ضرورت ہوتی تھی۔ کیڈٹ کالج کی تعلیم دو سال کی تھی۔ یہاں آخری امتحان کے بعد پاس شدہ طالب علموں کو فوج میں کمیشن ملتا تھا اور Passing out parades (یعنی رسم شمشیر بندی) کے بعد ان کو فوج میں افسر بنا دیا جاتا تھا۔ یہ افسر صرف اپنے صنوف حربیہ کے مدارس اختصاص میں اعلیٰ فوجی تعلیم پا کر فوج کے دستوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل مانے جاتے تھے۔

جس سال میں کیڈٹ کالج میں گیا اس سال ہماری جماعت میں ۲۴۰ طالب علم تھے جو چار حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ہر حصہ ایک کمرے میں سبق پڑھا کرتا تھا اور سبق کے کمرے میں مختلف صفوف حربیہ کے طالب علم ملے جلے بیٹھتے تھے۔

کیڈٹ کالج میں ہم سب کو ہمارے مختلف صنوف حربیہ میں داخل ہونے کے باوجود ایک ہی طرح پر مختلف فنون حربیہ کے سبق دیئے جاتے تھے۔ ان میں تعبیہ (Tactic) تاریخ جنگ، فن اسلحہ (Weaponry) فوجی تنظیم اور نقشہ کشی کے سبق اہم مانے جاتے تھے۔ ہفتہ میں پورے تین دن اور سنیچر کو دوپہر تک نظری (Theoratical) سبق پڑھائے جاتے تھے اور دو دن ان کو کالج سے باہر اور شہر سے دور میدان اور پہاڑیوں میں عملی (Practical) طور پر سکھلایا جاتا تھا، جہاں ہمیں مختلف قسم کی قواعد کرنا پڑتی تھی۔

صبح کو ناشتہ کے بعد ایک گھنٹے میں گزشتہ روز کے سبقوں کو دہرانا اور یاد کرنا ہوتا تھا۔ ۹ بجے نظری سبق شروع ہوتے تھے۔ دوپہر کو ۱۲ بجے سے لے کر ایک بجے تک کھانے کا وقت ہوتا تھا۔ اس کے بعد چار گھنٹے اور نظری سبق جاری رہتے تھے۔ بعد میں دو گھنٹے ورزش اور تفریح کے لئے ہوتے تھے۔ میں چونکہ ترکی زبان پوری طرح نہ جانتا تھا۔ اس لئے تفریح کی بجائے مطالعہ میں مصروف ہو جایا کرتا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد پھر دو گھنٹے سبق یاد کرنے کے لئے مطالعہ میں لگتے تھے۔

ہفتے میں دو دن جب قواعد کے لئے ہم کو کالج سے کوئی دس بارہ میل باہر جانا ہوتا تھا تو ہم پوری فوجی وردی اور سامان میں لیس ہو کر کالج سے نکلتے تھے اور صبح سے شام تک میدانوں اور پہاڑیوں میں قواعد کرتے رہتے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی باہر ہی راشن کے طور پر کھایا کرتے تھے۔

ہفتہ کی چھٹی

ہمیں کالج سے ہفتے میں ڈیڑھ دن کی چھٹی ملتی تھی۔ ہم ہفتہ کے دن دوپہر کے بعد ایک بجے سے لے کر اتوار کے دن شام کے پانچ بجے تک کالج سے باہر سیر و تفریح کر سکتے تھے۔ لیکن صرف وہ طالب علم جن کے رشتہ دار استانبول میں مقیم تھے ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات کو ان کے ہاں بسر کر سکتے تھے۔ جو طالب علم استانبول کے سوا دوسرے شہروں کے رہنے والے تھے وہ اس رات کو بھی کالج میں حاضر ہونے اور ہفتہ کی شام کو ۷/ بجے کالج آکر وہاں سونے پر مجبور تھے۔ جن طالب علموں کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں اس رات کے بسر کرنے کی اجازت ہوتی تھی، وہ اتوار کی شام کو اپنے چھٹی کے کاغذ پر ان کے دستخط کرا کے اپنے کمپنی کمانڈر کو دکھلانے پر مجبور تھے تاکہ ان کی چھٹی کی رات کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں گزارنے کا پتہ چل جائے۔ میں نے عبدالرحمن ریاض بابر کے گھر میں چھٹی کی رات بسر کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور ہر ہفتہ اپنی چھٹی کے کاغذ پر ان سے دستخط کرا کے کالج لایا کرتا اور اپنے کمپنی کمانڈر کو دیا کرتا تھا۔

کالج کے طالب علموں کو چھٹی کی رات کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں گزارنے کی اجازت صرف اس صورت میں ملتی تھی کہ وہ اس محلے کے مختار (نمبردار) ان کے رشتہ داروں کے دستخط کرا کے اس کی تصدیق بھی کیا کرتا تھا کہ دستخط ان کے رشتہ داروں کے ہیں۔ کمپنی کمانڈر ہر ہفتہ ان دستخطوں کا چھٹی کے کاغذ پر کئے ہوئے دستخطوں سے مقابلہ کر کے اس بات کی پڑتال کیا کرتا تھا کہ چھٹی کے کاغذ پر جو دستخط ہیں وہ جعلی تو نہیں ہیں۔

فوجی ڈسپلن

کیڈٹ کالج میں فوجی ڈسپلن بہت سخت تھا۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر تھا اور وہ کام صرف اسی مقررہ وقت پر ہی کیا جا سکتا تھا۔ صبح کو بستر سے اٹھنا، رات کو سونے کے کمرے میں داخل ہونا اور سونا۔ صبح کو ہاتھ منہ دھو کر داڑھی مونڈنا، ورزش، ناشتہ، صبح کا مطالعہ، کالج کے سبقوں کے گھنٹے، دوپہر اور شام کو کھانے کے کمرے میں قطار بنا کر داخل ہونا، تفریح، دوپہر کے

بعد لیکچر، شام کی حاضری، رات کو سبقوں کا مطالعہ وغیرہ سب کاموں کے لئے اوقات مقررہ تھے۔ چھٹی کے دن طالب علموں کے لباس، رویہ اور ان کے چال چلن وغیرہ کی دیکھ بھال ہوتی تھی فوجی افسر انضباط (Provost Master) اور اس کے سپاہی شہر میں اسی غرض سے دورہ لگاتے رہتے تھے۔

میری عمر میرے ہم جماعتوں سے کوئی چودہ یا پندرہ برس زیادہ تھی چونکہ میری تعلیم اور میرا تجربہ بھی ان سے زیادہ تھا اس لئے میں ان کی نسبت زیادہ سنجیدہ مزاج تھا۔ اور ان کی طرح لڑکپن کی حرکات ہنسی مذاق سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے میرے سارے ہم جماعت مجھے آغابے "یعنی بڑا بھائی" کہنے لگے تھے۔ آج بھی جب کبھی مجھے اپنے پرانے ہم جماعتوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو ضرور مجھے آغابے کہہ کر پکارتے ہیں۔ آغابے کا تلفظ جلدی بولنے میں "آبے" کہا جاتا ہے۔

کالج کی عمارت میں جو سبق کے کمرے تھے وہ تین حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک حصے میں ہماری جماعت سبق پڑھتی تھی دوسرے حصے میں دوسری جماعت کے طالب علم پڑھا کرتے تھے ہم اپنے حصے سے اس دوسری جماعت کی درسگاہ میں نہ جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ طالب علم کالج میں ہم سے ایک سال پہلے داخل ہونے کی وجہ سے ہم سے سینئر مانے جاتے تھے۔ اگر کہیں اتفاق سے ہم کالج میں یا کالج سے باہر ان سے آمنے سامنے آجائیں تو ہم کو فوراً ان کو فوجی سلام دینا پڑتا تھا۔

اگر ہم میں سے کوئی اس موقعہ پر ان کو سلام نہ دے تو اس کو ان کی شکایت کی وجہ سے زجر و توبیخ کی سزا ملتی تھی۔

کالج کے تیسرے حصے میں ایک اور جماعت سبق پڑھا کرتی تھی جو ایسے فوجی افسروں سے مرکب تھی جنہوں نے ترکی کی جنگ آزادی (۲۲-۱۹۱۹ء) میں حصہ لینے کی وجہ سے کیڈٹ کالج میں پورے دو سال تعلیم نہ پائی تھی۔ ان کو اس زمانے میں مختصر سی فوجی تعلیم اور تربیت دے کر فوراً محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اب یہ افسر اپنی فوجی تعلیم کو پورا کرنے کے لئے کالج میں داخل کئے گئے تھے۔ ان کا کورس صرف ایک سال کا تھا۔ اس کے بعد ان کا امتحان ہوا تھا۔ جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے ان کو آئندہ فوج میں ترقی پانے کا موقع دیا گیا تھا

اور جونا کام رہے تھے ان کے مرتبے (Rank) تو برقرار رکھے گئے تھے لیکن ان کو ترقی پانے (Promotion) سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ایسے لوگ آگے چل کر پنشن یافتہ ہوئے اور فوج سے علیحدہ ہو گئے تھے۔

اس جماعت میں حسن بک نام ایک فرسٹ لفٹیننٹ بھی تھا جو اصل میں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں انگریزی فوج میں رسالدار میجر تھا اور تہران میں انگریزی سفارت خانہ کے محافظ سپاہیوں کا کمانڈر تھا۔ یہ شخص گجرات کا رہنے والا تھا۔ جہاد کا فتوئ نکلنے پر وہ ۱۹۱۵ء میں تہران کے ترکی سفارت خانہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ اس کو وہاں سے اس کے کمسن لڑکے علی جاہد کے ساتھ ترکی بھیجا گیا اور اس کے بیٹے کی تعلیم کا ذمہ ترکی سفیر محی الدین پاشا نے لے لیا تھا۔ اس لڑکے نے بعد میں ترکی کیڈٹ کالج سے ۱۹۳۵ء میں فوجی کمیشن حاصل کیا۔ وہ مدتوں ترکی فوج میں خدمت کرتا رہا۔ اس کی صحت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پیدل (Infantory) فوج سے کمسریٹ ڈیپارٹمنٹ میں اور پھر وہاں سے فوجی معلموں کی صنف میں داخل ہوا اور کرنیل کے مرتبہ تک پہنچا۔ دو سال ہوئے کہ وہ پنشن لے کر علیحدہ ہو گیا ہے۔

حسن بک (مرحوم) کی طرح اور بھی بہت سے پنجابی افسر اور سپاہی تھے جو مختلف محاذوں پر انگریزی فوجوں سے بھاگ کر ترکی فوج سے مل گئے تھے۔ میں نے ترکی میں ان میں سے بعض اشخاص کو استانبول، بروسہ، قونیہ کے شہروں میں دیکھا تھا۔ ان افسروں میں سے ایک شخص عباس بک تھا جس کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصہ میں آیا ہے اور جو کابل میں ترکی کے سفارت خانہ میں ترجمان کے طور پر کام کرتا تھا اور وہاں ہی فوت ہو گیا تھا۔ مظفر بک نام ایک افسر قونیہ میں ترکی ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں نوکر تھا اور جلال بابر نام ایک سپاہی انقرہ میں پاکستانی سفارت خانہ کھلنے کے بعد وہاں ملازم ہو گیا تھا۔

۱۹۲۹ء کی گرمیوں کے شروع میں مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) تحریک خلافت کے سلسلہ میں استانبول آئے تھے۔ اسعد فواد بک سے ملاقات کے دوران میں ان کو میرا حال معلوم ہوا کہ میں ترکی کیڈٹ کالج میں تعلیم پا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ اسعد فواد بک اور عمر رضا دوغرول بک (مرحوم) نے بہت کوشش کی کہ مجھے کالج سے چھٹی دلا کر ان سے ملائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ مجھے مولانا محمد علی جوہر کی آمد کا علم اس ہفتے بار کے دن چھٹی ملنے پر ہوا۔ اس روز جب میں عمر رضا دوغرل بک سے ملا تو انہوں نے مجھے

مولانا جوہر کے ورود استانبول اور مجھ سے ملنے کی آرزو کا ذکر کیا۔ میں ان کی ملاقات کے شرف سے محروم رہنے کی وجہ سے اپنے کو بڑا بد نصیب سمجھتا ہوں۔

بروسہ کی مصنوعی لڑائیاں: (Manoeuvers)

۱۹۲۹ء کے موسم خزاں میں سالانہ امتحان کے بعد ہماری جماعت کے سارے طالب علم مصنوعی جنگوں میں بحیثیت سپاہیوں کے شریک ہوئے۔ یہ منیووزر بروسہ کے صوبے میں پندرہ دن جاری رہے تھے۔ اس کی تیاری کے لئے اول تو ہم کو کالج سے کوئی دس میل دور (قصر آیاز آغا) کے پاس کے جنگل میں کیمپ لگانے کا حکم ملا۔ اس کیمپ میں ہر ایک سکویڈ کے لئے جس میں آٹھ آدمی داخل تھے ایک مخروطی خیمہ لگایا گیا۔ یہاں ہمیں معمولی سپاہیوں کی طرح میدان جنگ کی زندگی گزارنا تھی۔ ہر روز ایک جنگی مسئلہ جس میں ہمیں ایک فرضی دشمن کا سامنا کرنا پڑتا تھا ہمارے سامنے لایا جاتا تھا اور ہمیں فرداً فرداً، سکویڈ کے طور پر سیکشن (Section) اور کمپنی (Company) کے طور پر فوجی طرز حرکت سکھلایا جاتا تھا۔ ہم اس طرح پر کوئی ۵ ہفتے قصر آیاز آغاز کے آس پاس کے جنگلوں اور پہاڑیوں اور میدانوں میں جنگی مشقیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم سب کو پورے فوجی سامان سے لیس کر کے لمبے لمبے کوچ کرنے کا عادی بنایا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ کوچ چند دنوں میں ۲۵ میل تک لمبا کر دیا گیا۔ ہم صبح کے ناشتہ کے بعد ۸/ بجے اپنی بندوق، گولہ و بارود، راشن، پانی کی بطخ پیٹھ پر بندھا ہوا ایک تھیلا جس کے ساتھ اوور کوٹ ایک کمبل اور سفری خیمہ بھی ہوتا تھا، لے کر مارچ شروع کیا کرتے تھے۔ فوجی اصول کے مطابق ہر پچاس منٹ کے کوچ کے بعد ہمیں دس منٹ ستانے (آرام) کی اجازت ملتی تھی۔ دوپہر کا راشن کھانے اور ایک گھنٹہ آرام کے لئے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر چار گھنٹے پیدل چل کر کیمپ کو واپس آیا کرتے تھے۔ سفری خیمہ (SQUAD) کے آٹھ سپاہیوں کے لئے ہوتا ہے۔ یہ خیمہ آٹھ ٹکڑوں کی شکل میں تھا۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے سکویڈ کے سفری خیمے کا ایک ٹکڑا اپنے تھیلے کے اوپر باندھ کر لے جایا کرتا تھا۔ مینوورز میں ہم ان آٹھ ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر ایک خیمہ بنا لیتے تھے اور رات کو اس میں سو جایا کرتے تھے۔ دن کو کوچ کرتے ہوئے اگر بارش ہو تو یہ سفری خیمہ کا ٹکڑا ہمارے لئے بارانی (Rain Coat) کا کام دیتا تھا۔

لمبے سفر کے اس طرح عادی ہو جانے کے بعد ہم کو قلعہ سلیمیہ میں بھیجا گیا۔ وہاں سے اگلے

روز بروسہ کو روانہ ہونا تھا۔ اس روز مجھے کچھ پیچش ہو گئی تھی۔ ایک اور طالب علم کاظم نام بھی ذرا سا بیمار تھا۔ اس نے تو ڈاکٹر سے رپورٹ لے کر مینوورز پر جانے سے اپنے کو معاف کرا لیا۔ مجھے بھی میرے ہم جماعتوں نے کہا کہ ڈاکٹر سے رپورٹ لے کر اس سفر میں شرکت سے معافی حاصل کر لوں۔ لیکن میں نے ان کی بات نہ مانی اور اگلے روز باقی ہم جماعتوں کے ساتھ بروسہ روانہ ہو گیا۔ اس روز مجھے چلنے میں تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن میں نے اپنی فوج کا ساتھ نہ

اگرچہ یہ مینور (فرضی لڑائی) تھی۔ لیکن اس میں موت کے ڈر کے سوا سچی لڑائی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جن مشقتوں کو جھیلنا پڑتا ہے ان سب کا ہم کو سامنا کرنا پڑا۔ اس فرضی لڑائی میں دو فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ دن کو لمبے لمبے سفر کرنا رات کو پہرہ دینا۔ بعض اوقات رات کو بھی سفر کر کے دشمن (مد مقابل کی فوج) پر چھاپہ مارنا۔ دشمن کے ہاتھ قید

ہو جانے کے خطرے کا سامنا کرنا۔ تکان، بھوک، پیاس، بے خوابی وغیرہ ایسے حالات جو لڑائیوں میں سپاہیوں کو پیش آتے ہیں، ہم نے ان سب کو جھیلا۔ بروسہ میں ایک دن موسلادھار بارش ہوئی جس سے پانی کی نالیاں ندیاں بن گئیں، اور کوچ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس رات سونے کے لئے ایک چپہ زمین بھی نہ ملی اور ہمیں گیلی زمین پر کمبل بچھا کر سونا پڑا۔ ایک اور روز مد مقابل فوج سے پہلے ہمیں ایک مقام پر پہنچنے اور اس پر قبضہ کرنے کا حکم ملا۔ اس روز صبح سے لے کر سہ پہر تک ہم کو متواتر کوچ کرنا پڑا۔ فوجی قاعدے کے طور پر ہر پچاس منٹ کے بعد جو دس منٹ کا وقفہ ستانے کے لئے ہمیں ملنا چاہئے تھا، وہ بھی نہ دیا گیا۔ کیونکہ چھ گھنٹے کے کوچ میں اگر دس منٹ آرام اور ستانے کے لئے رکھے جاتے تو ہم اپنے مقام مقصود پر ایک گھنٹہ دیر میں پہنچتے اور دشمن ہم سے پہلے وہاں پہنچ کر اس مقام پر قبضہ کر لیتا۔ متواتر چھ گھنٹے چلنے سے ہماری ٹانگوں میں سکت نہ رہی اور بدن بالکل چور ہو گیا۔ میں اس روز کی تھکان کو آج تک نہیں بھولا۔

مینوورز کے آخری دن ہم کو مد مقابل فوج پر حملہ کرنے کا حکم ملا، جو ایک پہاڑ پر قابض تھی۔ اس پہاڑ کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے ہمیں صبح سے شام تک ایک دن صرف کرنا پڑا۔ شام کے نزدیک جب ہم اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے اور مد مقابل فوج وہاں سے پسپا ہو گئی۔ تو ہم سب پیاس سے بدحواس ہو چکے تھے۔ ہماری بطخوں میں جتنا پانی تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس پہاڑ پر نہ کوئی درخت تھا کہ اس کے سایہ میں ہم ذرا دیر آرام کرتے اور نہ ہی کوئی قدرتی چشمہ تھا جس کے پانی سے اپنی پیاس بجھاتے۔ اتفاق سے ہمیں ایک کوا نظر آیا جو ہمارے سروں پر سے گزر کر

ہمارے بائیں طرف کی وادی کو اڑا جا رہا تھا۔ اس لئے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ کوا پانی پینے کے لئے اس وادی کی طرف جا رہا ہے، اور اگر ہم بھی اس طرف جائیں تو ہمیں پانی ضرور ملے گا۔ اس پر میں اور ایک اور طالب علم نے اپنے چند ایک دوستوں کی بھی بطخیں لیں اور پہاڑی سے اس وادی کی طرف اترنے لگے بہت لمبے سفر کے بعد اس وادی کی تہہ میں ہم نے ایک گڑھے میں جمع شدہ کچھ پانی دیکھا جو آس پاس کی دلدلی زمین سے رس رس کر وہاں جمع ہو گیا تھا۔ اس پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بھی صاف نہ تھا۔ اس میں مینڈک تیر رہے تھے۔ اس کی بو بھی کچھ بھلی سی نہ تھی۔ لیکن کوئی اور چارہ نہ تھا۔ ہمیں اسی پانی سے اپنی پیاس بجھانا پڑی۔ ہم اپنے دوستوں کی بطخوں کو اسی پانی سے بھر کر پھر پہاڑ پر چڑھے، اور ہمارے ساتھیوں نے اس میں سے چند گھونٹ پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گندے پانی کے پینے سے ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی بیمار نہ ہوا۔

مینوورز کے ختم ہونے پر ہم چار دن پیدل چل کر پھر کیڈٹ کالج میں پہنچ گئے۔ ان پندرہ دنوں میں ہم میں سے نہ کوئی طالب علم بیمار ہوا اور نہ ہی کوئی اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہا۔

دوسرا سال

مینوورز کے ختم ہونے پر اور کیڈٹ کالج واپس آنے پر ہم کو سالانہ امتحان کے بعد دوسری جماعت میں چڑھا دیا گیا۔ صرف دو طالب علم جو میری طرح امتحان دے کر سول سکول سے کیڈٹ کالج میں داخل ہوئے تھے، پہلی جماعت کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ اس لئے ان کو کالج سے نکال دیا گیا۔ سول سکولوں سے کیڈٹ کالج میں داخل ہونے والے ہم چار طالب علم تھے۔ ان دو طالب علموں کے نکلنے کے بعد میں اور ایک طالب علم جس کا نام خیری آفندی تھا، کیڈٹ کالج میں رہ گئے۔ خیری آفندی اصل میں ترکی نسل سے تھا لیکن مصر میں پیدا ہوا تھا، اور فرانس کے ایک ہائی سکول کا پاس شدہ تھا۔ وہ رسالہ میں تھا اور میں توپخانہ میں تھا۔ میں نے ابتدائی فوجی تعلیم قلعہ سلیمیہ میں حاصل کی تھی اور اس نے شہر قربنفلر ایلی میں لی تھی جو اس وقت ترکی رسالہ کا ایک بڑا فوجی مرکز تھا۔

اعلیٰ حضرت محمدؐ نادر شاہ (مرحوم) کا فرمان

انہی دنوں اعلیٰ حضرت محمدؐ نادر شاہ (مرحوم) کا چچازاد بھائی سردار محمدؐ کریم جان جو ترکی میں دو سال سے استحکام یعنی سفرینا (Sappers and Miners) کے دستہ میں قواعد سیکھ رہا تھا، بچہ سقا کے مغلوب ہونے پر (جس نے امیر امان اللہ خان مرحوم کو شکست دے کر افغانستان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا) استانبول سے کابل روانہ ہوا۔ میں نے اس کو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کے نام جو بچہ سقا کو قید کر کے تخت افغانستان پر متمکن ہو گئے تھے، ایک پرائیویٹ خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء دیا۔ اس خط میں مَیں نے ان کو تاج پوشی کی مبارکبادی دے کر جنگ آزادی افغانستان کا زمانہ یاد دلایا، جب کہ میں ان کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں ٹھل کے میدان میں لڑا تھا اور یہ لکھا کہ:

"اب جبکہ خدا نے آپ کو افغانستان کا بادشاہ بنا کر آپ کو طاقت اور قوت بخشی ہے تو آپ ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی کوشش کریں"۔ اس خط کے آخر میں مَیں نے یہ شعر لکھا تھا۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بہ ما نیز کنند

اس کے جواب میں ایک فرمان مورخہ ۲۷/ثور ۱۳۰۹ ہجری شمسی (بمطابق ۱۸۔ذی الحجہ ۱۳۴۸ قمری۔ ۱۹/مئی ۱۹۳۰ء) انہوں نے مجھے سفارت افغانی (انقرہ) کے ذریعہ بھیج کر میری سرافرازی کی تھی۔

فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

محترم اور صداقت شعار مولانا ظفر حسن خان

آپ کا عریضہ مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء جس میں آپ نے مجھے سلطنت کی مبارکباد دی تھی، میری نظر سے گزرا۔ اس کا مضمون جو آپ کے جذبات اور احساسات اسلامی کا مرقع تھا میری دلی خوشی کا باعث ہوا۔

میں سوچا کرتا ہوں کہ ایسی مصیبت کے زمانے میں اور ایسے نازک وقت میں جب بالکل بے سروسامانی تھی اور وسائل موجود نہ تھے میری کامیابی تو نہ صرف محال بلکہ ناممکن تھی۔ لیکن

خدائے قادر نے اپنے فضل ورحمت سے اس قوم کی ٹوٹی ہوئی ناؤ کو جو ڈوبنے کے قریب تھی، فلاح اور نجات کے ساحل پر لگا دیا۔ اس کے بکھرے ہوئے اجزا کو پھر باہم جمع کر دیا۔ اور آپ جیسے عالم انسانیت واسلامیت کے حقیقی خیر خواہوں اور طرفداروں کی دعاؤں کو اپنی بارگاہ واھب العطایا میں قبول فرمالیا۔

آخر میں خدائے تعالیٰ سے عالم اسلام اور خاص کر اپنے عزیز وطن افغانستان کے لئے ترقیات روزافزوں نیاز کرتا ہوں اور آپ کی صحت کا خواہاں ہوں۔ جناب مولانا عبیداللہ صاحب و کیپٹن کاظم بک (۱) کو میرا سلام پہنچا دیں۔

(دستخط) محمدؐ نادر

ایک اہم واقعہ

کیڈٹ کالج کی دوسری جماعت میں بھی ہم پہلی جماعت کی طرح نظری سبق پڑھا کرتے تھے اور عملی قواعد سیکھا کرتے تھے۔ اس سال کا اہم واقعہ جس کا میرے مستقبل پر کافی برا اثر پڑا، ہمارا ششماہی امتحان تھا۔ اب تک باوجود ترکی زبان کے کم جاننے کے میں سب سبقوں میں اچھے نمبر لیتا رہا جس سے استاد مجھے اچھی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ لیکن اس ششماہی امتحان میں فوجی تنظیم کے سبق کے بارے میں ہمارے استاد نے پہلی جماعت میں پڑھائے ہوئے سبقوں میں سے ایک سوال پوچھ لیا۔ میں اس سوال کا ٹھیک جواب بھول گیا تھا۔ اس لئے اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میری طرح میرے دائیں، بائیں اور آگے پیچھے بیٹھنے والے طالب علم بھی اس کا جواب بھول چکے تھے۔ لیکن انہوں نے بڑی چالاکی سے کتاب کھول کر نقل اتاری اور اس سوال کا ٹھیک جواب دے دیا۔ انہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی کتاب سے نقل اتار لوں۔ لیکن میں نے اس قسم کی ناجائز کارروائی سے اجتناب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اس سبق کے امتحان میں بہت کم نمبر ملے۔ جماعت کے ہشیار طالب علموں نے جن کو اس سوال کا جواب یاد تھا، انہوں نے

---

(۱) کیپٹن کاظم بک راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں (جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھا گیا ہے ہند، جرمن، ترکی مشن میں ترکی نمائندے کے طور پر شامل ہو کر کابل آیا تھا۔

خود بخود اپنے پرچے میں ٹھیک جواب لکھ دیا تھا۔ جن کو یاد نہ تھا انہوں نے چالاکی سے کتاب سے نقل اتار لی تھی۔ اس لئے کسی کا پرچہ اتنا خراب نہ تھا، جتنا کہ میرا تھا۔ امتحان کا نتیجہ نکلنے پر مجھ سے فوجی تنظیم کے سبق کے استاد نے اس کے سبق میں کم نمبر لینے کا سبب پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس سبق کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس نے تعجب کیا کہ ساری جماعت میں صرف میں ایک ایسا طالب علم تھا جس کا پرچہ اتنا خراب تھا۔ لیکن میں نے اس کو اور کوئی جواب نہ دیا، اور نہ ہی نقل اڑانے والے طالب علموں کی چغلی کھائی۔ اس امتحان میں فوجی تنظیم کے سبق میں کم نمبر لینے کی وجہ سے میرے سالانہ نمبروں کی میزان کم ہو گئی۔

اسی امتحان میں مارٹر گن (MORTAR GUN) کے سبق کے پرچے میں میں نے ترکی زبان کم جاننے کی وجہ سے ایک ایسی غلطی کی کہ اس سوال کے جواب کے معنی بدل گئے۔ (MORTAR) توپوں کو جنگ میں استعمال کرنے کے لئے گولہ، بارود، خود توپ چلانے والے سپاہیوں کے دشمن کی گولہ باری سے بچنے کی خاطر گڑھے اور خندقیں کھودی جاتی ہیں، جن کو ترکی زبان میں (صیغناق) (Sighnak) یعنی محل محفوظ کہا جاتا ہے۔ میں امتحان میں اس لفظ کو تو بھول گیا اور اس جگہ ضاغناق (SAGHNAK) جس کے معنی موسلادھار بارش کے ہیں لکھ دیا۔ موسلادھار بارش کا اس سوال کے جواب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے اس سبق کے امتحان میں بھی میرے نمبر کٹ گئے۔ ان ۲ دو سبقوں میں کم نمبر لینے کی وجہ سے میرا درجہ جماعت میں گر گیا۔

ہم سال میں دو مرتبہ ترکی قومی عیدوں کے موقع پر استانبول کی فوج کے ساتھ مارچ پاسٹ کیا کرتے تھے۔ ایک قومی عید (۳۰/اگست) کو ہوتی ہے۔ یہ جنگ آزادی ترکی کی فتح کی یاد میں ہے، جب غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو شکست دے کر اناطولیہ کی سرزمین سے ان کو نکال دیا تھا۔ دوسری عید ترکی جمہوریت کی سالگرہ کے دن (۲۹/اکتوبر) کو منائی جاتی ہے جب کہ ترکی میں شہنشاہی نظام حکومت کی بجائے ۱۹۲۳ء میں جمہوریت قائم ہوئی تھی۔ یہ مارچ پاسٹ ان دنوں ہمارے کالج سے کوئی دس میل کے فاصلے پر شہر کے سب سے بڑے میدان (چوک بایزید) میں ہوتی تھی۔ کیڈٹ کالج کے طالب علم قومی جھنڈے اور فوجی بینڈ کے بعد مگر باقی فوجوں سے پہلے مارچ پاسٹ کیا کرتے تھے۔ اس روز صبح کو ہم نئی وردیاں پہن کر کالج سے چوک بایزید تک پیدل جایا کرتے تھے، اور دوپہر کے بعد پریڈ ختم ہونے پر پیدل

کالج واپس آتے تھے۔ اس طرح ہم کو گھنٹوں بھر کھڑا رہنا اور کوئی بیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ لیکن اس تکان کے باوجود بھی ہم شہر کی بڑی سڑکوں اور بڑے بازاروں سے بہ یک آواز ترکی فوجی ترانہ اور کیڈٹ کالج کا گانا گاتے ہوئے بڑی اینٹھ سے گزرا کرتے تھے۔ ہماری آواز سے شہر کے گلی کوچے گونج اٹھا کرتے تھے، اور لوگ ہمیں دیکھنے کے لئے، جوق در جوق سڑکوں کے کناروں پر اور گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں میں جمع ہو جایا کرتے تھے اور بڑے جوش و خروش سے تالیاں بجا کر ہمارے انتظام اور موزوں قدم رفتار کی داد دیا کرتے تھے۔

طالب علموں کی کامیابی کا درجہ

دوسری جماعت کے آخری امتحان کے بعد ہر صنف کے طالب علموں کی کامیابی کا درجہ متعین کرنے کے لئے دو سالوں کے امتحانوں کے نمبر جمع کیے جاتے تھے۔ اس طرح پر پیدل صنف کے طالب علموں کا درجہ علیحدہ اور رسالہ اور دوسرے صنفوں کے طالب علموں کے درجے علیحدہ، توپ خانہ کے طالب علموں کا درجہ علیحدہ اور رسالہ اور دوسرے صنفوں کے طالب علموں کے درجے علیحدہ علیحدہ مقرر ہوتے تھے۔ دوسرے سال کے ششماہی امتحان میں میرے دو مضمونوں کے نمبر کٹ جانے کی وجہ سے توپ خانہ کے طالب علموں میں جن کی تعداد ہماری جماعت میں ۶۰ تھی میرا درجہ بارھواں ہو گیا تھا۔ اگر میں ان دو مضمونوں میں اچھے نمبر لے سکتا تو میں شاید پانچویں یا چھٹے درجہ پر کیڈٹ کالج سے پاس ہوتا۔ لیکن پھر بھی میں نے کافی اونچا درجہ حاصل کیا تھا، کیونکہ میں ابھی ترکی زبان اچھی طرح نہ جانتا تھا۔

ان درجوں کے لحاظ سے ہر طالب علم کو ایک فائل نمبر دیا جاتا تھا، جو آئندہ اس کی فوجی زندگی میں ہمیشہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے سارے سرکاری فوجی کاموں اور لکھت پڑھت کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ میرا فائل نمبر (توپ خانہ ۹۳۰_۱۲) تھا، جس کے یہ معنی تھے کہ میں توپ خانہ کی صنف میں فوجی تعلیم پا کر ۱۹۳۰ء میں بارھویں نمبر پر پاس ہوا تھا۔

میرا فوجی کمیشن

دوسری جماعت کے سالانہ امتحان کے دنوں میں ہم رسم شمشیر بندی (Passingout prade) کے لئے بھی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ہمارے لئے نئی وردیاں بنائی گئی

تھیں اور ہر طالب علم کے لئے ایک مرصع پیٹی اور ایک تلوار خریدی گئی تھی۔ یکم مئی ۱۹۳۰ء کو ہماری رسم شمشیر بندی ہوئی۔ جس میں ہم کو فوجی کمیشن دیا گیا، اور ہم سب نے ملک اور قوم کی صادقانہ خدمت کرنے کا حلف اٹھایا۔ اب ہمارا مرتبہ (Rank) امیدوار لیفٹننٹ ہوا۔ اس مرتبہ کو آج کل ترکی زبان میں (آس تیغمن) کہا جاتا ہے اور یہ ترکی فوج میں افسروں کا سب سے چھوٹا رتبہ مانا جاتا ہے (۲۵)

فوجی کمیشن ملنے پر ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب ہم ایک معمولی سپاہی کی بجائے افسر بن گئے تھے، جس کی وجہ سے راستہ میں چلتے پھرتے ہوئے ہر سپاہی ہم کو بڑے ادب سے سلام دیا کرتا تھا۔ اب ہم میں سے ہر شخص اپنے کو ایک بڑا آدمی سمجھنے لگا تھا۔ میرے لئے تو فوجی کمیشن کی اور بھی بڑی اہمیت تھی کیونکہ اب میری عمر بھر کی تمنا بر آئی تھی، اور مجھے اب یہ امید لگ گئی تھی کہ فنون حرب سیکھنے کی وجہ سے میں ضرور ہندوستان کی آزادی کے لئے نمایاں خدمت ادا کر سکوں گا (۱۹۳۰ء تک انگریزی حکومت نے ہندوستان میں وہاں کے لوگوں کو فوجی کمیشن دینے کا اصول منظور نہ کیا تھا۔)

باب بیسواں

توپ خانہ اختصاص کالج میں میرا داخلہ

(ARTILLERY SPECIALIZATION COLLEGE)

ملٹری کالج سے پاس ہونے اور فوجی کمیشن لینے کے بعد ہر صنف کے طالب علم افسر اپنے اپنے اختصاص کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ ہم توپ خانہ کے افسروں کو دو سال کی تعلیم کے لئے آرٹلری اختصاص کالج بھیجا گیا تھا۔ یہ کالج استنبول کے محلہ (ماچقہ) میں تھا، یہاں جو نظری سبق ہمیں پڑھائے جاتے تھے ان میں سے اہم ترین سبق مندرجہ ذیل تھے۔

اعلیٰ فن اسلحہ۔ (Higher Weaponry)
فن انداخت۔ (Artillery Shooting)
فن بیلاسٹیک (Ballastics)
توپخانہ کا تعبیہ (Artillery Tactics)
سراغ رسانی۔ (Artillery Reconnaisance)

زہریلی گیس اور اس کے بر خلاف حفاظت کے طریقے۔

اعلیٰ فن اسلحہ کے سبق کے ذیل میں ہمیں توپوں اور ہتھیاروں کی ساخت کے اصول پڑھائے جاتے تھے۔

فن انداخت کے سبق میں دشمن کے مختلف ہدفوں مثلاً پیدل فوج، توپ، مشین گن

رسالہ، محل ترصد (Observation Post) کو گولہ باری سے خراب کرنے کے قواعد سکھائے جاتے تھے۔

فن بیلاسٹیک کے سبق میں (Targectory of Projectile) کے بارے میں علمی معلومات دی جاتی تھیں۔ یعنی توپ کے منہ سے گولا نکل کر ہوا میں کیسے جاتا ہے اور اس پر کیا کیا اثر پڑتے ہیں۔

فن اسلحہ اور فن بیلاسٹیک کے سبقوں کو سمجھنے کے لئے اعلیٰ ریاضی کے جاننے کی ضرورت تھی۔ اس لئے ہمیں ریاضی کی وہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے (A) اور (B) کورس میں پڑھی تھیں۔

سراغ رسانی کے سبق میں میدان جنگ کی پہاڑیوں میں دشمن کے ہدفوں کا پتہ نکالنے، اس پر کارگر گولا باری کرنے کی غرض سے اپنی توپوں کے لئے جگہ ڈھونڈنے اور دشمن کو اور اپنی گولہ باری کے اثر کو دیکھنے کے لئے محل ترصد تلاش کرنے کا کام سکھلایا جاتا تھا۔ تعبیہ کے درس میں توپوں کو دشمن کی نگاہ سے اوجھل رکھ کر اس پر تباہ کن آگ برسانے میں کار آمد ہونے والے موقع پر لیجانا اور وہاں سے دشمن پر خفیہ طریق سے فیر کرنا سکھلایا جاتا تھا۔ عملی سبقوں میں ہمیں توپ خانہ کے سکیشن کمانڈر اور بیٹری کمانڈر کے فرائض سکھلائے جاتے تھے۔ نیز رنگروٹوں کو توپ خانہ کی تعلیم دینے کے طریقے پڑھائے جاتے تھے۔ اس سبق کے ذیل میں توپوں میں گھوڑے جوت کر یا پہاڑی توپوں کو خچروں پر لاد کر پہاڑیوں اور نشیب و فراز والی زمینوں میں پہنچانا اور انداخت کے موقع پر پہنچنے کے لئے مناسب راستہ تلاش کرنا، پھر توپوں کو فیر کے لئے انداخت کے موقع پر لگانا پڑتا تھا۔ ہمارے زمانے میں توپوں میں گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ لیکن اب تو ترکی فوج میں سارا توپ خانہ موٹروں کے ذریعہ حرکت کرتا ہے۔

اس کالج میں چھ ماہ تعلیم پانے کے بعد ہمارا ششماہی امتحان ہوا۔ اس میں کامیاب ہونے پر مجھے سیکنڈ لیفٹیننٹ کا مرتبہ ملا۔

مکتب عالی انداخت توپ خانہ (Artillery firing College)

پڑھائی کا پہلا سال ختم ہونے پر ہم کو دو ماہ کے لئے استنبول سے باہر آرٹلری فائرنگ کالج (مکتب عالی انداخت توپ خانہ) میں بھیجا گیا۔ یہاں ہمیں مختلف فوجی مسائل کو حل کرنا، اور ان

کے مطابق اپنی توپوں کو پہاڑیوں میں لے جاکر موقع انداخت (Firing Position) میں لگانا پڑتا تھا، جیسا کہ سچی مچی لڑائی کے میدان میں کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں سارے نظری سبقوں کو جو ہم نے توپ خانہ اختصاص کالج میں پڑھے تھے اور خاص کر ان نظری سبقوں کو جو ہم کو فائرنگ کالج میں محرک مرعی پر اثر انداز ہونے والی قوتوں کو یعنی جاذبیہ ارض (Gravity) ہوا کی سرعت، اس کے درجہ حرارت اور درجہ رطوبت، توپ کے گولے کی سرعت ابتدائیہ جو اس کو بارود کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، حساب کرنے کے لئے سکھائے گئے تھے، عملی جامہ پہنانا پڑتا تھا اور حقیقی گولہ بارود سے کام لے کر توپوں کو چلانا ہوتا تھا۔ نشانہ بازی کی درستی اور گولہ باری کے اثر معلوم کرنے کے لئے ہم میں سے دو دو افسر باری باری ہدف (یعنی نشانہ) کے نزدیک ایک خندق کھود کر اس میں دوربین ہاتھ میں لے کر بیٹھا کرتے تھے، اور وہاں سے پورٹیبل (یعنی سیار) ٹیلیفون کے ذریعہ گولوں کے اثر کو توپ خانے کے افسر کو بتایا کرتے تھے۔ (۲۶)

اس کالج کے سبقوں میں اعلیٰ ریاضی (Higher Mathemetics) کا دخل تھا۔ میں چونکہ لاہور میں بی اے میں (Pure Mathemetics) پڑھ چکا تھا اس لئے مجھے ان سبقوں کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی تھی اور میں اپنے دوسرے ہم جماعت افسروں کو اس بارے میں مدد بھی دیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے استاد میری بڑی قدر کیا کرتے تھے۔

ایک روز سہ پہر کو ہم اسی قسم کی مشق کے بعد کالج کو لوٹنے کو تیار ہو رہے تھے کہ ہمارے کرنیل استاد نے مجھے حکم دیا کہ جماعت کو گھوڑوں پر سوار کر کے باقاعدہ کالج کو واپس لاؤں۔ کرنیل صاحب یہ حکم دے کر اور جماعت کے مونیٹر رفیق بک کو اپنے ساتھ لے کر کالج چلے گئے۔ میں نے توپوں میں گھوڑے جوتنے کا اور اپنے ہم جماعتوں کو قطار بندی کا حکم دیا اور اپنے استاد کے چلے جانے کے کوئی آدھ گھنٹے بعد جماعت کے ساتھ کالج کو روانہ ہوا۔ جماعت میں سے دو تین افسروں نے استاد کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر آپس میں کانا پھوسی کی اور میری اجازت کے بغیر اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر، پہاڑی علاقہ کے بعد میدان میں سرپٹ گھوڑ دوڑ شروع کر دی۔ اس پر جماعت کے دوسرے طالبعلم افسر بھی گھوڑے دوڑانے لگے، اور سب کے سب تتر بتر ہو گئے، اور کالج میں بڑی بے انتظامی سے پہنچے۔ استاد نے یہ دیکھ کر مجھے بلایا اور میرے ان ہم جماعتوں کے نام پوچھے جنھوں نے یہ بد انتظامی شروع کی تھی۔ میں نے اپنے ہم

جماعتوں کی حمایت کرنے اور ان کو سزا سے بچانے کے لئے اپنی لاعلمی بیان کی۔ اس پر استاد نے مجھ میں یہ قصور نکالا کہ میں جماعت میں انتظام کرنے کے ناقابل ہوں۔ اس کی مجھے یہ سزا ملی کہ اس ہفتے بار اور اتوار کی چھٹی سے محروم کر دیا گیا اور مجھے رات کو کالج میں اکیلا رہنا پڑا۔ فوجی تعلیم کے زمانے میں (یعنی دو سال کیڈٹ کالج میں اور دو سال آرٹلری کالج میں) مجھے یہ پہلی اور آخری سزا ملی تھی۔

مکتب عالی انداخت توپ خانہ کا دو ماہہ کورس ختم ہونے کے بعد ہمارا سالانہ امتحان ہوا۔ جس میں میں نے اچھے نمبر لئے اور جماعت کا اسسٹنٹ مونیٹر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد میں اوپر کی جماعت میں چڑھ گیا۔

پہلی جماعت کے امتحان کے بعد ہمیں گرمی کے موسم میں دو ماہ کی چھٹی ملی۔ میں نے اس چھٹی کو دوسرے ہم جماعت افسروں کی طرح سیر سپاٹے میں گزارنے کی بجائے اس سے یہ فائدہ اٹھایا کہ شہر سے باہر جو توپخانہ کی بیٹری (Battery) کی چھاؤنی تھی وہاں جا کر رنگروٹوں کو پریڈ سکھانے کے کام میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے کی بیٹری کمانڈر سے اجازت لے لی۔ بیٹری کمانڈر میری اس تجویز سے بہت خوش ہوا۔ مجھے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے رنگروٹوں کو قواعد سکھلانے اور ان کی تربیت کرنے کے اصول سیکھ لئے۔ یہ تجربہ میرے لئے آگے چل کر جب میں آرٹلری کالج ختم کر کے ترکی توپ خانہ میں افسر لگا، بہت کار آمد ثابت ہوا۔

آرٹلری کالج میں میرا دوسرا سال

اس زمانے میں آرٹلری کالج کی دوسری جماعت کے افسروں میں سے چند ایک محنتی اور شکیلے جوان ہر سال جمہوریت ترکی کی سالگرہ کے موقع پر استنبول سے انقرہ کو مارچ پاسٹ اور پریڈ میں بطور افسر توپ خانہ شریک ہونے کے لئے بھیجے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہماری جماعت میں سے بھی آٹھ افسر ہمارے مونیٹر کی کمان میں ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے انقرہ بھیجے گئے۔ بطور اسسٹنٹ مونیٹر کے میرا بھی حق تھا کہ میں بھی اس پریڈ میں شامل ہونے کے لئے انقرہ بھیجا جاؤں۔ لیکن چونکہ میں دبلا پتلا اور ذرا کمزور سا تھا، اس لئے میں اس عزت سے محروم کر دیا گیا اور میری بجائے ادھم بک نامی میرا ایک ہم جماعت جو بہت شکیلا

جوان تھا انقرہ بھیج دیا گیا۔ مجھے اس سے رنج تو ضرور ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی حکمت الٰہی مضمر تھی، کیونکہ انقرہ پہنچنے پر ادھم بک کو توپ خانہ کے ساتھ پریڈ میں شریک ہونے کے لئے جو گھوڑا ملا وہ بہت ہی بد کتا تھا اور جب کوئی اس پر سوار ہونے کی کوشش کرتا تو اس کو گرانے کے لئے اپنے پچھلے دونوں پاؤں پر دو شاخہ کھڑا ہونے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس گھوڑے کے توپ خانے کے افسروں نے ادھم بک کو اس کی اس بری عادت سے متنبہ کیا اور اس کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ جب ادھم بک پریڈ کے دن چھاؤنی میں اس گھوڑے پر چڑھا تو گھوڑا اپنی عادت کے مطابق دو شاخہ کھڑا ہوا۔ ادھم بک بڑی چستی سے اس کی پیٹھ سے اتر کر اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس نے اس کی لگام بھی چھوڑ دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا لگام کے چھوٹنے سے اتنے زور سے دو شاخہ ہوا کہ اس کا توازن خراب ہو گیا اور وہ اپنے کو سنبھال نہ سکا اور پیٹھ کے بل پر گر پڑا جس سے اس کا سر سڑک کے پتھریلے فرش سے ٹکرا کر پھٹ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ خوش قسمتی سے ادھم بک اس کی پیٹھ سے اترنے میں کامیاب ہو گیا تھا، ورنہ وہ بھی گھوڑے کے نیچے دب کر بالکل کچلا جاتا۔ جب میں نے یہ واقعہ سنا تو خدا کا شکر کیا۔ کیونکہ اگر میں ادھم بک کی بجائے انقراہ میں ہوتا تو شاید اس کی طرح پھرتی سے اس گھوڑے کی پیٹھ سے نہ اتر سکتا، اور وہاں ہی جان دے دیتا۔

فال

افسر بننے کے بعد میں اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنی تنخواہ پر گزارہ کر سکوں۔ اس لئے میں نے شادی کا ارادہ کیا۔ مجھے اس سے پہلے چند ایک ترکی خاندانوں کی طرف سے ایسی تجویزیں پیش ہوئی تھیں لیکن ابھی تک کوئی مناسب ناطہ نہ ملا تھا۔ ایک دفعہ ایک ترکی سفیر کی بہن کے متعلق مجھے کہا گیا تھا لیکن اس میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ میں فوج سے استعفیٰ دے کر سول زندگی اختیار کروں تاکہ لڑکی کی جائیداد کا انتظام کر سکوں۔ میں نے اس تجویز کو منظور نہ کیا تھا۔ کیونکہ فوجی افسر بننا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ ایک دوسری تجویز ایک بحری افسر کی لڑکی کے بارے میں تھی۔ میں چونکہ ارادہ رکھتا تھا کہ فوجی تعلیم لے کر پھر کسی طرح ترکی افسر کے طور پر افغانستان جاؤں۔ میں نے لڑکی کے والدین کو اپنے اس ارادے کی خبر دی۔ مگر وہ اپنی اکلوتی بچی کو اپنے سے جدا کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس لئے یہ تجویز بھی ادھوری رہ گئی۔

فال دیکھنے اور مستقبل کے بارے میں خبر حاصل کرنے کا دنیا کے ہر ملک کے لوگوں کو شوق ہوتا ہے۔ مثلاً برصغیر میں دیوان حافظ اور قرآن شریف سے مسلمان لوگ فال دیکھا کرتے ہیں۔ ترکی میں قہوہ کے پیالے، تاش کے پتوں، یا ہتھیلی کی لکیروں سے مستقبل کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان طریقوں میں سے ترکی میں قہوہ کی پیالی سے فال دیکھا جانا بہت عام ہے۔ اس کے لئے وہ شخص جو اپنا مستقبل معلوم کرنا چاہے ایک پیالی میں قہوہ پی کر پیالی کو پلیٹ میں الٹا کر کے رکھ دیا کرتا ہے اور جب پیالی ٹھنڈی ہو جائے تو فال دیکھنے والا اس کو الٹا کر اس کے اندر کے قہوہ کی تلچھٹ کے ذرات کو اچھی طرح سے دیکھ بھال کر ان سے قہوہ پینے والے کے مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی کیا کرتا ہے۔

ہمارے آرٹلری کالج کے باورچی خانہ میں ایک عورت کام کیا کرتی تھی جو کھانے کے وقت ہماری میز لگانے میں، ہمیں کھانا دینے میں اور برتن دھونے میں دوسرے نوکروں کو مدد دیتی تھی۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ قہوہ کی پیالی سے اچھی طرح فال دیکھ سکتی ہے۔ میں نے ایک روز قہوہ پی کر اپنی پیالی اس کو دی اور اس سے پوچھا کہ آیا میری شادی ہونے کی کوئی قریبی امید ہے یا نہیں؟ اس نے میری قہوہ کی پیالی کے اندر دیکھ کر مجھے بتایا کہ اس کو اس بارے میں فی الحال تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔

میں اگرچہ فال پر یقین نہیں رکھتا لیکن مندرجہ ذیل واقعہ نے مجھے اس بارے میں قدرے قائل کر دیا تھا۔

ترکی فوج میں ہر افسر کو فوجی سکولوں میں ایک غیر زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ اس زمانے میں فوجی سکولوں میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اب ان میں روسی زبان کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ہر فوجی طالب علم ان غیر زبانوں میں سے ایک زبان سیکھنے پر مجبور ہے۔ میں نے کیڈٹ کالج میں فرانسیسی زبان لی تھی۔ چونکہ میں انگریزی جانتا تھا۔ میں توپ خانہ اختصاص کالج کی پہلی جماعت میں فرانسیسی پڑھتا رہا۔ لیکن دوسری جماعت میں کوئی اچھا انگریزی کا معلم نہ ملنے کی وجہ سے مجھے کالج کے پرنسپل نے کہا کہ میں زبان کے سبق کے گھنٹے میں فرانسیسی کا سبق نہ پڑھا کروں بلکہ اس کی بجائے اپنے ہم جماعتوں کو انگریزی پڑھا دیا کروں۔ میں نے ان کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لیکن اس خیال سے کہ تین سال کی پڑھی ہوئی فرانسیسی زبان نہ بھول جاؤں میں نے فرانسیسی زبان کے پرائیوٹ سبق لینے شرع کر دئے۔ میری استانی ایک

یونانی لڑکی تھی جس کی ماں انگریزی کے پرائیوٹ سبق دیا کرتی تھی۔ یہ ماں اور بیٹی دونوں اسی طرح سبق پڑھا کر اپنا گزارہ کیا کرتی تھیں۔ لیکن اس لڑکی نے مجھ سے کوئی فیس لینا منظور نہ کیا کیونکہ میں اس کو ترکی زبان سکھلاتا تھا۔ ایک روز اس سے باتوں باتوں میں فال دیکھنے کا ذکر آیا اور میں نے اس کو کہا کہ میں فال کا قائل نہیں ہوں۔ اس پر اس نے مجھے اپنے بارے میں ایک فال کا ذکر کیا اور یہ کہا۔

"استانبول میں ایک ارمنی عورت ہے جو بہت یقینی طور پر انسان کا مستقبل معلوم کر سکتی ہے۔ لوگ اکثر اس کو اپنی قہوہ کی پیالی دکھلاتے ہیں اور وہ ان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتی ہے۔" اس لئے ایک روز میری والدہ نے مجھے کہا کہ میں قہوہ پی کر اپنی پیالی اس کو دوں۔ تاکہ وہ اس کو اس ارمنی عورت کو دکھلائے (ایسے فال دیکھنے والے لوگ اپنی پیشن گوئی کے مقابلہ میں کچھ دام لیا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ترکی میں فال دیکھنا قانوناً منع ہے اس لئے یہ لوگ اپنے پیشے کو بہت خفیہ طور پر چلاتے ہیں) میری والدہ میری پیالی کو اس عورت کے ہاں لے گئی اور اس کو کہا کہ اس نے خود اس پیالی میں قہوہ پیا ہے۔ فال دیکھنے والی عورت نے پیالی کو اچھی طرح تدقیق کیا اور کہا کہ اس پیالی میں اصل میں ایک نوجوان لڑکی نے قہوہ پیا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میری ماں کو تعجب ہوا کہ اس نے کس طرح جانا کہ میری ماں نے اس پیالی میں قہوہ نہیں پیا تھا، بلکہ میں نے پیا تھا۔ اس پر میری ماں نے اعتراف کیا کہ اس نے اس کو غلط معلومات دی تھیں۔ فال دیکھنے والی عورت نے کہا "اس پیالی میں قہوہ پینے والی لڑکی کی پیٹھ پر ایک بڑا سا تل موجود ہے (حالانکہ میری والدہ کو اس کا بالکل علم نہ تھا) اور اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ اس سے خوش نہیں ہے بلکہ اپنے کو اس وجہ سے بد قسمت خیال کرتی ہے اور ایک روز خود کشی کر لے گی۔"

میری ماں نے گھر واپس آکر میرے کپڑے اتروائے اور میری پیٹھ کو کھلوا کر دیکھا کہ میری پشت پر تل ہے کہ نہیں؟ لیکن حقیقتاً میری پیٹھ پر ایک بڑا سا تل موجود تھا۔ منگنی سے میرے خوش نہ ہونے کے بارے میں جو کچھ اس فال دیکھنے والی عورت نے کہا تھا وہ بھی ٹھیک تھا۔ کیونکہ میری ماں نے میری منگنی ایک مالدار یونانی سے کر دی تھی جس کو میں پسند نہ کرتی تھی اور جو مصر میں رہتا تھا"۔

اس واقعہ کے کوئی تین ماہ بعد جب میں ایک روز فرانسیسی کا سبق پڑھنے کو اپنی استانی کے

ہاں گیا تو میں نے اس کا گھر بند پایا۔ اگلے روز میں نے اخبار میں پڑھا کہ اس نے کشتی سے آبنائے باسفورس میں چھلانگ مار کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن ملاح نے اس کو ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ غالباً وہ اپنی ماں کے ساتھ ترکی سے یونان کو چلی گئی تھی۔"

آرٹلری کالج کے دوسرے سال کے آخر کے نزدیک میں نے ایک روز پھر قہوہ پی کر اپنے باورچی خانہ کی نوکرانی سے فال پوچھی۔ اس دفعہ اس نے بتایا کہ:

اب آپ کی شادی نزدیک ہے اور آپ ایک لڑکی سے ناطہ کرنے کے لئے گفت و شنید کر رہے ہیں (اس نے لڑکی کے خدو خال بھی بیان کئے) اور آپ کو کچھ دنوں میں ایک اہم خط آنے والا ہے جس میں آپ کو روپیہ ملنے کا ذکر ہو گا۔

اس عورت کی پیش گوئی پر مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ میں ان دنوں حقیقتاً ناطہ ڈھونڈ رہا تھا اور مجھے اس بارے میں بہت امید پیدا ہوئی تھی۔ نیز چونکہ میں افغانستان جانے کے لئے جہاں اب سردار محمد نادر خان (مرحوم) بادشاہ بن گئے تھے، افغانی سفارت انقرہ سے خط و کتابت کر رہا تھا، مجھے ان دنوں سفارت خانہ سے خط آنے کی امید لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک ہفتے بعد مجھے افغانی سفارت انقرہ سے یہ خبر ملی کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ مرحوم نے مجھے کابل بلا لیا اور اس کے لئے زادِ راہ کے طور پر کچھ روپیہ بھیج دیا ہے۔

ناطہ کے لئے میری تلاش اور افغانستان جانے کو میری آرزو اور اس بارے میں افغانی سفارت سے میری خط و کتابت کے متعلق آرٹلری کالج کے کسی فرد واحد کو بھی اطلاع نہ تھی جس سے میرے دل میں اس کا شبہ پیدا ہو کہ نوکرانی نے اس قسم کی چہ میگوئیاں سن کر میری فال اتنی صحیح بتائی تھی۔

میری منگنی اور شادی

اس زمانے میں آرٹلری کالج کے سیکنڈائر کے طالب علم افسروں کو کالج کے بورڈنگ ہاؤس سے باہر شہر میں گھر کرایہ پر لے کر رہنے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھا کر کالج کے نزدیک ایک گھر میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ بھی ہوا

کہ فرصت کے وقت کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی کر لیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہاں رہتے ہوئے ایک ترکی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو اسلام پر عیسائیوں کے حملوں اور اعتراضوں کے توڑ میں ترکی علماء نے لکھی تھی۔ اس ترجمے کو اشرف ادیب بک مالک کتب خانہ آثار علمیہ جس نے اس سے پہلے میرے اور عمر رضا دوغرول مرحوم کے ذریعے "سیرت النبیؐ" مصنفہ مولانا شبلی مرحوم کا ترکی میں ترجمہ کرا کے (عصر سعادت) کے نام سے چھاپا تھا، چھپوانا چاہتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مالی مشکلات کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

میری مالکہ مکان کو جب معلوم ہوا کہ میں آرٹلری کالج سے پاس ہونے کے بعد شادی کرنا چاہتا ہوں تو پہلے اس نے میرے ایک دوست کے ذریعہ اپنی ایک رشتہ دار لڑکی کا ناطہ پیش کیا۔ میں نے اس کو پسند نہ کیا۔ اس پر اس نے اپنی لڑکی کا ناطہ تجویز کیا۔ جب میں نے اس کو بھی پسند نہ کیا تو اس نے اپنے بھائی ڈاکٹر نیازی بک کے ہم جماعت ڈاکٹر پروفیسر مظفر شوقی ییزبک کی بہن امینہ مکرم خانم کے متعلق مجھے کہا اور بتایا کہ وہ استنبول کے ایک شریف خاندان سے منسوب ہے۔ اس کے والد احمد شوقی بک مرحوم ایک جید عالم، حافظ قرآن، عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر، علوم دینیہ کے معلم اور خشنویس تھے۔ وہ سلانیکا میں جب وہ شہر ترکی مقبوضات میں داخل تھا، ایک سکول کے مدیر تھے۔ انہوں نے بعد میں استنبول میں ایک پرائیویٹ سکول کھولا تھا۔ لیکن سلطان عبدالحمید خان ثانی نے جو تجدد پسندی اور دستوری حکومت کے بر خلاف تھا، اپنے جاسوسوں کی اس رپورٹ پر کہ احمد شوقی بک اپنے سکول میں طالبعلموں کو تجدد پسند خیالات سکھلاتے ہیں، اس سکول کو بند کر دیا تھا۔ مالکہ مکان نے مجھے یہ بھی بتلایا کہ ڈاکٹر پروفیسر مظفر شوقی ییزبک ایک مشہور نوجوان ترکی ڈاکٹر ہیں جنہوں نے استنبول کے میڈیکل کالج سے پاس ہونے کے بعد پیرس میں چھ سال ڈاکٹری پر ریسرچ کی تھی اور ترکی میں مرض ذیابیطس کا موڈرن طرز معالجہ جاری کیا تھا۔ وہ گرمی میں اپنی بہن امینہ مکرم خانم کے ساتھ ترکی کے مشہور صحت افزا مقامات "پرنسز آئیلنڈز" میں سے جزیرہ پرنکھ پو پر جس کو ترکی میں (بیوک آدا) کہا جاتا ہے، رہا کرتے ہیں۔ سردی میں ان کی رہائش استانبول کے مشہور محلّہ (جغال اوغلی) میں جہاں ان کا مطب بھی ہے۔ ہوا کرتی ہے۔ مجھے یہ ناطہ بہت جاذب نظر آیا۔ مالکہ مکان نے مجھے ایک روز گرمیوں میں مکرم خانم سے جب وہ جزیرہ سے استنبول اس سے ملنے آئی، اپنے ہاں ملایا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ اگرچہ میرا مرتبہ صرف لیفٹیننٹ کا تھا اور میری تنخواہ معمولی تھی۔

لیکن میں چونکہ ہندوستان میں یونیورسٹی میں پڑھ چکا تھا، اور علمی معلومات کے لحاظ سے اپنے ہم جماعتوں سے بلند تر تھا، مکرم خانم نے اس رشتہ پر اظہار رضامندی کیا۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سے منگنی کی اجازت حاصل کی جائے۔ لیکن مجھے صرف یہ جھجک تھی کہ میری تنخواہ بہت معمولی ہے اور میں ایک ایسی لڑکی کے لئے جس نے ہمیشہ آرام کی زندگی بسر کی ہے۔ ایسے سامان آسائش بہم نہ پہنچا سکوں گا جیسے کہ اس نے ابتک دیکھے تھے۔ اس لئے میں نے اس کا ذکر مالکہ مکان سے کیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ انہوں نے پہلے تو اپنے بعض دوست فوجی افسروں کے ذریعے میرے حالات معلوم کئے اور جب ان کو میرے اخلاق اور کریکٹر کے بارے میں اطمینان ہو گیا تو وہ اس ناطہ پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے اپنی بہن کو میری تنخواہ کے برابر ماہانہ مالی امداد دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر ہماری منگنی ۵ فروری ۱۹۳۲ء کو ہو گئی۔ ۵ فروری کی تاریخ کو میں اپنی زندگی میں ایک مبارک تاریخ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس تاریخ کو میں نے ہجرت کی اور اپنے ملک کی جنگ آزادی شروع کی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے اسی کی برکت سے آج ہماری شادی کا ۳۵ واں سال ختم ہو گیا ہے۔ خداوند کریم نے ہمیں اس سارے عرصہ میں نہایت ہی خوش و خرم رکھا ہے۔ (۲۷)

آرٹلری کالج کی دوسری جماعت کے سبقوں کے ختم ہونے سے پہلے ہماری شادی ہو جانی چاہئے تھی۔ اس لئے میں نے ترکی فوجی قانون کے مطابق وزارت جنگ ترکی سے شادی کی اجازت مانگی۔ ترکی حکومت ترکی افسروں کو شادی کی اجازت دینے سے پہلے اس بات کی تحقیق کیا کرتی ہے کہ آیا لڑکی کا خاندان اور لڑکی کا چال چلن اتنا اچھا ہے کہ اگر ایک افسر اس گھرانے میں شادی کرے تو اس کے نام اور عزت پر کوئی بٹہ نہیں لگے گا۔ اگرچہ میری سسرال کے بارے میں ایسی تحقیقات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اصول اور قانون کی پابندی ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ تحقیق کی گئی جس کا نتیجہ جیسا کہ قدرتی طور پر ہونا ضروری تھا، بہت اچھا نکلا اور مجھے مکرم خانم سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ ہم نے نکاح کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء مقرر کر لی۔

آخری امتحان سے پہلے اپریل کے مہینے میں ترکی توپ خانہ کے افسروں کو ترکی جنگی بیڑے کے جہاز دکھلائے جایا کرتے ہیں تاکہ ان کو جنگی جہازوں کی توپوں کے بارے میں کچھ علم حاصل ہو جائے۔ ہماری جماعت کو بھی اس دورہ پر بھیجا گیا۔ ہم نے ترکی کراؤزر (یاووز) کی سیر کی۔

یہ وہی جرمن کراؤزر تھا جس کا اصلی نام گوبن تھا اور جس نے پہلی جنگ عظیم کے شروع میں ایک اور جرمن کراؤزر برسلا کے ساتھ اتحادیوں کے جنگی جہازوں کے تعاقب سے بچنے کے لئے بحیرہ روم سے درہ دانیال میں پناہ لی تھی۔ یہ دونوں جہاز جب ترکی سمندروں میں داخل ہوئے تو ان پر ترکی پرچم لگا دیا گیا تھا۔ لیکن ان جہازوں نے چند روز استنبول میں رہنے کے بعد اچانک بحیرہ اسود میں داخل ہو کر روسی بندر گاہ اوڈیسہ پر گولہ باری کر دی۔ (ان جہازوں کی اس کارروائی کا ترکی حکومت کو علم نہ ہوا۔ صرف انور پاشا مرحوم کی منظوری سے ان جہازوں کے جرمن کمانڈر نے ایسی ناجائز حرکت کی تھی) اس پر ترکی اور روس کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی اور ترکی جرمنوں کا اتحادی بن کر پہلی جنگ عظیم میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئی۔ جس کا چار سال بعد یہ نتیجہ نکلا کہ جرمنی کے ساتھ ترکوں نے بھی شکست کھائی اور اس طرح چھ سو سالہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

اپریل ۱۹۳۲ء کے آخر میں ہمارا سالانہ امتحان ہوا اور میں جماعت میں اول رہا۔ اس کے بعد ہمیں ترکی کے مختلف حصوں میں توپ خانہ کی افسری کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے لئے قرعہ (لاٹری) ڈالا گیا۔ تاکہ کسی افسر کو یہ شکایت نہ ہو کہ اس کو ناحق دور دراز کے گریزن میں مقرر کیا گیا اور ایک مالدار یا بارسوخ خاندان کے افسر کو استنبول میں یا کسی اور اچھی جگہ میں تعینات کر دیا گیا۔ لاٹری سے میری تقرری (قونیہ) میں ہوئی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی۔ کیونکہ (قونیہ) ایک بڑا تاریخی شہر ہے، جو ایک زمانے میں سلطنت عثمانیہ سے پہلے سلاطین سلجوقی کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ یہاں مولانا جلال الدین رومی کا مزار ہے۔

۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو میری شادی ہوئی اور میں اپنی بیوی کے ساتھ ۲۹ اپریل کی صبح کو قونیہ روانہ ہو گیا، تاکہ قانون کے مطابق اپریل کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے میں اپنی بیٹری میں، جو پانچویں آرٹلری رجمنٹ کے ماتحت تھی، حاضری دے دوں۔ (۲۸)

قونیہ میں میری فوجی کمانڈ

ہم چوبیس گھنٹے کے ریل کے سفر کے بعد ۳۰ اپریل کی صبح کو قونیہ پہنچے اور بلدیہ کے ہوٹل میں اترے۔ اس زمانے میں یہ قونیہ کا سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو یہاں چھوڑا اور

خود چھاؤنی جاکر اپنی رجمنٹ میں مقررہ وقت پر داخل ہو گیا۔ وہاں سے گھر وغیرہ کرایہ پر لینے اور اپنا ٹھکانہ لگانے کے لئے میں نے تین دن کی چھٹی لی۔

میں نے چھاؤنی کے نزدیک ایک گھر کرایہ پر تلاش کیا تاکہ رجمنٹ کو میرا آنا جانا آسان ہو اور میں اپنی بیٹری کے سپاہیوں کی ہر وقت نگرانی کر سکوں۔ وہاں ہمیں ایک گھر دکھلایا گیا جو ایک منزلہ تھا مگر اس میں آرام سے رہنے اور ضروریات زندگی کو بہ آسانی پورا کرنے کا سامان کافی نہ تھا۔ میری بیوی کو ایسے گھر میں رہنے پر مجبور ہونے سے بہت رنج ہوا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے استنبول میں اب تک بہت آرام دہ زندگی بسر کی تھی۔ وہ ایسے گھروں میں رہنے کی عادی تھی جہاں ہر قسم کا سامان آرام مہیا تھا۔ گرمی میں استنبول کے بہترین صحت افزا مقام پر رہتی تھی۔ اور سردی کے موسم کو ایک بہت بڑے گھر کی ایک منزل میں جس میں آٹھ کمرے تھے، اور جس میں ہر قسم کے اسباب استراحت موجود تھے، گزارا کرتی تھی۔ اب یہ کہ میرے فوجی پیشہ کی وجہ سے اور چھاؤنی کے نزدیک رہنے کے بارے میں میری خواہش کے باعث ایسے ادنیٰ گھر میں رہنے پر مجبور ہو رہی تھی جہاں نوکرانی کا ملنا بھی مشکل تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے چھاؤنی آنے جانے کی مشکلات کو اپنے اوپر لینے کا فیصلہ کیا اور شہر کے اندر ایک شریف محلہ میں ایک گھر کا مردانہ حصہ جو نہایت ہی آرام دہ تھا کرایہ پر لے لیا۔ یہ گھر قونیہ کے سابق ڈپٹی کمشنر کی بوڑھی بیوہ کا تھا۔ حسن اتفاق سے مالکہ مکان کی پالی ہوئی ایک نوجوان عورت ہمارے لئے بطور نوکرانی کے کام کرنے پر راضی ہو گئی۔ اس طرح مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری بیوی اس نئے ماحول میں آرام سے زندگی بسر کر سکے گی اور میں اپنے فوجی فرائض کو بجالانے میں تندہی سے مصروف ہو سکوں گا۔ ہمارا یہ گھر چھاؤنی سے دور ہونے کی وجہ سے میں دوپہر کے کھانے پر گھر نہ آسکتا تھا اور صبح کو ساڑھے سات بجے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔ شام کو ساڑھے چھ بجے سے پہلے واپس نہ آسکتا تھا۔ میری بیوی نے اپنی ملنساری اور خوش اخلاقی کے ذریعہ جلد ہی اپنی ہمسایہ عورتوں سے تعلقات پیدا کر لئے جن سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو چنداں تنہائی محسوس نہ ہوئی۔ چند روز بعد ہم کو معلوم ہوا کہ قونیہ میں میری خانم کے بھائی پروفیسر ڈاکٹر مظفر شوقی بک کے دو تین ہم جماعت ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں آنے جانے اور ان سے راہ و رسم بڑھا لینے سے قونیہ میں ہمارے لئے بالکل ایسا ہی ماحول پیدا ہو گیا جیسا کہ استنبول میں تھا۔

توپ خانہ کا کورس،

ابھی ہمیں قونیہ آئے ہوئے کوئی دو مہینے ہوئے تھے کہ ہماری خوش قسمتی سے میری بیٹری کی توپوں کے بارے میں استانبول میں ایک کورس شروع ہوا اور مجھے اس کورس میں شریک ہونے اور ان توپوں کے طرز استعمال کو سیکھنے کے لئے جولائی ۱۹۳۲ء میں استانبول بھیج دیا گیا۔ میری بیٹری کی توپیں سویڈن کے کارخانہ توپ سازی میں جس کا نام بوفورس تھا نئی بنی تھیں اور چند ماہ پہلے مختلف آرٹلری رجمنٹوں کو دی گئی تھیں۔ اس لئے ان کے افسروں کو ان کے طرز استعمال کے بارے میں ٹریننگ دینے کی ضرورت تھی۔

استانبول آنے پر میں نے بیوک آدا کے صحت افزا جزیرہ پر ایک گھر کرایہ پر لیا اور اپنی بیوی کے لئے جیسی کہ شادی سے پہلے اس کی عادت تھی پھر یہاں گرمیاں گزارنے کا انتظام کیا۔ ہمارا یہ کورس تین مہینے جاری رہا۔ یہاں ہم نے ان توپوں کو چلانے کے اصول ان کے جدول انداخت (Firing Tables) کو جو دوسری توپوں کے جدول انداخت سے بالکل مختلف اور مشکل ترین تھے استعمال کرنے کا طریقہ سیکھا۔ یہ توپیں پہاڑی توپیں تھی جو ٹکڑے ٹکڑے کر کے خچروں پر لادی جاتی تھیں۔ ایک توپ کو اس کے گولے بارود کے ساتھ میدان جنگ میں لے جانے کے لئے آٹھ خچریں درکار ہوتی تھیں۔ ہمیں خاص کر رات کو توپوں کو اندھیرے میں خچروں پر لاد کر فیر کی جگہ پر پہنچانا اور وہاں ان کے ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر فیر کے لئے تیار کرنا پڑتا تھا۔ اس کی مشق کے لئے ہم کو دن کے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ کر توپ کے Breech loading Mechanism کو جس کو ترکی میں مما کہتے ہیں اور جو توپ کی نالی میں گولہ بارود بھرنے کے بعد توپ کے پچھلے حصہ کو بند کرنے اور بارود کو آگ لگانے کا کام دیتا ہے، پرزے پرزے کر کے پھر اس کو نئے سرے سے جوڑنا پڑتا تھا۔ اسی طرح توپ کے Recoiling system کو جس کو ترکی میں باصغی کہتے ہیں کھول کر دوبارہ جوڑنا ہوتا تھا تاکہ اگر لڑائی کے وقت میدان جنگ میں توپ میں کوئی نقص یا خرابی پیدا ہو گئی ہو تو ہم خود اس کو مستری کی مدد کے بغیر درست کر سکیں۔

مینوورز (فرضی لڑائی)

ستمبر ۱۹۳۲ء میں کورس ختم ہونے کے بعد میں اپنی بیوی کو پھر قونیہ لایا۔ میں نے جو کچھ

وہاں پڑھا تھا اس کو اپنے سپاہیوں کو سکھلانا شروع کیا۔ ہماری بیٹری میں ان دنوں افسروں کی تعداد کم تھی۔ بیٹری کمانڈر کیپٹن اسعد بک کے سوا صرف میں ایک افسر تھا۔ حالانکہ ایک بیٹری میں پانچ افسروں کا سٹاف ہونا چاہیے۔ اس لئے مجھے حد سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔

اس کے باوجود بھی ہم رات کو اور جمعہ کو چھٹی کے دن (ان دنوں ترکی میں جمعے کے دن ہفتہ وار تعطیل ہوتی تھی۔ اب تو اتوار کے دن چھٹی ہوتی ہے) اپنے دوستوں کے حلقے میں اچھا وقت گزار لیتے تھے۔ خانم کی خوش خلقی اور ملنساری کی وجہ سے ہمارا حلقہ احباب بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس میں خانم کے بھائی کے ہم جماعت ڈاکٹروں سے بھی جو قونیہ کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ہمیں بہت مدد ملی۔ اس کے علاوہ چونکہ خانم کے بھائی اس کو باقاعدہ طور پر مالی امداد دیتے تھے، اس لئے ہمارا رہن سہن میرے ہم مرتبہ افسروں سے بلند تر تھا، اور ہم زیادہ تر اپنے لیفٹینںٹ دوستوں کی بجائے بٹالین اور رجمنٹ کمانڈروں اور ان کے اہل و عیال کی صحبت میں وقت گزارا کرتے تھے جس سے خانم کی طبیعت نہ اکتاتی تھی اور اس کو استانبول میں رہنے والی اس کی سہیلیوں کی یاد چنداں نہ ستاتی تھی۔

قونیہ میں سالانہ مینوورز کا موسم آ رہا تھا۔ اس لئے مجھے ایک سلوتری کیپٹن کے ساتھ اپنی آرٹلری رجمنٹ کے لئے استکشاف (سراغرسانی) کو بھیجا گیا۔ میرا فرض یہ تھا کہ میں اس میدان کو جانے کے لئے راستے نکالوں جہاں ہمارے پیدل ڈویژن کے ساتھ ہماری آرٹلری رجمنٹ مینوورز کے لئے جائے گی تاکہ گھوڑوں کو میدانی توپوں (Field guns) کو کھینچنے میں مشکل نہ پڑے۔ اس کے علاوہ میرا یہ بھی فرض تھا کہ اپنی رجمنٹ کے لئے ایسے جائے ترصد (Observation Posts) معلوم کروں جہاں سے مخالف طرف کی فوج کو دیکھنا ممکن ہو۔ نیز مجھے اپنی رجمنٹ کی سب توپوں کے لئے ایسے فیر کے موقع بھی تلاش کرنا تھے جہاں سے وہ مخالف طرف کی آنکھ سے اوجھل رہ کر گولہ باری کر سکیں۔ سلوتری کیپٹن کا فرض تھا کہ وہ اس کا پتہ چلائے کہ مینوورز کے میدانوں کے آس پاس کے گاؤں کے مویشیوں میں کوئی ایسا مرض تو نہیں ہے جو ہمارے گھوڑوں اور خچروں کو لگ جائے۔ نیز اسے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ مختلف پڑاؤں پر ہماری رجمنٹ کے گھوڑوں کے لئے پانی اور چارہ کا کیا بندوبست ہو سکے گا۔

ہم دونوں ایک ہفتے کے بعد ان ساری باتوں کا پتہ لگا کر قونیہ کو واپس آئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد ہمارا پیدل ڈویژن اور ہماری آرٹلری رجمنٹ مینوورز پر گئی۔ یہ فرضی لڑائی ۱۵ دن تک جاری

رہی۔ قونیہ کے آس پاس پہاڑیاں نسبتاً کم ہیں۔ اس لئے ہماری توپوں کو یہاں سے گزرنے میں چنداں مشکلات پیش نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ قونیہ کے علاقہ میں گرمی کے آخری مہینوں میں بارش بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان مینوورز میں ہمیں اس قسم کی دقتیں پیش نہیں آئیں جیسی کہ ہم نے ۱۹۲۹ء میں بروسہ کے مینوورز میں دیکھی تھیں۔

میرے لئے افغانستان جانے کی اجازت

مینوورز سے واپسی پر میں نے فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا کمانڈر انچیف افواج ترکی کو عبدالرحمن ریاض بابر بک کی معرفت عرضی بھیجی کہ مجھے بطور فوجی معلّم کے افغانستان جانے کی اجازت دی جائے۔ اس وقت میرا مرتبہ صرف سیکنڈ لیفٹیننٹ کا تھا۔ اس لئے میرے لئے اس قسم کی اجازت لینا مشکل تھا۔ کیونکہ ترکی حکومت اپنی ساکھ رکھنے کے لئے معلّم کے طور پر ایک تجربہ کار اور بلند مرتبہ افسر کو بھیجنا زیادہ مناسب سمجھتی تھی۔ اس لئے میں نے جنرل فخرالدین ترک قان پاشا سے درخواست کی کہ وہ میری سفارش کریں۔

انہوں نے فیلڈ مارشل سے مل کر میرے لئے اس کی اجازت لے لی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ افغانستان جانے سے پہلے ترکی فوج میں کم از کم ایک سال پورا کروں تاکہ فوجی تعلیم و تربیت کا ایک سالہ پروگرام عملی طور پر چلا کر رنگروٹوں کو قواعد سکھلانے کے سارے اصول اچھی طرح سمجھ لوں۔ اس لئے میں نے باوجود افغانی سفیر کے اصرار کے جو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے حکم کے مطابق مجھے جلد از جلد افغانستان بھیجنا چاہتا تھا، پورے ایک سال تک ترکی فوج میں کام کیا۔

اس عرصہ میں، مَیں نے افغانی سفارت کے ذریعے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ میری خانم کے لئے بھی سفر خرچ عنایت کریں۔ کیونکہ وہ مجھ سے علیحدہ ہندوستان کے راستے سے افغانستان جائے گی اور میں انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان کے راستے افغانستان نہ آسکوں گا۔ بلکہ روس سے سفر کروں گا اور روس کے حالات ایسے ہیں کہ وہاں سے ایک عورت کا سفر کر کے افغانستان پہنچنا ناممکن ہے۔ کچھ عرصہ بعد اعلیٰ حضرت کی طرف سے اس بارے میں بھی افغانی سفارت کو پیغام پہنچ گیا۔ حالانکہ حکومت افغانستان نے جو ادر فوجی معلّم یا سول ڈاکٹر وغیرہ ترکی سے منگائے تھے، ان کے اہل و عیال کے لئے علیحدہ کوئی سفر خرچ نہ دیا تھا۔

اگرچہ افغانستان جانے کے لئے مجھے کمانڈر ان چیف فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا نے اجازت دے دی تھی لیکن اصل حکم مجھے اس بارے میں ترکی وزارت جنگ سے لینا چاہیئے تھا۔ اس لئے میں نے ترکی وزارت جنگ کو ایک عرضی بھیجی۔ فیلڈ مارشل صاحب موصوف کی سفارش اور جنرل فخرالدین ترک قان پاشا کی کوشش سے آخر کار وہاں سے بھی حکم آگیا کہ مجھے فوجی دستہ کی کمان کے فرائض سے سبکدوش کر کے افغانستان جانے کے لئے پاسپورٹ دیدیا جائے اور مجھے افغانستان میں خدمت کے زمانے میں ترکی فوج سے چھٹی پر مانا جائے۔

یہ حکم مجھے اگست ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتہ میں ملا اور میں اپنی خانم کے ساتھ یکم ستمبر ۱۹۳۳ء کو قونیہ سے روانہ ہو کر انقرہ آیا۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی انقرہ نہ دیکھا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ افغانستان جانے سے پہلے ایک دفعہ اپنے مرکز حکومت کو دیکھیں تاکہ افغانستان میں انقرہ کے حالات پوچھنے والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں۔ ہم انقرہ میں پانچ دن رہے۔ اس عرصہ میں ہم نے بند انقرہ (انقرہ باراژی) کی جو شہر کو پانی مہیا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور غازی فارم کی جس کو غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک (مرحوم) نے انقرہ سے باہر کے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر نئے درخت لگوا کر بڑی محنت سے بنوایا تھا، سیر کی۔

انقرہ کے قیام کے دوران میں میں ممدوح شوکت بک سفیر ترکی سے ملا جو ہندوستان کے راستہ کابل جانے والے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میری فوجی کتابیں اور میرے کیڈٹ کالج اور آرٹلری کالج کے سبقوں کے نوٹ اپنے ساتھ کابل لے جائیں۔ کیونکہ میں ان کتابوں اور کاغذات کو روس کے راستہ نہ لے جا سکتا تھا، اور نہ ہی ان کو خانم کے ہاتھ بھیج سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں انگریزی حکومت ان کتابوں کو خانم سے لے کر ضبط نہ کر لے۔ سفیر صاحب نے میری یہ درخواست منظور کر لی۔ انہوں نے ان ساری کتابوں کو اپنے سامان کے ساتھ اپنے ڈپلومیٹک حقوق سے فائدہ اٹھا کر پوری حفاظت سے میرے لئے کابل پہنچا دیا۔ اس کے بعد ہم افغانستان روانہ ہونے کے لئے انقرہ سے استنبول آئے۔

اکیسواں باب

افغانستان کو ہماری روانگی

استانبول آکر ہم نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ اس میں ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں خانم کو ہندوستان سے گزار کر افغانستان نہ لے جا سکتا تھا کیونکہ مجھے انگریزوں کے ہاتھ پڑنے اور موت کی سزا دیئے جانے یا کم از کم قید میں ڈالے جانے کا خطرہ تھا۔ خانم روس کے راستہ بحیرہ خزر اور ترکستان سے گزر کر ہرات نہ پہنچ سکتی تھی کیونکہ اس زمانے میں روس کے اس علاقہ کے حالات ایسے ناگفتہ بہ تھے کہ ایک شریف عورت کا وہاں جانا اور کھانے کی کمی اور ہوٹل کی عدم موجودگی کو برداشت کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں افغانی سفیر سلطان احمد خان سے جو گرمیاں گزارنے کے لئے انقرہ سے استنبول آیا ہوا تھا اور ببک کے محلے میں سمندر کے کنارے ایک کرایہ کے گھر میں رہتا تھا، ملا اور اس سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ افغانستان نے ترکی سے ایک لیڈی ڈاکٹر اور فوجی بینڈ کے لئے ایک بینڈ ماسٹر مانگا ہے اور میں نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زاہدہ خانم کو چنا ہے جو اپنے خاوند رمزی بک کے ساتھ کابل جائے گی۔ بینڈ ماسٹر کے طور پر رجب بک نام ایک معلم موسیقی انتخاب ہوا ہے۔ وہ بھی اپنے ساتھ اپنی بیوی کو لے جائے گا۔ آپ کی خانم ان کے ساتھ کابل جا سکتی ہے۔

میں ڈاکٹر زاہدہ خانم اور رجب بک سے ملا اور خانم کو ان کے ساتھ کابل بھیجنے کے بارے میں گفتگو کی۔ افغانی سفیر سلطان احمد خان میرا کابل سے پرانے زمانے سے واقف تھا، اور مجھے اپنا استاد مانا کرتا تھا۔ کیونکہ جب میں کابل میں تھا تو اس نے اور فیض محمد خان وزیر خارجہ افغان نے مجھ سے انگریزی پڑھی تھی۔ سفیر کے مجھے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے کی وجہ سے زاہدہ خانم اور رجب بک پر بہت اچھا اثر پڑا۔ انہوں نے میری خانم کے ساتھ سفر کرنے میں اپنے لئے فائدہ دیکھا۔

سفیر نے ایک روز مجھے اور خانم کو اپنے گھر کھانے پر بلایا اور بتایا کہ نور الحق نام ایک سرحدی نوجوان جو ہجرت کے سلسلہ میں ہندوستان سے افغانستان آیا تھا اور پھر وہاں سے ترکی آکر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے لگا تھا، اپنی تعلیم ختم کر کے افغانستان جا رہا ہے۔ وہ کچھ انگریزی اردو بھی جانتا ہے۔ وہ راستے میں خانم کو ترجمان کا کام دے سکتا ہے۔ نیز دو افغانی لڑکے جو استانبول میں زیر تعلیم تھے مگر بیماری کی وجہ سے اپنی تعلیم کو ادھوری چھوڑ کر افغانستان لوٹنے پر مجبور ہیں، خانم کے قافلے میں شریک ہو کر کابل جائیں گے۔

ایک روز سفیر کو ہم نے ڈاکٹر مظفر شوقی یبزبک (مرحوم) کے گھر پر چائے کے لئے بلایا اور وہاں اس سے اس سفر کے بارے میں مفصل باتیں کیں۔ گفتگو کے دوران میں اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میری خانم سنگر سینے کی مشین سے بہت اچھا نقش کاری کا کام جانتی ہے تو اس نے اصرار سے درخواست کی کہ خانم اپنی اس مشین کو بھی ساتھ لے جائے اور کابل میں اس کی بیٹیوں کو جن کے لئے اس نے ایک ایسی مشین خریدی ہے، سوزن کاری اور نقش بنانے کا کام سکھلائے۔ خانم نے اس کی بات مان لی اور اپنی مشین کو جو پاؤں سے چلائی جانے کی وجہ سے بہت بھاری بھر کم تھی، اپنے ساتھ کابل لے جانا منظور کر لیا۔

بارہ تیرہ سال پہلے جب میں کابل میں تھا تو وہاں چینی کا ڈنر سٹ اور چھری کانٹے جیسی چیزیں بالکل نہ ملتی تھیں۔ اس لئے میں نے خانم کو مشورہ دیا کہ وہ بارہ آدمیوں کا ڈنر سٹ اپنے ساتھ استانبول سے لے جائے تاکہ وہاں ہمیں لوگوں کو دعوت وغیرہ دینے میں مشکل پیش نہ آئے۔ اس سارے سامان کو سمندر اور خشکی کے راستہ ترکی سے افغانستان تک پہنچانے کے لئے اس کو بہت احتیاط سے پیک کرنے کی ضرورت تھی۔ ورنہ چینی اور شیشے کے برتنوں کا جہاز سے ریل پر اور ریل سے موٹر پر رکھنے میں بالکل ٹوٹ پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ خانم نے اس سارے سامان کو اتنی احتیاط اور سلیقے سے صندوقوں میں لگایا تھا کہ باوجود اتنے لمبے اور مشکل سفر کے یہ سب چیزیں بالکل صحیح و سالم کابل پہنچ گئیں۔ خانم نے میرے مشورے پر اتنی تکلیف اٹھائی۔ حالانکہ کابل پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ وہاں کے حالات اتنے بدل گئے تھے کہ اس قسم کا سامان کابل کے بازاروں میں بہت فراواں تھا اور بہت سستے داموں پر مل سکتا تھا۔

میں نے ایک جہازران کمپنی سے بات چیت کر کے رومانیہ کے جہاز Transilvania پر خانم کے قافلے کے لئے ٹورسٹ کلاس کے ٹکٹ لئے۔ یہ جہاز

استانبول سے اسکندریہ جا رہا تھا۔ مسافروں کو وہاں سے خشکی پر اترنا اور ریل سے پورٹ سعید جانا پڑے گا۔ جہاں ان کو بمبئی جانیوالا California جہاز ملے گا۔ میں نے خانم کے لئے بھی ٹورسٹ کلاس ہی کا ٹکٹ لیا۔ کیونکہ اگر خانم اپنے قافلے کے دوسرے ساتھیوں کی نسبت زیادہ آرام دہ کیبن میں سفر کرتی، تو ان کے حسد کا باعث ہوتی۔ اس کے ساتھیوں کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ اچھی کلاس کا ٹکٹ لے سکیں۔ ڈاکٹر زاہدہ خانم کو جو سفر خرچ ملا تھا، وہ اس سے اپنے خاوند کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور تھی، اور رجب بک کو جو سفر خرچ ملا تھا وہ اس سے اپنی بیوی کا بھی ٹکٹ لینے پر مجبور تھا۔ حالانکہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) نے میری خانم کے لئے مجھ سے علیحدہ سفر خرچ بھیجا تھا۔ میں نے بھی اپنے لئے ایک اطالوی جہاز کا جو استانبول سے بحیرہ اسود کی روسی بندر گاہ باطوم کو جانے والا تھا، ٹکٹ لیا۔ ان تیاریوں میں ہمیں کوئی چالیس دن لگے۔ اس عرصہ میں میں نے خانم کو کچھ فارسی پڑھائی اور اردو کے کچھ الفاظ جو اس کو ہندوستان میں سے گزرتے ہوئے کام آسکتے تھے، سکھلائے، نیز اس کو ہندوستانی سکوں (روپیہ، اٹھنی، چونی، آنہ، پیسہ وغیرہ) کی قیمتیں ترکی لیرے کے لحاظ سے یاد کرائیں۔

استانبول سے ایک خط میں نے خوشی محمد کو ماسکو کے پتہ پر لکھا اور اس کو کہا کہ وہ ماسکو سے قفقاس آکر مجھے شہر طفلس میں ملے جہاں میں اس سے ملنے کے لئے ایک روز ٹھہروں گا۔ اگرچہ مجھے خوشی محمد کے سیاسی خیالات سے اتفاق رائے نہ تھا کیونکہ وہ روسیوں اور کمیونسٹوں کا دلدادہ تھا لیکن اس کی پرانی دوستی اور ہم جماعتی کی یاد مجھے ہمیشہ تڑپایا کرتی تھی اور میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش پیدا ہوا کرتی تھی کہ اس سے پھر ایک دفعہ ملوں۔

استانبول سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے فرسٹ لفٹیننٹ حسن بک کے بیٹے علی جاہد کے لئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کو محی الدین پاشا کی وفات کے بعد میں نے تعلیم کے لئے وظیفہ دینا شروع کر دیا تھا اور جو اب ترکی کیڈٹ کالج میں پڑھ رہا تھا، دو سال کا خرچ بنک میں داخل کرا دیا اور ہدایت کر دی کہ اس روپے میں سے اس کو ہر ماہ باقاعدہ اس کا وظیفہ دیدیا جایا کرے۔ اس کتاب کے حصہ اول میں لکھا جا چکا ہے کہ میرے بھائی صاحب (مرحوم) کی کالج کی تعلیم کا انتظام کرتے ہوئے وکیل عبدالغنی صاحب (مرحوم) نے یہ شرط لگائی تھی کہ بھائی صاحب (مرحوم) نوکر ہو کر اپنی اولاد کے علاوہ ایک آرائیں لڑکے کی تعلیم کا خرچ اپنے ذمہ لیں۔ بھائی صاحب مرحوم نے زندگی بھر اسی اصول پر عمل کیا تھا۔ ان کا یہ اصول میرے لئے

بھی دستور حیات بن گیا تھا اور میں بھی اپنی کمائی میں سے ایک یا دو نادار اور ہونہار بچوں کی تعلیم کے لئے ہمیشہ وظیفہ دیتا رہا ہوں۔ حسن بک کے اس کی ترکی بیوی سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس وجہ سے وہ علی جاہد کی تعلیم کا خرچ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ علی جاہد نے میرے افغانستان جانے کے بعد اپنی فوجی تعلیم کو تن دہی سے پورا کر کے ۱۹۳۵ء میں فوجی کمیشن لے لیا۔

میری روس کو روانگی

میں استانبول سے ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جہاز پر باطوم کو روانہ ہوا۔ خدا حافظی کے لئے گودی پر خانم کے علاوہ جنرل فخرالدین ترک قان پاشا (مرحوم) ان کے دو افسر بیٹے، سفیر افغانستان سلطان احمد خان اور لفٹیننٹ کرنل یمنی بک جو ہمارے خاندانی دوست تھے، آئے۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر پروفیسر مظفر شوقی منیر بک بروقت نہ پہنچ سکے اور جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ میں روس جانا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے نہ اس ملک کی حکومت پسند تھی اور نہ ہی وہاں کا سیاسی ماحول اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت افغانستان کو جانے کے لئے مجھے اور کوئی راستہ نہیں ملا۔ کیونکہ ہر طرف انگریزوں کا اثر پھیلا ہوا تھا۔

میں ۱۴/اکتوبر کو باطوم پہنچا اور سیدھا قونصل خانے گیا۔ اس زمانے میں باطوم میں ترکی قونصل جنرل رشدی بک (مرحوم) تھے۔ میں نے ان کو اپنا حال بتایا۔ انہوں نے مجھے ترکی کی روائتی مہمان نوازی دکھائی اور مجھے اپنا مہمان بنایا۔ ان کی خانم اور ایک چھوٹی بیٹی ان کے ساتھ تھی۔ اس لئے ان کو باوجودیکہ روسی لوگ ان سے ملنے سے جھجکتے تھے، وہاں زیادہ تنہائی محسوس نہ ہوتی تھی۔

باطوم زار روس کے زمانے میں بہت بڑا شہر تھا۔ سمندر کے کنارے پر اس کے سرسبز باغات جن میں کیلے اور کھجور کے درخت بھی موجود تھے، بہت ہی دل افروز تھے۔ اس زمانے میں بھی ان باغات کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔ لیکن شہر میں دوکانوں میں کوئی سامان موجود نہیں تھا اور لوگ نہایت ہی غریب تھے۔ باکو کا پٹرول نل کے ذریعہ اس بندرگاہ کو لایا جاتا ہے اور یہاں سے ٹینکروں پر لادا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی گودی میں اکثر کوئی نہ کوئی غیر ملکی جہاز پٹرول لادنے کے لئے موجود رہتا ہے۔

باطوم سے رشدی بک نے ۱۵/اکتوبر کو مجھے روسی انٹورسٹ ادارے کے ذریعے طفلس روانہ کر دیا۔ روس میں غیر ملکی لوگ سفر کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ انٹورسٹ ادارے کے ذریعے ریل، سمندری جہاز یا ہوائی جہاز کا ٹکٹ لیں اور ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرائیں۔ یہ ادارہ ایک سرکاری محکمہ ہے اور وہاں کام کرنے والے کلرک، ترجمان، رہبر وغیرہ سب گورنمنٹ کے ملازم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس ملک میں ہوٹل ریسٹورنٹ، ریل، جہاز رانی کی کمپنیاں وغیرہ سب ادارے حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ انٹورسٹ ادارے کے ملازم نے میرے سارے سامان کو افغانی سرحد تک بھیجنے کا ذمہ لیا۔ اس لئے میرے پاس ان کپڑوں کے سوا جو میرے بدن پر تھے اور کوئی لباس نہ رہا۔ دنیا کے اور کسی ملک میں اس قسم کا رواج نہیں ہے کہ ایک مسافر کا سارا سامان اس سے لے کر حکومت کا محکمہ ریل یا کوئی اور ادارہ اس کو سرحد کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس میں یہ قاعدہ اس لئے جاری کیا گیا ہے کہ غیر ملکی لوگ روسیوں کو اپنے سامان میں سے کوئی چیز فروخت نہ کر سکیں۔ اس زمانے میں روس میں روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی سخت قلت تھی اور وہاں کے لوگ ایسی چیزوں کے خریدنے کے لئے بہت زیادہ روپیہ دینے پر تیار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں پر ان چیزوں کو دیکھنے سے بہت برا اثر ہوتا تھا۔ کیونکہ روسی گورنمنٹ نے ان کو ہمیشہ یہی بتایا تھا کہ روس کے لوگ دنیا کے سارے دوسرے ملکوں کے لوگوں سے بہت زیادہ آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہر قسم کے سامان زندگی کے مالک ہیں جبکہ دوسرے ملکوں میں ہر چیز کی قلت ہے۔

اگلے روز طفلس پہنچ کر میں ایک ہوٹل میں خوشی محمد کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن میرے وہاں دو روز رہنے کے باوجود بھی مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کو میرا خط نہیں ملا، یا وہ خط ملنے کے باوجود بھی طفلس نہیں آ سکا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کو میرا خط نہ ملا ہو۔ کیونکہ روس میں باہر سے آنے والے خط سنسر کئے جاتے ہیں اور شاید سنسر نے میرا خط روک لیا تھا۔ اگر میرا خط اس کو ملا اور اس کے باوجود وہ طفلس نہ آ سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت روس میں ایک شہر

سے دوسرے شہر کو جانے کے لئے بھی لوگوں کو حکومت سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یعنی وہاں ایک داخلی پاسپورٹ لینے کے بعد سفر کی اجازت ملتی تھی۔ میں خوشی محمد کے انتظار میں دو روز ہوٹل میں بیٹھا رہا اور شہر کی سیر کو بھی نہ گیا۔ آخر کار ۱۸/اکتوبر کو وہاں سے روانہ ہو کر باکو آیا۔

باکو بحیرہ خزر کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ یہاں پٹرول نکلتا ہے۔ شہر کے باہر بہت سے کنوئیں ہیں جن پر بڑے بڑے پمپ لگے ہوئے ہیں جو دور سے برجوں کے مانند نظر آتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی غربت میں پڑے ہوئے تھے۔ خاص کر مسلمان محلّہ کے لوگ بہت غریب نظر آتے تھے۔ ان کے گھر بھی پرانے طرز کے اور معمولی سے تھے۔ پٹرول کے کنوؤں میں کام کرنے والے مزدوروں کی رہائش کے لئے بڑے بڑے گھر حکومت کی طرف سے بنوائے گئے تھے جہاں وہ لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن یہ گھر اتنے کم تھے کہ ایک کمرے میں سارے کا سارا ایک خاندان رہنے پر مجبور تھا۔ یہ گھر سرکاری ہونے کی وجہ سے مزدور ان کو اچھی حالت میں نہ رکھتے تھے۔ اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے جن کی مرمت صرف حکومت کی طرف سے کی جا سکتی تھی۔

باکو میں میں ایک ہوٹل میں اُترا اور وہاں سے ترکی قونصل کو ملنے گیا۔ قونصل فواد نبیل بک نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ وہ اکثر مجھے اپنے ہاں کھانے پر بلایا کرتا تھا۔ روس میں لوگوں کا غیر ملکیوں سے ملنا جلنا روسی حکومت کی طرف سے بہت شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے فواد نبیل بک باکو میں تنہائی سے بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ میرا باکو آنا اس کے لئے بڑا غنیمت ثابت ہوا تھا۔

میں نے باکو میں رہتے ہوئے فواد نبیل بک کو بتایا کہ میری خانم ۱۶/اکتوبر کو استانبول سے چل کر ۲۱/اکتوبر کو Transilvania جہاز پر اسکندریہ اور وہاں سے ریل کے ذریعہ پورٹ سعید پہنچے گی جہاں سے وہ بمبئی جانے والے California جہاز پر سوار ہوگی۔ اس کے پاس سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کو جہاز سے اُتر کر ریل پر سوار ہونے اور پھر وہاں سے دوسرے جہاز پر پہنچنے میں مشکلات پیش آنے اور جہاز پر بروقت نہ چڑھنے کا خطرہ ہونے سے مجھے اس کے بارے میں بہت اندیشہ لگا ہوا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ لاسلکی کے ذریعہ مصر سے

معلوم کرے کہ خانم بخیریت California جہاز پر سوار ہو گئی ہے یا نہیں۔ اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ لاسلکی کا پیغام بھیج کر ضرور اس بارے میں معلومات حاصل کر لے گا۔ دو دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ "جہاز California سے اس کے لاسلکی پیغام کا جواب آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خانم کا قافلہ بہ خیر جہاز پر سوار ہو گیا ہے" جب میں کابل پہنچ کر خانم کو ملا تو اسنے مجھے کہا "جہاز والوں نے مجھے آپ کے لاسلکی پیغام کے بارے میں اطلاع دی تھی اور مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اتنی دور سے میری خیریت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

باکو سے میں نے جہاز پر بحیرہ خزر سے گزرنے کے لئے انٹورسٹ ادارے کے ذریعہ جہاز کا ٹکٹ لینا چاہا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنا پاسپورٹ ان کو دکھلاؤں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ طفلس سے باکو کو چلتے ہوئے میں اپنا پاسپورٹ طفلس کے ہوٹل کے دفتر سے لینا بھول گیا ہوں۔ پاسپورٹ ہوٹل والوں نے پولیس کو بھیج دیا تھا اور وہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے مجھے جہاز کا ٹکٹ نہ مل سکا۔ فواد نبیل بک نے فوراً طفلس کو تار دے کر میرا پاسپورٹ منگایا۔ مگر اس کے لئے مجھے باکو میں دو دن اور ٹھہرنا پڑا۔ میرا پاسپورٹ ۲۴/اکتوبر کو مجھے ملا اور میں اگلے روز جہاز پر سوار ہو کر (کراسنو وڈسک) کی بندر گاہ کو روانہ ہو گیا۔

روانگی سے پہلے میں نے قونصل خانہ کے ذریعے روسی ریل کے دفتر سے معلوم کرایا کہ آیا میرا سامان باطوم سے باکو پہنچ گیا ہے یا نہیں۔ مجھے روسیوں نے یقین دلایا کہ سامان باکو آگیا ہے اور جہاز پر میرے ساتھ (کراسنووڈسک) اور وہاں سے ریل کے ذریعہ (کُشک) بھیج دیا جائے گا۔

ہمارا جہاز ۲۷/اکتوبر کو (کراسنووڈسک) کی بندر گاہ میں پہنچا۔ یہ شہر اتنا سنسان پڑا ہوا تھا کہ اس میں انٹورسٹ کا ادارہ مجھے کسی ہوٹل میں نہ ٹھہرا سکا۔ دراصل شہر میں ہوٹل کے نام سے کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ انٹورسٹ ادارے کے آدمی نے مجھے گودی کے نزدیک ایک بھیانک سی عمارت میں سونے کو کہا۔ اس میں لیٹنے کے لئے نہ چارپائی تھی اور نہ بستر تھا۔ میں یہاں رات کو ریل کی روانگی کے دن تک ایک بینچ پر لیٹا۔ کھانا بھی بہت خراب تھا۔ ریسٹورانٹ میں گوبھی کا شوربا اور بحیرہ خزر سے پکڑے ہوئے Crabe بکتے تھے۔ میں نے یہ جانور اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے پنجے اور اس کی عجیب وغریب شکل مجھے اتنی بری معلوم ہوئی کہ میں اس کو

نہ کھا سکا۔ یہاں دو دن مجھے سخت گراں معلوم ہوئے۔ میں یہاں بالکل اکیلا تھا۔ جہاں نہ سونے کا سامان تھا اور نہ ہی پیٹ بھر کر کھانا کھانے کا کوئی انتظام۔ ایک طرف میں اس کس مپرسی کی حالت میں تھا اور دوسری طرف مجھے اپنی خانم کا خیال آتا تھا کہ وہ بے چاری بھاری بھر کم سامان کے ساتھ ایسے ساتھیوں کے ہمراہ جن سے استانبول سے چلنے سے صرف چند روز پہلے اس کا تعارف ہوا تھا کیسے سفر کرے گی؟

یہاں بھی میں نے انٹورسٹ والوں سے معلوم کیا کہ میرا سامان جہاز پر باکو سے کراسنو وڈسک آگیا ہے یا نہیں۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ میرا سامان میرے ساتھ افغانی سرحد تک بھیج دیا جائے گا۔ حالانکہ جیسا کہ مجھے آگے چل کر بڑی تلخی سے معلوم ہوا. انٹورسٹ والوں نے جھوٹ بول کر مجھے دھوکا دیا تھا اور میرا سامان کراسنو وڈسک نہ آیا تھا۔

میں ۲۸/اکتوبر کی شام کو کراسنو وڈسک سے ریل پر چڑھا اور عشق آباد کے راستے ۳۰/اکتوبر کو کشک پہنچا۔ یہاں بھی کوئی ہوٹل نہ تھا۔ اس پر مجھے افغانی قونصل نے قونصل خانہ میں مہمان رکھا کیونکہ میں ترکی رعایا تھا اور افغانی حکومت کا ملازم ہو کر بطور فوجی معلم کے کابل جا رہا تھا۔ اس زمانے میں جیسا کہ کتاب کے دوسرے حصہ میں میرے حج کے سفر کی ذیل میں لکھا جا چکا ہے. افغانی حکومت اور ترکی حکومت میں یہ سمجھوتہ تھا کہ ایسی جگھوں پر جہاں ترکی قونصل نہ ہو ترکی رعایا کے امور کا انتظام افغانی قونصل کرے گا اور جہاں افغانی قونصل نہ ہو وہاں ترکی قونصل افغانی رعایا کو ان کے کاموں میں مدد دے گا۔

کشک میں مجھے اپنے سامان کا پانچ دن انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں میں ہر روز ریلوے سٹیشن پر جا کر پوچھا کرتا تھا کہ میرا سامان آیا ہے یا نہیں؟ میں نے دیکھا کہ میرے ویزے کی مدت ختم ہو رہی ہے اور اگر میں مقررہ تاریخ تک روس کے علاقے سے نہ نکلا تو پھر مجھے وہاں سے نکلنے کی اجازت بھی نہ ملے گی۔ اس لئے میں نے اپنا سارا سامان روس میں چھوڑ کر افغانستان جانے کا فیصلہ کیا اور حسین راغب بک مرحوم. سفیر ترکی مقیم ماسکو جو میرے خسر برہ دوفتور پروفیسر مظفر شوقی بیزبک (مرحوم) کے دوست تھے ایک خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ اپنی سفارت کے ذریعے میرے سامان کا روسی حکومت سے پتہ لگائیں۔ اس کے بعد میں ۴ نومبر کو کشک سے روانہ ہو کر افغانی سرحد پر آیا اور وہاں سے ہرات پہنچا۔

کابل کو میری روانگی

ہرات میں اس وقت میجر جنرل قاسم خان کمانڈر تھا۔ میں اس کو استانبول سے جانتا تھا جہاں اس نے ترکی سٹاف کالج میں تعلیم پائی تھی۔ وہ دوسرے افغانی افسروں کے ساتھ جو استانبول میں زیر تعلیم تھے. امیر امان اللہ خان کے بر خلاف بچہ سقا کی بغاوت کے زمانے میں اپنی فوجی تعلیم کو ادھوری چھوڑ کر افغانستان واپس آگیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر میں مہمان رکھا۔ میں اس سے اجازت لے کر روسی قونصل خانہ گیا۔ اپنے سامان کے بارے میں مَیں نے قونصل سے کہا کہ تار دے کر معلوم کرے کہ میرا سامان کب تک مجھے مل سکتا ہے۔ قونصل نے وعدہ کیا کہ تار کے ذریعے اس کا پتہ لگائے گا۔ میں دو دن اور قونصل خانہ گیا لیکن وہاں روس سے کوئی جواب نہیں آیا۔ روسی قونصل خانہ میں میرے آنے جانے سے افغانی پولیس مجھے شبہ کی نظر سے دیکھنے لگی۔ لیکن چونکہ میں قاسم خان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کو میرے قونصل خانے میں جانے کا سبب معلوم تھا. مجھے پولیس نے کوئی تکلیف نہ دی۔

ہرات سے قاسم خان نے میرے پہنچنے کی خبر اعلےٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کو دی۔ ان کو اس پر بہت خوشی ہوئی۔ بعد میں جب میں کابل پہنچا تو مجھے میری خانم نے بتایا کہ اس کو اللہ نواز خان سے جو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کے زمانے میں افغانستان میں وزیر امور عامہ (Minster of Public Works) مقرر ہو گئے تھے معلوم ہوا تھا. کہ اعلیٰ حضرت (مرحوم) نے میرے جلد کابل پہنچنے کے لئے ہرات کو ایک افغانی ہوائی جہاز بھیجنا چاہا تھا لیکن اس وقت کے افغانی ہوائی جہاز پر میرے بخیر کابل پہنچنے کا ان کو پورا یقین نہ ہونے کی وجہ سے اس سے در گزر کر گئے تھے۔

ہرات میں چار روز رہنے کے باوجود بھی جب مجھے اپنے سامان کے بارے میں روسی قونصل خانہ سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو میں ایک لاری پر ۸ نومبر کو کابل روانہ ہو گیا اور سبزوار کے راستے ۹/نومبر کو فراہ پہنچا۔ یہاں شام کو رباط (سرائے) میں مجھے یہ خبر ملی کہ محمد نادر شاہ کو کسی نے گولی مار دی۔ مجھے پہلے تو اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن جب لوگوں نے کہا کہ اگلے روز حاکم (کمشنر) فراہ کے ہاں فاتحہ خوانی ہے تو مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ میں افغانستان کے حالات سے وہاں ۲۲۔۱۹۱۵ء میں سات سال رہ کر واقف ہو چکا تھا۔

بادشاہ کا اس طرح مارا جانا ایک بد امنی اور خانہ جنگی کا اشارہ ہو سکتا تھا جیسا کہ امیر حبیب اللہ خان (مرحوم) کے قتل پر ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کو تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی چار سال ہی ہوئے تھے۔ انہوں نے بچہ سقا کو شکست دے کر ملک میں بہت مشکل سے امن وامان قائم کیا تھا۔ مجھے ڈر لگا کہ اب ان کی شہادت کی وجہ سے ملک میں پھر لٹیروں اور ڈاکوؤں کا دور دورہ ہو جائے گا اور مجھے شاید کابل پہنچنا بھی نصیب نہ ہو گا۔ ایک طرف میری اپنی جان کے لالے پڑے اور دوسری طرف مجھے اپنی خانم کی خیریت کی فکر لگی ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے اس کے بارے میں ابھی تک کوئی خبر نہ ملی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔ وہ آیا ہندوستان میں ہے یا افغانستان میں داخل ہو چکی ہے۔ مجھے میری ضمیر ملامت کرنے لگی کہ میں اس کو اس کے ملک اور عزیزوں سے جدا کر کے ایک پرائے ملک میں جس کی وہ زبان بھی نہیں جانتی تھی۔ لایا اور وہاں اس کو بے کسی کی حالت میں ڈالدیا۔

رات کو میں نے رباط (سرائے) میں دوسرے مسافروں سے چھپ کر ان پونڈوں کے نوٹوں کو جو میرے پاس باقی تھے اپنے جانگئے کے نیفے میں سیا۔ مجھے اس سے یہ امید تھی کہ اگر کابل جاتے ہوئے ہماری لاری پر ڈاکوؤں نے چھاپہ مارا اور ہمارا سامان چھینا تو شاید وہ میرے بدن پر جانگیا چھوڑ دیں گے اور اس طرح میں اپنا روپیہ بچا سکوں گا۔ یہ ایک خیال خام تھا کیونکہ اگر ڈاکو میرا جانگیا نہ بھی اتروائیں تو میری تلاشی تو ضرور لیں گے اور یہ روپیہ مجھ سے چھین لیں گے۔

اگلے روز صبح کو نو بجے میں کمشنر فراہ کے دربار میں گیا۔ وہاں دیکھا کہ لوگوں کا جم غفیر لگا ہوا ہے اور فاتحہ پڑھی جا رہی ہے۔ میں کمشنر صاحب سے ملا، اور جناب محمد نادر شاہ مرحوم کی مبارک روح کے لئے فاتحہ پڑھی۔ مجھے ان کی موت کا اتنا سخت رنج تھا کہ میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ مجھے ان سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ میں صرف ان کے بلاوے پر افغانستان آیا تھا۔ مجھے ان سے پھر مل کر جنگ آزادی افغانستان کے دنوں کی یاد کو تازہ کرنے کی امید تھی۔ انہوں نے حج کے موقع پر مجھے مالی مدد دے کر قبلہ والدہ صاحبہ مرحومہ کا دیدار کرانے میں جو میری مدد کی تھی، اس کو میں نہ بھولا تھا۔ مجھے ان سے ملنے کی اتنی تمنا تھی جتنی کہ ایک عزیز ترین رشتہ دار سے ملنے کے لئے میرے دل میں ہو سکتی تھی۔ بعد میں

کابل پہنچنے پر ڈاکٹر عبدالغنی شاہ نے جو کابل کے سول ہسپتال کے ہیڈ فزیشن تھے. مجھے بتایا کہ:

"ایک روز اعلیٰ حضرت نادر شاہ (مرحوم) نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "اگر ظفر مجھے اپنا بھائی سمجھے تو میرے لئے باعث فخر ہو گا۔" ہمیں یہ سن کر بہت تعجب ہوا تھا کہ آپ نے ان کے دل میں کیسے ایسی جگہ پیدا کر لی تھی"۔

افسوس ہے کہ میری قسمت میں پھر ان کے حضور میں باریاب ہونا نہ لکھا تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

میں فاتحہ خوانی کے بعد کمشنر صاحب سے رخصت لے کر لاری پر (گرشک) کے راستہ قندھار روانہ ہوا۔ دریائے ہلمند پر پل نہ تھا۔ اس لئے بہ مشکل ہم ایک ناؤ پر جو لکڑی کے لٹھوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر بنائی گئی تھی، گزرے۔ راستہ بالکل خراب تھا۔ پکی سڑک تو بالکل موجود ہی نہ تھی، لیکن راستے میں امن وامان تھا۔ لوگوں کو اپنے محبوب القلوب بادشاہ کی ناگہانی موت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ سب غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ محمد نادر شاہ (مرحوم) نے بچہ سقا کو شکست دے کر چند ہی سال میں ملک میں ایسا امن وامان قائم کر دیا تھا کہ لوگ ان کے دلدادہ ہو گئے تھے۔

میں ۱۳/ نومبر کو قندھار پہنچا۔ یہاں میجر جنرل عبدالاحد خان کمانڈر تھا۔ وہ بھی قاسم خان کی طرح استانبول میں سٹاف کالج میں تعلیم پا چکا تھا۔ اس کو بھی میں استانبول سے جانتا تھا۔ اس نے بحیثیت ترکی افسر کے اپنا مہمان بنایا اور ٹیلی فون سے میرے قندھار پہنچنے کی خبر اللہ نواز خان کو دی۔ میں قندھار سے ۱۶/ نومبر کو روانہ ہوا اور ۱۷/ نومبر کو غزنی آیا۔ میں نے یہاں سے ٹیلی فون پر خانم سے باتیں کیں۔ اس طرح ہم کو ایک دوسرے کی خیریت کے بارے میں اطمینان ہو گیا۔ میں ۱۸ نومبر کی شام کو کابل پہنچا۔ یہاں ڈاکٹر نور محمد، سید عبداللہ شاہ جی نائب سالار مشین خانہ (کمانڈر آرمز فیکٹری) میرے پرانے ہجرت کے ساتھی محمد حسن یعقوب، مجاہدین کی جماعت کے پرانے ممبر عبدالرزاق نے میرا شہر سے باہر استقبال کیا۔ اللہ نواز خاں مرض گردہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میری پیشوائی کو نہ آ سکے لیکن انہوں نے میرے لئے اپنی موٹر کار بھیج دی۔ خانم بھی شام کو اندھیرے میں شہر سے باہر میرے استقبال کے لئے نہ آ سکی۔ ڈاکٹر نور محمد مجھ سے ماسکو میں جدا ہو کر پیرس چلا گیا تھا۔ وہاں سے اس نے محمد نادر خان (مرحوم) کے ذریعہ جو ان دنوں میں پیرس میں افغانی سفیر تھے، انگریزوں سے ہندوستان واپس جانے کی

اجازت لے لی تھی اور جب محمد نادر شاہ (مرحوم) افغانستان کے بادشاہ بنے تو وہ افغانی حکومت کا ملازم بن کر کابل آ گیا تھا اور سول ہسپتال میں ڈاکٹر عبدالغنی شاہ کے ماتحت سرجن لگا دیا گیا تھا۔ شاہ جی پنجاب سے بھاگ کر افغانستان میں پناہ گزیں ہو گیا تھا اور نادر شاہ مرحوم کے ماتحت بچہ سقا کے بر خلاف لڑا تھا۔ اس لئے اس کو اعزازی طور پر لفٹنٹ جنرل (نائب سالار) بنا دیا گیا تھا اور ہتھیاروں کے کارخانہ (مشین خانہ) کا مدیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ محمد حسن یعقوب میرے ساتھ لاہور سے ہجرت کر کے کابل آیا تھا اور جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اول میں لکھا جا چکا ہے وہ پھر جماعت مجاہدین میں شامل ہو کر پہلے چر کنڈ اور پھر وزیرستان چلا گیا تھا۔ وہاں سے وہ امیر امان اللہ خان (مرحوم) کے زمانے میں کابل آیا تھا اور دربار شاہی کا ترجمان مقرر ہو گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کے زمانے میں بھی اسی عہدے پر رہا اور انگریزی اور ہندوستانی اخبارات کا ان کے لئے ترجمہ کیا کرتا تھا۔

عبدالرزاق جیسا کہ کتاب کے حصہ اول میں لکھا گیا ہے۔ جماعت مجاہدین کے ساتھ کابل آیا تھا اور ہمارے ساتھی رحمت علی زکریا کو قید سے نکال کر کابل سے ترکستان لے گیا تھا۔ وہ امیر امان اللہ خان کے زمانے میں جماعت مجاہدین سے جدا ہو کر کابل آیا تھا اور محکمہ تعلیم میں ٹیچر مقرر ہو کر جلال آباد میں پڑھاتا رہا۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر خان کے زمانے میں کابل میں وزارت تعلیم کے عملے میں کام کرنے لگا تھا۔

میں کابل میں اللہ نواز خان کے گھر جہاں میری خانم کو محمد نادر شاہ (مرحوم) کے حکم سے مہمان رکھا گیا تھا، آیا۔ خانم کو خیریت اور عزت سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور ہم خداوند کریم کا شکر بجالائے کہ اس نے ہمیں پھر خیریت سے ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔

خانم کا سفر

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خانم کے کابل کے سفر کا حال مختصر طور پر لکھوں جس سے معلوم ہو کہ وہ ہندوستان سے کیسے گزری، کابل کس طرح پہنچی اور وہاں اس نے نادر شاہ مرحوم کی ناگہانی موت کی وجہ سے کیسی کٹھن گھڑیاں کاٹیں۔ میں یہ حالات اس کی اپنی ڈائری سے نقل کرتا ہوں جو اس نے استانبول میں میری روس کو روانگی کے بعد باقاعدہ لکھنا شروع کر دی تھی اور جس سے مجھے اس کی اور اپنی ان دنوں کی زندگی کے حالات کا پورا مرقع ملتا ہے۔

خانم میرے استانبول سے روس کو روانہ ہونے کے چار روز بعد یعنی ۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو رومانیہ کے جہاز Transilvania پر اسکندریہ کو روانہ ہوئی۔ اس کو اس کے بھائی پروفیسر ڈاکٹر مظفر شوقی اور لفٹنٹ کرنل یمنی بک نے جہاز پر چڑھا کر اس کو خدا حافظ کہا۔ خانم اس طرح استانبول سے میرے بغیر روانہ ہونے اور اپنے اکلوتے بھائی سے جدا ہونے کی وجہ سے بہت مغموم تھی، جس سے وہ اپنے آنسو نہ روک سکی۔ جہاز میں ٹورسٹ کلاس کی کیبن بھی کچھ آرام دہ نہ تھی۔ لیکن اس کو یونان کی بندرگاہ (Pires) کے بعد کچھ مسافروں کے جہاز سے اتر جانے پر ایک چھوٹی کیبن مل گئی تھی۔

۱۹/ اکتوبر کو اس کا جہاز اسکندریہ پہنچا۔ لیکن کسٹمز کنٹرول میں دیر لگنے کی وجہ سے اس کا قافلہ پورٹ سعید جانے والی ریل پر سوار نہ ہو سکا۔ اس لئے اس کو ایک رات اٹلانٹک ہوٹل میں رہنا پڑا۔ وہاں سے اس کا قافلہ ریل سے (بنجا) سٹیشن پر آیا۔ یہاں ان کو گاڑی بدلنا پڑی۔ قافلہ کا سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے تین منٹ جیسے کم عرصہ میں گاڑی بدلنا ان کے لئے بہت مشکل ہوا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ پورٹ سعید جانے والی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ وہ پورٹ سعید میں ۱۱/ اکتوبر کو California نام جہاز پر سوار ہوئے۔ یہ جہاز ۲۵ ہزار ٹن کا تھا۔ اس میں مسافروں کے لئے ہر قسم کا آرام کا سامان موجود تھا۔ اگلے روز اس کو میرا لاسلکی پیغام جو میں نے باکو سے ترکی قونصل فواد بینل بک کے ذریعہ بھجوایا تھا، ملا۔ اس طرح اس کو میری خیریت کا اور لاسلکی کا جواب آنے پر مجھے اس کی خیریت کا حال معلوم ہوا۔

اس کا جہاز ۳۰/ اکتوبر کی صبح کو بمبئی بخیر پہنچا۔ ۲۹/ اکتوبر ترکی جمہوریت کی بنیاد کی دسویں سالگرہ کا دن تھا، جب سارے ملک میں رات کو اس تقریب پر بہت شادمانی کا اظہار کیا گیا تھا۔ ملک میں ہر طرف بڑی دھوم دھام سے اس دن کو منانے کے لئے پہلے ہی سے تیاریاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ساری ترکی قوم نے اس دن کو عید کی طرح بڑے جوش و خروش سے منایا تھا۔ میری خانم نے اپنی ڈائری میں اس وقت کے اپنے خیالات اور جذبات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"آج جبکہ ہماری ساری قوم اس مبارک روز کی خوشیاں منا رہی ہے اور ہمارا ملک ہمارے نجات دہندہ قومی ہیرو غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کے زیر قیادت امن و امان سے راہ ترقی پر بڑی تیزی سے گامزن ہے، میں اپنے خاوند اور اکلوتے بھائی سے جو اس دنیا میں میرے لئے دو عزیز ترین ہستیاں ہیں جدا، ایک پرائے ملک کی سرزمین پر قدم رکھ رہی ہوں۔ جہاں اس وقت نہ کوئی میرا ہمدرد ہے اور

نہ کوئی مجھے جاننے والا ہے۔ لیکن مجھے ایک طرف تو یہ امید سہارا دے رہی ہے کہ افغانستان کے بادشاہ نے بہ ذات خود میرے خاوند کو افغانستان میں فوجی معلمی کا کام سرانجام دینے کو بلا کر ہمارے لئے ایک روشن مستقبل تیار کیا ہے مگر دوسری طرف مجھے یہ اندیشہ بھی لگا ہوا ہے کہ ہندوستان اور افغانستان کا کٹھن سفر اکیلی کیسے گزاروں گی۔ میرا یہ اندیشہ اس خیال سے ذرا کم ہو جاتا تھا کہ میں اپنے خاوند کے زاد بوم میں ہوں جس کی آزادی کے لئے اس نے اپنے عزیزوں کو خیرباد کہی تھی اور اپنا سارا career چھوڑا تھا اور جس کی سیر اس سے پہلے بہت کم ترکی عورتوں نے کی تھی۔ قصہ مختصر بمبئی (ہندوستان) میں جہاز سے اترتے ہوئے وطن اور عزیزوں کے فراق کے ساتھ ساتھ میرے دل میں نئی نئی امنگیں بھی موجزن تھیں۔"

خانم اور اس کے رفیق راہ دو روز اور ایک رات بمبئی میں ہوٹل میں رہے۔ خانم اکیلی بازاروں کی سیر کو نکل جایا کرتی تھی لیکن ملک کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اس کو راستہ گم ہونے کا ڈر رہتا تھا۔ اس لئے وہ ہوٹل سے نکلتے ہوئے ہوٹل کا ایک کارڈ جس پر ہوٹل کا نام اور پتہ وغیرہ لکھا ہوتا تھا، اپنے ساتھ لے لیا کرتی تھی تاکہ اگر کہیں راستہ بھول جائے تو کسی پولیس مین کو یا کسی راہ گیر کو کارڈ دکھلا کر ہوٹل کا راستہ معلوم کر لے، لیکن اس کو اس قسم کی ضرورت کبھی پیش نہ آئی۔

خانم کو بمبئی کی عمارتیں اور سڑکیں تو پسند آئیں لیکن بعض لوگوں کا ننگے پاؤں پھرنا اور صرف دھوتی باندھنا اس کو برا معلوم ہوا۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ:

"شہر باوجود کھلی اور آسفالٹ سڑکوں کے گند انظر آتا تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں ہوٹل میں برقی پنکھا چلنے کے باوجود گرمی تھی۔ خانم ہندوستانی کھانا نہ کھا سکی کیونکہ اس میں مرچیں اور گرم مصالحہ زیادہ تھا۔ اس لئے وہ یورپین کھانا کھایا کرتی تھی۔ ہوٹل کا ریسٹورینٹ اگرچہ ستھرا معلوم ہوتا تھا لیکن ویٹر اور خدمت گار صفائی کا کچھ خیال نہ رکھتے تھے۔"

بمبئی سے خانم کا قافلہ ۳۱ اکتوبر کی شام کو ریل سے پشاور کو روانہ ہوا۔ ہندوستان میں ریل

گاڑیاں ترکی ریل گاڑیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں ریلوے کے محکمہ کی طرف سے رات کو سونے کو بستر نہیں دیا جاتا۔ ریل کے ڈبے ایک دوسرے سے بالکل جدا اور مستقل ہوتے ہیں۔ اس لئے ریل کے چلنے کے بعد ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں مسافروں کا آنا جانا ممکن نہیں ہوتا۔ ریل میں وہاں کھانے کی گاڑی بھی نہیں ہوتی۔ روٹی صرف سٹیشنوں پر سے لے کر کھانی ہوتی ہے۔ اس لئے پشاور تک اس کا سفر کچھ آرام دہ نہ رہا۔

خانم ۲ نومبر کو رات کے وقت پشاور پہنچی۔ یہاں کا ہوٹل اچھا تھا لیکن مچھروں کی وجہ سے وہ آرام سے نہ سو سکی۔ اگلے روز افغانی وکیل تجارت سے ملی (انگریزوں کے زمانے میں پشاور میں جو افغانی نمائندہ رہتا تھا اس کو وکیل تجارت کہا جاتا تھا اور وہ قونصل کے فرائض ادا کرتا تھا) اتفاق سے اس وقت کا افغانی وکیل تجارت میرا دوست عبدالرسول خان تھا جو میرے ماتحت ۲۲-۱۹۲۱ء میں وزارت جنگ افغانستان میں میرے ترکی آنے سے پہلے کام کر چکا تھا۔ اس نے پشاور سے خانم کا سامان لاری پر مفت کابل بھیجنے اور خانم کے لئے موٹر کرایہ پر لینے میں اس کی بہت مدد کی۔

خانم ۵/ نومبر کو جلال آباد سے گزر کر نملہ کے پڑاؤ پر پہنچی۔ یہ ایک چھوٹی مگر بہت ہی پُرفضا جگہ ہے۔ یہاں کی شاہی کوٹھی جس میں پرانے زمانے میں امیر حبیب اللہ خاں (مرحوم) سردی کے موسم میں کابل سے جلال آباد جاتے ہوئے قیام کیا کرتے تھے، ایک بہت بڑے باغ کے بیچ میں واقع ہے۔ اب یہ کوٹھی ہوٹل کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

خانم کا کابل پہنچنا

خانم اگلے روز کابل پہنچی اور اپنے ساتھ کے سامان کو کسٹمز میں چھوڑ کر ہوٹل کابل میں اُتری۔ اس وقت کابل میں صرف یہی ایک ہوٹل تھا جہاں یورپین کھانا مل سکتا تھا۔ خانم نے نور الحق کو اللہ نواز خاں وزیر امور عامہ کے گھر یہ معلوم کرنے کو بھیجا کہ میں کابل پہنچ گیا ہوں یا نہیں۔ اللہ نواز کو جب خانم کے آنے کی خبر ملی تو انہوں نے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کی خدمت میں عرض کیا۔ اعلیٰ حضرت (مرحوم) نے حکم دیا کہ ظفر کے کابل آنے تک خانم کو اللہ نواز خان اپنے گھر مہمان رکھیں۔ اس کے بعد اللہ نواز خان ہوٹل آ کر خانم سے ملے اور اس کو بتایا کہ میں ابھی تک ہرات ہی میں ہوں اس خبر سے خانم خوش نہ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے اللہ

نواز خان کے گھر میں رہنے پر رضامندی ظاہر کی۔

اس کو اللہ نواز خان نے زنانہ میں ایک کمرے میں مہمان رکھا۔ اللہ نواز خان کی بیوی ان دنوں زچہ تھی۔ اللہ نواز خان نے ترکی سفارت کے ترجمان عباس بک کو بلا کر خانم سے باتیں کیں اور اس کو تسلی دی کہ ظفر جلد ہی کابل پہنچ جائے گا۔ (عباس بک جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں لکھا گیا ہے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزی فوج سے بھاگ کر ترکوں سے مل گیا تھا۔ ترکی حکومت نے اس کو وزارت خارجہ میں ترجمان بنا دیا تھا اور بعد میں کابل کی ترکی سفارت میں مقرر کر دیا تھا)

۶/نومبر کو خانم کا وہ سامان جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی لیکن کسٹمز میں رہ گیا تھا، آیا۔ راستہ کی گرد کی وجہ سے سارے کپڑے صندوق میں بند ہونے کے باوجود بھی بالکل میلے ہو گئے تھے۔ اس کا سارا دن ان کو صاف کرنے اور استری کرانے میں گزرا۔

۷/نومبر کو وہ ترجمان عباس بک کے ساتھ کمال عاطف بک مرحوم کے گھر گئی جو افغانی حکومت کے ترکی قانونی مشیر تھے۔ ان کی بیوی بھی ترکی تھی۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر رفقی بک مرحوم کے گھر گئی جو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کے طبیب خاص تھے اور جنہوں نے کابل میں سب سے پہلی مرتبہ ایک سینی ٹوریم تپ دق کے مریضوں کے لئے بنایا تھا اور میڈیکل کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کی بیوی ارمنی تھی لیکن ترکی رعایا مانی جاتی تھی۔ اس سے ڈاکٹر رفقی بک نے جوانی میں جب کہ وہ ایک ہسپتال میں نرس کے طور پر کام کر رہی تھی، شادی کر لی تھی۔ اس عورت سے میری خانم کی کبھی نہ بنی۔ کیونکہ اس کا خاوند شاہی طبیب ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کو بڑے پایہ کی عورت سمجھتی تھی۔ حالانکہ محمد نادر شاہ (مرحوم) میری وجہ سے میری خانم کو بڑی عزت دے رہے تھے۔

اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شہادت

۸/نومبر ۱۹۳۳ء کو شاہی محل کے باغ میں حبیبیہ کالج کے طالب علموں کو انعام تقسیم کرنے کے لئے شہزادہ محمد ظاہر خان ولی عہد سلطنت نے ایک جلسہ کرایا اور اپنے والد اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ لڑکوں کا شوق بڑھانے کے لئے اور اپنی رعایا کے دلوں میں اپنی ہر دلعزیزی قائم کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے ان کو انعام تقسیم کریں۔ بدقسمتی سے محمد نادر شاہ (مرحوم) کے

برخلاف بعض لوگوں کے دلوں میں دشمنی تھی۔ ان میں سے سب سے زیادہ دشمنی سپہ سالار چرخی جو امیر عبدالرحمٰن (مرحوم) کے زمانے میں افغانی فوجوں کا کمانڈر تھا، کے خاندان کے لوگوں میں تھی۔ اس دشمنی کی ابتدا امیر حبیب اللہ خاں ولد امیر عبدالرحمٰن خاں (مرحوم) کے زمانے میں ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سپہ سالار چرخی کا بڑا بیٹا غلام نبی خان جو ایک فوجی کمانڈر تھا، اپنے باپ کے عہدے کا اپنے کو وارث مانتا تھا۔ حالانکہ امیر حبیب اللہ خان نے محمد نادر خان کو اپنا کمانڈر ان چیف بنا دیا تھا۔ کیونکہ کمانڈر ان چیف کے عہدے میں وراثت کا تو کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہ عہدہ صرف اسی شخص کو ملتا ہے جس کے اندر قابلیت اور ایسی لیاقت ہو۔ امیر امان اللہ خان ولد امیر حبیب اللہ خان (مرحوم) کے زمانے میں غلام نبی خان کو بطور سفیر ماسکو اور چھوٹے بھائی غلام جیلانی خان کو جو فوجی کمانڈر تھا سفیر کے طور پر ترکی بھیجا گیا تھا۔ امیر امان اللہ خان (مرحوم) بچہ سقا کی بغاوت کی وجہ سے ۱۹۲۹ء میں اپنے تاج و تخت سے دست بردار ہو کر افغانستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو محمد نادر خان (مرحوم) نے افغانستان کے مشرقی حصہ میں اور غلام نبی خان نے شمالی حصہ میں بچہ سقا کے برخلاف ہتھیار اٹھائے۔ محمد نادر خان مرحوم کامیاب ہو کر افغانستان کے بادشاہ بنے۔ لیکن غلام نبی خان کو بچہ سقا کے آدمیوں نے شکست دے دی اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ بچہ سقا کو سزائے موت ملنے کے بعد غلام نبی خان اور اس کے بھائی غلام جیلانی خان نے کابل آ کر اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کی بیعت کر لی اور ان کو بادشاہ مان لیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پرانی رقابت اور دشمنی کو نہ بھولے تھے۔ انہوں نے نادر شاہ (مرحوم) کے برخلاف سازشیں شروع کر دیں اور اپنے کو امیر امان اللہ خان (مرحوم) کا طرفدار ظاہر کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا اور ملک میں بغاوت پھیلانا چاہی۔ اس پر ان دونوں بھائیوں کو موت کی سزا ملی۔ غلام نبی خان کا پروردہ ایک لڑکا اس تقسیم انعامات کے جلسہ میں شریک ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلام نبی خان کے خاندان نے انتقام کے لئے اس لڑکے کو خفیہ طور پر تیار کیا تھا کہ وہ ان کا انتقام لے۔ اس نے اس جلسہ میں اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ پر پستول سے فائر کیا جس سے وہ وہیں فوت ہو گئے۔ اللہ نواز خان نے جو اس جلسہ میں موجود تھے، قاتل کو گرفتار کر لیا، لیکن اس واقعہ سے سلطنت کی بنیادیں ہل جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ شہید نے بڑی مشکل سے امن و امان قائم کیا تھا۔

اس حادثہ کی خبر بجلی کی طرح سارے ملک میں دفعتاً پھیل گئی۔ اللہ نواز خان کی

بیوی اور بچوں کو بھی اس کا پتہ لگا۔ اس پر ان کی دس سالہ بچی (عزیزہ) روتی ہوئی میری خانم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو گلے پر چھری کی طرح چلا کر اس کو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کی موت کی خبر بتانے کی کوشش کی۔

خانم بے چاری کو اس سے بہت پریشانی ہوئی اور وہ اللہ نواز خاں کی بیوی کے کمرے میں گئی۔ اس کو بھی روتے دیکھا۔ گھر میں اس وقت کوئی شخص خانم کی زبان جاننے والا موجود نہ تھا۔ نورالحق جو اس کی ترجمانی کیا کرتا تھا اس وقت خانم کے سامان کو جو لاری پر پشاور سے کسٹم میں آیا تھا، نکالنے کے لئے گیا ہوا تھا خانم نے اپنی اس وقت کی بے کسی اور کس مپرسی کی حالت کو اپنی ڈائری میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ہائے بچارے نادر خان! ہم آپ کے بلاوے پر اپنے ملک سے افغانستان آئے تھے۔ آپ کو میرے خاوند سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آپ میرے خاوند کی وجہ سے میری ایسی عزت کیا کرتے تھے کہ ہر روز اللہ نواز خان کے ذریعے میری خاطر پرسی کرایا کرتے تھے۔ خدا جانے اب ظفر پر کیا گزری ہوگی۔ ملک میں اگر افراتفری پھیل گئی تو مجھ پر اور میرے خاوند پر کیا بنے گی۔ اس کو خدائے علیم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ شاید ہم اس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکیں گے۔ میں ابھی تک ترکی سفیر سے بھی نہیں ملی ہوں۔ یہاں تک کہ ترکی سفارت کا راستہ بھی نہیں جانتی ہوں کہ وہاں پناہ لے کر اپنے خیالات کا اپنی زبان سے اظہار کر کے اپنے دلی جذبات کو کسی کو سمجھاؤں۔ اللہ نواز خان کے گھر والے سب گھر چھوڑنے اور کسی پرامن جگہ میں پناہ لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا پاسپورٹ اور جو روپیہ میرے پاس تھا، اس کو لے کر ان کے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اللہ نواز خان کی موٹر پر ترکی سفارت چلی جاؤں۔ میں ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ نورالحق کسٹم سے میرے سامان کے ساتھ آگیا۔ اس نے کہا کہ:

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ سرداروں اور لوگوں نے ولی عہد محمد ظاہر خان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کو اپنا بادشاہ مان لیا ہے اور شہر میں بالکل امن وامان ہے۔"

اس کے تھوڑے عرصہ بعد توپوں سے نئے بادشاہ کی سلامی اتاری گئی اور کوئی دو گھنٹے بعد وزیر اللہ نواز خان اپنے گھر آگئے۔ وہ نہایت ہی مغموم تھے۔ ان کو دیکھ کر میں بھی اپنے آنسو نہ روک سکی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ:

"محمد نادر شاہ (مرحوم) نے اپنی شہادت سے کوئی دس منٹ پہلے آپ کی خاطر پرسی کی تھی اور کہا تھا کہ خانم کو بتایا جائے کہ ظفر ۴/نومبر کو ہرات پہنچ چکا ہے۔" ان کی یہ باتیں سن کر مجھے محمد نادر شاہ کی موت کا اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ میں تو ایک ایسی ہستی کے نابود ہونے سے جو میرے خاوند کی اتنی قدر کرتی تھی اور جس نے اس کی وجہ سے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔"

میرا کابل پہنچنا

میں سفر کے بعد اللہ نواز خان کے گھر آکر ان سے ملا۔ وہ ابھی تک بیماری کی وجہ سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ یہاں میں نے اعلیٰ حضرت شہید کی روح پرفتوح پر فاتحہ پڑھی اور کھانا کھا کر خانم کے ساتھ اپنے سونے کے کمرے میں آیا۔ یہاں ہم نے ایک دوسرے کو اپنی سرگزشت اور سفر کے حالات سنائے۔ بیچاری خانم نے جب ان ڈراؤنی گھڑیوں کا ذکر کیا جو اس نے میری غیر حاضری میں اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کی شہادت پر گزاری تھیں تو میرے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ایک دفعہ خدا کا پھر شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں باہم دوبارہ ملا دیا۔

میری وزیر جنگ افغانستان سے ملاقات

بیماری سے آفاقہ پانے پر اللہ نواز خاں نے مجھے سردار محمود خان وزیر جنگ افغانستان اور پھر ہاشم خان صدر اعظم افغانستان کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کی شہادت کے بعد خاندان شاہی کے سارے ممبر ارگ (قلعہ شاہی) کے محلات میں رہنے لگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ابھی ملک میں امن وامان کے پورے طور پر قائم ہو جانے کے بارے میں

کافی اطمینان حاصل نہ ہوا تھا۔

میں دوسرے ترکوں کی طرح افغانی گورنمنٹ سے اپنی تنخواہ اور مدت خدمت کے بارے میں استانبول سے کوئی کونٹریکٹ کر کے افغانستان نہ آیا تھا۔ مجھے استانبول سے چلنے سے پہلے دوستوں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ مجھے ضرور اس بارے میں افغانی گورنمنٹ سے ایک تحریری سمجھوتہ کر لینا چاہئے تاکہ کابل پہنچ کر مجھے تنخواہ وغیرہ کے بارے میں مشکلات پیش نہ آئیں۔ میں نے ان کا یہ مشورہ نہ مانا تھا۔ کیونکہ مجھے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) نے بذات خود افغانستان بلایا تھا اور میں ان سے اس بارے میں سودا کرنا نہ چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے ممکن مرتبہ ہر طرح پر اعزاز بخشیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے حضور میرے باریاب ہونے سے پہلے وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اب مجھے مجبوراً ان کے بھائی سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ افغانستان سے اس بارے میں گفتگو کرنا پڑی۔ میں نے اس بارے میں اللہ نواز خان سے مدد لی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے لئے دوسرے ترکی افسروں کی طرح تنخواہ مقرر کرائیں۔ چنانچہ انہوں نے افغانی کیڈٹ کالج کے ترکی معلم کیپٹن ملی بک کی طرح میرے لئے بھی ۴۰ پونڈ ماہوار تنخواہ مقرر کرا دی۔ مجھے رہائش کے لئے حکومت کی طرف سے بے کرایہ ایک گھر اور اردلی کے طور پر ایک افغانی سپاہی بھی دیدیا گیا۔

کابل میں اس زمانے میں اچھے گھروں کی بڑی قلت تھی۔ افغانی وزارت تعلیم نے غیر ملکیوں کے لئے ترکی سفارت کے سامنے ایک دو منزلہ بڑا گھر (اپارٹمنٹ ہاوس) بنوایا تھا جس میں دس خاندانوں کی رہائش کے لئے دس حصے (اپارٹمنٹ) تھے۔ اس کے صحن میں ٹینس کورٹ تھا اور موٹروں کے لئے گاراج بھی موجود تھا۔ مجھے وزیر جنگ نے اسی اپارٹمنٹ ہاوس میں سب سے اچھا حصہ اوپر کی منزل میں دلوا دیا۔ اس حصہ میں چار بڑے کمرے، ایک چھوٹا کمرہ اور ایک بڑا بر آمدہ تھا۔ باورچی خانہ اور غسل خانہ بھی اندر ہی تھا اور گھر میں پانی کا نل آتا تھا۔ اس زمانے میں کابل میں ایسا گھر صرف بعض بڑے عہدہ داروں کو میسر ہو سکتا تھا۔ اس وقت افغانستان میں گھروں میں سنٹرل ہیٹنگ کا رواج نہ تھا اور نہ ہی پتھر کا کوئلہ ملتا تھا۔ اس لئے کمروں کو بخاریوں میں لکڑیاں جلا کر گرم کیا جاتا تھا۔ یہ ایک کافی درجہ کا تکلیف دہ اصول تھا، جس سے گھر میں صفائی رکھنا بہت مشکل ہوتا تھا۔

اس گھر کا فرش سیمنٹ یا لکڑی کا نہ تھا جیسا کہ ترکی گھروں کا فرش ہوتا ہے۔ یہاں فرش پر

مٹی لیپی جاتی ہے جس سے ہمیشہ گرد اور خاک رہتی ہے۔ اس لئے افغانی حکومت نے مجھے بہت سی دریاں اور قالین دے دیئے تھے جن کو فرش پر بوریئے بچھا کر لگایا جاتا تھا۔ اس طرح سے سارے گھر کا فرش صاف ستھرا رہتا تھا۔

ہم اس گھر میں ۸/دسمبر ۱۹۳۳ء کو آبسے۔ سردیاں ہونے کی وجہ سے، ہم نے جلد بازار سے بخاریاں (انگیٹھیاں) خریدیں اور کمروں کو گرم کرنا شروع کر دیا۔

۱۲/نومبر کو میری خانم کو ملکہ صاحبہ نادر شاہ نے شرف باریابی بخشنے کے لئے شاہی محل میں بلا کر اس کا ثبوت دیا کہ اعلیٰ حضرت شہید (نادر شاہ) کی وفات کے باوجود بھی وہ مجھ پر اور میری خانم پر ویسی ہی مہربان ہیں جیسی کہ ان کی زندگی میں ہو سکتی تھیں۔

میری خانم اللہ نواز خان کی موٹر کار پر محل گئی اور ترجمان کے طور پر ایک افغانی افسر اکرم خان کی ترکی بیوی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ خانم نے ملکہ صاحبہ کی خدمت میں باریاب ہونے پر اعلیٰ حضرت شہید کے لئے فاتحہ خوانی کی۔ وہ محل میں کوئی دو گھنٹے ٹھہری۔ اس عرصہ میں ایک طرف تو چائے کا دور رہا اور دوسری طرف استانبول کے بارے میں اور میرے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔

بائیسواں باب

افغانی کیڈٹ کالج میں میری معلّمی

افغانی کیڈٹ کالج کی اس زمانے کی حالت

جب میں نے ۱۰/دسمبر ۱۹۳۳ء کو افغانی کیڈٹ کالج میں پڑھانا شروع کیا اس وقت کالج کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ کالج کے طالب علم عارضی طور پر سردار عبدالقدوس خان مرحوم سابق وزیر اعظم افغانستان کی کوٹھی اور اس کی ملحقات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) نے کیڈٹ کالج کے لئے کابل شہر کے جنوبی حصے کے باہر قلعہ بالا حصار کے نزدیک ایک موڈرن عمارت بنوانا شروع کی تھی لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے تعمیر کا کام سست پڑ گیا تھا۔ بالا حصار کے قلعے کو انگریزوں نے دوسری انگریز۔ افغانی جنگ کے زمانے میں کابل پر قبضہ کر کے خراب کر دیا تھا اور صلح کے معاہدے میں یہ شرط لگا دی تھی کہ یہ قلعہ پھر کبھی آباد نہ کیا جائے۔ اس طرح یہ قلعہ ۱۸۸۰ء سے لے کر اعلیٰ حضرت سلطان محمد نادر شاہ کے زمانے تک ویران سا پڑا رہا تھا۔ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ نے یہاں افغانی کیڈٹ کالج کی عمارت کی بنیاد ڈال کر انگریزوں کو اپنی پوری آزادی منوا دی تھی۔ میری معلّمی کے شروع میں سردار عبدالقدوس خان مرحوم کی کوٹھی کچھ اچھی حالت میں نہ تھی اور اس کی مرمت کے لئے جو کچھ روپیہ سردار علی شاہ خان کمانڈر کیڈٹ کالج نے افغانی وزارت جنگ سے حاصل کیا تھا وہ کافی ثابت نہ ہوا تھا۔

اس کالج میں جو طالب علم زیر تعلیم تھے وہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے حکم سے سویلین سکولوں کی نویں اور دسویں جماعتوں سے یہاں لائے گئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں کابل میں کوئی فوجی ہائی سکول موجود نہ تھا۔ کالج میں مکی بک نام ایک ترکی

افسر Tactics (لعبتیہ) کا سبق پڑھاتا تھا کالج کے باقی معلم زیادہ تر ترکی کے تعلیم یافتہ افغانی افسر تھے، جن کی تعلیم بچہ سقا کی بغاوت اور امیر امان اللہ خان کے افغانستان چھوڑ جانے کی وجہ سے ادھوری سی رہ گئی تھی۔

افغانی فوج کی تعلیم و تربیت میں افراتفری

امیر امان اللہ خان نے اپنے زمانے میں کچھ افغانی افسر، ترکی کے علاوہ فرانس اور روس بھی بھیجے تھے۔ یہ افسر بھی بچہ سقا کی بغاوت کی وجہ سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر افغانستان واپس آگئے تھے۔ فوج میں ان مختلف افسروں کے درمیان سخت رقابت تھی جو بعض اوقات بغض اور عداوت کے درجہ تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ کیونکہ ان میں سے ہر شخص اپنی ہی تعلیم پر ناز کیا کرتا تھا، اور دوسرے ملکوں میں پڑھے ہوئے افغانی افسروں سے، اپنے کو برتر سمجھتا تھا۔ خاص کر فرانس کے تعلیم یافتہ افغانی افسروں کو اپنی تعلیم پر بہت ناز تھا۔

توپ خانہ کے وہ افغانی افسر جو ترکی میں اپنی تعلیم کو ادھوری چھوڑ کر بچہ سقا کی بغاوت کی وجہ سے اپنے وطن واپس آنے پر مجبور ہو گئے تھے، اعلیٰ ریاضی نہ جاننے کی وجہ سے ترکی کے اختصاص کالج کے سبقوں کو پوری طرح نہ سمجھ سکے اور وہاں کی تعلیم سے اچھی طرح فائدہ نہ اٹھا سکے تھے۔ اس وجہ سے فرانس کے پڑھے ہوئے افغانی افسروں کے سامنے ڈٹ کر کسی فوجی مسئلہ پر گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ اس سے عام طور پر یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ترکی میں توپخانہ کے فنون کی تعلیم بالکل ناقص ہے۔

میں نے جب افغانی کیڈٹ کالج میں پڑھانا شروع کیا تو مجھے بھی لوگوں کے اس خیال خام کی وجہ سے کافی دقت پیش آئی۔ مجھے ترجمان اور معاون کے طور پر کرنل علی احمد خان نام کا ایک افغانی افسر جو ترکی کے آرٹلری اختصاص کالج میں ایک سال پڑھ چکا تھا، دیا گیا۔ اس وقت افغانی کالج میں فوجی نصاب تعلیم کی کوئی کتاب بھی موجود نہ تھی۔ اس لئے میں نے اپنے سبقوں کے نوٹوں کو سائیکلوسٹائل کی مشین سے چھاپ کر اپنے طالب علموں کو دینا شروع کیا۔ فرانس کے پڑھے ہوئے افغانی افسران نوٹوں کو دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ کیونکہ ان کو امید نہ تھی کہ میں ان کے فرانس کے پڑھے ہوئے سبق کو اپنے طالب علموں کو پڑھا سکوں گا۔ میرے ان نوٹوں میں توپخانہ کے متعلق وہ سارے سبق موجود تھے جو انھوں نے فرانس میں پڑھے تھے۔ اس پر ان کو یقین آگیا کہ ترکی میں بھی توپ خانہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔

ترکی، روس اور فرانس کے تعلیم یافتہ افغانی افسروں کی باہمی رقابت کی وجہ سے جو افراتفری افغانی فوج کی تعلیم و تربیت میں پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کرنا میں نے اپنا فرض سمجھا۔ کیونکہ جب تک ایک فوج کے تعلیمی نصاب میں اور تعلیم و تربیت کے اصولوں میں وحدت اور یگانگت نہ ہو، وہ فوج نہ تو خانہ جنگی کے رفع کرنے میں کام دے سکتی ہے اور نہ ہی ایک غیر ملکی دشمن کا سامنا کر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے شروع ہی سے وزیر جنگ سردار شاہ محمود خان کی توجہ اس خرابی کی طرف دلانا شروع کی اور ان کو کہا کہ جب تک افغانی فوج کی تعلیم و تربیت میں وحدت اور یگانگت پیدا نہ کی جائے، اس وقت تک فوج سے جنگ میں کوئی کام بھی نہیں لیا جا سکتا اور فوجی تعلیم میں وحدت پیدا کرنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ آئندہ افغانستان سے باہر صرف ایک ملک میں افغانی افسر فوجی قواعد سیکھنے کے لئے بھیجے جائیں۔

میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ یہ ملک صرف ترکی ہو سکتا ہے جو افغانستان کا سچا دوست ہے، اور جس کی فوج نے صرف چند سال ہوئے یونانیوں کو شکست فاش دے کر اپنی جنگی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ میرے مدمقابل کے لوگ کہا کرتے تھے کہ افغانی افسروں کو فرانس اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک میں فوجی تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ ان لوگوں سے میری یہ بحث کوئی ڈیڑھ سال تک چلتی رہی لیکن میں آخر کار افغانی گورنمنٹ کو اپنا نقطہ نظر منوانے میں کامیاب ہو گیا اور افغانی گورنمنٹ نے ترکی سے افغانی کیڈٹ کالج کے لئے فوجی اساتذہ بلانا منظور کر لیا۔

اس وقت کی افغانی فوج میں تعلیم و تربیت کے اصولوں میں گڑبڑ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ توپ خانہ کے ان افسروں کی تعلیم کے لئے جنہوں نے صرف پرانے اصولوں پر اور افغانستان میں رہ کر قواعد سیکھی تھی ایک اطالوی فوجی معلم بلوایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ فوج کے اونچے رینک کے افسروں کو سٹاف کالج کے سبق پڑھانے کے لئے ایک جرمن افسر نوکر رکھا گیا تھا۔

اطالوی افسر نے کچھ مدت کام کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ افغانی رنگروٹ اور حوالدار اس قابل نہیں ہیں کہ توپوں کی نشان بندی کے لئے آلہ نشان کو صحیح طور پر استعمال کر کے توپوں کو ایک پہاڑ کی اوٹ میں سے ہدف (یعنی نشانہ) کی طرف پھیرنے کا کام سرانجام دے سکیں۔ کیونکہ ان کو لکھنا پڑھنا اور کچھ حساب کے قاعدے جو نشان بندی کے لئے ضروری ہوتے ہیں، سکھلانا ناممکن ہے۔ اس لئے اس نے افغانی وزارت جنگ کو ایک رپورٹ بھیج کر یہ تجویز کی تھی کہ توپوں کی نشانہ بندی کا فرض حوالدار کی بجائے ایک افسر کو دینا چاہئے۔ چونکہ توپ خانہ کی

ایک بیٹری میں دو آلہ نشان اور ایک دوربین بیٹری ہوتی ہے اس لئے ہر بیٹری میں اس کے پانچ افسروں کے علاوہ ان تین آلات کو استعمال کرنے کے لئے تین افسر اور ہونے چاہئیں۔ اس وقت افغانی توپ خانہ میں تعلیم یافتہ افسروں کی بہت کمی تھی۔ اگر تین افسران آلات کو استعمال کرنے کے لئے مقرر کر دیئے جائیں تو بیٹری کے باقی فرائض کو پورا کرنے کے لئے افسر کہاں سے ملیں گے؟ اگر اس اطالوی معلم کی تجویز کو مان لیا جاتا تو وہ چند ایک نئی بیٹریاں بھی جو افغانستان میں اس وقت موجود تھیں، افسروں کی کمی کی وجہ سے بالکل بیکار ہو جاتیں۔ میں نے افغانی کیڈٹ کالج میں معلمی کا کام شروع کرنے پر جب اس اطالوی معلم کی یہ تجویز سنی تو مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ ترکی میں ہم ان آلات کا استعمال اپنے رنگروٹوں کو بہ آسانی سکھلایا کرتے تھے اور ان کو لکھنا پڑھنا اور کچھ حساب کے قاعدے پڑھا کر ان فرائض کی ادائیگی کے لئے ان کو بیٹری میں کام پر لگا دیا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے کیڈٹ کالج کے کمانڈر جنرل علی شاہ خان سے کہا کہ اگر آپ ایک توپ خانہ کی بیٹری وزارت جنگ سے کالج کے لئے لے لیں تو میں رنگروٹوں کو آلات نشان کا استعمال سکھلا دوں گا اور ان کی ساری ٹریننگ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لوں گا۔ اس پر کالج کے کمانڈر نے وزارت جنگ سے ایک توپ خانہ کی بیٹری کالج کے لئے لے لی۔ میرے طالب علم بھی توپ خانہ کی قواعد سیکھنے کے لئے اس بیٹری سے فائدہ اٹھانے لگے۔ میں نے بیٹری کے تین ہوشیار رنگروٹوں کو آہستہ آہستہ لکھنا پڑھنا اور حساب کے کچھ قاعدے سکھلائے اور ان کو آلات نشان کے استعمال کا ماہر بنا دیا۔ نو ماہ کی کوشش اور تعلیم کے بعد میں نے کیڈٹ کالج کے کمانڈر سے کہا کہ وہ وزیر جنگ سردار شاہ محمود خان سے کالج آنے کی درخواست کرے تاکہ وزیر موصوف میرے پڑھائے ہوئے رنگروٹوں کا امتحان بذات خود لیں۔ سردار صاحب نے امتحان کے لئے کیڈٹ کالج آنا منظور کر لیا۔ میں نے اپنے تیار کردہ رنگروٹوں سے ان کے سامنے نشان بندی کا وہ تمام کام کروایا جس کو اطالوی معلم افغانی افسروں کے ذمے ڈالنا چاہتا تھا۔ وزیر صاحب نے دیکھ لیا کہ ایک افغانی رنگروٹ کو نشان بندی کے سارے قواعد سکھلائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا بیٹری کمانڈر تندہی سے اس کو تعلیم دے۔

میری یہ کامیابی دیکھ کر وزیر صاحب بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ میرے اصول تعلیم کی وجہ سے افغانی حکومت کو ہر بیٹری کے لئے تین اور افسروں کو تیار کرنے اور ان کو تنخواہ دینے سے

نجات ملتی تھی۔ اس کے بعد وزیر صاحب نے اس اطالوی معلم کا کونٹریکٹ ملازمت ختم کر دیا اور اس کو افغانی گورنمنٹ کی ملازمت سے سبکدوش کر کے اٹلی واپس بھیج دیا۔ اس طرح افغانی حکومت ایک غیر ملکی جنگی ماہر کو تنخواہ دینے سے بھی بچ گئی۔

کیڈٹ کالج کے اس امتحان کے وقت جو فوٹو لیا گیا تھا اس کی ایک نقل کتاب کے آخر میں درج کی جاتی ہے۔ (۲۹)

کیڈٹ کالج میں میری ان کامیاب کارروائیوں کی وجہ سے میرا رسوخ افغانی وزارت جنگ میں بہت بڑھ گیا اور افغانی توپ خانہ کے سارے پرانے افسروں کو نئے اصولوں پر تعلیم دینے کا کام بھی مجھے دے دیا گیا۔ کالج اور توپ خانہ کے ہیڈ کوارٹرز کو آنے جانے کے واسطے افغانی گورنمنٹ نے میرے لئے ایک موٹر کار اور ڈرائیور مقرر کر دیا۔ میں وزیر جنگ سردار شاہ محمود خان کی خدمت میں دن کو ان کے دفتر میں اور شام کے بعد ان کی بیٹھک میں جہاں وہ بلیرڈز کھیلا کرتے تھے بلا تکلف آنے جانے لگا۔ یہاں تک کہ کمانڈر کیڈٹ کالج بھی، کالج کی بعض ضروریات کی منظوری میرے ذریعے وزارت جنگ سے لینے لگا۔

میری ترقی

میں کابل آنے سے پہلے چونکہ ترکی فوج میں ایک سال خدمت کر چکا تھا اور اس عرصہ میں وہاں کے افسر میرے کام سے خوش تھے۔ اس لئے مجھے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے سے ۳۰ اگست ۱۹۳۴ء کو فرسٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملنے کے لئے انہوں نے رائے دے دی تھی۔ ترکی میں اس زمانے میں ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کو تین سال تک اس عہدے پر کام کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کے افسر اس کی قابلیت اور لیاقت کی تصدیق کر دیں تو اس کو فرسٹ لیفٹننٹ بنا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی وزارت جنگ ترکی کی طرف سے ترقی ملنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ یہ حکم مجھے ستمبر ۱۹۳۴ء میں کابل کے ترکی سفارت خانے کے ذریعہ پہنچا۔

کابل میں ہماری سوشل (سماجی) زندگی

کابل میں صرف چار پانچ ترکی کنبے تھے۔ باقی ترکی ماہر جو افغانی حکومت کے ملازم تھے، وہ

کنوارے تھے جن کو اپنے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہوٹل کابل میں کھانا کافی مہنگا تھا۔ گھر پر ان کے لئے ایک اچھا باورچی رکھنا بھی مشکل تھا۔ اس لئے ہم نے ان میں سے تین چار اشخاص کے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے اپنے گھر میں Mess بنالیا تھا۔ اگرچہ خانم کو فارسی نہ جاننے کی وجہ سے نوکروں سے باورچی خانہ میں کام لینے میں کافی مشکلات پیش آیا کرتی تھیں، لیکن ہمارے کھانے کا انتظام اس کی نگرانی میں اچھا اور سستے داموں ہو جایا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد اکثر اوقات دوسرے ترک پڑوسی بھی ہمارے ہاں آجایا کرتے تھے، اور ہمارا وقت اس طرح بہت اچھا گزر جایا کرتا تھا۔ ہم کو اگر کوئی تکلیف تھی تو صرف یہ تھی کہ استنبول کی طرح جہاں کی مچھلیاں بہت مشہور ہیں، کابل میں سمندری مچھلیاں نہ ملتی تھیں۔ کبھی کبھی دریائی مچھلی بہم پہنچ جاتی تھی جو اتنی لذیذ نہیں ہوتی جتنی کہ سمندری مچھلی ہوتی ہے۔ کابل میں ترکی کے بنے ہوئے مختلف قسم کے پنیر، زیتون اور زیتون کا تیل بھی دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم سب کو ترکی کھانوں کی حسرت رہتی تھی۔ اگرچہ افغانستان کی مختلف قسم کی پلاؤ اور ترکاریوں سے اس کی ذرا تلافی ہو جایا کرتی تھی۔

جمعہ کو چھٹی کے دن ہم سب ترک مل کر قصر چہل ستون، دار الامان، باغ بابر، باغ بالا پمقان (جس کو عام زبان میں پغمان کہا جاتا ہے) استالیف جیسی تفریح کی جگہوں کو جو کابل کے مضافات میں واقع ہیں، جا کر سیر و تفریح کیا کرتے تھے۔ ہم میں اکثر ترکوں کی اپنی موٹر کاریں تھیں۔ جن اشخاص کے پاس موٹر کار نہ تھی وہ اپنے دوستوں کی موٹروں سے فائدہ اٹھا کر اس قسم کی پکنک میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ (۳۰)

وہ افغانی افسر جو ترکی کے تعلیم یافتہ تھے ہمارے گھر اکثر چائے پر آیا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ وزیر جنگ افغانستان سردار شاہ محمود خان جو اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ شہید کے چھوٹے بھائی تھے اور شاہی رسالہ کا کمانڈر پرنس اسد اللہ خان جو اعلیٰ حضرت شہید کا بھانجا تھا، اسی طرح ہمارے گھر پر آئے تھے۔ (۳۱)

گرمیوں میں ہر مہینے وزیر اعظم افغانستان، وزیر جنگ یا وزیر خارجہ غیر ملکی لوگوں کو اپنے باغ میں ایک گارڈن پارٹی دیا کرتے تھے جس میں ہم سب ترک مع اپنے کنبے کے مدعو ہوتے تھے۔ مختلف سفارتیں بھی اس قسم کی دعوتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن میں ایرانی سفارت خانے کے سوا اور کسی سفارتخانے میں نہ جایا کرتا تھا۔ انگریزی سفارت خانہ میں تو ان دنوں میرا

جانا ناممکن تھا۔ کیونکہ میں انگریزوں سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم کی مختلف پارٹیوں میں انگریزی سفیر اور اس کے عملے سے ہاتھ بھی ملانا نہ چاہتا تھا۔ انگریزوں کو میرا کابل (واپس) آنا پسند نہ آیا تھا۔ مجھے اس کا علم اس طرح ہوا کہ سعد اللہ بک (مرحوم) کونسلر سفارت خانہ ترکی نے مجھے ایک روز بتایا کہ انگریزی سفیر نے میرے کابل آنے سے پہلے اس سے (سعد اللہ بک سے) ایک دفعہ یہ پوچھا تھا کہ ظفر حسن کیوں افغانستان آرہا ہے؟ سعد اللہ بک (مرحوم) نے مجھے کہا کہ سفیر کے اس سوال کا جواب میں نے یوں دیا "میں نہیں جانتا کہ ظفر حسن کیوں افغانستان آرہا ہے۔ شائد افغانی حکومت نے اس کی فوجی خدمات ہماری گورنمنٹ سے حاصل کر لی ہیں اور ہماری گورنمنٹ اس کو کابل بھیج رہی ہے"۔

میں روسی سفارت خانے میں بھی نہ جایا کرتا تھا۔ وہاں میں صرف ایک مرتبہ گیا تھا۔ جب کہ فخر الدین آلتائی پاشا کی سرکردگی میں ایک ترکی وفد جو افغانستان اور ایران کے سرحدی تنازعہ کا فیصلہ کرنے کو ہرات اور وہاں سے کابل آیا تھا۔ روسی سفیر کی طرف سے انہیں روسی سفارت خانہ میں مدعو کیا گیا تھا۔

جرمنوں سے میرا جھگڑا

ہمارے اپارٹمنٹ ہاؤس کے صحن میں ٹینس کورٹ بھی تھا۔ یہاں عام طور پر افغانی وزارت تعلیم کے جرمن اور فرانسیسی ملازم اور ان کے دوست الگ الگ وقتوں میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ ایک روز ہم ترکوں نے کہا کہ ٹینس کھیلنے کے لئے ہفتہ میں ایک دن ہمارے لئے بھی مقرر ہونا چاہئے۔ ہم نے اپنے اس ارادے کی اطلاع افغانی وزارت خارجہ اور وزارت تعلیم کے ذریعے جرمنوں اور فرانسیسیوں کو دے دی اور ان کو کہہ دیا کہ اگلے ہفتے جمعہ کے دن ہم کھیلیں گے۔ مگر جرمنوں نے اس کو منظور نہ کیا۔ ان کا Charge d, Affaires جو جرمن سفیر کی عدم موجودگی کی وجہ سے کابل میں جرمن نمائندہ مانا جاتا تھا، ہمارے اپارٹمنٹ ہاؤس میں رہنے والے جرمنوں کے بلاوے پر اس روز ٹینس کھیلنے آگیا۔ ہم نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ آج کھیلنے کی باری ترکوں کی ہے۔ جرمن نمائندے نے اس پر چیں بہ جبیں ہو کر کچھ سخت الفاظ میں جواب دیا، جس کو عمر شوکت بک (مرحوم) پروفیسر کیمسٹری کی بیوی نے جو جرمن زبان جانتی تھی، سمجھ کر، مجھے کہا کہ "یہ شخص بدتمیزی کر رہا ہے۔" اس پر میں نے اپنے اردلی کو حکم دیا کہ

اس کو ہمارے گھر سے نکال دے۔ میرے سپاہی نے اس کو دھکے دے کر ہمارے اپارٹمنٹ ہاؤس سے نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس پر جرمن نمائندے نے فوراً افغانی وزارت خارجیہ میں جاکر شکایت کی کہ افغانی سپاہی نے اس کی ہتک کی ہے۔ اس طرح پر اس نے اس جھگڑے کو جرمن افغان کے تنازعہ کا رنگ دے دیا۔ افغانی وزارت خارجیہ اس سے سہم گئی۔ مجھے افغان وزارت جنگ کے حکام نے پوچھا کہ میں نے کیوں ایک افغانی سپاہی کو اس کام کے لئے استعمال کیا۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ "افغانی سپاہی میرا اردلی ہے جو میرا پرائیویٹ کام کرنے اور خطرے کے وقت میری حفاظت کرنے پر مقرر ہے۔ جرمن نمائندے نے میری ہتک کرنا چاہی۔ اس پر میں نے مجبوراً اپنے اردلی کو حکم دیا کہ اس کو ہمارے گھر کے احاطے سے باہر نکال دے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ افغانی وزارت خارجیہ کے حکام نے جرمن نمائندے کو ذرا ٹھنڈا کیا اور چند دن بعد وزیر خارجیہ نے اپنے باغ وزارت میں ایک گارڈن پارٹی دی جس میں اس نے ہم ترکوں اور جرمنوں کے درمیان صلح صفائی کرادی اور یہ مسئلہ اس طرح رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد ترک اپنی باری کے روز ٹینس کھیلنے لگے۔ (۳۲)

خانم کا آپریشن

مجھے کابل آئے ہوئے کوئی ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں میری پڑھائی ہوئی جماعت نے پہلے سال کا امتحان کامیابی سے دے دیا تھا۔ اس سے میری پوزیشن افغانستان میں اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ میں اپنی ان کامیابیوں پر نازاں اور اپنی خوش قسمتی پر بہت شاداں تھا کہ مندرجہ ذیل واقعہ کی وجہ سے میرے طالع کے مطلع پر پریشانی کی گھٹائیں چھا گئیں۔

میں اس واقعہ کی تفصیلات خود خانم کی ڈائری سے خلاصۃً نقل کرتا ہوں۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۵ء کو خانم کے ساتھ گل باغ میں جو کابل کے نزدیک ایک بہت ہی پر فضا جگہ ہے گیا تھا۔ وہاں سیر کرتے ہوئے ایک جگہ خانم کو ایک نالی پر سے چھلانگ لگا کر گزرنا پڑا۔ جس کے بعد اس کو اپنے دائیں پاؤں میں ذرا درد محسوس ہونے لگا۔ اگلے روز صبح کو یہ درد اور بھی بڑھ گیا۔ ہم نے پہلے تو اس کو نقرس (رموماٹیڈم) کا درد سمجھا اور ڈاکٹر نے اس بیماری کی دوا دی۔ لیکن اس سے درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تین دن بعد اس کے دائیں پیر پر جہاں درد تھا ایک پھنسی نکل

آئی اور اس سے پیپ آنے لگی۔ اس پر سرجن رفقی بک (مرحوم) نے اس کے پاؤں کو ایک لوہے کے تار کے بنے ہوئے سپلنٹ میں رکھ کر باندھ دیا تاکہ حرکت کرنے اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر چلنے کی ضرورت نہ رہے اور پاؤں کو آرام ملے۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ چار دن کے بعد جب ڈاکٹر رفقی بک (مرحوم) نے زخم کا پھر معائنہ کیا تو ایکسریز کرانے کا فیصلہ کیا تاکہ دیکھا جائے کہ پاؤں کی ہڈیاں ٹھیک ہیں یا کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔

آخر کار ۲۲ مئی ۱۹۳۵ء کو خانم کو شفاخانہ میں لے جایا گیا۔ وہاں ایکسریز لینے پر معلوم ہوا کہ پاؤں کی درمیانی انگلی کو ایڑی سے جوڑنے والی چھوٹی سی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ایک معمولی سی چھلانگ لگانے سے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جانے پر ڈاکٹر کو تعجب ہوا۔ لیکن خانم نے جب اس کو بتایا کہ اس کو چار سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ کا بخار آیا تھا اور وہ ایک دن اسی بیماری کی حالت میں گر پڑی تھی جس سے اس کا دایاں پاؤں زخمی ہو گیا تھا, اور یہ زخم کئی سال تک مندمل نہ ہوا تھا۔ اس زمانے میں ترکی میں ایکس ریز کا اپریٹس نہ ہونے کی وجہ سے معلوم نہ کیا جاسکا کہ گرنے کی وجہ سے پاؤں کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے یا نہیں۔ لیکن کئی سال کے معالجہ کے بعد زخم سے ہڈی کا ایک ٹکڑا نکل آیا تھا اور دوسرا ٹکڑا زخم کے اندر رہ گیا تھا۔ یعنی گرنے کی وجہ سے پاؤں کی ایک نازک ہڈی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد زخم آہستہ آہستہ اچھا ہو گیا تھا۔ اس ہڈی کا وہ ٹکڑا جو زخم کے اندر رہ گیا تھا دوسرے اعضاء کی طرح نشوونما نہ پاسکا۔ آخر کار یہ ٹکڑا بھی کابل میں چھلانگ لگانے سے ٹوٹ گیا۔ جس سے پاؤں میں پھر زخم ہو گیا اور پیپ آنے لگی۔ اس پر سرجن نے فیصلہ کیا کہ پاؤں کا آپریشن کیا جائے۔ کابل میں اس زمانے میں زنانہ ہسپتال میں سامان جراحی کم تھا اور صفائی کا انتظام بھی اچھا نہ تھا۔ اس لئے خانم نے زنانہ ہسپتال میں آپریشن کرانا پسند نہ کیا۔ اس پر افغانی وزیر محکمہ صحت عامہ یحییٰ خان سے اجازت لی گئی کہ مردانہ ہسپتال میں آپریشن کرایا جائے۔ کابل میں اس زمانے میں ایسی اجازت ملنا مشکل تھی کیونکہ مردانہ شفاخانہ میں ایک عورت کا جانا ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن میری خاطر اس کی اجازت دے دی گئی۔

۲۵ مئی ۱۹۳۵ء کو سرجن رفقی بک نے آپریشن کیا اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو نکال دیا۔ آپریشن میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ خانم کے لئے شفاخانہ میں ایک کمرہ تیار کیا گیا تھا۔ اس کو آپریشن کے بعد اس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ کوئی دو گھنٹے بعد ہوش میں آئی۔ میں نے

ایک رات اسی کمرے میں خانم کے ساتھ گزاری اور اگلے دن اس کو گھر لے آیا۔ زخم کے اچھے ہونے میں چالیس دن لگے۔ ہر دوسرے دن پٹی بدلی جاتی تھی۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ اس میں کئی گز لمبی ململ کی پٹی بھری جاتی تھی۔ ڈاکٹر رفقی بک نے زخم کی مرہم پٹی کرنے میں سخت احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس لئے خدا کے فضل سے زخم میں پھر پیپ پیدا نہیں ہوئی اور زخم چالیس دن کے بعد بالکل بھر آیا۔

خانم کی اس بیماری کے دوران میں ہمارے سب ترکی، افغانی اور ہندوستانی دوستوں نے ہم سے بہت اظہار ہمدردی کیا۔ ایک دن سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ بہ نفس نفیس اس کی خاطر پرسی کو آئے۔ ان کی تشریف آوری سے ہم سب بہت ممنون ہوئے۔

کابل میں زلزلہ

خانم کا پاؤں ابھی لوہے کے تار کے (Splint) ہی میں تھا کہ ایک دن کابل میں گیارہ بجے دن کو سخت بھونچال آیا۔ کوئٹہ کا شہر اسی زلزلہ میں تباہ ہوا تھا۔

خانم بے چاری نے باوجود اس کے کہ چارپائی سے خود بخود اترنا اس کے لئے ناممکن تھا، جان کے ہول سے بستر سے اتر کر اپنے کو اپنے سونے کے کمرے کے دروازے تک پہنچا دیا۔ لیکن اس کے پاؤں میں اس کی حرکت سے اتنا درد ہوا کہ وہاں سے آگے بڑھ کر بیٹھک سے نہ گزر سکی اور وہاں ہی گر گئی۔ پڑوسی ترکی عورتوں نے آکر اس کو وہاں سے اٹھایا اور اس کو پھر بستر پر لٹا دیا۔ میں اس وقت کیڈٹ کالج میں اپنی جماعت کو توپوں سے قواعد کرا رہا تھا۔ زلزلہ آنے پر مجھے خانم کی حالت کا خیال آیا۔ اس لئے فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر گھر پہنچا تاکہ دیکھوں کہ خانم پر کیا گزری۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کو بستر پر سے اس طرح اترتے ہوئے کوئی چوٹ نہ لگی تھی۔

مولوی بشیر صاحب کی شہادت کی خبر

خانم کی بیماری کی پریشانی سے میں نے بہ مشکل نجات پائی تھی کہ خبر آئی کہ جماعت

مجاہدین چمرکنڈ میں سے دو آدمیوں نے رات کو مولوی بشیر صاحب کا گلا تلوار سے کاٹ کر ان کو شہید کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ دو شخص ان کی سونے کی کوٹھڑی کے دروازے پر پہرہ پر مقرر تھے۔ لیکن اصل میں ان کو انگریزوں نے پیسہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور انہوں نے اس مجاہد فی سبیل اللہ کو ایسی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ مولوی بشیر صاحب (مرحوم) جن کا اصلی نام عبدالرحیم تھا، ایک جید مذہبی عالم تھے جو ہمیں ہجرت کرانے کے بعد اپنا گھر بار، اہل و عیال اور کاروبار کو چھوڑ کر جماعت مجاہدین امس میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں نے جماعت مجاہدین کے ممبروں میں ایک نئی روح پھونکنا چاہی تھی۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ جماعت مجاہدین کے ممبروں کو نئے ہتھیاروں سے مسلح کیا جائے اور ان کے مرکز سرحد کے مختلف آزاد قبائل کے علاقوں میں قائم کئے جائیں اور قبائل سے دوستانہ تعلقات بڑھا کر ان کو آہستہ آہستہ انگریزوں کے بر خلاف منظم کیا جائے۔ تاکہ اگر پھر کبھی انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں آزادی کی تحریک چلے یا افغانستان پھر انگریزوں سے لڑے تو انگریزی فوجوں پر سرحدیوں کا ایک متحدہ حملہ کرائیں۔ انہوں نے جماعت مجاہدین کی نئے اصولوں پر تنظیم کے لئے ہمارے رفقاء میں سے عبدالرشید (مرحوم) اور محمد حسن (یعقوب) کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ان میں سے عبدالرشید (مرحوم) کو امس سے سرحدیوں کے لئے ایک چھوٹا سا اخبار جو سائیکلوسٹائل سے چھاپا جاتا تھا، نکالنے کا کام دیا تھا۔ اور محمد حسن (یعقوب) کی سرکردگی میں جماعت مجاہدین کا ایک مرکز وزیرستان کے علاقے میں قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دو خائنوں نے پیسے کے لالچ سے مولوی بشیر ایسے جانثار اور فدائی اسلام شخص کو جس نے اپنی ساری زندگی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر دی تھی، ایسی بے دردی سے اور خواب کی حالت میں تلوار سے ذبح کر کے مار ڈالا تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

جب اس جان خراش سانحہ کی خبر کابل پہنچی تو ہم پرانے اور نئے مہاجروں نے ایک جلسہ عام کرنا چاہا تاکہ انگریزوں کے بر خلاف پروٹسٹ کیا جائے۔ لیکن افغانی حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ اس لئے فقط کابل کے محلّہ (دہ افغاناں) کی مسجد میں ان کے لئے فاتحہ خوانی کی گئی۔ ان کی شہادت کے بعد جماعت مجاہدین ایک بالکل نکمی سی ٹولی ہو کر رہ گئی۔

میری والدہ صاحبہ کی وفات

کابل آنے کے بعد میں بھائی صاحب مرحوم سے باقاعدہ خط و کتابت کرنے لگ گیا تھا۔ اس

پر والدہ صاحبہ نے بھائی صاحب پر اصرار کرنا شروع کیا کہ وہ ان کو کابل لے جائیں۔ مگر بھائی صاحب نے ان کی سن رسیدگی اور کابل کے سفر کی مشکلات کا خیال کر کے ان کو اس سے باز رکھا۔ اگرچہ ان کے دل میں ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ مجھے ایک دفعہ پھر دیکھیں لیکن ہماری قسمت میں نہ تھا کہ ہم پھر باہم مل سکیں۔ آخر ایک دن بھائی صاحب نے مجھے لکھا کہ والدہ صاحبہ آپ کی یاد میں تڑپتی ہوئی فوت ہو گئی ہیں۔ مجھے اس سے سخت رنج ہونا تو بالکل قدرتی بات تھی لیکن مجھے بے انتہا افسوس ہوتا ہے کہ میں والدین کی ساری عمر میں کوئی خدمت نہ کر سکا۔ یہ قلق مجھے مرتے دم تک لگا رہے گا۔

افغانستان میں ترکی فوجی مشن

افغانی کیڈٹ کالج میں معلمی شروع کرنے کے بعد مجھے افغانی فوج کی اصلاح کے لئے جو کام ضروری معلوم ہوئے اور جن کو عملی جامہ پہنانا میں نے اپنا مقصد زندگی بنایا تھا، ان میں سے ایک کو تو پورا کرنے میں مَیں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ کام جیسا کہ اوپر بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے، افغانی فوج کی تعلیم و تربیت کے اصول میں وحدت پیدا کرنا تھا۔ افغانی وزارت جنگ نے اب افغانی افسروں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے صرف ترکی بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ میرے طالب علموں میں سے قابل افسر اس غرض کے لئے چنے گئے اور ان کو ترکی فوج میں ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے ترکی بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

دوسرا کام جو میں نے اپنے پیش نظر رکھا وہ اس سلسلہ میں یہ تھا کہ کابل میں افغانی افسروں کو فوجی قواعد سکھلانے کے لئے ترکی سے ایک فوجی مشن بلایا جائے جس میں ہر فن جنگ کے ماہر داخل ہوں۔ اس مقصد کے حصول سے پہلے ضروری تھا کہ ترکوں کے سوا جو غیر ملکی فوجی افسر میرے کابل آنے سے پہلے افغانی حکومت نے نوکر رکھے ہوئے تھے، ان کو افغانستان سے رخصت کرایا جائے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اطالوی ماہر توپ خانہ کو تو میں نے افغانی وزارت جنگ کے ذریعہ کابل سے واپس اٹلی بھجوا دیا تھا۔ لیکن جرمن افسر جو بڑے رینک (مرتبہ) کے افغانی افسروں کو سٹاف کالج کے سبق پڑھانے پر مقرر تھا، ابھی کابل میں موجود تھا۔ اس کی نوکری کو ختم کرنا صرف وزیراعظم افغانستان سردار محمد ہاشم خان کے حکم سے ہو سکتا تھا۔ اس قسم کا حکم وزیراعظم سے لینا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ سردار محمد ہاشم خان میرے اس زمانے سے

دوست تھے جب جنگ آزادی افغانستان کے بعد ۱۹۱۹ء میں میں ان کے ماتحت جلال آباد میں کام کیا کرتا تھا۔ اب مختلف موقعوں پر جب ان سے کسی تقریب پر میری ملاقات ہوتی تو میں ترکی سے ایک فوجی مشن کے بلانے پر زور دیا کرتا اور ان سے عرض کیا کرتا کہ افغانی افسروں کی تعلیم کے لئے ایک جرمن افسر کافی نہیں ہے۔ ہر فوجی فن کی تعلیم کے لئے کم از کم ایک معلم ہونا چاہئے اور اب چونکہ افغانی افسروں کو ٹریننگ کے لئے صرف ترکی بھیجنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے، یہ سب ماہرین فنون جنگ بھی ترکی ہی سے آنے چاہئیں۔ میں ان کو یہ بھی کہا کرتا تھا کہ ترکی سے ایسے ماہر افسر بلانے میں ایک فائدہ، افغانی گورنمنٹ کے لئے یہ بھی ہو گا کہ ترک جرمنوں کی نسبت کم تنخواہ پر ملیں گے۔ نیز ترکی افسر ایک مسلمان ملک میں جرمنوں کی نسبت زیادہ لگاؤ اور تن دہی سے کام کریں گے۔

میری اس تجویز پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا تھا کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل خود ترکی نے جرمن افسروں سے فوجی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لئے افغانستان کو بھی براہ راست جرمنوں سے جنگی تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ میں اس کا جواب یہی دیا کرتا تھا کہ ترکوں نے صرف اپنے ہی بل بوتے پر پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو جن کی پیٹھ پر انگریزی اور فرانسیسی حکومتیں کھڑی تھیں، اور ان کو ہر قسم کی مدد دے رہی تھیں، شکست فاش دے کر دنیا سے اپنی فوجی لیاقت کا لوہا منوایا ہے۔

میری یہ کوشش کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ مجھے جب کبھی موقع ملتا تو میں شام کے بعد ڈاکٹر نور محمد کے ساتھ جو وزیراعظم کے طبیب خاص تھے، قصر زین العمارہ میں جہاں سردار محمد ہاشم خان رہا کرتے تھے، جایا کرتا تھا، اور وہاں بھی اس مسئلے کو مناسب طریقہ پر زیر بحث لایا کرتا تھا۔ بعض اوقات ہماری گفتگو طول کھینچ جاتی تھی، اور وزیراعظم مجھے اپنے ساتھ کھانا کھانے کو مدعو کر لیا کرتے تھے۔ آخر کار میری باتوں نے اپنا اثر دکھایا اور سردار محمد ہاشم خان (مرحوم) نے اپنے بھائی سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ سے مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا کہ ترکی سے ایک فوجی مشن افغانی کیڈٹ کالج کے لئے بلایا جائے، جس میں ہر جنگی فن کا ایک ماہر افسر بطور معلم کے شامل ہو۔ اس مشن کی سرکردگی کے لئے کرنل ضیاء بک کو جو امیر امان اللہ خان کے زمانے میں افغانستان میں رہ چکا تھا اور جس نے جمال پاشا (مرحوم) کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ (قطعہ نمونہ کے نام سے) تیار کر کے اپنی فوجی لیاقت کا افغانوں کو ثبوت دیا تھا ترکی سے بلوانے کا فیصلہ ہوا اور اس بارے میں ترکی حکومت سے بات چیت کرنے کے لئے افغانی سفیر

متعینہ انقرہ کو ہدایات دے دی گئیں۔

قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی سے میری خط و کتابت

کابل میں ایک سال کام کرنے کے بعد میں نے ان افغان حاجیوں کے ذریعے جو اس سال کابل سے حج کے لئے حجاز جا رہے تھے قبلہ مولانا سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم کرنا چاہا۔ میں نے ان لوگوں کے ذریعہ ان کو کچھ روپیہ بھی بھیجا۔ لیکن یہ سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ اگلے سال مجھے کابل سے حج پر جانے والا کوئی آدمی نہ ملا۔ کابل میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (شہید) نے تخت افغانستان پر بیٹھنے کے بعد قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ تعلقات پیدا کئے تھے اور ان کو ایک بڑی رقم بھیجی تھی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ شہید ہو گئے۔ اس پر قبلہ مولانا صاحب (مرحوم) کے ساتھ جو تعلقات پیدا ہوئے تھے وہ بھی کٹ گئے۔

تیئسواں باب

نئی افغانی توپوں کی خریداری کے لئے میرا یورپ جانا

توپخانہ کے افغانی افسروں کو جدید اصول جنگ اور نئے ہتھیاروں کے بارے میں نظری سبق پڑھانے کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا، جب تک ملک میں جدید توپیں اور ان کے آلات متعلقہ موجود نہ ہوں۔ اگرچہ افغانستان نے امیر امان اللہ خان کے زمانے میں اٹلی اور روس سے چند ایک توپخانہ کی بیٹریاں خرید لی تھیں۔ لیکن یہ توپیں نسبتاً پرانی تھیں اور ان کے ساتھ وہ آلات جو اس زمانے کی جنگ میں موثر گولہ باری کے لئے ضروری ہیں، موجود نہ تھے۔ اس لئے میں نے وزیر جنگ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ فوج کے لئے نئی توپیں خریدی جائیں کیونکہ جدید توپوں کے بغیر افغانی فوج کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی، اور دوسرے ملک افغانستان کی قدر و قیمت کے قائل نہیں ہو سکتے۔ نئی توپوں کی خریداری پر بہت روپیہ لگتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس کے حل کی کوئی اور صورت ہی نہ تھی، اس لئے افغانی گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو نئی توپیں ضرور خریدی جائیں۔ اس فیصلے کے بعد مختلف سفارتوں نے اپنے اپنے ملک کی توپوں کو افغانستان کو بیچنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ مثلاً روسی سفارت نے روس میں تعلیم یافتہ افغانی افسروں کے ذریعہ وزارت جنگ کو کہلایا کہ چونکہ پہلے بھی روس سے توپیں لی گئی ہیں، اس لئے پھر وہاں سے توپیں خریدی جائیں۔ تاکہ ملک میں سب توپیں ایک ہی قسم کی ہوں، جس سے افسروں کی تعلیم میں آسانی ہوگی، اور ان کا گولہ بارود بھی ہمسایہ ملک سے بآسانی مل سکے گا۔ اطالوی مستری (روزن ہارڈی) جو ایطالوی توپوں کی دیکھ بھال کے

لئے ابھی تک افغانستان میں موجود تھا، اپنی توپوں کی تعریف میں کہا کرتا تھا کہ چونکہ افغانی افسروں کو ان توپوں کا تجربہ ہے، اس لئے افغانستان کو اٹلی سے اور توپیں خریدنا چاہئیں۔ جاپانی سفیر نے مجھ سے راہ ورسم پیدا کی تاکہ میں جاپان سے توپوں کی خریداری کے لئے وزارت جنگ افغانستان میں اپنے رسوخ کو استعمال کروں۔ یہ ساری تجویزیں مختلف سفارتوں وغیرہ کی طرف سے اس لئے پیش ہو رہی تھیں کہ افغانستان ان کی پرانی اور مستعمل توپیں لے لے اور وہ اپنے ملک میں جدید اصول کی توپیں بہ آسانی بنا سکیں۔ میں پرانی توپوں کی خریداری کا طرف دار نہ تھا۔ میں نے ترکی میں سویڈن کے بوفورس کارخانہ کی بنی ہوئی نئی توپیں اور نیا سامان جنگ اور آلات گولہ باری دیکھے تھے۔ اس لئے میں اسی پر زور دیتا تھا کہ توپیں ضرور یورپ کے کسی کارخانہ اسلحہ سازی میں نئی بنوائی جائیں۔ چیکوسلواکیہ کے کارخانہ اسلحہ سازی (سکوڈا) نے افغانستان کے اس ارادے کے بارے میں اطلاع حاصل کی اور یہ اس طرح ہوا کہ عبدالحکیم جان جو ڈاکٹر غلام محمد، طبیب خاص علیا حضرت صاحبہ (ملکہ امیر حبیب اللہ خان مرحوم) کے لڑکے تھے اور جنہوں نے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (شہید) کو جب وہ بچاسقا سے لڑنے کو فرانس سے پشاور اور وہاں سے خوست (علاقہ جنوبی افغانستان) میں داخل ہوئے تھے، مدد دی تھی، تجارت کے لئے لاہور سے کابل آئے ہوئے تھے اور افغانی وزارت جنگ کے لئے ضروری اشیاء کو یورپ سے خرید کرنے میں بطور ایک تجارتی گماشتہ (کمیشن ایجنٹ) کے کام کرتے تھے۔ ان کے وزیر جنگ افغانستان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کو جب توپوں کی خریداری کے بارے میں افغانی گورنمنٹ کا ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے سکوڈا فیکٹری کو لکھ کر وہاں سے کئی نمائندے اور جنگی سامان کے کیٹلوگ (فہرستیں) منگائے۔ وزیر صاحب نے یہ فہرستیں تدقیق کے لئے مجھے دیں۔ چونکہ سکوڈا فیکٹری کی بنائی ہوئی توپیں مدتوں سے ترکی فوج میں استعمال ہو رہی تھیں، میں نے وزیر صاحب کو مشورہ دیا کہ نئی توپیں سکوڈا کی فیکٹری میں بنوائی جائیں۔ انہوں نے میرا مشورہ مان لیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں ان کو بتاؤں کہ ان نئی توپوں کے ساتھ کیا کیا نئے آلات گولہ باری اور کس قسم کا نیا سامان ہونا چاہئے، انہوں نے فیکٹری کے نمائندوں کے ساتھ قیمت کے بارے میں سمجھوتہ کر کے پہاڑی توپوں کی دس بیٹریاں خریدنے کے لئے ایک دستاویز پر دستخط کر دیئے، اور مجھے حکم دیا کہ اس خریداری کی نگرانی اپنے ذمے لوں۔ میں نے جب اس دستاویز کو پڑھا تو دیکھا کہ اس میں وہ آلات جو توپوں کی پر اثر گولہ باری کے لئے موجودہ زمانے میں

ضروری ہیں، فہرست میں داخل نہیں ہیں۔ میں نے جب وزیر صاحب کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تو انہوں نے کہا: "آپ خود فیکٹری کے نمائندوں سے بات کریں، اور اگر ممکن ہو تو ان نئے آلات کو بھی فہرست میں داخل کر دیں، اور اگر وہ نہ مانیں تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں نے توپوں کی قیمت اور خریداری کے بارے میں دستاویز پر دستخط کر دیئے ہیں"۔

میں اب بڑی مشکل پوزیشن میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ نئے آلات گولہ باری کے بغیر جو پر اثر گولہ باری کرنے میں کام آتے ہیں، ان نئی توپوں کی اہمیت کچھ زیادہ نہ ہوگی۔ نیز میں یہ بھی جانتا تھا کہ ترکی حکومت نے جب بوفورس فیکٹری سے نئی پہاڑی توپیں خریدی تھیں، تو توپوں کی ساخت کے کام کی نگرانی کرنے کے لئے ترکی ماہرین فن اسلحہ سازی کا ایک مشن سویڈن بھیجا گیا تھا، اور اس کا سارا خرچ بوفورس فیکٹری نے برداشت کیا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ سکوڈا فیکٹری بھی ایک ایسے مشن کا خرچ برداشت کرے۔

میں نے سکوڈا فیکٹری کے نمائندوں سے گفتگو شروع کی اور ان سے وہ آلات مانگے جو ہوا کی سرعت، ہوا کی حرارت اور ہوا کے درجہ رطوبت کو معلوم کرنے میں کام آتے ہیں۔ کیونکہ گولہ جب توپ کے منہ سے نکل کر ہوا میں سے جاتا ہے تو اس پر ہوا کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس تاثیر کے ٹھیک طور پر حساب کرنے پر گولے کا نشانے پر لگنا یا نہ لگنا موقوف ہوتا ہے۔ نیز توپوں کی گولہ باری کے حسابات کے لئے جدول انداخت (گولہ باری) اور جدول گرافک کی ضرورت ہوتی ہے، جو پرانے زمانے میں استعمال نہ ہوتے تھے۔ ان جدولوں کے علاوہ توپوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خچروں پر لادنے اور گولہ باری کی جگہ تک لے جا کر پھر ان کو جوڑ کر گولہ باری کے لئے تیار کرنے کے اصول اور قاعدوں کی ایضاح کرنے والی کتابوں (یعنی تعلیم نامہ اور تعریف نامہ) وغیرہ کا فارسی میں چھپوانا ضروری تھا۔ اور توپوں کی ساخت کی نگرانی کرنے کے لئے ایک ترکی ماہر توپ سازی کا مقرر کیا جانا اور میری سرکردگی میں ایک افغانی مشن کا چیکوسلواکیہ جانا اور اس کے سارے اخراجات کا فیکٹری کی طرف سے دیا جانا بھی لازمی تھا۔

فیکٹری کے نمائندوں کو ان سب امور کے منوانے میں مجھے کوئی تین ماہ لگ گئے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی فیکٹری کے جنرل منیجر کی منظوری کے بغیر کچھ نہ کر سکتے تھے، اور اس پر اڑے ہوئے تھے کہ چونکہ وزیر صاحب سمجھوتے پر دستخط کر چکے ہیں، اس لئے اس سمجھوتے میں درج شدہ سامان اور آلات کے سوا ان کو اور کوئی نیا سامان دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے آخر ان کو یہ لالچ

دیا کہ اگر وہ میرا تجویز کردہ سامان فہرست میں داخل کر دیں تو آئندہ افغانستان جتنا سامان جنگ یورپ سے خریدے گا وہ سب کا سب انہی کی فیکٹری سے لیا جائے گا۔ ان لوگوں پر اس بات کا اثر ہوا اور انہوں نے میرے تجویز کردہ سامان اور آلات کا فہرست میں داخلہ منظور کر لیا (اس سامان اور ان آلات کی قیمت دس ہزار پونڈ بنتی تھی) اور اپنے جنرل مینیجر سے بھی منظوری حاصل کر لی، اور ۵/فروری ۱۹۳۶ء کو اس نئے سامان اور ان جدید آلات کی فراہمی کے بارے میں جو دستاویز تیار کی گئی اس پر انہوں نے دستخط کر دیئے۔ افغان حکومت نے توپوں کی ساخت پر نگرانی کرنے والے مشن کی سرکردگی پر مجھے مقرر کر کے چیکوسلاواکیہ جانے کا حکم دے دیا۔ اس مشن میں افغانی وزارت جنگ نے کیپٹن عبدالمجید خان اور کیپٹن باز محمد خان کو میری مدد کے لئے مقرر کیا تاکہ توپوں کی ساخت کی نگرانی میں میرے ماتحت کام کریں۔ میں نے افغانی گورنمنٹ سے یہ بھی درخواست کی کہ ترکی سے ایک ماہر فن اسلحہ سازی منگایا جائے جو چیکوسلواکیہ میں رہ کر توپوں کی ساخت، ان کا معائنہ اور امتحان اور ان کی گولہ باری کا تجربہ کرانے کا ذمہ دار ہو۔ افغانی حکومت نے اپنے سفیر متعینہ انقرہ کو اس بارے میں حکم دیا کہ ترکی گورنمنٹ سے ایک ایسے ماہر کی خدمات حاصل کرے۔ چنانچہ میجر سعدالدین بک کو حکومت ترکی کی طرف سے اس کام کے لئے میرے ماتحت مقرر کر دیا گیا۔ اور وہ چیکوسلواکیہ کے شہر پلیزن میں جہاں سکوڈا کا کارخانہ اسلحہ سازی واقع ہے آ کر بعد میں مجھ سے ملاقی ہو گیا تھا۔

خانم کی ترکی کو روانگی

کابل سے یورپ کو روانہ ہونے سے پہلے میرے لئے ضروری تھا کہ خانم کو ترکی بھیج دوں۔ وہ ایک سال سے اس انتظار میں تھی کہ اگر توپوں کی خریداری کا فیصلہ ہو اور مجھے اس کام کے لئے یورپ بھیجا جائے تو وہ استنبول آ کر چند دنوں اپنے بھائی اور رشتہ داروں سے ملے اور پھر یورپ میرے پاس آ جائے۔

توپوں کی خریداری کی نگرانی کا کام مجھے ملنے پر وہ ۱۸ فروری ۱۹۳۶ء کو قصر شاہی میں ملکہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ شہید کو خدا حافظ کہنے گئی اور اس کے بعد وزیر جنگ کی بیگم شہزادی قمرالبنات صاحبہ کی طرف سے الوداعی چائے پر مدعو ہوئی۔ وزیر صاحب کے گھر اسی وقت اتفاق سے ملکہ

اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ بھی موجود تھیں۔ یہاں اس نے ان سے بھی رخصت لی۔

میں اگلے روز اس کے ساتھ کابل سے ہندوستان کی سرحد کی طرف روانہ ہوا، تاکہ اس کو کم از کم (طورخم) تک جو ہندوستان جاتے ہوئے آخری افغانی چوکی ہے، پہنچا دوں۔ کابل میں رہنے والے ترکوں میں سے اکثر اصحاب اس کو خدا حافظ کہنے کیلئے بگرامی کے مقام تک آئے جو کابل سے جلال آباد جاتے ہوئے پہلا پڑاؤ مانا جاتا ہے۔ عبدالحکیم جان بھی ہمارے ساتھ تھے۔

۲۰ فروری کو ہم موٹر پر جلال آباد اور وہاں سے ڈکہ اور پھر طورخم پہنچے۔ یہاں خانم سے رخصت ہوا۔ ہندوستان کی سرحد تک اس طرح آنے کے باوجود وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے سے محروم رہنے کی وجہ سے مجھے سخت رنج ہوا۔ میں بمشکل اپنے آنسو روک سکا۔ خانم سے رخصت ہو کر میں کابل کو لوٹنے کے لئے ایک لاری پر سوار ہوا، اور خانم موٹر پر پشاور کو روانہ ہوئی۔

اس کے بعد کے حالات میں پھر اس کی ڈائری سے خلاصۂ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

پشاور میں عبدالحکیم جان نے اس کے سامان کو ریل کے ذریعہ کراچی بھیجنے کا انتظام کیا۔ خانم نے کابل میں فارسی سیکھ لی تھی۔ اس لئے حکیم جان نے سفر میں اس کی ترجمانی اور مدد کرنے کے لئے اس کے ساتھ اپنا ایک فارسی جاننے والا نوکر کر دیا۔ خانم ۲۱ اور ۲۲ فروری کو لاہور میں فلیٹیز Flaties ہوٹل میں ٹھہری اور عبدالحکیم جان کی اہلیہ صغریٰ بیگم کے ساتھ سیر اور خرید و فروخت کے لئے بازار گئی۔ ۲۲ فروری کی صبح کو خانم ریل پر دہلی روانہ ہوئی۔ میں نے بھائی صاحب کو خط لکھ دیا تھا کہ خانم لدھیانہ سے گزرتی ہوئی ان سے اسٹیشن پر ملے گی۔ اس سے پہلے خانم اور بھائی صاحب نے ایک دوسرے کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہم نے اشارت مقرر کی تھی کہ خانم لدھیانہ میں گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر ایک سرخ رومال ہلائے گی۔ چنانچہ اس اشارت کے ذریعے انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بھائی صاحب مرحوم کے ساتھ میرے ماموں زاد بھائی چوہدری عبدالحق بھی تھے۔ وہ دونوں لدھیانہ سے گاڑی پر سوار ہو کر انبالہ تک آئے اور راستے میں عبدالحکیم جان کے نوکر کی مدد سے خانم سے بات چیت کرتے رہے۔ انبالہ کے اسٹیشن پر بھائی صاحب اور چوہدری صاحب خانم سے جدا ہوئے اور وہ دہلی اور آگرہ کی سیر کے لئے آگے روانہ ہو گئی، اور وہاں سے ۲۶ فروری ۱۹۳۶ء کو پھر انبالہ بھائی

صاحب کے گھر آئی۔ بھابھی صاحبہ (مرحومہ) نے ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق اس کے گلے میں ایک ہار ڈالا۔

یہاں ہی خانم میری ہمشیرہ صاحبہ (مرحومہ) اور میری بھتیجی سعیدہ سے ملی۔ ان سب نے خانم کا اتنے خلوص سے خیر مقدم کیا کہ وہ آج تک ان کے اظہار محبت کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ اس نے ہمشیرہ صاحبہ (مرحومہ) اور بھابھی صاحبہ (مرحومہ) اور سعیدہ کو کچھ تحفے دیئے۔ انہوں نے بھی خانم کو اپنے ملک کی دستکاری اور مصنوعات کے قیمتی نمونے بطور ہدیہ اور بطور تحفہ کے دیئے۔ ان تحفوں کے باعث اس کے اسباب میں ایک سوٹ کیس کا اضافہ ہو گیا۔

خانم ان سے شام کو رخصت ہو کر لاہور کے راستے ۲۸/فروری کو کراچی پہنچی۔ اس کو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس کا وہ سامان جو پشاور سے کراچی بھیجا گیا تھا، ابھی تک نہیں آیا تھا۔ حالانکہ کراچی سے جہاز اسی روز بصرہ کو جانے والا تھا۔ اس لئے اس کو اگلے جہاز کے انتظار میں کراچی میں ایک ہفتہ ٹھہرنا پڑا۔ یہاں اتفاق سے اس کو ڈاکٹر نور محمد (مرحوم) کا بھتیجا جو ایک دفعہ کابل میں ہمارے گھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چائے پر آیا تھا، مل گیا۔ اس نے اس کی کافی مدد کی جس سے وہ بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ حکیم جان کا فارسی دان نوکر اس کا کافی روپیہ خرچ کرا رہا تھا۔ غالباً وہ اپنی تنخواہ کے علاوہ خانم کے لئے بازار سے خرید و فروخت کرانے میں اپنے لئے کچھ کمیشن بھی اینٹھ لیتا تھا۔

خانم ۹/ مارچ ۱۹۳۶ء کو کراچی سے بصرہ کو جہاز پر روانہ ہوئی اور ۱۲ مارچ کو بصرہ میں اتری۔ کسٹمز میں اس کا سامان کھولا گیا۔ حالانکہ وہ عراق سے ٹرانزیٹ گزر رہی تھی۔ اس وجہ سے اس کو کافی دقت پیش آئی۔ اگر کسٹمز والے اس کا سامان مہر کر دیتے جس سے راستہ میں اس کے کھلنے اور چور بازار میں بیچا جانے کا امکان نہ رہتا، تو ان مشکلات میں نہ پڑتی، اور عراقی حکام کو جو ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنے اسباب میں سے کوئی چیز کسٹمز دیئے بغیر عراق میں نہ بیچ دے، وہ بھی زائل ہو جاتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ملکوں میں سفر کرنے والے لوگوں کو آسانی بہم پہنچانے کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ خانم کا سفر بصرہ سے لے کر ترکی سرحد تک بھی کافی تکلیف دہ رہا۔ وہ آخر کار ۱۹ مارچ ۱۹۳۶ کو خیریت سے استنبول پہنچ کر اپنے بھائی سے مل گئی۔

میں نے ڈکہ سے ۲۰ فروری کو کابل واپس آ کر چیکوسلاواکیہ جانے کی تیاریاں شروع کیں۔

ان کے متعلق تفصیلات اور باقی حالات کو میں اپنے ان خطوط سے یہاں نقل کرتا ہوں جو میں نے وقتاً فوقتاً کابل سے خانم کو بھیجے تھے اور جو اس نے فائل میں لگا کر آج تک بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھے تھے۔

میں ۲۶ مارچ ۱۹۳۶ کو کابل سے عبدالمجید خان اور باز محمد خان نام افغانی افسروں کے ساتھ روانہ ہوا اور خانہ آباد کے راستے روس پہنچا۔ افغانستان میں یہ بارشوں کا موسم تھا۔ جس سے ندیوں اور نالوں میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس سے ہمیں راستہ میں کافی مشکلات کا سامنا ہوا۔ ہمیں کابل سے روسی سرحد تک پہنچنے میں سات دن لگے۔ یہاں سے ہم ۱۰ اپریل کو ماسکو پہنچے۔

ماسکو میں ہم افغانی سفارت میں اترے۔ اگلے روز میں ہوٹل لکس میں محمد علی (احمد حسن) کو جس کا ہندوستان میں خوشی محمد نام تھا، دیکھنے کے لئے گیا۔ اگرچہ مجھے اس کے خیالات پسند نہ تھے، اور نہ ہی میں اس کے سیاسی عقیدے کا قائل تھا، کیونکہ وہ کمیونسٹ بنا ہوا تھا۔ لیکن پرانی دوستی اور ہم جماعتی کی وجہ سے اس کو ملے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنی بیوی فاطمہ اور اپنی لڑکی یاسمین کے ساتھ ہوٹل میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پرانے حالات سنائے اور بتایا کہ وہ ایک دفعہ خفیہ طور پر ایک جہاز پر سوار ہو کر مدراس گیا تھا، تاکہ وہاں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں سے تعلق پیدا کرے اور جب اس کو انگریزوں کے ہاتھ پڑنے کا اندیشہ ہوا تو وہاں سے ایک جہاز پر خفیہ طور پر سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

میں نے دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھایا جس کو اس کی بیوی نے اپنے کمرے میں خود پکایا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا کہ وہ ایسی تنگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ روسی اس کو پھر خفیہ طور پر ہندستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی بچی کے ساتھ اس کے وطن یوگوسلاویہ کو بھیج دے۔ اس نے مجھے درخواست کی کہ جب وہ پراگ سے گزرے تو میں اس کی مدد کروں۔

میرا چیکوسلاواکیہ پہنچنا

میں افغانی افسروں کے ساتھ ماسکو سے ۱۲ اپریل کو روانہ ہو کر ۱۵ اپریل کو پراگ پہنچ گیا۔

پراگ کے ریلوے اسٹیشن پر ہمیں سکوڈا فیکٹری کے نمائندے ملے۔ ہم اس رات (Shrob ek) ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہاں مجھے تو بحیثیت پریذیڈنٹ مشن خریداری اسلحہ کے ایک Suite (بیٹھک والا کمرہ) ملا۔ افغانی افسر دو کمروں میں ٹھہرے۔ یہاں سے ہم اگلے روز پلیزن آئے، جہاں سکوڈا کی اسلحہ سازی کی فیکٹری واقع ہے۔ یہاں کارخانہ والوں نے شہر کے باہر اپنا ایک ہوٹل بنایا ہوا ہے جس میں صرف وہ لوگ ٹھہرائے جاتے ہیں جو سکوڈا فیکٹری سے ہتھیار خریدنے کو پلیزن آتے ہیں۔ یہاں میجر سعدالدین بک ترکی ماہر اسلحہ سازی بھی اپنی بیوی کے ساتھ ۱۵/ اپریل کو پہنچ گیا۔ [اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ جو فوٹو کچھ عرصہ بعد ہم نے اتروایا تھا۔ وہ آخر میں درج ہے]۔ (۳۳)

سکوڈا فیکٹری کے ساتھ جو کونٹریکٹ افغانی گورنمنٹ نے میرے مشورے کے بعد کیا تھا سعدالدین بک نے اس کو میرے ساتھ مل کر پڑھا اور اس میں کچھ اور سامان اور آلات کے زیادہ کئے جانے کے بارے میں مجھے ایک تجویز پیش کی۔ ان آلات کو اب فیکٹری سے مفت لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ کابل میں وزیر جنگ سردار محمود خان کے کونٹریکٹ پر دستخط کر دینے کے بعد میں نے فیکٹری کے نمائندوں سے بہت سا سامان لے لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے فیکٹری کے منیجر سے گفتگو کی اور آخر میں اس کو سعدالدین بک کے تجویز کردہ سامان کو ہمیں مفت دینے پر راضی کر لیا۔ اس نئے سامان کی قیمت کوئی تین ہزار پونڈ تھی۔

ہمارے مشن کے علاوہ اس ہوٹل میں ایک ایرانی مشن کے ممبر، دو امریکن اور چند ایک یوگوسلاوی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہوٹل کا باغ بہت دل افزا تھا۔ اس میں ٹینس کورٹ بھی تھا۔ اس ہوٹل میں بھی میں ایک سوٹ (suite) میں ٹھہرا تھا۔ ہمارے مشن کے سارے ممبر سکوڈا فیکٹری کے مہمان مانے جاتے تھے۔ اس لئے ہمارے سارے اخراجات فیکٹری کی طرف سے دیئے جاتے تھے۔ یہاں سے ہم ہر روز صبح کو ۸ بجے سکوڈا کی موٹر کار پر سوار ہو کر فیکٹری کو جو شہر پلیزن سے باہر کافی دور تھی، جایا کرتے تھے اور وہاں دوپہر کے بعد دو بجے تک توپوں کے ڈھالے جانے اور دوسرے سامان کی تیاری کی نگرانی کے کام پر لگے رہتے تھے۔ جونہی توپوں کے مختلف پُرزے بنتے جاتے تھے ان کا ہم شرط نامہ اسلحہ سازی کے مطابق معائنہ کیا کرتے تھے اور سعدالدین بک ان کو مختلف فنی اصولوں پر پرکھا کرتا تھا۔ یہاں اس کام میں ہمیں کوئی ڈیڑھ سال لگا۔ اس عرصے میں جو اور واقعات پیش آئے ان کا یہاں مختصر ساذکر کرنا بے جا نہ ہو گا۔

میرا فرانس سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا کا سفر

سکوڈا فیکٹری توپیں تو خود بناتی تھی لیکن ان کے لئے گولہ بارود فرانس کی شنائڈر فیکٹری میں بنوایا کرتی تھی۔ اس طرح توپوں کی گولہ باری کی جگہ سے لے کر جو جنگ میں دشمن کی نگاہ سے اوجھل رکھی جاتی ہے، محل ترصد تک جو کسی اونچی جگہ پر اور دشمن کی صفوں کے نزدیک ہوتا ہے، اور جہاں سے دشمن کی کارروائیاں نظر آ سکتی ہیں، خبر رسانی کے لئے ٹیلیفون اور دوسرے ذرائع رسل و رسائل ضروری ہوتے ہیں۔ سکوڈا فیکٹری ان کو سوئٹزرلینڈ سے خریدا کرتی ہے، اور دشمن کی ان کارروائیوں اور حرکتوں کا پتہ لگانے کے لئے جو دوربین بیٹری اور توپوں کی شست لگانے کے لئے جو دوربین توپ اور آلہ نشان وغیرہ لازم ہوتے ہیں، ان کو آسٹریا کے کارخانوں میں تیار کرایا کرتی تھی۔ گولہ بارود کی نگرانی کے لئے مجھے متعدد دفعہ میجر سعدالدین بک اور دو افغانی افسروں کے ساتھ فرانس جانا پڑا۔ اسی طرح آلات خبر رسانی کی ساخت کو دیکھنے کے لئے سوئٹزرلینڈ اور دوربینوں اور آلہ نشان کی پڑتال کرنے کو آسٹریا اور براٹسلاوا جانا پڑا۔ ہمارے سفر کا سارا خرچ سکوڈا فیکٹری کے ذمے تھا۔ ایک دفعہ پیرس کے سفر میں سکوڈا کے یان نام انجینئر نے جو ہمارے ساتھ بطور مہمان دار کے تھا، یہ غلطی کی کہ پراگ سے ہمارے خرچہ کا سارا روپیہ بنک کے ذریعہ پیرس بھیج دیا اور اپنے پاس نقد کوئی رقم نہ رکھی۔ پیرس پہنچ کر ہم (Regina) ہوٹل میں اترے اور پراگ کے بنک سے روپے کے فرانسیسی بنک میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اتوار کو تو بنک بند ہوتے ہی ہیں۔ لیکن اس کے دو تین روز بعد بھی ہمارا روپیہ نہیں آیا۔ جس سے ہمیں ہوٹل میں کھانے وغیرہ کا خرچ دینے میں مشکل پڑی۔ آخر کار میں افغانی سفارتخانہ گیا۔ سفیر سردار شاہ ولی خان جو اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کے چچا ہیں، ان دنوں پیرس میں نہ تھے۔ اس لئے میں کونسلر سفارت اسلام بیگ سے ملا۔ وہ اگرچہ مجھے ذاتی طور پر نہ جانتے تھے لیکن غائبانہ میرا نام سن چکے تھے۔ جب میں نے اپنی مشکلات کا حال ان کو بتایا تو انہوں نے فوراً مجھے کچھ روپیہ قرض دے دیا۔ چند روز بعد سکوڈا فیکٹری سے پیسہ آ جانے پر میں نے ان کا روپیہ شکریہ کے ساتھ ادا کر دیا۔

خانم کا بلیزن آنا

خانم استنبول میں کوئی ڈیڑھ ماہ ٹھہری۔ اس عرصہ میں اس نے دو سال کی جدائی کے بعد

اپنے اکلوتے بھائی اور رشتہ داروں کو جی بھر کر دیکھ لیا تھا۔ میں بھی برلن میں اکیلا رہنے سے ذرا تنگ ہونے لگا تھا۔ اس لئے میں نے اس کو چیکو سلاواکیہ بلا لیا۔ وہ ۴ مئی ۱۹۳۶ء کو استنبول سے ریل پر چڑھی اور ۶ مئی کو پراگ پہنچی۔ اس کے پاس فیکٹری کے منیجر، مہماندار اور ہمارے دوسرے واقفوں اور دوستوں کے لئے بہت سے ترکی سگریٹ اور مشہور ترکی مٹھائی کے جس کا نام راحت حلقوم ہے لیکن بولنے میں لوقم کہا جاتا ہے، کئی ڈبے تھے۔ چیکو سلاواکیہ میں باہر سے آنے والا ایک شخص اپنے ساتھ صرف دو سو سگریٹ لا سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس اس سے زیادہ سگریٹ ہوں تو کسٹمز دینا پڑتی ہے۔ اسی طرح راحت حلقوم کی مٹھائی پر جس کو انگریزی میں (Turkish delight) کہا جاتا ہے، چونگی کا محصول لگتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زبان نہ جاننے کی وجہ سے انسان کو سفر میں کبھی کبھی فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب خانم چیکو سلاواکیہ کی سرحد پر پہنچی تو کسٹمز والوں نے اس سے سگریٹ اور مٹھائی کے بارے میں کچھ پوچھا۔ وہ ان کی بات نہ سمجھ سکی، اس لئے اس نے سر ہلا دیا۔ اس پر کسٹمز کا افسر کسی اور بات کے پوچھے بغیر اس کے ڈبے سے نکل گیا اور وہ کسٹمز دینے سے بچ گئی۔

میں اس سے پراگ کے ریلوے اسٹیشن پر ملا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس نے یہ دو دن کا سفر اکیلے اور کوئی غیر ملکی زبان جاننے کے بغیر کیسے پورا کیا۔

سردار شاہ محمود خان، وزیر جنگ افغانستان کا جرمنی آنا

میں اپنی عادت کے مطابق صبح کے آٹھ بجے سے لے کر دوپہر کو دو بجے تک فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا اور فیکٹری سے ہوٹل آکر دوپہر کے کھانے کے بعد توپوں کے بارے میں جو کتابیں فیکٹری والوں نے انگریزی میں مجھے دی تھیں، ان کا فارسی میں ترجمہ کر کے ان کو چھپوانے کی تیاریاں کیا کرتا تھا۔ ۲۰/ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو خبر آئی کہ سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ افغانستان Goiler (گلے کی سوج) کا آپریشن کرانے کو برلن آئے ہیں۔ میں ان سے ملنے، ان کی صحت کا حال معلوم کرنے اور توپوں کی ساخت کے بارے میں ان کو تفصیلات بتانے کے لئے ۱۸/ مئی کو برلن گیا۔ خانم بھی میرے ساتھ تھی۔ آپریشن جرمنی کے مشہور سرجن زاور برخ (Sourbrukh) نے کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرہم پٹی کرنے میں بے احتیاطی کی

وجہ سے زخم میں پیپ پڑ گئی تھی، جس سے وزیر صاحب کو بہت تکلیف ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد پیپ ختم ہو گئی اور زخم بھرنا شروع ہو گیا۔ اللہ نواز خان سفیر افغانی متعینہ برلن ہم سے ملنے کو ہمارے ہوٹل آئے۔ میں بھی بازدید کے لئے ان کے پاس سفارت خانہ افغانی میں گیا اور ان کو ان کی پوزیشن کی وجہ سے مبارک باد دی۔ ہم برلن میں ۲۴/ مئی تک رہے۔ اس عرصہ میں ایک روز شام کو وزیر صاحب نے مجھے، خانم کو، اللہ نواز خان، عبدالحکیم جان اور سفیر افغانی متعینہ روم کو جو ان دنوں برلن آئے ہوئے تھے، ایڈلن ہوٹل میں جہاں وہ خود ٹھہرے ہوئے تھے، اور جو ان دنوں برلن کا سب سے مشہور ہوٹل مانا جاتا تھا، کھانے پر بلایا۔ ایک دن اللہ نواز خان نے اور ایک روز افغانی بنک کے نمائندہ برلن نے بھی ہماری دعوت کی۔ اس ایک ہفتہ کے اندر ہم نے برلن کی خوب سیر کی۔ اور خانم نے برلن کی اس زمانے کی سب سے بڑی تجارتی کوٹھی (wertherm) سے کچھ خرید و فروخت کی۔ اللہ نواز خان نے بھی خانم کو کچھ تحفے دیئے۔

نئی توپوں سے گولہ باری کا تجربہ

سکوڈا فیکٹری نے وزیر صاحب کو دعوت دی کہ چیکو سلاواکیا آکر توپوں کو خود بھی دیکھیں۔ اس پر وہ ۶/ اکتوبر کو جنرل محمد عمر خان چیف آف سٹاف افغانستان اور نمائندہ نیشنل بنک افغانستان کے ساتھ پراگ آئے۔

انہوں نے نئی بنی ہوئی افغانی توپوں کی گولہ باری کا تجربہ کرانے کو کرنل محمد عارف خان کو مقرر کیا جو ترکی کے سٹاف کالج کا تعلیم یافتہ تھا (وہ بعد میں جنرل کے عہدے پر پہنچا اور چیکو سلاواکیہ میں افغانی سفیر مقرر ہوا تھا۔ اس تجربہ کے کامیاب ہونے پر جو فوٹو توپوں کے ساتھ ہم نے کھنچوایا تھا اس کی ایک نقل یہاں درج کی جاتی ہے (اس فوٹو میں افغانی فٹ بال ٹیم کے منیجر پرنس محمد یوسف خان کو بھی جو ٹیم کے ساتھ ان دنوں چیکو سلاواکیہ آیا ہوا تھا، شامل کر لیا گیا تھا)۔ (۳۴)

حکومت چیکو سلاواکیہ نے وزیر صاحب کو اپنے ملک کے دوسرے اسلحہ سازی کے کارخانے بھی دکھلانا چاہے۔ اس لئے میں پراگ سے وزیر صاحب کے ساتھ سلاویا کے شہر برنو

گیا تاکہ کارخانہ مشین گن سازی کو دیکھ سکوں۔ لیکن وہاں وزیر صاحب نے مشین گنوں کی خریداری کے لئے جیسی کہ امید تھی کوئی آرڈر نہیں دیا۔

برونو سے چیکوسلاواکیہ حکومت نے وزیر صاحب کے لئے استانبول جانے والی ریل کے ساتھ ایک سپیشل گاڑی لگائی۔ برونو سے چلتے ہوئے جو فوٹو ان کے ساتھ لیا گیا تھا، اس کی نقل کتاب کے آخر میں دی جاتی ہے۔ (۳۵)

وزیر صاحب چیکوسلاواکیہ سے ویانا آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہاں انہوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو میری خدمات سے خوش ہو کر میری تنخواہ بڑھا کر پچاس پونڈ ماہوار کر دی اور دو سال کے لئے میرا کنٹریکٹ ملازمت اور بڑھا دیا گیا اور مجھے حکم دیا کہ جب تک ساری افغانی توپیں تیار ہو کر کابل روانہ نہ کر دی جائیں، میں چیکوسلاواکیہ میں رہوں۔

وزیر صاحب یہاں سے استانبول اور انقرہ گئے اور وہاں سے ایران کے راستے جلدی ہی افغانستان کو لوٹ گئے۔ کیونکہ وزیر اعظم افغانستان سردار محمد ہاشم خان بیمار ہو گئے تھے اور معالجہ کے لئے جرمنی آنے پر مجبور تھے۔

وزیر اعظم افغانستان کا جرمنی آنا

وزیر اعظم صاحب اکتوبر کے مہینے کے آخر میں برلن آئے۔ شاہی طبیب رفقی بک ان کے ہمراہ تھے۔ وزیر اعظم صاحب کے معالجہ کے دوران میں مَیں دو تین دفعہ ان سے ملنے کو برلن گیا۔ میں نے وہاں ان کو افغانی توپوں کی ساخت کے بارے میں مفصل معلومات دیں۔ آخری ملاقات میں مَیں نے ان سے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ بعض افغانی افسروں اور سرکاری ملازموں نے آپ سے میری غیبت کی ہے اور کہا ہے ظفر حسن توپوں کی ساخت کے کام کو طول دے رہا ہے تاکہ یورپ میں مزہ کی زندگی بسر کرتا رہے۔ نیز میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ لوگ اس پر بہت چیں بہ جبیں ہیں کہ افغانی حکومت نے مجھے باوجود اس کے کہ نہ میں افغانی رعایا ہوں اور نہ افغانی نژاد ہوں، توپوں کی ساخت کی نگرانی کرنے والے مشن کا صدر مقرر کیا ہے، اور افغانی افسروں کو میری ماتحتی میں دے دیا ہے"۔

اس پر وزیر اعظم صاحب نے یہ جواب دیا۔ "آپ کے بارے میں آج تک کوئی شکائت میرے کان تک نہیں پہنچی ہے اور اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ان توپوں کو اتنے سستے داموں پر نہ خرید سکتے تھے، اور نہ ہی اتنے آلات اور سامان جنگ ہم کو مفت مل سکتا تھا۔ آپ کو بے خبر لوگوں کی شکایت کی پروا نہیں کرنا چاہئے۔ پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہوں اور پیغمبروں پر بھی نکتہ چینی کیا کرتے ہیں"۔

میں نے وزیر اعظم صاحب کا ان تسلی بخش الفاظ اور مجھ پر اعتماد کرنے کے باعث دل سے شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت ہو کر چیکوسلاواکیہ واپس آ گیا۔

ہمارے مشن کے ممبروں کو فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ جاتے ہوئے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے پراگ میں فیکٹری کے خرچ پر یہاں کے بہترین ہوٹل Alcoron میں ٹھہرایا جاتا تھا، جہاں میرے لئے مشن کا ہیڈ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایک سوٹ (بیٹھک والا کمرہ) ریزرو کرایا جاتا تھا۔

میرا توپوں کے پرزوں کے فوٹو گرافوں کا البم تیار کرنا

میں ویانا سے واپس آ کر افغانی توپوں کے پرزوں کے فوٹو گرافوں کا البم تیار کرنے میں مصروف ہوا جو طالب علموں اور افسروں کو توپ کا استعمال سکھلانے کے لئے ضروری تھا۔ یہ کام کئی ماہ جاری رہا۔ کیونکہ ہر پرزے کے تیار ہو جانے کے بعد اس کا فوٹو لیا جاتا تھا اور اس کا نام فارسی میں ایک چٹ پر ٹائپ کر کے اس کے نیچے چپکا دیا جاتا تھا، اور پھر اس چٹ کے ساتھ فوٹو کا فوٹو لیا جاتا تھا جو اس کام میں بڑا دل تنگی کا باعث ہوتا تھا۔ افغانی افسروں کے ساتھ خانم نے بھی میری بڑی مدد کی تھی۔

اس کام کے ساتھ توپوں کے فیر کرنے کے اصولوں، توپوں کے فیر کرنے کے طریقوں اور توپوں کے پرزوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کو خچروں پر لادنے اور ان کو گولہ باری کی جگہ پر پھر جوڑ کر توپ سے فیر کرنے کے قاعدوں کے بارے میں جو کتابیں میں نے انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کی تھیں، ان کو دونوں افغانی افسر فارسی کے ٹائپ رائٹر سے لکھ کر چھپنے کے لئے تیار کیا کرتے تھے۔

چیکوسلاواکیا کی سیر

انہی دنوں سکوڈا فیکٹری کے منیجر نے ہم سب کو چیکوسلاواکیہ کے مختلف قابل دید مقامات کی سیر کرائی۔ ہم ۶ جولائی ۱۹۳۶ء کو کارلسباد گئے۔ یہاں روماٹیزم، جگر اور معدہ کی بیماریوں کے معالجہ میں فائدہ دینے والے گرم پانی کے چشمے ہیں۔ اس شہر کا کرسٹل شیشہ کا کارخانہ بھی بہت مشہور ہے۔ ہم اسی طرح ۲۶ جولائی کو کونسٹینٹن باد اور ۲۹ جولائی کو مارین باد گئے۔ یہ بھی صحت افزا مقام ہیں، اور یہاں بھی گرم پانی کے شفابخش چشمے ہیں، جہاں دنیا کی ہر جگہ سے مالدار مریض آکر اپنا معالجہ کراتے ہیں۔

کارخانہ مُرمّت کاری اسلحہ کی خریداری کا خیال

میں چاہتا تھا کہ افغانستان نئی توپیں خریدنے کے بعد کارخانہ مرمت کاری اسلحہ (جس کو کابل میں مشین خانہ کہا جاتا تھا) کے لئے ماڈرن مشینری لے۔ اس لئے میں نے افغان گورنمنٹ سے پوچھے بغیر اپنی ذمہ داری پر سکوڈا فیکٹری کے منیجر سے اس کام کے لئے موڈرن مشین مہیا کرنے کے بارے میں گفتگو کی۔ میرا خیال یہ تھا کہ اگر سکوڈا فیکٹری ایسی مشینوں کو سستے داموں دے دے تو افغانی گورنمنٹ کو ان کے فوائد سمجھا کر ان کے خریدنے پر راضی کروں۔ مگر اس گفتگو کے دوران میں سکوڈا کے نمائندے نے مجھے کہا کہ "اگر آپ سکوڈا فیکٹری سے مشین خانہ کے لئے نئی مشینری لینے کا افغانی گورنمنٹ کے ساتھ ہمارا سمجھوتہ کرادیں تو آپ کو دس فیصد کمیشن دیا جائے گا"۔

مجھے اس کی بات پر بڑا غصہ آیا کہ وہ مجھے کمیشن دے کر ایک قسم کی رشوت دینا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ "اگر افغان گورنمنٹ ایسی مشینری خریدنا بھی چاہے تو میں تمہاری اس تجویز کے بعد سکوڈا فیکٹری سے ایسی مشینری خریدنے سے منع کر دوں گا۔ کیونکہ میں تاجر نہیں ہوں جو سکوڈا سے کمیشن لے، بلکہ میں افغان گورنمنٹ کا نمائندہ ہوں جس کا فرض گورنمنٹ کے مفاد کی حفاظت ہے"۔

اتفاق سے انہی دنوں عبدالحکیم جان مرحوم (۱۹ اگست کو) اپنی بیگم کے ساتھ لندن سے پراگ آئے۔ میں بھی خانم کے ساتھ ان سے ملنے پراگ گیا۔ عبدالحکیم جان نے سکوڈا کے منیجر کو کہا کہ "آپ کے آدمیوں نے ظفر حسن کے سامنے ایسی تجویز کر کے سارا کام بگاڑ دیا ہے۔" چنانچہ میں نے افغانی گورنمنٹ کو اس کے بعد ایسی مشینری کی خریداری کے لئے کوئی تجویز پیش نہ کی۔

ہمارا پھر پیرس جانا

فرانس سے گولہ بارود تیار ہو جانے کے بارے میں خبر آنے پر ہم مشن کے سب ممبر یکم ستمبر ۱۹۳۶ء کو پیرس گئے۔ اس دفعہ انجینئریان نے جو پھر ہمارا مہماندار مقرر ہوا تھا پہلے سفر کی طرح غلطی نہ کی اور روپیہ اپنے ساتھ لایا۔ میری خانم اور سعدالدین بک کی خانم بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم ایک دن پیرس میں ریجینا ہوٹل میں ٹھہرے اور اگلے روز بارہ بجے دوپہر کو شہر بورڈو کو جہاں افغانی توپوں کا گولہ بارود بنا تھا، روانہ ہوئے۔ ہم نے انجینئریان سے کہا، معلوم کرے کہ ریل میں کھانے کی گاڑی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہم نے دوپہر کو ریل پر سوار ہونے سے پہلے کھانا نہ کھایا تھا۔ اس نے غالباً اس بارے میں لاپرواہی برتی اور بغیر تحقیق کے ہمیں کہہ دیا کہ ریل کے ساتھ ڈائننگ کار لگی ہوئی ہے۔ پیرس سے روانہ ہونے کے بعد ایک بجے ہم نے اس سے کہا کہ "چلیں اور ڈائننگ کار میں دوپہر کا کھانا کھالیں،" اس پر اس نے گارڈ سے پوچھا کہ ریل کے ساتھ ڈائننگ کار ہے یا نہیں۔ اس کو معلوم ہوا کہ کھانے کی گاڑی اس ریل کے ساتھ نہیں لگائی گئی ہے۔ کیونکہ ریل شام کو بورڈو پہنچ جائے گی۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا، اور اس نے راستہ میں ایک اسٹیشن سے ہمارے لئے کچھ ٹوسٹ اور گوشت کے بنے ہوئے سینڈوچ لے لئے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ "سینڈوچ میں جو گوشت ہے وہ سؤر کا گوشت ہے یا بکرے کا" تو اس نے جواب دیا کہ "سور کا گوشت ہے" ہم نے اس کو بتایا کہ "سور کا گوشت کھانا ہمارے لئے حرام ہے" اس پر اس نے سینڈوچ سے گوشت نکال کر خود کھالیا اور روٹی ہم کو دینا چاہی۔ ہم نے اس کو بتایا کہ "ہم اس روٹی کو بھی نہیں کھا سکتے کیونکہ اس کو سور کا گوشت چھو گیا ہے" اس پر اس کو بہت تعجب ہوا اور کہنے لگا "آپ لوگ بڑے متعصب اور قدیم خیال واقع ہوئے

ہیں۔ "اس کی اس بے وقوفی کی وجہ سے ہم اس روز بھوکے ہی رہے۔

بورڈو تک ہمارا ریل کا سفر اچھا رہا۔ لیکن فرانسیسی ریل گاڑیاں اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ ڈبے ڈگمگاتے رہتے ہیں۔ جس سے ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ گاڑی پٹڑی سے اتر جائے گی۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا سانحہ پیش نہیں آیا۔

بورڈو پہنچ کر ہم ایک ہوٹل میں اترے اور اگلے روز آرکاشوں گئے جو سمندر کے کنارے ایک صحت افزا مقام ہے۔ یہاں ہم نے دوپہر کا کھانا باروت گولہ باری کے کارخانہ کے منیجر کے مہمان کے طور پر کھایا۔ بورڈو اپنی شراب کی نفاست کی وجہ سے فرانس کے سب شہروں سے زیادہ مشہور ہے۔ انجینئریان کے منہ میں تو بورڈو کی شراب کو مفت پینے کی امید کی وجہ سے پانی بھر آیا تھا۔ لیکن میں نے منیجر کو کہا کہ "میں شراب بالکل نہیں پیا کرتا۔" اس پر منیجر کارخانہ نے دسترخوان سے شراب بالکل اٹھا دی۔ میں نے اصرار کیا کہ جو شخص شراب پینا چاہتا ہے اس کے لئے آرڈر کر دے۔ لیکن اس نے مشن کے ہیڈ ہونے کی وجہ سے میری اتنی پاسداری کی کہ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے نہ خود شراب پی اور نہ ہی کسی اور کو دی۔

ہم ۴ ستمبر تک بورڈو میں رہے۔ لیکن منیجر نے ہمارے سامنے کبھی شراب نہ پی اور نہ کسی کو پلائی۔ انجینئریان جو ہر روز شراب پینے کا عادی تھا اس سے بڑا چیں بہ جبیں ہوا۔ لیکن ہم خوش تھے کہ ہم نے اس سے اس کی لاپرواہی کا جس کی وجہ سے ہم بورڈو آتے ہوئے بھوکے رہے تھے، کچھ بدلہ تو لے لیا۔

میری اقبال شیدائی سے ملاقات

۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو پیرس آکر میں اقبال شیدائی سے ملا۔ اس کی فرانسیسی بیوی جو اس وقت میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی، اس کے ساتھ تھی۔ یہ شیدائی صاحب سے ماسکو کے بعد میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے اس کے کاروبار اور گزارے کے بارے میں اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ۱۹۴۹ء میں میں جب پاکستان گیا تو اس کے بھائی سے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد وطن آیا تھا۔ لیکن پھر واپس چلا گیا تھا اور اب اٹلی کے شہر میلان میں اُردو کا پروفیسر ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس جیسے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار نوجوان کی خدمت سے

پاکستان نے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا۔ (اس کے ساتھ جو فوٹو ہم نے پیرس میں کھنچوایا تھا اس کی ایک نقل یہاں کتاب کے آخر میں دی جاتی ہے۔ (۳۶))

ہم نے دو دن پیرس کی سیر کی اور عجائب گھر جیسی شہرہ آفاق جگہوں کو دیکھا اور ۸ ستمبر کو پھر واپس پلیزن آ گئے۔

خوشی محمد کی بیوی کا پراگ آنا

۲۱/ ستمبر ۱۹۳۶ء کے دن احمد حسن (خوشی محمد) کی بیوی فاطمہ اور اس کی لڑکی یاسمین ماسکو سے پراگ آنے والی تھی۔ اس لئے میں اور خانم پلیزن سے پراگ آئے اور اس سے ملے۔ ہم نے اس کو اور اس کی بچی کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور اگلے روز ان کے ویزے اور کسٹمز کے کاموں کو ختم کرا کے ان کو یوگوسلاویا روانہ کر دیا۔ ان سے اب بھی میری کبھی کبھار خط و کتابت ہو جاتی ہے۔ یاسمین تعلیم پا کر ڈاکٹر بن چکی ہے اور ان کی ماں ٹائپسٹ کے طور پر کسی جگہ کام کرتی ہے۔

میری خانم کا استنبول واپس جانا

چیکوسلاواکیہ میں ترک بہت کم تھے۔ ترک سفارت خانہ پراگ میں ہونے کی وجہ سے ترکی سفیر اور ان کا سٹاف سب پراگ میں رہتے تھے۔ پلیزن میں ترکی قونصل خانہ نہیں تھا۔ اس لئے یہاں ہمارے سوا صرف میجر سعد الدین بک اور اس کی بیوی دو ترک ایسے تھے، جن سے ہمارا میل ملاپ تھا۔ میجر صاحب کی بیوی حاملہ ہونے کی وجہ سے اکثر صاحب فراش رہتی تھی۔ اس وجہ سے میری خانم کا دل یہاں تنگ ہونے لگا تھا۔ اس پر میں نے اس کو ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو استنبول واپس بھیج دیا۔ تاکہ جب تک میں افغانی توپوں کو کابل روانہ کرا کے ترکی نہ آؤں، وہ وہاں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہ سکے۔

افغانی توپوں کے متعلق سکوڈا فیکٹری کے منیجر کی تجویز

افغانی توپیں جیسے جیسے تیار ہوتی جاتی تھیں، ان کی گولہ باری کا تجربہ کیا جاتا تھا۔ اور جیسا کہ

اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ان تجربوں کو دیکھنے کے لئے کبھی کرنل عارف خان آتا تھا اور کبھی افغان نیشنل بنک کا نمائندہ جو برلن میں رہتا تھا، آیا کرتا تھا، اور ایک دفعہ جنرل محمد عمر خان آیا تھا۔

ان تجربوں کے کامیاب ہونے سے ہم کو بہت خوشی تھی اور توپوں کو پے در پے افغانستان بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو رہی تھیں کہ سوڈٹ المان کے علاقہ کی وجہ سے جرمنی اور چیکوسلاواکیہ کے تعلقات خراب ہونے لگے۔ اس علاقے کی آبادی کی اکثریت جرمن نسل ہونے کی وجہ سے جرمنی اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، جس سے ان دونوں ملکوں کے درمیان لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس پر کارخانہ سکوڈا کے ایک منیجر نے کہا کہ "جرمنوں سے لڑائی کا خطرہ ہے اور ہماری حکومت کو توپوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ افغانی توپیں ہماری حکومت کو دے دیں تو ہم افغانستان کے لئے ایک سال کے اندر نئی توپیں بنا دیں گے۔ اگر آپ افغان گورنمنٹ کو اس پر راضی کر لیں تو ہم آپ کو کافی کمیشن دیں گے"۔

مجھے یہ تجویز بہت بری معلوم ہوئی کیونکہ انہوں نے مجھے روپے کا لالچ دیا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی فضا پر جنگ کی ڈراؤنی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اگر لڑائی ہو گئی تو پھر شاید سکوڈا کو نئی توپیں بنانا نصیب نہ ہو گا۔ کیونکہ جرمنی چیکوسلاواکیہ پر بآسانی قبضہ کر لے گا۔

اس لئے میں نے منیجر کی تجویز کو فوراً نامنظور کر دیا اور اس کو کہہ دیا کہ "اگر افغانی توپوں کی ساخت میں ایک روز کی بھی دیر ہوئی تو ان کا کنٹریکٹ توڑ دیا جائے گا اور سکوڈا فیکٹری کو اس کے بعد ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا"۔ اس منہ توڑ جواب پر وہ منیجر خاموش ہو گیا اور ساری افغانی توپیں مقررہ تاریخ تک رفتہ رفتہ افغانستان بھیج دی گئیں۔ جب میرے بعض دوستوں نے یہ واقعہ سنا تو انہوں نے مجھے کہا کہ "ایسے موقعے سے آپ نے کیوں فائدہ نہ اٹھایا۔ آپ اس طرح فیکٹری کے خرچ پر ایک سال اور یورپ میں رہ سکتے تھے اور فیکٹری سے کمیشن بھی لے سکتے تھے"۔ لیکن میں ان کو یہی جواب دیا کرتا تھا کہ "میں کوئی تاجر نہیں ہوں کہ کمیشن لوں۔ میں افغانی گورنمنٹ کا نمائندہ ہوں۔ اس لئے اس کے مفاد کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے"۔ غریب افغانستان نے بمشکل ان توپوں کی خریداری کے لئے روپیہ فراہم کیا تھا۔ اگر یہ توپیں تیار ہو جانے پر چیکوسلاواکیہ کو دے دی جاتیں تو افغانستان کو ایک سال اور ان توپوں کا انتظار کرنا پڑتا اور اس عرصہ میں خدا جانے دنیا کا کیا حشر ہوتا۔ (چنانچہ ایک سال بعد ہٹلر نے سوڈٹ المان کے صوبہ کی وجہ سے چیکوسلاواکیہ سے لڑائی کی اور اس کو مغلوب کر کے اس کو اپنی

نو آبادی بنا لیا اور اس کو سارے ہتھیاروں سے محروم کر دیا۔ اگر میں سکوڈا والوں کی تجویز مان جاتا تو بیچارے افغانستان کی توپیں کبھی کابل نہ پہنچتیں، بلکہ جرمنوں کے قبضہ میں ہوتیں)۔

نئی توپوں کی گولہ باری کا آخری تجربہ

آخری افغانی بیٹری کی گولہ باری کا تجربہ کامیابی سے ۱۲/جنوری ۱۹۳۷ء کو عمل میں آیا۔ اس روز فیکٹری کے جنرل منیجر مسٹر لیمبرسکی نے ایک دعوت دی جس میں ہمارے مشن کے ممبروں کے علاوہ فیکٹری کے کوئی تیس مدیر اور کارکن شامل تھے۔ مسٹر لیمبرسکی نے جو تقریر اس تقریب پر کی اس میں میرے متعلق خاص کر مندرجہ ذیل الفاظ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

"ہماری قوم ایک چھوٹی سی قوم ہے لیکن ہم محنت کشی اور سنجیدگی سے کام کرنے کے دلدادہ ہیں، اور جو شخص محنت سے اپنا کام کرے اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ آپ نے یہاں بڑی جان فشانی سے کام کیا ہے۔ اس لئے ہم آپ کے کام کو بہت سراہتے ہیں۔ اور اس کا یقین رکھتے ہیں کہ افغانی حکومت بھی جس کے آپ نمائندے ہیں، آپ کی خدمت کی قدر کرے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا یہ سفر چیکوسلاواکیہ کا آخری سفر نہ ہو گا۔ بلکہ آپ پھر بھی یہاں آئیں گے اور آپ کو پھر یہاں دیکھنے سے ہم کو بڑی خوشی ہو گی"۔

اس تقریر کا جواب دیتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"میں آپ کا اور فیکٹری کے دوسرے اہلکاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سب نے ہمارے کام میں ہماری پوری طرح مدد کی۔ لیکن ہمارے مشن نے آپ لوگوں کو کافی تنگ کیا۔ کیونکہ ہم ہر روز کوئی نہ کوئی نیا آلہ کنٹریکٹ سے خارج آپ سے طلب کرتے رہے۔ میں اپنی اس عادت کے مطابق آج بھی آپ سے ایک بات کی درخواست کروں گا (اس پر سب نے قہقہہ لگایا) میرا آخری مطالبہ یہ ہے کہ آپ دوسرے غیر ملکی مشنوں کے کام کو ذرا پیچھے ڈال کر ہمارے مشن کے کام کو ذرا جلدی سرانجام دیں اور ہماری توپوں کی آخری بیٹری کو (ٹریسٹ) کی بندرگاہ سے جو جہاز ۱۰ فروری کو روانہ ہونے والا ہے، اس پر لاد دیں"۔

اس کے جواب پر مسٹر (بینڈر) نے جو بار برداری کے کام کا منیجر تھا، وعدہ کیا کہ وہ ہماری

آخری بیٹری اور اس کے سارے سامان کو اس جہاز پر چڑھا دے گا۔ اس کے بعد وہ بہت جوش میں آیا۔ میرے لئے اپنا شراب کا گلاس اٹھا کر ایک گیت جس کی ابتدا "زندہ باد زندہ باد" سے ہوتی تھی، گانا شروع کر دیا۔ اس پر باقی چک مدعوین بھی اس کے ساتھ گانے میں شریک ہو گئے۔

ہماری آخری بیٹری کے چیکوسلاواکیہ سے روانہ ہونے پر یکم فروری ۱۹۳۷ء کو پلیزن میں ہمارے ہوٹل میں فیکٹری کی طرف سے ہمیں آخری دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں جنرل منیجر مسٹر لیمبرسکی کے نمائندے کی حیثیت سے اسلحہ سازی کے شعبہ کا منیجر موجود تھا۔ اس نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی، اس میں میرے متعلق یہ پر معنی الفاظ استعمال کئے۔

"آپ ایک مشرقی آدمی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اپنے فرائض کے سخت پابند ہیں اور بہت محنت کش واقع ہوئے ہیں۔ آپ اپنے ہر کام کو بہت باقاعدہ کرتے ہیں۔ آپ نے ہم لوگوں کو بھی محنت کشی اور باقاعدگی سکھلا دی ہے"۔

میری استانبول کو واپسی

فیکٹری کا دستور تھا کہ آخری دعوت سے پہلے مشن کے صدر کو فیکٹری کی طرف سے ایک تحفہ جو اس کو پسند ہو، دیا جائے۔ مجھ سے بھی اسلحہ سازی کے منیجر نے ایک دفعہ اپنے اس اصول کا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس وقت اس کو جواب دیتے ہوئے تحفہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ منیجر نے میرے اس انکار کو میری خاکساری سمجھا اور میرے لئے ایک سونے کا فونٹین پین تحفہ کے طور پر بنوایا اور اس دعوت کے موقعے پر مجھے دینا چاہا۔ لیکن میں نے بڑی نزاکت اور سنجیدگی سے اس کو لینے سے انکار کر دیا، جس پر اس کو بہت تعجب ہوا۔

اس دعوت میں میں نے منیجر سے کہا کہ آخری بیٹری کے ساتھ اسی جہاز پر اپنا ایک مستری بھی افغانستان بھیجے۔ تاکہ جب میں وہاں پہنچ کر افغانی حکومت کے ارکان کو توپوں کی گولہ باری دکھلاؤں تو وہ بھی وہاں موجود ہو اور اگر کوئی خرابی پیش آئے تو اس کو درست کرے۔

منیجر نے میری آخری درخواست کو بھی منظور کر لیا۔ حالانکہ کونٹریکٹ میں کوئی ایسی شرط موجود نہ تھی۔ اس سے مجھے بہت اطمینان ہوا کہ فیکٹری نے ان توپوں کا افغانستان میں بھی تجربہ کرانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ ہمارے مشن کے دو افغانی افسر کیپٹن عبدالمجید خان اور کیپٹن

باز محمد خان بھی اسی جہاز پر اپنے ملک کو روانہ ہو گئے۔ ان توپوں کا طرز استعمال سکھلانے اور ان کی گولہ باری کے اصولوں کو افغانی افسروں کو پڑھانے کے لئے جو کتابیں ضروری تھیں میں ان کو سکوڈا فیکٹری کے خرچ پر یورپ میں چھپوانا چاہتا تھا۔ اس بارے میں پیرس کے ایک چھاپہ خانہ سے ہماری خط و کتابت ہو رہی تھی مگر ابھی تک اس بارے میں وہاں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا۔ اس لئے مجھے کچھ مدت اور پلیزن میں رہنا پڑا۔ آخر کار جب پیرس سے اس بارے میں منفی جواب آیا تو میں نے فیکٹری کو یہ بات منوائی کہ یہ کتابیں افغانستان میں چھاپی جائیں، لیکن اس کا خرچہ فیکٹری دے۔

یہ سارے کام ختم کر کے میں نے ۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو کارخانہ والوں کو الوداع کہا اور افغانستان لوٹنے کے لئے استانبول کو روانہ ہو گیا۔ خانم کو چیکوسلاواکیہ سے یہ آخری فوٹو میں نے بھیجا تھا جو کتاب کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ (۳۷)

چوبیسواں باب

افغانستان کو میری واپسی

۱۱مارچ ۱۹۳۷ء کو استانبول پہنچنے کے سات دن بعد ۱۸مارچ ۱۹۳۷ کو میں انقرہ گیا تاکہ وزارت جنگ ترکی کو، افغان حکومت کی طرف سے میرے کونٹریکٹ خدمت کے دو سال اور بڑھا دیئے جانے کی خبر دوں، اور کابل جانے کی اجازت حاصل کروں۔ ان امور کا فیصلہ کرنے میں مجھے بارہ دن لگے۔ اس عرصہ میں کمانڈر انچیف افواج ترکی فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا (مرحوم) نے بھی مجھے باریابی بخشی اور وزارت خارجہ ترکی نے مجھے کابل کو سیاسی کوریر کی حیثیت سے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر میں ۱۱اپریل ۱۹۳۷ء کو پھر انقرہ گیا۔ وہاں سے مجھے اور خانم کو ڈپلومیٹک پاسپورٹ دیا گیا اور وزارت خارجہ کی جو ڈاک باطوم اور باکو کے ترکی قونصل خانوں اور تہران و کابل کی سفارتوں کے لئے تھی، میرے سپرد کی گئی۔ اس کے بعد میں ۱۸اپریل ۱۹۳۷ء کو استانبول لوٹا۔

ترکی سیاسی کوریر کے طور پر سرکاری ڈاک کے ساتھ روس سے بہ خیر گزرنا ایک بہت مشکل کام تھا۔ میں نے کابل میں رہتے ہوئے سنا تھا کہ روسی گورنمنٹ نے کئی دفعہ افغانی کوریر کو دھوکا دے کر اس کا ڈپلومیٹک بیگ جس میں افغانی سفارت خانہ کی خفیہ خط و کتابت کے کاغذات تھے، چرا لیا تھا۔ میں بھی اس قسم کے حادثے سے بہت ڈرتا تھا۔ کیونکہ اگر ترکی کی سیاسی ڈاک کسی طرح سے میرے ہاتھ سے نکل جائے تو ترکی میں میری فوجی اور سیاسی زندگی بالکل ختم ہو جانے کا ڈر تھا۔ مگر اس بھاری ذمہ داری کے ساتھ مجھے ڈپلومیٹک پاسپورٹ ملنے سے میرا یہ فائدہ ہوا کہ روس، ایران اور افغانی کسٹمز میں میرا سامان معائنہ اور پڑتال سے معاف رہا اور باطوم، باکو اور تہران میں ترکی نمائندے جن کو میری آمد کی خبر بذریعہ تار دی گئی تھی، میرے استقبال کو تیار تھے۔

انگریزوں کی وجہ سے میں ہندوستان سے گزر کر افغانستان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے کابل جانے کو میرے لئے صرف روس اور ایران کا راستہ تھا۔ مگر استانبول سے روسی بندر گاہ باطوم کو جانے والے جہاز بہت کم تھے۔ اس لئے مجھے استانبول میں کافی مدت انتظار کرنا پڑا۔

ہماری استانبول سے روانگی

آخر کار میں اور خانم ۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کو پیر کے دن استانبول سے دوپہر کے تین بجے ایک اطالوی جہاز پر سوار ہوئے جو بلغاریہ، رومانیہ اور روس کی بندر گاہوں سے ہوتا ہوا بحر اسود کے مغربی شمالی اور مشرقی سواحل کے ساتھ ساتھ چل کر باطوم جانے والا تھا۔

اس جہاز پر ہمارے سوا صرف ایک آسٹرین میاں بیوی تھے جو کہ نئے شادی شدہ تھے۔ وہ انگریزی نہیں بولتے تھے۔ اس لئے ان سے ہماری بات چیت نہ ہو سکی۔

ہمارا جہاز ۱۱ مئی کو بلغاریہ کی بندگاہ بورغاز پہنچا اور یہاں دو گھنٹے میں تجارتی مال اتار کر اور نیا مال لے کر بلغاریہ کی دوسری بندر گاہ وارنا کو روانہ ہو گیا۔ وارنا میں جہاز سے روئی کی گانٹھیں جو ہندوستان سے آئی تھیں، اتاری گئیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ ترکی بلغاریہ کے اتنے نزدیک ہونے کے باوجود کیوں بلغاریہ کو روئی بر آمد نہیں کر سکتا؟ جہاز یہاں سے لنگر اٹھا کر ۱۲ مئی کو رومانیہ کی بندر گاہ کونسٹینٹینا پہنچا اور وہاں ۱۳ مئی کی دوپہر تک مال لادتا رہا۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شہر کی سیر کے لئے خشکی پر اتر سکتے تھے، اور بخارسٹ (پایہ تخت رومانیہ) کو بھی جا سکتے تھے۔ لیکن میرے ساتھ ڈپلومیٹک بیگ ہونے کی وجہ سے ہم جہاز سے نہیں اترے۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ہماری سیاسی ڈاک کو خواہ مخواہ کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

ہم ۱۵ مئی کو صبح ۸ بجے روس کی نوور دیکی کی بندر گاہ پہنچے۔ یہاں روسی کارکنوں نے ہمارے جہاز کی بہت احتیاط سے تلاشی لی۔ معلوم ہوتا تھا کہ روسیوں کو اس کا ڈر رہتا تھا کہ کوئی جاسوس جہاز میں چھپا ہوا نہ ہو جو خفیہ طور پر ان کے ملک میں داخل ہو سکے۔ انہوں نے جہاز کی کیبن کی الماریاں بھی اچھی طرح سے تلاش کیں کہ وہاں روسی حکومت کے خلاف پراپیگنڈے کے پمفلٹ وغیرہ موجود نہ ہوں۔ جن کو خفیہ طور پر جہاز والے روسی لوگوں کو ان کی حکومت

کے بر خلاف بڑھکانے کے لئے روس میں داخل کر سکیں۔ یہ تلاشی کوئی چار گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد جہاز کو مال لینے میں بھی کافی دیر لگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ روسی لوگ جہاز کے لادنے اور خالی کرنے کے کام میں وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ بندر گاہ کے قلی بھی بہت ست تھے۔ ہمارے جہاز نے یہاں سے ۱۸ مئی ۱۹۳۷ء کو دوپہر کے ایک بجے لنگر اٹھایا۔

ہمارا روس میں داخلہ

جہاز ۲۴ گھنٹے بعد باطوم پہنچا۔ یہاں بھی روسیوں نے جہاز کے عملے وغیرہ کی پڑتال کی۔ جس سے ہم شام کے پانچ بجے سے پہلے جہاز سے نہ اتر سکے۔ اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی۔ لیکن ہمارے آنے کی خبر وزارت خارجہ ترکی کی طرف سے باطوم کے ترکی قونصل جنرل کو پہنچ چکی تھی۔ اس لئے ہمیں جہاز سے لینے کو قونصل خانہ کا سیکرٹری کامل امیر اللہ بک موٹر پر آیا ہوا تھا۔ اگر قونصل خانہ کی موٹر کار ہمارے لئے نہ آئی ہوتی تو ہمیں بار برداری کے لئے کوئی گاڑی نہ مل سکتی تھی۔ ہمارے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہونے کی وجہ سے کسٹمز میں ہمارا سامان نہ کھولا گیا۔ ترکی قونصل جنرل رشدی بک اپنے اہل وعیال کے ساتھ اسی جہاز پر واپس ترکی جا رہے تھے۔ میں ان کو ۱۹۳۳ء میں افغانستان جاتا ہوا باطوم میں ملا تھا۔ انہوں نے مجھے اس دفعہ بھی قونصل خانہ میں مہمان رکھا۔ وہ شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہم سے رخصت ہوئے اور رات کو جہاز پر سوار ہو گئے۔

اگلے روز ہم شہر کی سیر کے لئے نکلے۔ سڑکیں پکی اور آسفالٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ شہر میں باغیچے لگے ہوئے تھے۔ لیکن لوگوں کا لباس بالکل مزدوروں کے لباس کی مانند تھا۔ تجارتی اشیا بہت کم یاب اور مہنگی تھیں۔ میوہ تو بالکل ندارد تھا۔

ہم ۲۰ مئی کو دوپہر کے بعد دو بجے ریل پر سوار ہوئے۔ یہاں کی ریل میں بھی روس کی دوسری ریلوں کی طرح فرسٹ کلاس کی سلیپنگ کار میں ۴ بستر تھے۔ ہمارے پاس ڈپلومیٹک بیگ ہونے کی وجہ سے اس کے چرائے جانے کا ڈر تھا۔ اس لئے ہم دوسرے مسافروں کو اپنے ڈبے میں جگہ دینا نہ چاہتے تھے۔ ہم نے سارے ڈبے کو اپنے لئے ریزرو کرانا چاہا اور دو بستروں کی بجائے چاروں بستروں کا کرایہ ادا کرنے کو تیار ہوئے۔ لیکن اسٹیشن ماسٹر نے اس کو منظور نہ کیا

اور کہا کہ "روس میں روپیہ کے ذریعے دو شخص چار ٹکٹ نہیں لے سکتے اور ڈبے کو اپنے لئے ریزرو نہیں کرا سکتے"

ترکی قونصل خانہ کے سیکرٹری نے بمشکل اس کو یہ کہہ کر راضی کیا کہ یہ سیاسی کوریئر ہیں اور ڈپلومیٹک بیگ لے جا رہے ہیں۔ اس لئے ان کو یہ رعایت ملنی چاہئے۔

ہم نے کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ کار میں بھی جانا پسند نہ کیا کیونکہ ہم ڈپلومیٹک بیگ کو اپنے ڈبے میں چھوڑ کر وہاں سے باہر نہ جانا چاہتے تھے۔ خانم کو بھی ڈبے میں چھوڑ کر کھانے کے لئے میرا ڈائننگ کار میں جانا مناسب نہ تھا۔ اس لئے ہم نے کھانا اپنے ڈبے میں منگایا۔ کھانا بالکل معمولی اور بہت مہنگا تھا۔

ہم ۲۱ مئی کو باکو پہنچے۔ یہاں قونصل خانہ کا سیکرٹری جمال بک ہمیں اسٹیشن پر ملا، اور ہمیں انٹوریسٹ کے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ ہوٹل نیا نیا بنا تھا اور کافی صاف ستھرا تھا۔ ہم یہاں سے قونصل خانہ گئے اور ڈپلومیٹک بیگ کو قونصل فواد بنیل کے حوالہ کیا۔ میں ان سے بھی ۱۹۳۳ء میں افغانستان جاتا ہوا ملا تھا۔ فواد بک نے بھی اصرار کیا کہ ہم قونصل خانہ میں ٹھہریں۔ لیکن ہم نے ان کی مہمان نوازی کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا اور ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔

۲۲ مئی کو باکو سے ایران کی بندرگاہ پہلوی کو جہاز جانیوالا تھا۔ لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ چند دن باکو میں رہ کر وہاں کی سیر کریں۔ دوپہر کو قونصل فواد بک ہمارے ہوٹل میں آئے اور ہمیں ساتھ لے کر دوپہر کے کھانے کے لئے قونصل خانہ کو لوٹے۔ یہاں بھی دوپہر کا کھانا روسی اصول کے مطابق سہ پہر کو چار بجے کھایا جاتا تھا۔ کیونکہ لوگ ناشتہ صبح کو کافی دیر سے اور بڑی مقدار میں کھاتے ہیں۔ ان کا کھانا شام کو اکثر معمولی سا ہوتا ہے، جس میں زیادہ خوراک نہیں کھائی جاتی۔ شام کا کھانا عام طور پر کوئی دس بجے رات کو کھایا جاتا ہے۔

اگلے دن قونصل فواد بک نے ہمیں شہر کی سیر کرائی۔ شہر کے باہر پٹرول نکالنے والے پمپ ہر طرف نظر آتے ہیں۔ شہروں میں مزدوروں کے لئے گورنمنٹ نے بڑے بڑے اور کئی کئی منزلہ گھر بنوائے ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں رہنے والے لوگ ان گھروں کے مالک نہیں ہیں؛ اس لئے ان کی حفاظت، نگرانی اور مرمت کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے۔ اس وجہ سے اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے پڑے تھے۔

باکو سے جو پٹرول نکلتا ہے وہ پائپ لائن کے ذریعہ باطوم جاتا ہے اور وہاں سے ٹینکروں پر

لاد کر دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ باکو سے ہم ۲۶ مئی کو دوپہر کے بعد اڑھائی بجے جہاز پر سوار ہو کر پہلوی کو روانہ ہوئے۔ اس روسی جہاز میں مسافروں کو کھانا کھلانے کے لئے مردوں کی بجائے عورتیں کام کرتی تھیں۔ روس میں عام طور پر عورتیں مردوں کی طرح ہر قسم کا کام کرتی ہیں۔ مثلاً ٹراموے میں کنڈکٹر اور ٹراموے ڈرائیور بھی عورتیں ہی ہیں۔ عورتیں سڑکوں پر مزدور بن کر بھی کام کرتی ہیں اور ان کا لباس بھی معمولی مزدوروں کے لباس جیسا ہوتا ہے۔ روس میں اس زمانے میں جوتوں کی بڑی قلت تھی۔ ایک دوکان سے جوتا خریدنے کے لئے کئی ہفتہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ جو مال آتا تھا وہ ان لوگوں کو بیچ دیا جایا کرتا تھا جنہوں نے مدتوں سے اپنا آرڈر درج کرایا ہوا ہوتا تھا۔ ہم نے باکو میں کسی مرد کو اچھی ہیٹ لگائے ہوئے نہ دیکھا۔ سب لوگ کیپ پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر قونصل خانہ کے سیکرٹری جمال بک کو میں نے اس کی ہیٹ سے پہچانا تھا۔ کیونکہ وہی ایک شخص تھا جو پلیٹ فارم پر موجود لوگوں میں ہیٹ لگائے ہوئے تھا۔

ہمارا سرزمین ایران پر قدم رکھنا

ہم ۲۷ مئی کو صبح کے وقت بندرگاہ پہلوی میں اترے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روس سے ہم بخیریت نکل آئے اور سیاسی ڈاک کو بھی حفاظت سے اپنے ساتھ لا سکے۔

پہلوی سے ہم نے ایک موٹر کار کرایہ پر لی اور وہاں سے ۱۰ ۳۰ بجے روانہ ہو کر شام کو ساڑھے سات بجے قزوین پہنچے۔ ہم راستے میں سرسبز جنگلوں اور اونچے اونچے پہاڑوں سے گزرے۔ سڑک پختہ تھی اور موڑ کھاتی کھاتی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتی تھی۔ نظارہ بہت اچھا تھا۔ لیکن راستہ تنہا اور بھیانک سا تھا، جس پر لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔

اگلے روز ہم نے ایک اور بہتر موٹر کرایہ پر لی اور گیارہ بجے قزوین سے روانہ ہو کر شام کو ساڑھے سات بجے تہران پہنچے۔ پہلوی سے تہران کوئی تین سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ قزوین اور تہران کے درمیان کی سڑک اس وقت کچھ مرمت طلب تھی۔ اس لئے ہمیں کار میں کافی ہچکولے لگے اور دو دفعہ ٹائیر پھٹا۔

تہران پہنچتے ہی میں نے سرکاری ڈاک سفارتخانے کے حوالہ کی اور ہم فردوسی ہوٹل میں جا اترے۔ یہ ایک عالیشان اور خوبصورت ہوٹل ہے جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ رضا شاہ پہلوی

(مرحوم) کی ملکیت ہے۔ یہاں ہمیں ترکی ملٹری اٹیچی کیپٹن جلال بک اور سفارتخانہ کے ڈاکٹر نیازی بک (مرحوم) جو خانم کے بھائی کے ہم جماعت دوست تھے، آکر ملے۔ فردوسی ہوٹل میں اس وقت کچھ مرمت ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے ہم وہاں چنداں آرام نہ کر سکے اور اگلے دن (۲۹ مئی کو) ایران تور ہوٹل میں چلے گئے۔

تہران میں اس وقت بھی بڑی بڑی عمارتیں مثلاً نیشنل بنک، پارلیمنٹ ہاؤس وغیرہ موجود تھیں۔ قزوین سے تہران کو آتے ہوئے شہر میں داخل ہونے کی جگہ پر اور شہر سے مشہد کو روانہ ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکلنے کے موقع پر شہر کو زینت بخشنے والی عمارات موجود تھیں۔ سڑکیں بھی اچھی اور صاف تھیں۔ لیکن اس زمانے میں گندے پانی کی نالیاں اوپر سے کھلی تھیں، اور گندے پانی کے زیر زمین بہنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ گھروں میں نلکیوں سے پانی بھی نہ آتا تھا۔ لیکن اب سننے میں آیا ہے کہ گندے پانی کے بہنے کے لئے زیر زمین نل لگا دیئے گئے ہیں، اور گھروں میں نلکوں سے پانی آتا ہے۔

اس وقت تہران کے ہوٹل اور ریسٹورنٹ استنبول کے ہوٹلوں اور ریسٹورینٹوں کی طرح صاف ستھرے نہ تھے۔ ان دنوں میں سب سے اچھا کھانا (لوقانطہ) نام ریسٹورنٹ میں ملتا تھا۔ چلاؤ کباب ایران کا قومی کھانا سمجھا جاتا ہے۔ چلاؤ ایران کے باریک چاولوں کو پانی میں ابال کر بنایا جاتا ہے۔ وہاں پاکستان کی طرح چاولوں کو گھی میں بھون کر پلاؤ نہیں بنایا جاتا۔ تہران میں ان ابلے ہوئے چاولوں کو رکابی میں رکھ کر ان میں تھوڑا سا مکھن ملایا جاتا ہے اور کباب پلیٹ میں اس کے ساتھ رکھ دیئے جاتے ہیں۔

ہم نے ۳۱ مئی ۱۹۳۷ء کو تہران سے مشہد جانے کو ایک موٹر کار کرایہ پر لی اور بارہ گھنٹے میں کوئی ۳۵۰ میل قطع کر کے سبزوار پہنچے۔ ایران کی یہ سڑک بہت اچھی تھی۔ اس پر بین الاقوامی ٹریفک کی ساری نشانیاں موجود تھیں۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی (مرحوم) نے اس سڑک کے بنوانے پر خاص توجہ دی تھی اور تعمیر کے اثنا میں اس کا معائنہ بذات خود اس طرح کیا کرتے تھے کہ جہاں ان کا جی چاہتا سڑک کو کھدوا کر اس کی بناوٹ کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ اگر سڑک کی ساخت اس کے ٹھیکے میں مقررہ شرائط کے مطابق نہ نکلے تو وہیں ٹھیکیدار کو پھانسی دے دیا کرتے تھے۔

سبزہ وار کے شہر میں اس وقت کوئی اچھا ہوٹل نہ تھا۔ جس ہوٹل میں ہم اترے وہاں نہ ہاتھ

منہ دھونے کا انتظام تھا اور نہ ہی کھانا لذیذ تھا۔ ڈاکٹر نیازی بک (مرحوم) نے جو اس زمانے کے ایران کے حالات اچھی طرح جانتے تھے، تہران سے چلتے ہوئے کچھ کھانا بنوا کر ہمیں بطور زاد راہ دے دیا تھا۔ سبزوار آتے ہوئے اور سبزوار میں بھی ہم نے زیادہ تر اسی کھانے پر گزارہ کیا۔

ہم اگلے روز مشہد پہنچے۔ میں افغانی قونصل خانہ گیا۔ کیونکہ ترکی اور افغانی معاہدہ کے مطابق یہاں افغانی قونصل ترکی رعایا کے امور کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے افغانی قونصل میرا پرانا دوست مرزا باز محمد خان نکلا۔ میں نے اس سے افغانی ویزا لینے کے لئے اپنا پاسپورٹ اس کو دیا۔ اس نے میرا پاسپورٹ دیکھ کر مجھے کہا کہ "پاسپورٹ پر ایران سے باہر نکلنے کا ویزا موجود نہیں، اور آپ کا پاسپورٹ ڈپلومیٹک ہونے کے باوجود بھی اس ویزا کے بغیر آپ ایران کی سرزمین سے باہر نہیں جا سکتے ہیں۔ مشہد کے ایرانی حکام کو ویزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے پاسپورٹ کو تہران بھیجنا ہو گا، اور ایرانی وزارت خارجہ سے ویزا ملنے تک آپ کو مشہد میں رہنا ہو گا"۔

اس وجہ سے ہم پانچ روز مشہد میں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں ہم بہترین ہوٹل میں ٹھہرے۔ لیکن حسب خواہش آرام نہ کر سکے۔ ہم ۷ جون ۱۹۳۷ء کو مشہد سے پھر موٹر پر افغانی سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سڑک اچھی نہ تھی۔ اس لئے ۱۲۵ میل کا سفر ہمارے لئے کافی تکان دہ ثابت ہوا۔

ہمارا افغانستان پہنچنا

افغانی سرحدی چوکی پر پہنچ کر میں نے ہرات کو ٹیلیفون کر کے افغانی کمانڈر جنرل عبدالاحد خان کو جو ترکی کے سٹاف کالج کا تعلیم یافتہ اور استنبول سے میرا واقف تھا، اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اس نے ہرات میں ہمیں اپنے گھر میں مہمان رکھا اور ہماری بہت خاطر تواضع کی۔ اگلے روز کمانڈر نے ہمیں شہر کی سیر کرائی۔ ہرات ایک پرانا اور تاریخی شہر ہے۔ لیکن اس وقت وہاں نہ کوئی نئی عمارت تھی اور نہ ہی کوئی اچھا ہوٹل تھا، اور نہ ہی کوئی ترقی کا اثر نظر آتا تھا۔ اس شہر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بڑے بڑے گھروں میں ایک حوض بنا ہوتا ہے جس میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے۔ گھر کے کاموں کے لئے جتنا پانی درکار ہوتا ہے سب اسی حوض سے لیا جاتا ہے۔

اس لئے صفائی کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ ہرات میں گرمیوں میں ہر شام چالیس دن تک سخت ہوا چلتی ہے اور اگر یہ ہوا نہ چلے تو ان حوضوں کے پانی میں اتنی بو پیدا ہو جایا کرتی ہے کہ آدمی اس پانی کو استعمال نہیں کر سکتے۔

ہرات سے ہم نے ایک اور موٹر کرایہ پر لی اور ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو علی الصباح یہاں سے روانہ ہوئے۔ کیونکہ گرمی کی وجہ سے دوپہر کے وقت سفر کرنا ناممکن تھا۔ ہم نے رات فراہ میں گزاری۔ یہاں کے کمشنر نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کمانڈر ہرات نے اس کو ٹیلیفون سے کچھ حکم دے دیا تھا۔

اگلے روز ہم نے فراہ سے روانہ ہونے سے پہلے دل آرام کے پڑاؤ کو ٹیلیفون سے ہمارے لئے کھانے کا انتظام کرنے کو کہا اور دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ ہم ان پڑاؤں میں کھانے پینے میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ کیونکہ ندی اور کنوؤں کے پانی سے پیچش ہونے کا یا ٹائفائڈ کا بخار لگنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں پینے کے پانی کو ایک بڑی چائے دانی میں خوب ابال کر مٹی کی صراحی میں بھر دیا کرتا تھا اور ٹھنڈا ہونے کے لئے اس کو ایک ہوادار جگہ پر رکھ دیا کرتا تھا۔ ہمارے لئے پڑاؤ والے نے مرغ پلاؤ اور روٹی تیار کی تھی، مگر ہم اس کو نہ کھا سکے۔ کیونکہ مرغ کا گوشت نرم نہ ہوا تھا، اور چولھے کے دھوئیں کی وجہ سے پلاؤ میں دھوئیں کی بو پیدا ہو گئی تھی۔ ہم یہاں کی روٹی بھی نہ کھا سکے کیونکہ آٹے میں کچھ ریت ملی ہوئی تھی۔ اس لئے ہم اسی زادِ راہ پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوئے جو ڈاکٹر نیازی بک (مرحوم) نے ہمیں تہران سے چلتے ہوئے دیا تھا۔

۱۲ جون ۱۹۳۷ء کو ہم گرشک پہنچے۔ خانم ناکافی خوراک کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی اور جون کی گرمی اور دشت بقوہ میں سفر کرنے سے اتنی بے تاب اور بے سکت تھی کہ پڑاؤ پر گاڑی سے اتر کر سونے کے کمرے تک بہ مشکل پہنچی، اور وہاں جاتے ہی بستر پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس کو کچھ تھوڑی دیر بعد ذرا ہوش آیا۔ افسوس ہے کہ یہاں بھی کھانا ویسا ہی خراب تھا جیسا کہ دل آرام کے پڑاؤ پر تھا۔ ہم نے گرم چائے میں تہران سے اپنے ساتھ لائی ہوئی روٹی کے خشک ٹکڑے بھگوئے اور انہی کو نرم کر کے کھایا۔

خانم نے اپنے ملک میں کبھی ایسی گرمی نہ دیکھی تھی۔ اس کو ایسی بے سروسامانی اور بھوک کا بھی ساری عمر میں کبھی سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ مگر وہ ان تمام مشکلات کے باوجود اگلے دن پھر سفر

کو تیار ہو گئی اور ہم جوں توں کر کے بہ خیر قندھار پہنچ گئے۔ یہاں ہم ہوٹل میں اترے۔ میں قندھار کے گورنر سردار محمد داؤد خان سے ملنے گیا۔ داؤد خان اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) کے بڑے بھائی سردار محمد عزیز خان مرحوم کا بیٹا تھا (بعد میں افغانستان کا وزیر جنگ اور پھر وزیر اعظم بھی بنا تھا۔ اسی کی غلط خارجہ سیاست کی وجہ سے پاکستان اور افغانستان کے سیاسی تعلقات بھی خراب ہوئے تھے) وہ ایک مغرور سا آدمی تھا۔ میں اس کو اس کی کم سنی کے زمانے سے جانتا تھا۔ کیونکہ میں ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک افغانستان میں رہ چکا تھا۔

قندھار کا شہر اس زمانے میں پرانی حالت پر تھا۔ وہاں صرف ایک دو نئی عمارتیں نظر آتی تھیں۔ ہم یہاں دو دن رہ کر ۱۵ جون ۱۹۳۷ء کو غزنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں قندھار غزنی کی سڑک کچھ اچھی حالت میں نہ تھی۔ لیکن ہرات، قندھار کی سڑک سے اچھی تھی۔

غزنی کا شہر جو سلطان محمود کا پایہ تخت اور ایک زمانے میں علم و ہنر کا مرکز رہ چکا تھا، اب ایک بالکل چھوٹا سا شہر رہ گیا ہے۔ جہاں نہ شاہی محلات ہیں اور نہ ہی کوئی مشہور یادگاریں تھیں۔ یہاں صرف ایک مسجد کا مینارہ آنے جانے والوں کی نظر کو جذب کرتا ہے۔ یہ مینارہ اینٹوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کا بنا ہوا ہے اور ایک ہزار سال سے برف و باراں اور آندھیوں کے باوجود اپنی پرانی حالت پر کھڑا ہوا ہے۔ ہمیں تعجب ہوا کہ صرف یہ مینارہ کیسے باقی رہ گیا ہے۔ حالانکہ اس کی مسجد دوسری عالی شان عمارات اور محلات کی طرح پرانے زمانے کے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے خاک میں مل چکی ہے۔

ہمارا کابل واصل ہونا

ہم ۱۶ جون ۱۹۳۷ء کو کابل پہنچے۔ ہمارے ترک دوستوں نے خانم کو بہت کمزور پایا۔ کیونکہ راستہ کی مشقت نے اسے کافی نحیف کر دیا تھا۔ لیکن اس نے جلدی پرانی صحت اور طاقت حاصل کر لی۔

کابل آ کر میں نے دیکھا کہ ترکی فوجی مشن جس کی منظوری میں نے چیکوسلاواکیہ جانے سے پہلے وزیر اعظم محمد ہاشم خان اور وزیر جنگ شاہ محمود خان سے بڑی مشکل سے لی تھی کابل پہنچ چکا

تھا۔ اس میں کیڈٹ کالج میں پڑھائے جانے والے ہر جنگی مضمون کے لئے ایک معلم افسر داخل تھا۔

میرے کابل پہنچنے سے پہلے افغانی توپیں بھی چیکوسلاواکیہ سے آگئی تھیں۔ میں نے جون کے آخری ہفتہ میں ان توپوں کو اور ان سے متعلق سارے آلات اور سامان کو خیموں میں انتظام سے لگوایا تاکہ وزیر جنگ اور ان کا سٹاف اس کا بخوبی معائنہ کر سکیں۔ اس تیاری کے بعد میں نے وزیر صاحب سے معائنہ کے لئے آنے کی درخواست کی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ "اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ بہ نفس نفیس اس سارے سامان کو دیکھنے آئیں گے"۔

اعلیٰ حضرت اور وزیر جنگ ان توپوں اور سامان جنگ کے معائنہ سے بہت خوش ہوئے۔ اس موقعے پر جو فوٹو گراف اعلیٰ حضرت اور کمانڈر کیڈٹ کالج کے ساتھ میں نے کھنچوائے تھے، یہاں درج کیئے جاتے ہیں۔ (۳۸) (۳۹)

میرا نئی توپوں سے گولہ باری کرانا

اس کے ایک ہفتہ بعد ان نئی پہاڑی توپوں سے گولہ باری کرانے کے لئے ایک دن مقرر ہوا۔ اس روز گولہ باری کے میدان میں وزیر اعظم افغانستان سردار محمد ہاشم خان، وزیر جنگ شاہ محمود خان، باقی وزرائے سلطنت، افغانی وزارت جنگ کا سارا عملہ اور ترکی فوجی مشن کے سارے ممبر موجود تھے۔ میں نے چیکوسلاواکیہ سے آئے ہوئے مستری کو ساتھ لے کر توپوں کے پرزوں کو جوڑا اور گولہ باری کے لئے تیار کیا، اور اپنے طالب علموں میں سے چند ایک کو توپوں پر اور محل ترصد میں بطور نائک اور حوالدار مقرر کیا۔ جن نشانوں پر گولے برسائے جانیوالے تھے، ان کو خود وزیر جنگ نے مقرر کیا۔ توپوں سے یہ نشانے دکھائی نہ دیتے تھے۔ کیونکہ توپیں ایک پہاڑی کے پیچھے اوجھل رکھی گئی تھیں۔ یہاں سے آلہ نشان کے ذریعہ شست لگا کر میں نے فن توپچی کے اصول کے مطابق گولہ باری شروع کرائی۔ توپوں کی بہت درستی سے چلنے اور گولوں کے بالکل نشانوں کے اوپر پھٹنے سے وزیر جنگ اور باقی حاضرین بہت خوش ہوئے۔

اس تجربے کے بعد میں نے دو ماہ تک ان نئی توپوں کے استعمال کے قواعد ایک طرف تو کیڈٹ کالج کے طالب علموں کو پڑھانے، دوسری طرف افغانی توپ خانے کے افسروں اور نان کمیشنڈ افسروں کو ان توپوں کے چلانے کے اصول سکھلانے کے لئے دو کورس قائم کیے۔

میرے بھائی میاں محمود حسن اور چوہدری عبدالحق کا کابل آنا

میں نے اپنے دوبارہ افغانستان آنے سے فائدہ اٹھا کر اپنے بڑے بھائی صاحب میاں محمود حسن صاحب (مرحوم) کو لکھا کہ وہ مجھے کابل ملنے آئیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے ۲۳ سال ہو چکے تھے۔ ان سے ملنے کی میرے دل میں بڑی آرزو تھی۔ والد صاحب مرحوم کی زیارت تو مجھے اس دنیا میں ہندوستان چھوڑنے کے بعد نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ۱۹۲۰ء میں میری مفارقت سے تڑپتے ہوئے فوت ہو گئے۔ اس لئے میں بھائی صاحب سے جن کو میں اپنے لئے پدر مقام سمجھتا تھا، ملنے کی بڑی تمنا رکھتا تھا۔ وہ ہمارے ماموں زاد بھائی چوہدری عبدالحق کے ساتھ جن سے مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار تھا، ستمبر ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں افغانستان آئے۔ میں نے اور خانم نے ان کا کابل سے باہر ۱۲ میل کے فاصلے پر خیر مقدم کیا، اور ان سے ملنے کے بعد خدائے جامع المفارقین کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس دنیوی زندگی میں مجھے پھر ان سے ملا دیا۔ بھائی صاحب (مرحوم) کابل میں ۲۰ روز ٹھہرے جس کے بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ گئے۔ یہ جدائی ہمارے لئے بہت گراں تھی کیونکہ اس وقت ہمیں پھر کبھی ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میں انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان میں داخل نہ ہو سکتا تھا اور وہ کالے کوسوں کا سفر کر کے ترکی نہ آسکتے تھے۔ کابل میں جو فوٹو ہم نے ۱۵ ستمبر کو لیا تھا، اس کی ایک نقل یہاں درج کی جاتی ہے۔ (۴۰)

میرا کونٹریکٹ توڑنا اور ترکی واپس آنا

میرے فوجی مستقبل کی درخشانی اس پر منحصر تھی کہ ترکی واپس جا کر جلد از جلد سٹاف کالج میں داخل ہوں اور وہاں سے پاس ہو کر ترقی لوں۔ اس وقت کے ترکی فوجی اصولوں کے مطابق سٹاف کالج میں داخل ہونے والے افسروں کا کیپٹن ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ میں اس وقت صرف فرسٹ لیفٹیننٹ کے رینک پر تھا۔ میرے کیپٹن بننے کے لئے مجھے ترکی فوج میں کم از کم ایک سال تک ایک توپخانہ کی بیٹری کی کمان سنبھال کر، کمانڈری کے امتحان میں اچھے نمبر لینے کی ضرورت تھی اور کیپٹن بننے کے بعد مجھے سٹاف کالج میں داخلہ کا امتحان بھی پاس کرنا تھا۔ اس کے بعد سٹاف کالج میں تین سال تعلیم پانا ہوتا ہے۔ ترکی فوج کے اصولوں کے مطابق سٹاف کالج

سے پاس ہونے والے افسروں کو تین سال کی سینارٹی (قدم) دی جاتی ہے جس سے وہ سٹاف کالج میں تعلیم نہ پانے والے اپنے ہم جماعتوں سے تین سال سینئر بن جایا کرتے ہیں۔ میرے لئے سٹاف کالج میں پڑھنا اور وہاں سے ڈپلوم لینا کئی ایک لحاظ سے ضروری تھا۔

اول تو چونکہ میں آئندہ چل کر ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں ایک کمانڈر کے طور پر شریک ہونے کی آرزو رکھتا تھا۔ اس لئے اعلیٰ ترین فوجی تعلیم کو جو صرف سٹاف کالج میں دی جاتی ہے، حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے چونکہ میری عمر میرے ہم جماعتوں سے کوئی تیرہ چودہ سال زیادہ تھی، مجھے ۴۶ سال کی عمر سے پہلے میجر کا رینک حاصل کرنا تھا۔ ورنہ ترکی فوجی قانون کی وجہ سے مجھے ۴۶ سال کی عمر میں فوج سے ریٹائر ہونا پڑے گا۔ اس مجبوری ریٹائری سے بچنے کے لئے میرا جلد از جلد سٹاف کالج میں داخل ہونا اور وہاں سے ڈپلومہ لے کر تین سال کی سینارٹی حاصل کرنا لازمی تھا۔

اس لئے میں نے فوراً ترکی واپس آنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کی اطلاع افغانی وزارت جنگ کو دی (لیکن جیسا کہ آگے چل کر مفصل لکھا جائے گا، میری قسمت میں سٹاف کالج میں داخل ہونا اور وہاں سے ڈپلومہ لینا نہ تھا) جب سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ افغانستان کو میرے اس فیصلہ کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلا کر بہت سمجھایا اور مجھے ترکی واپس جانے سے باز رکھنے کے لئے کہا کہ "ترکی جا کر کیپٹن بننے اور سٹاف کالج سے ڈپلوم لینے سے آپ کو مادی طور پر کبھی اتنا فائدہ حاصل نہ ہو گا، جتنا افغانستان میں رہتے ہوئے اعلیٰ تنخواہ لے کر حاصل ہو رہا ہے"۔

مجھے تمغہ استور کا دیا جانا

لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اس پر انہوں نے اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ سے میرے فیصلہ کا ذکر کیا اور مجھے میری خدمات کے صلہ میں افغانی تمغہ استور (ستارہ) دیئے جانے کے لئے بادشاہ کے حضور میں سفارش کی۔ جب میں اس تمغے کو لینے کے لئے اعلیٰ حضرت کے دربار میں باریاب ہوا، تو اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ نے بھی مجھے افغانستان میں دو سال اور ٹھہرنے کے لئے کہا۔ لیکن میں نے ان سے بھی اپنی معذرت بیان کی اور عرض کیا کہ میرے فوجی مستقبل کے لئے

میرا ترکی واپس جانا اور سٹاف کالج میں تعلیم پانا ضروری ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے بھی ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو رخصت دے دی۔ اس تمغہ (استور) کے ساتھ جو فرمان شاہی مجھے اگلے دن ملا تھا، اس کا فوٹو یہاں درج کیا جاتا ہے۔ (۴۱) (۴۲)

اس فارسی فرمان کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

المتوکل علی اللہ

محمد ظاہر

بہ بفضل الٰہی بادشاہ افغانستان

کیڈٹ کالج کے سر معلم توپچی محترم ظفر حسن خان نے جو صادقانہ خدمات اور کوششیں کی ہیں ان کے صلہ میں ان کو شاندار تمغہ (استور درجہ سوم) سے سرفراز کیا جاتا ہے اور یہ فرمان ان کی خدمات کی تصدیق اور ان کے اس تمغہ کا مستحق ہونے کے ثبوت میں ہمارے حضور سے ان کو عطا کیا گیا ہے۔

بتاریخ ۵/ برج المیزان ۱۳۱۶ ہجری شمسی امضا شد

(بہ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۹۳۷ء)

دستخط شاہانہ
محمد ظاہر شاہ

سردار شاہ محمود خان نے اس کے علاوہ میری خدمات کی وجہ سے خانم کا واپسی کا خرچہ بھی دیا۔ حالانکہ ہمارے کنٹریکٹ میں اس بارے میں کوئی آرٹیکل موجود نہ تھا۔ سردار محمد ہاشم خان وزیر اعظم افغانستان نے خانم کو اور مجھے قصر زین العمارہ میں شام کے کھانے پر بلایا اور رخصت کے وقت شہر مرو کے بنے ہوئے دو غالیچہ کوٹ کے کالر پر لگانے کے لئے دو قرہ قولی کی کھالیں خانم کو بطور تحفہ دیں۔

خانم ملکہ صاحبہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ (مرحوم) اور ملکہ صاحبہ اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ اور بیگم وزیر صاحب جنگ کو بھی الوداع کہنے کو شاہی محل میں گئی۔ وزارت جنگ افغانستان کی طرف سے ایک خط میرے متعلق بطور اظہار خوشنودی کے سفیر افغانی مقیم انقرہ کے ذریعہ ترکی وزارت جنگ کو بھیجا گیا، جس میں میری خدمات کو بہت سراہا گیا تھا۔ اس کا ترکی ترجمہ ترکی

سفارت خانہ کابل کی طرف سے کیا گیا۔ یہ ترجمہ بھی افغانی وزارت جنگ کے خط کے ساتھ ترکی وزارت جنگ انقرہ کو روانہ کیا گیا۔ اس کی ایک نقل سفارت خانہ ترکی کی طرف سے مجھے بھی دی گئی جس کا فوٹو درج کیا جاتا ہے۔ (۴۳)

افغانی وزارت جنگ کے ترکی وزارت جنگ کو بھیجے ہوئے فارسی خط نمبر ۱۸۳ مورخہ میزان ۱۳۱۶ھ شمسی (بمطابق ۲۸ ستمبر ۱۹۳۷ء کے ترکی ترجمہ کا اردو ترجمہ۔

بہ وزارت جنگ جمہوریت ترکی

جمہوریت ترکی کے فوجی افسروں میں سے آرٹلری لیفٹیننٹ ظفر حسن بک ۴ نومبر ۱۹۳۳ء کو ہماری فوج میں کونٹریکٹ کے ساتھ خدمت پر مامور ہوئے اور کابل پہنچنے پر شاہی کیڈٹ کالج میں سر معلم توپچی کے طور پر مقرر کئے گئے تھے۔

ظفر حسن بک نے ہمارے کیڈٹ کالج میں اڑھائی سال بڑی محنت سے خدمت کی اور اس کام کے ساتھ ساتھ توپچی کی ایک میداتی بیڑی اور ایک پہاڑی بیڑی کے سپاہیوں کو قواعد سکھلا کر اپنی لیاقت اور کوشش مندی کا ثبوت دیا ہے۔

جب ہماری حکومت نے نئی توپیں خریدنے کا فیصلہ کیا تو ظفر حسن بک کو توپوں کا معائنہ اور قبول کرنے والی کمیٹی کا صدر بنا کر چیکوسلاواکیہ بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنے اس فرض کو ہماری خواہش کے مطابق سرانجام دیا۔ چیکوسلاواکیہ سے کابل واپس آکر انہوں نے ان نئی توپوں کے لئے تعلیم نامے، تعریف نامے اور گولہ باری کے جدول (گوشوارے) تیار کر کے ان کو چھپوایا، اور توپچیوں کے قواعد کے لئے پروگرام بنایا۔ توپچی کے افسروں اور نان کمیشنڈ افسروں کو تعلیم و تربیت دینے میں خدمت کی اور ان سے درسی اور جنگی گولہ باری کرائی۔

ان کے ساتھ ہمارا جو کنٹریکٹ تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ ہم ان کی اچھی خدمات کی وجہ سے اپنے دوست اور بھائی جمہوریت حکومت ترکی کی وزارت جنگ کو اظہار ممنونیت کرتے ہیں اور سر معلم موصوف کی کامیابی کے اور ترکی جمہوریت کی روز افزوں ترقی اور اقبال مندی کے تہ دل سے خواہاں ہیں۔

دستخط

وزیر جنگ افغانستان

شاہ محمود خان

یہ ملفوف فارسی خط کا ترجمہ ہے ریونیو سٹیمپ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تصدیق کا کام سٹیمپ لگائے بغیر اجراء ہوا ہے اور ۵ روپے بطور ٹیکس لئے گئے ہیں۔

مہر سفارت

[illegible]

[illegible] وزارت جنگ افغانستان کو روانہ کیا گیا [illegible]

گی جس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ (۲۳)

افغانی وزارت جنگ کے ترکی وزارت جنگ کو بھیجے ہوئے فارسی خط نمبر ۱۸۳ مورخہ [illegible] ت الف ۲

میزان ۱۳۱۶ھ شمسی (بمطابق ۲۸ ستمبر ۱۹۳۷ء) کے ترکی ترجمہ کا اردو ترجمہ۔

بہ وزارت جنگ جمہوریت ترکی

جمہوریت ترکی کے فوجی افسروں میں سے آرٹلری لیفٹیننٹ مظفر حسین بیگ [illegible] ۱۹۳۳ء کو ہماری فوج میں کنٹریکٹ کے ساتھ خدمت پر مامور ہوئے اور کابل پہنچنے پر شاہی کیڈٹ کالج میں معلم توپچی کے طور پر مقرر کئے گئے تھے۔

مظفر حسین بیگ نے [illegible] کیڈٹ کالج میں [illegible] سال بڑی محنت سے خدمت کی اور اس کام کے ساتھ ساتھ توپچی کی ایک میدانی بیٹری اور ایک پہاڑی بیٹری کے سپاہیوں کو قواعد سکھلا کر اپنی لیاقت اور کوشش مندی کا ثبوت دیا ہے۔

جب ہماری حکومت نے نئی توپیں خریدنے کا فیصلہ کیا تو مظفر حسین بیگ کو توپوں کا معائنہ اور قبول کرنے والی کمیٹی کا ممبر بنا کر چیکوسلواکیہ بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنے اس فرض کو ہماری خواہش کے مطابق سر انجام دیا۔ چیکوسلواکیہ سے کابل واپس آ کر انہوں نے ان نئی توپوں کے لئے تعلیم نامے، تعریف نامے اور گولہ باری کے جدول (گوشوارے) تیار کر کے ان کو چھپوایا اور توپچیوں کے قواعد کے لئے پروگرام بنایا۔ توپچی کے افسروں اور [illegible] کیڈٹ افسروں کو تعلیم و تربیت دینے میں خدمت کی اور ان سے درستی اور چستی کو گولہ باری کرائی۔

ان کے ساتھ ہمارا جو کنٹریکٹ تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ ہم ان کی اچھی خدمات کی وجہ سے اپنے دوست اور بھائی جمہوریت حکومت ترکی کی وزارت جنگ کو اظہار ممنونیت کرتے ہیں اور معلم موصوف کی کامیابی کے اور ترکی جمہوریت کی روز افزوں ترقی اور اقبال مندی کے دل سے خواہاں ہیں۔

دستخط

وزیر جنگ افغانستان

شاہ محمود خان

پچیسواں باب

کابل سے براستہ روس ہماری ترکی کو روانگی

ایران کے راستے سے افغانستان آتے ہوئے ہمیں سفر میں کافی تکلیف ہوئی تھی۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ روسی ہوائی جہاز پر جو ہفتہ میں ایک دفعہ باقاعدہ تاشقند سے کابل آیا کرتا تھا، ہم تاشقند جائیں، اور وہاں سے ریل پر ماسکو پہنچیں۔ اس لئے ہم نے روسی سفارتخانہ کے کارکنوں سے اس بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلے ہفتے جو ہوائی جہاز تاشقند سے کابل آئے گا وہ واپس جاتے ہوئے ہمیں تاشقند لے جائے گا۔ روسی سفارت خانہ سے ہم نے ماسکو اور اوڈیسہ کے راستے ترکی واپس جانے کے لئے ٹرانزٹ ویزا بھی لے لیا۔ لیکن جب روسی سفارتخانے کے عملے کو معلوم ہوا کہ میں ترکی افسر ہوں تو انہوں نے مجھے اور خانم کو ہوائی جہاز پر بھیجنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا "اب سردیاں شروع ہو رہی ہیں، اس لئے اس کے بعد روس سے کوئی ہوائی جہاز کابل نہ آئے گا"۔ اس پر ہم مجبور ہوئے کہ موٹر کار پر کابل سے چلیں اور (استالیف) ہیبک اور مزار شریف کے راستے روسی سرحد میں داخل ہوں۔ ہم اپنے ترک، افغان اور ہندوستانی دوستوں سے رخصت ہوئے، جو خدا حافظی کے لئے دور تک ہمارے ساتھ آئے۔

کابل سے ہماری روانگی

ہم نے ۲/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو کابل چھوڑا اور شام کو دو آب میخ زرین کے پڑاؤ پر پہنچے۔ راستہ بہت خراب تھا لیکن پڑاؤ پر ایک بہت عمدہ ہوٹل بنا ہوا تھا جس میں آرام کرنے سے ہماری ساری تکان دور ہو گئی۔ ہوٹل میں ہمارے سوا کوئی مسافر نہ تھا۔ اس لئے ہوٹل والوں نے ہمارے لئے کھانا

نہ بنایا تھا۔ پچھلی دفعہ ہرات سے قندھار جاتے ہوئے ہمیں کھانے کی خرابی سے جو مشکلات پیش آئی تھیں، ان کو مدنظر رکھ کر خانم نے کچھ مکرونی (اطالوی موٹی سیویاں) جن کو بہت جلد پکایا جا سکتا ہے اپنے ساتھ لے لی تھیں۔ اس لئے ہم نے یہی کھانا کھایا۔ رات کو میں نے سردار محمد ہاشم خان وزیر اعظم افغانستان کو ٹیلیفون کر کے ان کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کو آخری مرتبہ خدا حافظ کہا۔

اگلے روز یہاں سے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد روسی ہوائی جہاز تاشقند سے کابل جاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزرا۔ اس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ روسی سفارت خانہ نے ہمیں جان بوجھ کر ہوائی جہاز پر تاشقند نہ بھیجا تھا اور ہماری قسمت میں خشکی کے راستے کی تکالیف جھیلنا تھیں۔ دو آب میخ زرین کے بعد ہمیں ہندوکش کے پہاڑ پر چڑھنا پڑا۔ یہ راستہ بہت خطرناک تھا۔ سڑک کے ایک طرف سر بہ فلک پہاڑ اور دوسری طرف گہری وادی تھی۔ خدانخواستہ اگر موٹر میں کوئی خرابی ہوتی تو موٹر کا وادی میں گر جانا یقینی تھا۔ کیونکہ راستہ تنگ، خراب اور کافی موڑدار تھا۔ ہم دوپہر کو ایک گاؤں میں ٹھہرے۔

یہاں سے چلنے کے کچھ مدت بعد ڈرائیور نے دیکھا کہ اس کا بستره جو موٹر کار کے پیچھے بندھا ہوا تھا، کھل کر کہیں گر گیا۔ وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر موٹر پر اپنے بستر ے کی تلاش میں واپس گیا۔ گرمی سخت تھی۔ سورج سر پر پوری شدت سے تمتما رہا تھا۔ پاس کوئی درخت بھی نہ تھا کہ ہم اس کے سائے سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لئے ہم سڑک سے نیچے ایک نالہ کے کنارے پر اترے کہ پانی کی ٹھنڈک سے ذرا اپنی حرارت کم کریں۔ لیکن اس سے ہمیں کوئی زیادہ تسکین حاصل نہ ہو سکی۔ گرمی سے خانم کا دل دھڑکنے لگا۔ آخر ہم نے ایک چٹان دیکھی جس کے نیچے ذرا سایہ تھا۔ ہم اس کے سایہ میں سر کو چھپا کر بیٹھ گئے۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور جلد واپس آ گیا۔ کیونکہ اس کو نزدیک ہی اپنا بستره سڑک کے کنارے مل گیا تھا۔ ہم یہاں سے روانہ ہو کر سہ پہر کو چار بجے ہیبک کے پڑاؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک اچھا ہوٹل موجود تھا لیکن ہوٹل والے نے کھانا نہ پکایا تھا۔ اس لئے ہم نے پھر مکارونی پر گزارہ کیا۔

ہم ۴/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو دوپہر کے وقت مزار شریف پہنچے ہیبک سے چلنے سے پیشتر میں نے گورنر مزار شریف کو ٹیلیفون سے اپنے آنے کی خبر دے دی تھی۔ اس لئے اس نے ہوٹل میں ہمارے لئے کھانا تیار کرا دیا تھا۔ یہ شہر افغانی ترکستان کے صوبہ کا مرکز ہے اور یہاں روایت کے

مطابق حضرت علی مدفون مانے جاتے ہیں۔ ان کا مزار عوام کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ ہم بھی دوپہر کے بعد وہاں گئے۔ واپسی پر شام کے قریب گورنر اور فوجی کمانڈر مجھے ملنے آئے۔ ہم نے شام کا کھانا گورنر کے ہاں کھایا۔

ہم اگلے روز یہاں سے علی الصباح روانہ ہوئے۔ سڑک تو تقریباً نابود تھی۔ ہماری موٹر کار تقریباً دو گھنٹے بعد ایک فوجی چوکی پر پہنچی۔ اس کے بعد ریگستان اور ریت کے ٹیلے شروع ہو گئے۔ جہاں موٹر کار کا چلنا ناممکن تھا۔ گورنر نے ان مشکلات کو پیش نظر رکھ کر ہمارے سوار ہونے کے لئے ایک گھوڑا گاڑی جس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ہمارے سامان کے لادنے کے لئے ٹٹو تیار کرا دیئے تھے۔ دو سنتری ہماری حفاظت کی خاطر مقرر کر دیئے تھے اور مختلف چوکیوں کو ٹیلیفون کر کے ہمارے آنے کی خبر دے دی تھی۔

یہاں ہمارا سامان ٹٹوؤں پر لادا گیا اور ہم گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس ریگستان میں سڑک یا راستہ کا نام و نشان نہ تھا۔ کیونکہ شدید ہوا ریت کو ایک طرف سے دوسری طرف اٹھا کر نئے ٹیلے بنا دیتی تھی۔ گرمی اور ریت میں چلنے کی وجہ سے گھوڑے پسینہ میں تر ہو گئے۔ آخر کار ایک ایسی جگہ آئی جہاں گاڑی کا چلنا بھی ناممکن ہو گیا۔ میں اور خانم گاڑی سے اترے اور پیدل چلنے لگے۔ خانم کے لئے دوپہر کے قریب گیارہ بجے دھوپ میں ریگستان میں چلنا بہت مشکل تھا۔ ایک عورت جس نے ساری عمر شہر میں آرام دہ گھروں میں گزاری ہو، اس کے لئے اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا کافی مشکل تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی خانم نے ہمت نہ ہاری۔ اس کا ریت کے ٹیلوں میں سے پیدل گزرنا ایک ایسا واقعہ تھا جو صرف سینما کی فلموں میں دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ ہم آخر کار بہ صد مشکل ہموار اور بے ریت زمین پر پہنچے اور ہمارے پیچھے سے ہماری گاڑی کو سنتریوں اور کوچوان نے دھکیل دھکیل کر ان ریت کے ٹیلوں سے گزارا۔ اس کے بعد ہم پھر گاڑی پر سوار ہوئے اور آخر کار اس افغانی چوکی پر پہنچے جو دریائے آمو کے کنارے کے نزدیک افغانی سرحد پر خیموں اور مٹی کے گھروں کی بنی ہوئی تھی۔ یہاں چوکی کے فوجی کمانڈر نے اپنے سپاہیوں کی لائن بندی کرا کے میری سلامی لی۔ افغانی حکومت کے حکام اور افسروں نے راستے میں ہمیں آرام پہنچانے کی جتنی کوششیں کی تھیں، ان پر اس سلامی نے اور بھی طرہ لگا دیا۔ میری اس طرح پر عزت افزائی کو دیکھ کر خانم کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے نمناک ہو گئیں۔ میں بھی افغانی گورنمنٹ کی ان مہربانیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ہم نے دوپہر کا کھانا یہاں کے افسر کے ساتھ کھایا اور پھر گاڑی پر سوار ہو کر ایک گھنٹے بعد دریائے آمو کے کنارے پہنچے۔ افغانی کسٹمز میں معائنہ کے بعد ہم نے یہاں افغانی افسر کا شکریہ ادا کیا اور اس کو خدا حافظ کہہ کر روسی جہاز پر سوار ہو گئے۔

ہمارا روس میں داخلہ

ہم دریائے آمو کو جہاز پر کوئی ۱۵ منٹ میں عبور کر کے دو بجے کے قریب دوپہر کو پٹا کیسر یعنی ترمذ پہنچے۔ یہاں وارد ہوتے ہی ہمارے سفر میں مشکلات پڑنا شروع ہو گئیں۔ افغانستان سے روس کو آنے جانے والے مسافروں کی کمی کی وجہ سے اس روز روسی ویزا افسر اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ اس کو ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ دو مسافر آئے ہیں۔

اس نے آکر جہاز میں ہمارے پاسپورٹ دیکھنے کے بعد ہم کو ساحل پر اترنے کی اجازت دے دی۔ ساحل سے ویزا کے دفتر تک جانے کے لئے باربرداری کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ ہم نے یہاں دھوپ میں انتظار کرنا شروع کیا کہ شائد کوئی لاری وغیرہ آجائے جس پر سوار ہو کر ہم ویزا آفس تک جاسکیں۔ اتفاق سے ایک بڑا افسر وہاں سے گزرا۔ اس نے ہمیں انتظار کرتے ہوئے دیکھ کر ہم کو اپنی موٹر میں بٹھایا اور دفتر تک پہنچادیا۔ یہاں سے ہمیں کسٹمز آفس کو جانا تھا، جو شہر کے نزدیک تھا۔ لیکن یہاں بھی باربرداری کا کوئی ذریعہ میسر نہ تھا۔ ویزا آفس سے شہر کو ٹیلیفون کیا گیا۔ لیکن کوئی موٹر کار نہ ملی۔ آخر کوئی آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد دیکھا گیا کہ ایک لاری جس پر کچھ مزدور بھی سوار تھے وہاں سے گزر کر شہر کو جارہی ہے۔ ویزا افسر نے اس کو ٹھہرایا اور ہم کو سوار کر کے شہر بھیجنا چاہا۔ میں نے افسر کو کہا کہ خانم کو ڈرائیور کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن ڈرائیور نے اس کی بات نہ مانی۔ آخر کار خانم بھی میرے ساتھ مزدوروں کے ہمراہ لاری پر سوار ہوئی اور سارے راستہ میں لاری میں کھڑی رہی۔ ہچکولے کھاتی رہی اور بمشکل کسٹمز آفس پہنچی۔

یہاں ہمارے سامان کو کھولا گیا اور اس کی ایسی پڑتال کی گئی کہ ہم نے کبھی عمر بھر نہ دیکھی تھی۔ ہر کپڑے کو کھول کھول کر جھاڑا گیا۔ یہاں تک کہ سگریٹ کے ایک بڑے ڈبے کو جس میں ۱۰ سگریٹ کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے کھول کر کاغذ کے نیچے ڈبے کی تہہ کا بھی معائنہ کیا گیا۔ آخر میں ان انگریزی نوٹوں کی جانچ پڑتال کی باری آئی جو ہمارے پاس کابل میں میری تنخواہ سے

بچ رہے تھے۔ کسٹمز والوں نے ان نوٹوں کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے ایک کتاب نکالی جس میں ساری دنیا کے نوٹوں کی تصویریں تھیں۔ انہوں نے ہمارے نوٹوں کا انگریزی نوٹوں کی تصویروں سے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ اس معائنہ کے ختم ہونے تک شام ہو گئی۔

میرا خیال ہے کہ اس افسر کا مقصد ہمارے کپڑوں کو اس طرح پڑتال کرنے سے یہ دیکھنا تھا کہ ہم کوئی ایسا پمفلٹ یا کتاب تو اپنے ساتھ روس میں خفیہ طور پر داخل کرنا نہیں چاہتے جو کمیونسٹ نظام حکومت کے برخلاف ہو۔

اس پڑتال سے میں تو اتنا تنگ آیا اور سراسیمہ ہوا کہ خانم کے پاس جو سونے کی گھڑی اور زیورات تھے، ان کو کسٹمز میں دکھلا کر پاسپورٹ میں درج کرانا بھی بھول گیا۔ اس وجہ سے (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) ہم روس کی سرزمین سے ان قیمتی اشیاء کو اپنے ساتھ نکال نہ سکے۔

کسٹمز افسر کی پڑتال نے ہمارا اتنا وقت لے لیا کہ جب ہم شہر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ۶ بجے شام کو تاشقند جانے والی ریل گاڑی چلی گئی ہے۔ شہر میں اگلی گاڑی کا انتظار کرنے کے لئے جو صبح کے تین بجے جانے والی تھی کوئی آرام کی جگہ نہ تھی۔ لیکن ہمیں اتفاق سے دو افغانی نوجوان مل گئے جو پٹا کیسر میں کچھ کاروبار کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے کمرے میں، جو بہت ہی تاریک تھا، ہمیں آرام کرنے کو بلایا، اور ہمارے لئے کچھ کھانا تیار کیا۔ خانم تکان کی وجہ سے بے تاب تھی۔ اس نے کھانے کی بجائے ذرا سو جانا زیادہ اچھا سمجھا۔ یہاں کچھ آرام کرنے کے بعد ہم نے ریلوے اسٹیشن پر جانے کے لئے باربرداری کا ذریعہ تلاش کیا لیکن رات کو سٹیشن تک جانے والی کوئی موٹر کار نہ مل سکی۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ اتفاق سے ایک ایرانی جو افغانی رعایا کے کاموں کا بھی انتظام کیا کرتا تھا، اور جس کو میں ڈیڑھ سال پہلے چیکوسلاواکیہ جاتے ہوئے مل چکا تھا ان افغانی نوجوانوں سے ملنے آیا۔ اس نے ہماری مدد کا وعدہ کیا۔ لیکن اس کی اپنی موٹر کار کی بیٹری بہت کمزور ہو چکی تھی، اور موٹر کے انجن کو چلانے کے قابل نہ تھی۔ اس لئے اس نے کہا کہ وہ اپنے کسی دوست سے ایک بیٹری ادھار لے کر اپنی کار میں لگائے گا، اور عشاء کے بعد ہم کو اسٹیشن پر لے جائے گا۔ چنانچہ وہ بندہ خدا عشاء کے قریب آیا اور ہم کو اسٹیشن پر جو شہر سے کوئی دس میل تھا، لے گیا۔ ریل کا کمرہ انتظار (ویٹنگ روم) مسافر مرد اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرا

ہوا تھا اور ٹکٹ گھر (بکنگ آفس) کی کھڑکی کے سامنے مسافر ٹکٹ لینے کے لئے قطار باندھے کھڑے تھے۔ اس ایرانی نے ہم سے پیسے لے کر ریل کا ٹکٹ لینے کو ایک روسی مسافر کو جو اپنا ٹکٹ لینے کے لئے قطار میں کھڑا تھا دیئے۔ اور اس کو کچھ انعام دے کر اس سے ہمارے لئے ٹکٹ لینے کی درخواست کی۔ اگر وہ ایرانی ایسا انتظام نہ کرتا تو ہمارے لئے ٹکٹ لینا بہت مشکل ہوتا۔ کیونکہ میرے لئے خانم کو اکیلا چھوڑ کر قطار میں کھڑا ہونا اور ٹکٹ لینے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنا ناممکن تھا۔

ویٹنگ روم میں بنچ پر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسافر بھیڑ کی وجہ سے فرش پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض تو وہیں لیٹ کر سو گئے تھے۔ میں خانم کے ساتھ ترکی میں باتیں کر رہا تھا کہ چند ایک مسافر عورتیں کان لگا کر ہماری باتیں سننے لگیں۔ جب ان کو ہماری زبان کے کچھ لفظ سمجھ میں آئے تو انہوں نے پوچھا "کیا آپ ترک ہیں"؟ (ترکی زبان اور ترکستان کی بولی کی اصل اگرچہ ایک ہی ہے لیکن ترکوں کی زبان زیادہ شستہ ہے۔ اس لئے ترکوں اور ترکستانیوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں ذرا دقت پیش آیا کرتی ہے) ہم نے ان کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں آہستہ آہستہ بتلایا کہ ہم ترک ہیں اور استانبول جا رہے ہیں۔ استانبول کا نام سن کر وہ عورتیں اتنا خوش ہوئیں کہ انہوں نے بنچ خالی کر کے خانم کو وہاں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ہم نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔ خانم ان سے تھوڑی بہت باتیں کرنے لگی، اور میں وہاں سے کئی دفعہ ٹکٹ کا انتظار کرنے والوں کی قطار کی طرف گیا تاکہ دیکھوں کہ وہ روسی مسافر جس کو ہمارے ایرانی مہربان نے ہمارے لئے ٹکٹ لینے کو ہمارے پیسے دئے تھے، قطار میں کھڑا ہے یا نہیں۔

اس ٹرین پر مسافروں کی اتنی بھیڑ کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسافر دور دراز کا سفر کر کے اپنے گھروں کو جانے والے تھے۔ ایسے لوگوں کو سلیپنگ کار میں جانا ہوتا تھا کیونکہ ان کو ہماری طرح راستہ میں ایک دو راتیں کاٹنا تھیں۔ روسی سلیپنگ کار کے ہر ڈبے میں صرف چار آدمیوں کے لئے سونے کی جگہ ہوتی تھی۔

ہماری تاشقند کو روانگی

خدا خدا کر کے ہم کو ٹکٹ مل گیا۔ ہمارے بعد صرف دو اور آدمیوں کو ٹکٹ مل سکا۔ اگر

ہمارے لئے وہ ایرانی مہربان اپنے روسی واقف کے ساتھ ٹکٹ لینے کا انتظام نہ کرتا تو ہم وہاں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے اور ۱۵ گھنٹے اور دوسری ریل گاڑی کا انتظار کرتے۔

تاشقند جانے والی اس گاڑی پر سوار ہونے پر ہم نے دیکھا کہ ہمارے ڈبے میں "روسی مرد بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ تاشقند تک ایک رات اور دو دن اسی ڈبے میں رہنے اور سونے پر مجبور ہوئے۔ اس سے خانم کو سخت تکلیف ہوئی۔ وہ رات کو اپنا سلیپنگ سوٹ نہ پہن سکی، اور رات کو بھی روزمرہ کے سوٹ میں سونے پر مجبور ہوئی۔

ہم ۷/اکتوبر کو تاشقند پہنچے اور ان ٹورسٹ کے ادارے کے ذریعہ جو غیر ملکی لوگوں کو روس میں سفر کرنے میں مدد دیتا ہے، ایک ہوٹل میں اترے۔ یہاں ہم ایک رات رہے اور دوسرے دن ماسکو جانے کے لئے اسٹیشن پر گئے۔ جب ہمیں ریل کا ٹکٹ لینے کے لئے اپنا پاسپورٹ دکھلانے کی ضرورت ہوئی تو معلوم ہوا کہ انٹورسٹ ادارے کا ملازم ہمارے پاسپورٹ، پولیس کے دفتر میں، بھول آیا ہے۔ اس کی اس غلطی کی وجہ سے ہم اس روز ریل میں سوار نہ ہو سکے، اور ایک دن اور تاشقند میں رہنے پر مجبور ہوئے (اس ایک دن کی دیری کی وجہ سے ہمیں ماسکو اور اڈیسہ میں جو تکالیف پیش آئیں ان کا ذکر آگے چل کر مفصل کیا جائے گا)۔

تاشقند سے ماسکو جانے والی سلیپنگ کار کے ڈبے میں بھی ہمارے ساتھ دو روسی مرد سوار ہوئے۔ اس چار دن کے سفر کے دوران میں مَیں ان روسیوں سے آہستہ آہستہ بات چیت کرنے لگا۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک تو انجینئر تھا اور دوسرا ایک مستری تھا۔ اس سفر کے متعلق کئی واقعات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ان روسیوں نے میرا سوٹ دیکھ کر پوچھا کہ "آپ کے سوٹ کا کپڑا کہاں کا بنا ہوا ہے" میں نے جواب دیا کہ "یہ کپڑا ترکی کے اونی کپڑوں کے کارخانہ کا بنا ہوا ہے اور میرے سوٹ کے کپڑے کی قیمت ۴ پونڈ ہے"۔ ان روسیوں میں جو انجینئر تھا اس نے کہا کہ "مجھے آپ کی بات پر بڑا تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کارخانوں کی مشینوں کو ترکی نے روس سے خریدا تھا اور ان کارخانوں کو روسی انجینئروں نے کھڑا کیا تھا۔ جب ہم خود اپنے ملک میں اتنا اچھا کپڑا نہیں بُن سکتے تو ترکی کیسے بُن سکتے ہیں، اور کیسے اتنے سستے داموں بیچ سکتے ہیں؟" غرض اس کو یقین نہیں آیا کہ میرا سوٹ، جس کو اس نے بہت پسند کیا تھا، دیسی کپڑے کا ہے اور اتنا سستا ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ہم کو کابل سے چلتے ہوئے ایک دوست نے سو ترکی سگرٹوں کا ایک ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ ان سگرٹوں کے پچھلے حصہ پر، جو منہ میں لیا جاتا ہے مختلف رنگ کے کاغذ

لگے ہونے کی وجہ سے سگریٹ بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ سگرٹوں کا ڈبہ بھی بہت چمکدار تھا۔ ان سگرٹوں کو دیکھ کر ہمارے ہم سفر روسیوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر میں ان کو یہ سگریٹ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ میں نے روسی سگرٹوں کے بر خلاف ان کے دلوں میں کچھ برا اثر ڈالنے کے لئے ان کو یہ سگریٹ دیئے ہیں۔ ان کو ایسا خیال آنا کچھ بعید نہ تھا۔ کیونکہ روسی تمباکو بہت گھٹیا ہوتا ہے اور سگریٹ چھوٹا ہوتا ہے جس کے آخری حصہ میں ایک نلی لگی ہوتی ہے جو سگریٹ ہولڈر کا کام دیتی ہے۔ لیکن خانم کے اصرار پر میں نے ان کو ایک سگریٹ تحفے کے طور پر دے دیا۔ اس سے وہ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ان سگرٹوں کو صرف دوپہر کے کھانے کے بعد پینے کا فیصلہ کیا اور کھانے کا وقت آنے تک سگرٹوں کو ہاتھ میں لئے ریل گاڑی کے کوریڈور (بر آمدہ) ہی میں ٹہلتے رہے۔

انہوں نے جب مجھ سے ان سگریٹوں کی قیمت پوچھی تو میں نے ان کو کہا کہ ان سو سگرٹوں کے ڈبے کی قیمت ۷۵ قروش (پیاسٹر) ہے جو اس وقت کے نرخ کے مطابق دو شلنگ کے برابر ہوتے تھے۔ اس پر ان کو بڑا تعجب ہوا اور اس کا یقین نہ آسکا۔ کیونکہ روس میں بہت ہی معمولی ۲۰ سگریٹوں کی ایک ڈبی کی قیمت ایک روبل (اس وقت کے نرخ کے مطابق تین شلنگ) تھی۔

ایک دلخراش نظارہ

ماسکو جاتے ہوئے ایک رات کو ہماری ریل گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہری۔ ہم نے دیکھا کہ دوسری لائن پر ایک مال گاڑی کھڑی ہے، جس کے شروع اور آخر میں بڑے بڑے پروجیکٹر ہیں جو ساری گاڑی کو باہر کی طرف سے روشن کر رہے ہیں، اور پہرہ دار بندوق اور سنگین لگائے ہوئے اس گاڑی کے پاس پہرہ دے رہے ہیں۔ ہم نے سمجھا کہ شائد اس مال گاڑی میں گولہ بارود اور فوجی سامان لدا ہوا ہے کہ سپاہی اس کی اتنی احتیاط سے حفاظت کر رہے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس گاڑی کے جھروکوں میں سے کچھ انسانی صورتیں نظر آئیں اور گاڑیوں میں سے پانی بہنے لگا، جس سے معلوم ہوا کہ ان مال گاڑیوں میں مال کی بجائے انسان بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ سٹالن کے زمانے میں روسی حکومت نے کاشت کی زمینوں کو کو آپریٹو اصول پر کاشت کرانے کا فیصلہ کیا تھا، اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو بھی ذاتی ملکیت سے نکال کر ان کے مالکوں کو

کارخانے کے مزدوروں کی طرح ان زمینوں پر مزدور بنانا چاہا تھا۔ اس فیصلے کے بعد کسان اپنی فصل کا مالک نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ جو کچھ اس کے کھیت کی پیداوار ہو، اس کو حکومت کو دینے پر مجبور تھا۔ اس کے عوض حکومت اس کو گزارے کے لئے غلہ دیا کرتی تھی۔ بہت سے کسانوں نے حکومت کے اس فیصلہ کے بر خلاف سرکشی کی۔ حکومت نے ان سرکش لوگوں کو بہت بے دردی سے مال گاڑیوں میں بند کر کے یورپی روس کے علاقوں سے سائبیریا جلاوطن کر دیا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ یہ مال گاڑی جس کے پہلو میں ہماری ٹرین ٹھہری ہوئی تھی، اس قسم کے جلاوطنوں کو کہیں دور دراز کے روسی صوبوں کو لے جا رہی تھی۔ ماسکو تک ہمارا سفر بہت بے آرامی سے گزرا۔ کھانا اچھا نہ تھا۔ ڈائننگ کار میں صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میز پوش اور رومال میلے تھے۔ لیکن جب گاڑی ماسکو کے نزدیک پہنچی تو کھانے کی میزوں پر نئے میز پوش بچھا دیئے گئے اور کھانا کھانے والوں کو نئے رومال دیئے گئے۔

ہمارا ماسکو پہنچنا

ہم ۱۳ اکتوبر کو شام کے قریب ماسکو پہنچے۔ ہم نے انٹورسٹ ادارے کے ذریعہ میٹروپول ہوٹل میں کمرہ لینا چاہا۔ لیکن ہم کو کہا گیا کہ ”آپ کے پاسپورٹ میں ماسکو میں ٹھہرنے کے لئے کابل کے روسی سفارت خانے نے کوئی عبارت نہیں لکھی ہے۔ اس لئے آپ ماسکو میں نہیں ٹھہر سکتے، اور آپ کو ہوٹل میں جگہ نہیں دی جا سکتی“۔

ہمیں اس پر بڑا تعجب ہوا کیونکہ کسی ملک میں یہ قاعدہ نہیں کہ ایک مسافر ہر شہر میں ٹھہرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ اجازت لے، اور ملک میں داخل ہونے کے لئے ویزا لیتے ہوئے اس اجازت کو اپنے پاسپورٹ میں درج کرائے۔

ہم نے انٹورسٹ ادارے کے عملہ کو کہا کہ ”ہمارے لئے اسی رات اڈیسہ جانے والی گاڑی کا ٹکٹ لے لیں۔ معلوم ہوا کہ اس رات اڈیسہ جانے والی گاڑی میں سونے کی ساری جگہیں بھر چکی تھیں، اور اس لئے ٹکٹ ملنا ناممکن تھا۔

ہم نے ایسی پریشانی کی حالت اپنی ساری عمر میں نہ دیکھی تھی۔ ہمیں نہ ہوٹل میں رہنے کی اجازت ملتی تھی اور نہ ہی ماسکو سے جانے کے لئے ریل کا ٹکٹ میسر آتا تھا۔ یعنی ہم بے سروسامانی

میں رات کو ماسکو کی گلیوں میں آوارہ پھرنے پر مجبور تھے۔ اس پر ہم نے ترکی سفارت خانہ جانے اور وہاں سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور انٹورسٹ ادارے کی ایک ترجمان لڑکی کو اپنے ساتھ لیا۔ انٹورسٹ ادارے کی موٹر کار اوپر سے کھلی ہوئی تھی۔ ماسکو میں ان دنوں برف باری ہو رہی تھی۔ اس لئے ہم سفارت خانہ تک سارے راستے سردی سے کانپتے رہے۔ سفارت خانہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے سفارت خانہ کے سیکرٹری کو ڈھونڈ نکالا۔ اتفاق سے سیکرٹری وہی کامل اللہ بک تھا جو ہمیں باطوم میں ہمارے کابل جانے کے وقت ملا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ سفارت خانہ کا ایک ملازم پولیس کے دفتر بھیجا۔ پولیس نے ہمیں ایک رات ماسکو میں ٹھہرنے کی اجازت اس شرط پر دی کہ میں اگلے روز صبح کے دس بجے تھانہ میں حاضری دوں۔ اس کے بعد ہم ایک رات میٹروپول ہوٹل میں ٹھہر سکے۔

ہوٹل میں ہمارا قیام آرام دہ تھا۔ لیکن روسیوں کے ہمیں ماسکو میں ٹھہرنے سے منع کرنے پر ہم بہت چیں بہ جبیں تھے، اور اس نامعقول حرکت کی وجہ سے روسی گورنمنٹ پر سخت نکتہ چینی کرنے لگے۔ لیکن مجھے یاد آیا کہ روس میں ہوٹل کے کمروں میں روسی پولیس خفیہ مائیکروفون لگا دیا کرتی ہے جس سے وہ مسافروں کی سب بات چیت سن سکتی ہے۔

اس لئے میں نے خانم سے کہا کہ دھیمی آواز سے نکتہ چینی کرے۔ اس کے بعد ہماری باہمی گفتگو بالکل کانا پھوسی کی مانند رہی۔ ہم نے یہاں سنا کہ ایک امریکن نامہ نگار اور اس کی بیوی نے جو ہمیشہ روس کے حق میں مقالے لکھا کرتے تھے، ایک دفعہ روسی گورنمنٹ کے خلاف ایک آرٹیکل لکھ دیا۔ اس پر روسیوں نے اس کو اور اس کی بیوی کو پکڑ کر ماسکو کے باہر کسی ایسی جگہ بھیج دیا جہاں سے وہ کسی سے خط و کتابت نہ کر سکے۔ امریکن سفارت خانہ نے ان کی جلاوطنی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا پتہ نہ لگ سکا۔ خدا جانے ان کو قید میں ڈال دیا گیا یا مار ڈالا گیا۔ اس واقعہ کو سن کر خانم تو اتنی ڈری اور حواس باختہ ہوئی کہ اس نے منت مانی کہ خدا اگر ہم کو روس سے نکال کر صحیح سالم ترکی پہنچا دے تو وہ سات (۷) دنبوں کی قربانی دے گی۔

میں اگلے روز دس بجے انٹورسٹ ادارے کے ایک ملازم کے ساتھ تھانے میں حاضر ہوا، وہاں مجھے کہا گیا کہ آج رات کو اڈیسہ جانیوالی گاڑی کا ٹکٹ لو اور ماسکو چھوڑ دو۔ میں پولیس کے دفتر سے ہوٹل واپس آیا تو خانم نے مجھے بتایا کہ ہوٹل سے میری غیر حاضری کے دوران میں میجر شمسی زو بوبک معاون ملٹری اٹیچی ترکی نے جس کی بھانجی میری خانم کو جانتی تھی، اپنی موٹر کار بھیج کر ہمیں دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھایا۔

وہاں بھی خانم نے راستہ کی مشکلات کی شکایت کی۔ اس نے روسی گورنمنٹ پر یہاں بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ اس پر میجر شمسی بک نے اس کو منع کیا اور کہا کہ "بہت ممکن ہے کہ اس گھر میں خفیہ مائیکروفون موجود ہوں اور پولیس یہ ساری باتیں سن لے"۔

میجر شمسی بک نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ "شاید آپ کو اڈیسہ میں جہاز کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ رومانیہ کے راستہ ریل سے استانبول چلے جائیں۔ اگر آپ کو یہ تجویز منظور ہے تو میں آپ کے لئے رومانیہ کا ویزا لے سکتا ہوں"۔

ہم نے اس کی تجویز منظور کی اور اس نے ۱۴/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سہ پہر کے وقت ہمارے پاسپورٹ پر رومانیہ کا ویزا کرا دیا۔ لیکن روسی گورنمنٹ نے ہمیں رومانیہ کے راستہ ترکی جانے کی اجازت نہ دی اور کہا کہ "آپ کو کابل سے صرف اڈیسہ کے راستے روس سے نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لئے آپ کسی اور راستے سے روس سے باہر نہیں جا سکتے۔ اگر آپ ایسا کرنا چاہیں تو پہلے آج ماسکو چھوڑ کر اڈیسہ جائیں اور وہاں سے ماسکو کو درخواست دیں کہ آپ کو رومانیہ کے راستے روس سے نکلنے کی اجازت دی جائے"۔

ہمارا اڈیسہ پہنچنا

یہ ایک سخت نامعقول بات تھی۔ اگر ایسی اجازت ماسکو کی طرف سے دی جائے گی، تو اس وقت جب کہ ہم ماسکو میں ہیں، یہ اجازت ہم کو کیوں نہیں دی جاتی اور ہم کو کیوں خوامخواہ اڈیسہ تک سفر کرنے اور ریل کا ٹکٹ لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ لیکن کسی نے ہماری بات نہ سنی اور ہم چار و ناچار ۱۴/اکتوبر کو اڈیسہ روانہ ہو گئے۔ دو دن اور دو رات کے سفر کے بعد ہم ۱۷/اکتوبر کو اڈیسہ پہنچے اور لندن ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہ زار کے زمانے کی بنی ہوئی عالیشان عمارت تھی۔ اگلے روز ہم ترکی قونصل خانہ گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ قونصل تو چھٹی پر استانبول گیا ہوا ہے، اور اس کا سیکرٹری حمدی بک اور اس کی خانم وہاں ہیں۔ ہم نے حمدی بک سے کہا کہ "ہم نے ہوٹل سے معلوم کیا ہے کہ استانبول جانے والا جہاز ہمارے اڈیسہ آنے سے ایک روز پیشتر استانبول چلا گیا ہے، اور اب دوسرا جہاز پندرہ دن کے بعد جائے گا۔ اس لئے ہم رومانیہ کے راستے ترکی جانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ماسکو کو عرضی بھیجنا ہوگی"۔ اس نے ایک ایسی عرضی لکھ کر ماسکو بھیج دی اور ہم اس کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

ماسکو سے ہماری عرضی کا پندرہ دن تک کوئی جواب نہ آیا، اور پولیس والے ہمیشہ لیت ولعل کرتے اور بہانے بناتے رہے (یہ سارا خمیازہ ہمیں تاشقند کے انٹورسٹ ملازم کی غلطی کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ اگر وہ ہمارا پاسپورٹ پولیس کے دفتر میں نہ بھول آتا اور ہم اس وجہ سے تاشقند میں ایک روز اور ٹھہرنے پر مجبور نہ ہوتے تو استانبول کو ایک دن پہلے گئے ہوئے جہاز پر پہنچ سکتے تھے، اور اڈیسہ میں ۱۵ روز ہوٹل کے خرچ سے اور انتظار و پریشانی سے بچ سکتے تھے۔)

اگر حمدی بک اور ان کی بیوی وہاں نہ ہوتی تو خدا جانے ہم یہ پندرہ روز اڑ..... میں کیسے گزارتے ان دنوں میں ہم ایک روز روسی سرکس دیکھنے گئے۔ مگر سینما زیادہ نہ جاسکے۔ کیونکہ یہاں کی فلمیں یوکرنین زبان میں بھی تھیں، جو روسی سے ایک علیحدہ زبان ہے۔ میں روسی زبان جاننے کی وجہ سے روسی فلموں میں جو گفتگو ہوتی تھی اس کو سمجھ لیا کرتا تھا اور خانم کو اس کا ترجمہ بتادیا کرتا تھا۔ لیکن یہ صرف ہفتہ میں ایک دفعہ ہوتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے ہمارے لئے ۳۱/اکتوبر کو جہاز پر چڑھنے کی امید پیدا ہوئی۔ جہاز کی روانگی سے ایک روز پہلے حمدی بک نے ہم سے باتوں میں پوچھا کہ ہمارے پاس سونے کی گھڑی یا سونے چاندی کے زیورات ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیا ہم نے ان کو پاسپورٹ میں روس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے درج کرایا ہے یا نہیں۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ:

"ہمارے پاس اس قسم کی سونے کی چیزیں ہیں لیکن افسوس ہے کہ روسی سرحد پر کسٹمز آفس میں ہمارے سامان کی بہت سختی سے تلاشی لی جانے اور پڑتال کی جانے سے میں تو اتنا سراسیمہ ہو گیا تھا کہ خانم کے زیورات اور گھڑی کو پاسپورٹ میں درج کرانا بھول گیا"۔

اس پر حمدی بک نے ہمیں یہ مایوس کن خبر دی کہ ہم ان زیورات، گھڑیوں اور سونے کی دوسری چیزوں کو جو روسی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے پاسپورٹ میں درج نہ کی گئی ہوں، روس سے باہر نہیں لے جاسکتے، اور اگر خفیہ طور پر ایسی چیزوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی جائے اور پولیس کو اس کا علم ہو جائے تو اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ وہ سارے زیورات ضبط کر لئے جاتے ہیں اور ان کے مالک کو قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اس پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی ساری قیمتی چیزیں، جو ہمارے پاسپورٹ میں درج نہیں ہیں، حمدی بک کے حوالے کر دیں اور جب وہ چھٹی پر ترکی آئے تو وہ اپنے ساتھ لیتا آئے۔ کیونکہ اس کا ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہو گا اور اس کی جہاز پر چڑھتے ہوئے تلاشی نہ لی جائے گی۔

ہماری اڈیسہ سے ترکی روانگی

۳۱/اکتوبر کی صبح کو ہم گودی پر پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد حمدی بک اور اس کی بیوی ہم کو خدا حافظ کہنے کے لئے آئے۔ اس کی بیوی نے خانم سے کہا "میں آپ کے زیورات لائی ہوں اور جب کسٹمز کا معائنہ ختم ہو کر آپ جہاز پر سوار ہونے لگیں گی تو میں آپ کو چپکے سے یہ زیورات دے دوں گی"۔

ہم ابھی سوچ رہے تھے کہ ایسا کرنا مناسب ہے یا نہیں کہ پولیس کی چوکی سے ایک مسافر عورت کی چیخیں ہمارے کان میں پڑیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ اس نے ایک سونے کی گھڑی اپنے لباس میں چھپا کر ناجائز طور پر اپنے ساتھ روس سے باہر لے جانے کی کوشش کی تھی، اور اس کی تلاشی لینے والی پولیس کی عورت نے یہ گھڑی اس کے کپڑوں میں چھپی ہوئی دیکھ کر اس کو پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس عورت کی آہ وزاری کو سن کر ہم نے اس کی جرات نہ کی کہ ہم اپنے زیورات حمدی بک کی بیوی سے لے لیں ہمارے سامان کا کسٹمز میں معائنہ ہوا اور ہم بہ خیر جہاز پر سوار ہونے کے لئے حمدی بک اور اس کی بیوی سے رخصت ہوئے۔ حمدی بک کئی سال کے بعد جب چھٹی پر ترکی آئے تو اپنے ساتھ ہمارے یہ زیورات لائے اور ان کو بے کم و کاست ہمارے سپرد کر گئے۔

ہمارا جہاز دو دن اور دو رات کے سفر کے بعد مورخہ ۲/نومبر ۱۹۳۷ء کو استانبول پہنچا، اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم روس سے زندہ نکل کر ترکی آ گئے۔

الحمد للہ! الحمد للہ!

☆

چھبیسواں باب

ترکی میں میرا پھر فوجی خدمت کرنا

استانبول میں دو دن رہنے کے بعد میں انقرہ گیا تاکہ معلوم کروں کہ میری پوسٹنگ کہاں ہو گی۔ انقرہ میں مجھے وزارت جنگ سے حکم ملا کہ (قونیہ) میں اسی آرٹلری رجمنٹ میں جاکر کام کروں جہاں میں افغانستان جانے سے پہلے ملازم تھا۔ اس پر میں انقرہ سے استانبول آیا۔ وہاں سے ایک ہفتہ کے بعد میں نے ۱۵/نومبر ۱۹۳۷ء کو قونیہ جاکر ایک بیٹری کی کمان سنبھالی۔ یہاں میں نے تقریباً ایک سال کام کیا۔ اس عرصہ میں مَیں نے بہت سی فوجی مشقوں اور مینوورز میں حصہ لیا۔ یہاں ہی کرنل نورالدین بارانسل بک سے جو بعد میں جنرل کے رینک پر پہنچے اور ہمارے ڈویژن کمانڈر بننے کے بعد ترکی افواج کے کمانڈر انچیف ہو گئے تھے، میرا تعارف ہوا۔ ان سے ہمارے دوستانہ تعلقات آج بھی قائم ہیں۔

۱۹۳۸ء کے اگست کے مہینہ میں مجھے حکم ملا کہ ترکی کے مشرقی صوبہ (آغری) کے مرکزی شہر قرہ کوسہ میں فوجی خدمت کے لئے جاؤں۔ ترکی کے فوجی قوانین کے مطابق تمام افسر باری باری ترکی کے مشرقی صوبوں میں تین تین سال خدمت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان صوبوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ برف باری اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ راستے برف سے اٹ جاتے ہیں اور ان کا ترکی کے باقی حصوں سے تعلق کٹ جاتا ہے اور رسل و رسائل بالکل بند ہو جاتے ہیں۔ ان مشرقی علاقوں میں وہ پھل اور ترکاریاں جن کیلئے ترکی کے دوسرے حصہ مشہور ہیں، سردی کی وجہ سے پیدا نہیں ہو سکتیں۔

میں خانم کے ساتھ ۲۲/اگست کو استانبول سے جہاز پر سوار ہو کر بحیرہ اسود کی ترکی بندر گاہ طرابزون پر اترا، اور وہاں سے ایک موٹر کار کرایہ پر لے کر ۲/ستمبر ۱۹۳۸ء کو قرہ کوسہ آیا اور توپخانہ کی ایک میدانی بیٹری کا کمانڈر مقرر ہوا۔

میرا امتحان

یہاں آنے کے کوئی پندرہ دن بعد مجھے عملی امتحان دینا پڑا۔ جس میں مجھے کہا گیا کہ فرض کرو کہ جنگ کی وجہ سے آپ کی بیٹری کے دو آلہ نشان میں سے ایک آلہ ٹوٹ گیا ہے اور آپ کے پاس صرف ایک آلہ نشان رہ گیا جو بیٹری کی شست لگانے کے کام آسکتا ہے۔ اس لئے صرف ایک آلہ نشان کی مدد سے اپنی توپوں کو نشانہ پر لگاؤ۔

میں نے اس کام کو پورا کرنے اور توپوں کی شست لگانے کے بعد اپنے بٹالین کمانڈر کو اور اس کے ذریعے ڈویژن کمانڈر جنرل (باقی وان دمیر) پاشا کو خبر دی کہ توپیں تیار ہیں۔ جنرل موصوف نے شست کی درستی کو جانچنے کے لئے مجھے توپوں سے نشانہ پر گولہ باری کا حکم دیا۔ میری توپوں کے گولے نشانہ کے اتنے نزدیک پھٹے کہ سب افسروں نے مان لیا کہ اس گولہ باری کی وجہ سے اگر وہاں کوئی دشمن ہوتا تو وہ بالکل نیست و نابود ہو جاتا۔ اس امتحان کے نتیجہ سے میری بڑی ساکھ بن گئی۔

غازی مصطفٰے کمال پاشا اتاترک کی وفات کی خبر

مجھے قرۃ کوسہ آئے ہوئے ۲ مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا تھا کہ ہمیں ۱۰/نومبر ۱۹۳۸ء کو غازی مصطفٰے کمال پاشا اتاترک صدر جمہوریت ترکی کی وفات حسرت کا سانحہ پیش آیا۔ اس خبر سے ساری ترکی قوم ہکی بکی رہ گئی۔ کوئی ایسا مرد عورت اور بچہ نہ تھا جس نے کئی دنوں غم کے آنسو نہ بہائے ہوں۔ کیونکہ ترکی قوم اپنے نجات دہندہ کی موت کے بعد اپنے کو بے سردار محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے عصمت این اونی پاشا صدر جمہوریت منتخب ہو گئے اور لوگوں کو ذرا تسلی ہوئی کہ ان کی قیادت میں جمہوریت ترکی کی بنیادیں اور بھی مضبوط ہوں گی اور جو اصلاحات اتاترک مرحوم نے ملک میں جاری کر کے ترکی کو ایک موڈرن ملک بنانے کی کوشش کی تھی، وہ بار آور ہوں گی۔ عصمت پاشا کے انتخاب پر سارے فوجی مرکزوں میں توپوں کے (۱۰۱) فائروں سے سلامی اتاری گئی۔ قرہ کوسہ میں یہ فرض میری بیٹری نے ادا کیا اور میں نے اس تقریب پر ایک سو ایک فائر کرائے۔

قرۃ کوسہ کی سردیاں

میں قرۃ کوسہ میں تین سال فوجی خدمت کرنے پر مجبور تھا۔ یہ علاقہ ترکی کا سرد ترین صوبہ مانا

جاتا ہے۔ خانم نے یہاں صرف ایک سال سردی کا موسم گزارا۔ اس کے بعد وہ ہر سال سردیوں میں اپنے بھائی کے ہاں استانبول چلی جاتی تھی اور گرمیوں میں میرے پاس آجایا کرتی تھی۔ قرہ کوسہ میں میرا دوسرا سال تھا کہ ایک دفعہ آرمی کلب میں سردیوں میں ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات کو افسروں نے ایک محفل طرب و نشاط لگائی۔ اس میں سب افسروں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ صبح تک کلب میں پر لطف وقت گزارا۔ مگر جب ہم طلوع آفتاب پر آرمی کلب سے اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لئے باہر نکلے تو سردی سے ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے چاقو سے ہمارا چہرہ زخمی کر دیا ہے۔ اس پر ہم سب فوراً کلب کی عمارت میں واپس آئے۔ ہم نے کلب کے دروازے کے کنارے پر لگے تھرمامیٹر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سردی کی وجہ سے اس کا پارا (۵۲_) درجہ سنٹی گریڈ تک اتر گیا ہے۔ شاید سائبیریا ہی میں یا الاسکا اور گرین لینڈ ہی میں ایسی سردی ہوتی ہوگی۔ ایسی سردی میں ہمارے لئے اپنے گھروں تک جانا مشکل تھا۔ اس لئے ہم سب دوپہر کے وقت ہوا ذرا گرم ہونے تک وہاں بیٹھے رہے۔

ہم قرۃ کوسہ میں بھی سردی گرمی کے موسم میں دن رات فوجی مشقیں، قواعد اور مینوورز کیا کرتے تھے۔ سردی کے موسم میں (۱۶_) درجہ سنٹی گریڈ تک تو ہم قواعد کے لئے باہر میدان میں اور پہاڑیوں میں جایا کرتے تھے۔ اس وقت برف سردی کی وجہ سے یخ کے مانند اتنی سخت ہو جاتی تھی کہ جب میری بیٹری کی توپوں کو گھوڑے اس پر کھینچتے تھے تو نہ پہیئے کا اور نہ ہی گھوڑوں کے سموں کا اس پر کوئی نشان پڑتا تھا۔ اگر تھرمامیٹر کا پارہ ۱۶_ درجہ سنٹی گریڈ سے زیادہ نیچے اتر جاتا تو باہر میدانوں میں قواعد بند کر دی جاتی تھی۔ ایسی سخت سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نمدے کے بوٹ، اونی جرابیں اور اونی دستانہ، موٹے موٹے اونی بنیان اور اونی اوور کوٹ پہنا کرتے تھے۔

ہماری ٹوپیوں میں کانوں کو ڈھانپنے کے گوش پوش لگے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود بھی ایک دفعہ میرا بایاں کان اتنا ٹھنڈا ہو گیا تھا کہ اس کا رنگ پہلے تو نیلا پڑا اور پھر سیاہ ہو گیا۔ اگر میں اس روز اسی شدید سردی میں رہتا تو ضرور گنگرین ہو جاتا اور کان بالکل مرجھا کر گر جاتا۔

میری ترقی

کابل سے آنے کے بعد میں فوج میں تقریباً دو سال خدمت کر چکا تھا اور اس عرصہ

میں جتنے فوجی امتحان معائنہ اور پڑتالیں ہوئیں ان میں مَیں نے اچھے نمبر لئے تھے۔ اس لئے ۳۰/اگست ۱۹۳۹ء کو مجھے ترقی ملی اور میں کیپٹن ہو گیا۔

سٹاف کالج کے داخلہ میں میری ناکامی

کیپٹن کا رینک حاصل کرنے کے بعد میں نے سٹاف کالج کے داخلہ کے امتحان کی تیاریاں شروع کیں اور امتحان میں شریک ہونے کے لئے عرضی بھیجی۔ لیکن ایک نئے ترکی فوجی قانون کی وجہ سے جس کا مجھے کابل میں علم نہ ہوا تھا اور جس کے مطابق صرف وہ افسر جو ترکی میں پیدا ہوئے ہوں سٹاف کالج میں داخل ہو سکتے ہیں، میں داخلہ کے امتحان میں شریک ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ مجھے اس پر سخت قلق ہوا کیونکہ میں صرف اس غرض سے اپنا کونٹریکٹ ملازمت توڑ کر کابل سے ترکی واپس آیا تھا۔ مجھے اس وقت امید تھی کہ میں سٹاف کالج سے پاس ہو کر تین سال کی سینارٹی حاصل کروں گا، اور اس طرح پر ۴۶ سال کی عمر سے پہلے میجر بن جاؤں گا، اور ریٹائر ہونے سے بچ رہوں گا۔ کیونکہ جو افسر ۴۶ سال کی عمر تک میجر کا رینک حاصل نہ کر سکے اس کو فوجی خدمت سے ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ میرا ایک ہم جماعت خیری بک بھی جو ترکی نسل سے تھا لیکن مصر میں پیدا ہوا تھا، سٹاف کالج میں داخل ہو جانے کے بعد اس نئے قانون کی وجہ سے سٹاف کالج کی تعلیم کو ادھورا چھوڑنے اور کالج سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

میرے دل میں جو امنگیں اعلیٰ فوجی تعلیم پانے اور ہمیشہ فوج میں خدمت کرنے کے بارے میں تھیں، وہ اب سب کی سب خاک میں مل گئیں۔ لیکن صبر کے ساتھ ۴۶ سال کی عمر تک فوجی خدمت کرنے کے سوا میرے لئے اب کیا چارہ تھا۔ میں اپنے کو یہ کہہ کر کہ میری قسمت میں یہی لکھا تھا اور اس مرضی مولا میں میرے لئے کوئی بہتری مضمر ہے، تسلی دینے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے پولینڈ پر حملہ کرنے کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ میں تو ذاتی طور پر یہی تمنا رکھتا تھا کہ جرمنی انگریزوں کو شکست دے اور اس طرح ہندوستان آزاد ہو جائے۔ لیکن ترکی میں ابھی تک پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے اتحاد کی وجہ سے

سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہونے کے سبب سے تلخ یاد باقی تھی۔ اس لئے ترکی قوم اس دوسری جنگ عظیم میں پڑنا نہ چاہتی تھی۔ چنانچہ تقریباً آخری دم تک ترکی حکومت غیر جانبدار رہی اور امریکہ اور انگریزوں کے اصرار کے باوجود عصمت این اونی پاشا صدر جمہوریت ترکی اور فیلڈ مارشل فوزی چقماق پاشا (مرحوم) کمانڈر انچیف افواج ترکی نے اپنے ملک کو جنگ کی مصیبت سے بچائے رکھا۔ لیکن اپنی فوجوں کو لام بندی کے لئے تیار کیا تاکہ اگر کوئی ان کے ملک پر حملہ کرے تو مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ قرہ کوسہ میں جو کیویلری ڈویژن موجود تھا اور جس کے ماتحت ہمارا توپ خانہ کا بٹالین تھا اس میں نئے رنگروٹ بھرتی کئے گئے اور اس کے سپاہیوں کی تعداد کوئی تین گنا زیادہ کر دی گئی تھی۔

۲۲/جون ۱۹۴۰ء کو جرمنی نے فرانس کو شکست دے کر روس پر حملہ کیا۔ ہم کو اس سے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ روس ترکی کا پرانا دشمن مانا جاتا تھا۔ روس کے حملہ کا خطرہ سب سے زیادہ قرہ کوسہ کے محاذ پر تھا۔ اس لئے یہاں کے فوجی افسروں کے بال بچے سرحد سے دور اور ملک کے اندرونی حصوں میں بھیج دیئے گئے۔ لیکن ہمارے کمانڈر جنرل نور الدین بار انسل پاشا نے اپنی خانم اور بچوں کو قرہ کوسہ میں رکھا اور مجھے کہا کہ "جب میں اپنے بال بچوں کو قرہ کوسہ سے باہر بھیجوں گا تو آپ بھی اپنی خانم کو ان کے ساتھ بھیج دینا۔" اس لئے اس خطرناک وقت میں خانم بھی میرے ساتھ رہی۔ میں ان دنوں دن رات چھاؤنی میں رہا کرتا تھا اور خانم گھر میں رات کو اکیلی ہی رہنے پر مجبور تھی۔

آخر ایک روز خبر ملی کہ پانچ روز کے بعد رات کو روسی جنگی جہاز قرہ کوسہ پر حملہ کریں گے۔ اس لئے مقررہ رات کو ہم نے سارے گیریزن خالی کرا دیئے۔ کمانڈر کے بیوی بچوں اور میری خانم نے شہر چھوڑ دیا اور کوپ قیران نام گاؤں میں رات بسر کی۔ اس رات اتفاق سے سخت بارش ہوئی۔ اگرچہ ایسی حالت میں ہوائی حملہ کا احتمال کم تھا۔ لیکن میں ساری رات اپنی بیٹری کے ساتھ باہر میدان میں اپنی مشین گنوں سے ہوائی جہاز پر فیر کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ آخر آرمی کور کمانڈر کی طرف سے حکم آیا کہ روسی ہوائی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہنے کی وجہ سے فوجیں اپنی بیرکوں میں چلی جائیں۔ جرمن فوجوں کے روسی فوج کو شکست دینے کی وجہ سے ترکی پر روس کے حملے کا خطرہ بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لئے قرہ کوسہ میں، جنگ سے پہلے زمانے کی طرح چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ اگست ۱۹۴۱ء کے آخر میں ترکی کے مشرقی صوبہ میں میری فوجی خدمت کے تین سال

پورے ہوگئے اور میری تبدیلی کا زمانہ آیا۔

تھریس میں میری تقرری

۲۲/اکتوبر ۱۹۴۱ء کو مجھے مغربی محاذ پر تھریس میں جانے کا حکم ملا۔ یہاں جرمنوں کے بلقانی ملکوں میں پیش قدمی کرکے یوگوسلاویا اور بلغاریہ پر قابض ہو جانے کی وجہ سے فوجی حالت مشرقی محاذ سے بھی زیادہ نازک ہو گئی تھی اور یہی ڈر تھا کہ جرمن ترکی پر بھی حملہ کریں گے۔

تین سال مشرقی صوبوں میں خدمت کرنے کے بعد مجھے یہ امید تھی کہ میری پوسٹنگ کسی آرام کی جگہ پر ہوگی۔ لیکن ملک کے سیاسی حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ ترکی کو اپنی فوج کا بڑا حصہ مغربی محاذ پر جمع کرنا پڑا تھا۔ یہاں فوجوں کے اکثر دستے سردیوں میں بھی گھروں کی بجائے خیموں میں پڑے ہوئے تھے۔ میری بیٹری کے سپاہی بھی خیموں میں رہتے تھے۔ گھوڑے میدان میں باندھے جاتے تھے کیونکہ اصطبل موجود نہ تھا۔ اس لئے ایک طرف تو ہم گورنمنٹ کے فراہم کردہ سامان تعمیر سے اپنے سپاہیوں کے ذریعہ بیرک اور اصطبل بناتے تھے اور دوسری طرف اپنی توپوں کے لئے گولہ باری کی جگہ، توپ چیوں اور گولہ بارود کے لئے خندقیں اور محفوظ محل تیار کرنے پر مجبور تھے۔ میں نے گیریزن سے کوئی آٹھ میل کے فاصلہ پر خادم کوئی کے قصبے میں ایک گھر کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ قصبہ عمرلی کے مشہور گاؤں کے نزدیک ہے جہاں جنگ بلقان کے زمانے میں ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کے ہلال احمر کے مشن نے اپنا ہیڈ کوارٹرز بنایا تھا۔ یہ گاؤں اس وقت اس مشن کی وجہ سے ہندیا کوئی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

میں ہر صبح خواہ سردی کتنی ہی ہو اور برف بھی پڑ رہی ہو، ۶ بجے گھر سے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گیریزن جایا کرتا تھا اور وہاں قواعد کی حاضری کے وقت ۸ بجے پہنچ کر سارے دن اپنی بیٹری کے سپاہیوں کو فوجی مشقیں کرا کے شام کو آٹھ بجے گھر واپس آیا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جرمنوں نے یونان پر بھی قبضہ کر لیا اور ہمارے محاذ پر جنگ کا خطرہ اور بھی بڑھ گیا۔

اس پر میری بیٹری کو دس میل اور آگے جہاں اس کے لئے میں نے گولہ باری کی پوزیشن سیمنٹ اور کونکریٹ سے تیار کی تھی، محاذ کے نزدیک بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ہر رات میرا گھر آنا ناممکن ہو

گیا۔ اس پر خانم اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کو استانبول چلی گئی اور میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ خیمے میں رہنے لگا۔

تھریس میں میں نے جنگی حالت میں کوئی ایک سال گزارا۔ اس کے بعد ۲۱/اگست ۱۹۴۲ء کو مجھے انقرہ میں ریزرو آفیسرز کالج میں فن توپچی کا معلم مقرر کر دیا گیا۔

ریزرو آفیسرز کالج میں میری معلّمی

میں ستمبر ۱۹۴۲ء کے وسط میں انقرہ آیا اور ریزرو آفیسرز کالج میں ہائی سکول اور یونیورسٹی کے پاس شدہ طالب علموں کو فن توپچی پڑھانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کالج کے طالب علم یہاں آنے سے پہلے فوجی کیمپ میں دو ماہ ابتدائی فوجی قواعد سیکھتے ہیں اور اس کالج میں چھ ماہ کی پڑھائی کے بعد فوج میں جا کر ڈیڑھ سال پہلے تو بطور ایک امیدوار افسر کے اور پھر لیفٹیننٹ بن کر خدمت کرتے ہیں۔

اس اصول کے ذریعہ ترکی میں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان فوجی قواعد سیکھ کر افسر بننے کے قابل ہو جاتے ہیں اور فوج میں ڈیڑھ سال خدمت کر کے ایک فوجی دستے کی کمان سنبھالنے کے لائق بن جاتے ہیں۔ اس طرح پر لڑائی کے وقت یہ ریزرو آفیسرز افسری کا کام دے سکتے ہیں۔

ترکی میں دو سالہ فوجی خدمت سب بالغ مردوں کے لئے لازمی ہونے کی وجہ سے ہر نوجوان بشرطیکہ وہ فٹ ہو، اٹھارہ سال کی عمر کے بعد فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ آج کل کے نئے قاعدہ کے مطابق تو یہ ہوتا ہے کہ جن نوجوانوں کی تعلیم یونیورسٹی سے کم ہو وہ معمولی سپاہی کی طرح فوج میں خدمت کرتے ہیں، اور ان کو افسر بننے کا حق نہیں دیا جاتا اور جو یونیورسٹی پاس شدہ ہوں، ان کو افسر بنایا جاتا ہے۔ اس طرح پر جبری فوجی خدمت کے قانون کی وجہ سے ہر نوجوان صلح کے زمانے میں ہی جنگی قواعد اور ہتھیاروں کا استعمال کرنا سیکھ لیتا ہے۔

میں اس کالج میں چار سال پڑھاتا رہا۔ اس عرصہ میں طالب علموں کے آٹھ گروپ فوجی تعلیم لے کر کالج سے ریزرو آفیسرز بن کر نکلے۔ ہر گروپ میں کوئی ایک ہزار طالب علم ہوا کرتے تھے۔ یہاں کے سبقوں کے علاوہ میں نے ترکی جنرل ہیڈ کوارٹرز کے لئے انگریزی سے ٹیکٹکس (یعنی فن تعبیہ) اور اسٹریٹیجی (یعنی فن سوق الجیشی) کی نئی کتابیں اور نئے ہتھیاروں کا استعمال سکھلانے والے تعلیم نامے ترکی میں ترجمہ کئے۔ ان کتابوں سے تعلیم ناموں اور رسالوں کی تعداد

سولہ تھی۔ ان میں سے بعض اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

1)Field Service Regulations.

2)Armoured forces Manual Tactics and Technique.

3)Firing Tables of (9.4) cm. guns.

مجھے ترکی ہیڈکوارٹرز سے ایک انگریزی، ترکی فوجی لغت کے تیار کرنے کا بھی حکم ملا۔ اس کام میں ایک ہوا باز افسر اور ایک نیول افسر میری مدد کے لئے مقرر ہوا۔ ترکی میں ایسی لغت کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ اب امریکن اور انگریزی افسروں سے ہمارا تعلق روز بروز بڑھ رہا تھا اور نئے نئے ہتھیار ترکی فوج کو دیئے جا رہے تھے۔ اس کتاب کو تیار کرنے میں مجھے دو سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ کیونکہ میرے مددگار افسر اپنے اپنے شعبوں کے متعلق جو کچھ اصطلاحات جمع کر سکے، وہ انقرہ سے اپنی نئی پوسٹنگ پر جاتے ہوئے مجھے دئے گئے تھے اور میں اس کام کو اکیلا سرانجام دینے پر مجبور تھا۔ یہ کام کافی مشکل ثابت ہوا۔ لیکن خدا کے فضل سے آخر کار پورا ہو گیا، اور ترکی جنرل ہیڈکوارٹرز نے کتاب کو چھپوا کر اس کو سارے فوجی کتب خانوں میں بھیج دیا۔ اس سے ان افسروں کو جو انگریزی فوجی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے یا ایسی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کیا کرتے تھے، بہت مدد ملی۔

مجھے ہندستان بلانے کے لئے بھائی صاحب کی کوششیں

ڈاکٹر عبدالحفیظ جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے حصہ میں آچکا ہے کئی سال سے ترکی میں آئے ہوئے تھے۔ وہ پہلے تو استانبول میں اور پھر انقرہ میں گولہ بارود سازی کے کارخانوں میں کام کرتے رہے، اور آخری دنوں میں معدنیات انسٹیٹیوٹ میں ملازم تھے۔ ان سے ایک روز باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے بھائی میاں عبدالعزیز بیرسٹر اور سابق میئر لاہور کے ذریعہ ہندوستان واپس جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر ان کے بھائی نے ان کے لئے انگریزی حکومت سے معافی لے لی اور وہ ترکی سے ہندستان چلے گئے۔ جب میرے بھائی صاحب میاں محمود حسن (مرحوم) کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی میرے واپس بلانے کے لئے، غلام بھیک صاحب نیرنگ (مرحوم) کے ذریعے جوان

دنوں میں ہندوستان اسمبلی کے ممبر تھے، کوشش کرنا چاہی اور مجھے لکھا کہ میں اس بارے میں ایک عرضی ان کو بھیج دوں۔ میں نے ان کی تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میں کبھی بھی انگریزوں سے معافی نہیں مانگوں گا۔ بھائی صاحب مرحوم نے مجھے سمجھایا اور لکھا کہ ”اب ہندستان کے حالات بدل گئے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتفاق نہیں رہا ہے، اور مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب آپ کو ایسے نازک وقت میں وطن آکر اپنے تجربہ سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا چاہئے اور ان کو انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی دلانے میں ان کی مدد کرنی چاہئے۔ لیکن میں نے ان کی یہ بات نہ مانی۔ اگرچہ میں برصغیر کی آزادی کا خواہاں تھا اور اسی لئے اپنے عزیزوں سے جدا ہوا تھا۔ لیکن انگریزوں سے معافی مانگ کر وطن واپس جانا مجھے گوارا نہ تھا۔

انہی دنوں میں میرے بعض ترک دوستوں نے جن میں پروفیسر فریدوں ارگین بک، جو بعد میں ترکی پارلیمنٹ کے ممبر بھی بنے تھے، اور استانبول یونیورسٹی میں اقتصادیات کے معلم ہیں، مجھے کہا کہ ”اب آپ کے لئے ہندستان کے اندر کام کرنا ضروری ہے کیونکہ جس وقت کا آپ کو ۲۸ یا ۲۹ سال سے انتظار تھا، وہ سر پر آن پہنچا ہے۔ اب ہندستان کی آزادی کے لئے باہر رہ کر کام کرنے کی بجائے اندر جا کر کام کرنا چاہئے اور وہاں کے لیڈروں سے مل کر انگریزوں کے خلاف ایک نئی تنظیم بنانا چاہئے“۔

مجھے ان کی رائے بہت وزنی معلوم ہوئی۔ لیکن میں نے کھلم کھلا ہندوستان جانا پسند نہ کیا بلکہ میں انگریزی گورنمنٹ سے پوشیدہ طور پر ہندوستان جانے کے طریقے سوچنے لگا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے تو مجھے ہندستان کی سرحد کے نزدیک پہنچنا چاہئے، اور پھر وہاں سے خفیہ طور پر ہندستان میں داخل ہونا چاہئے۔ اس لئے میں نے افغانی سفیر فیض محمد خان کے ذریعہ انقرہ سے سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ افغانستان کو عرضی بھیجی کہ وہ افغانی فوج میں میرے خدمت کرنے کے لئے پھر ترکی گورنمنٹ سے اجازت لے کر مجھے افغانستان بلائیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر میں اس طرح کابل چلا گیا تو وہاں سے کسی نہ کسی طرح چھپ کر ہندستان میں داخل ہو جاؤں گا، اور وہاں خفیہ طور پر انگریزوں کے برخلاف جو اس وقت دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بہت پریشانی کی حالت میں تھے، کام کروں گا۔

تین ماہ کے انتظار کے بعد مجھے اس بارے میں کابل سے یہ مایوس کن جواب ملا کہ گورنمنٹ مجھے ایسے نازک زمانے میں کابل بلانا نہیں چاہتی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی تھی کہ سردار شاہ

محمود خان جو میرے خیالات سے واقف تھے اور مجھے انگریزوں کا دشمن سمجھتے تھے، یہ جانتے تھے کہ میں کابل میں ضرور انگریزوں کے برخلاف کوئی نہ کوئی کارروائی کروں گا، اور اس سے انگریزی افغانی سیاسی تعلقات میں پیچیدگیاں پڑنے کا اندیشہ ہو گا۔ میری یہ کوشش اس طرح پر ناکام رہنے کے بعد میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ترکی میں اس وقت تک خدمت کرتا رہوں جب تک خدا اور کوئی راستہ میرے لئے ہندستان کی آزادی کی کوشش کا نکالے۔

میرا فوج سے پنشن پانا

میں جولائی ۱۹۴۶ء تک ریزرو آفیسرز کالج میں معلم رہا۔ آخر کار میری پنشن کا وقت سر پر آن پہنچا۔ کیونکہ میں ۴۶ سال کی عمر سے پہلے میجر نہیں بن سکا تھا۔ میں ۱۹۳۹ء میں کیپٹن بنا تھا اور اس رینک والے افسر ۹ سال کی فوجی خدمت کے بعد میجر بنا کرتے ہیں۔ میرے میجر بننے میں ابھی دو سال باقی تھے۔ اس لئے پنشن کے قانون کے بموجب میں ۱۴/ جولائی ۱۹۴۶ء کو فوج سے ریٹائرڈ ہو گیا اور میری فوجی زندگی جس کا میں اتنا دلدادہ تھا، ادھوری رہ گئی۔ میں انقرہ میں بعض امور کے فیصلے کے لئے ستمبر کے وسط تک رہا، اور اس کے بعد استانبول آ گیا۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے دن جو میں نے فوٹو کھنچوایا تھا اس کی ایک نقل کتاب کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔ (۴۴)

ستائیسواں باب

استانبول میں میری رہائش، سٹاف کالج میں معلّمی

فوج سے ریٹائر ہونے پر میری زندگی کا چوتھا دور بھی ختم ہو گیا۔ پہلا دور ہندوستان میں گزرا، جہاں میں انجینئر بننے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کرنے پر یہ دور ختم ہو گیا۔ دوسرا دور افغانستان میں، جہاں میں نے ایک نیا کیریئر بنایا تھا، یہ دور بھی انگریزوں کی وجہ سے افغانستان چھوڑنے پر ختم ہوا۔ تیسرا دور روس میں انقلاب کی تحقیق میں لگا، لیکن میں نے وہاں کوئی کیریئر اختیار نہ کیا۔ روس کے لامذہب ماحول میں میرے لئے زیادہ دیر رہنے کا امکان نہ ہونے کی وجہ سے یہ دور بھی ختم ہوا۔ میں نے چوتھا دور ترکی میں شروع کیا اور اپنے لئے نیا فوجی کیریئر بنایا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بھی ایسی وجوہ سے جو میرے اختیار سے باہر تھیں، ادھورا رہ گیا تھا۔

سٹاف کالج میں میری معلّمی

اگرچہ چرخ فلک نے مجھے چار دفعہ مغلوب کیا لیکن اس کے باوجود بھی میرا عزم و ارادہ متزلزل نہ ہوا اور میں نے ہر دفعہ نئے ماحول میں اپنے لئے نئے سرے سے کیریئر بنایا۔ اس دفعہ بھی جب کہ میرے ہاتھ پاؤں میں سکت تھی اور میری صحت اچھی تھی، میں نے پنشن لے کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پسند نہ کیا اور اپنی زندگی کو از سر نو منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر میں نے جنرل باقی وان (میر پاشا مرحوم) کو جو ایک زمانے میں میرے ڈویژن کمانڈر تھے، اور اب سٹاف کالج کے چیف تھے، درخواست دی۔ انہوں نے مجھے سٹاف کالج میں انگریزی کا معلم مقرر کر دیا۔

برصغیر کی آزادی اور پاکستان کا قیام

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو اخبارات نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ ہندستانی مسلمانوں نے "پاکستان" کے نام سے اپنے لئے ایک آزاد وطن بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس خبر سے مجھے جتنی خوشی ہوئی اس کا بیان میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ میں نے خدائے لایزال کی بارگاہ میں سجدہ شکرادا کیا کہ اس نے اپنی بے پایاں مرحمت و عنائت سے مجھے اس دنیا میں یہ مبارک دن دیکھنا نصیب کیا۔

اگرچہ ترکی میں کوئی پاکستانی سفیر ۱۹۴۹ء کے آخر تک نہ آسکا لیکن پھر بھی مجھے آزاد ہندستان کے سفیر دیوان چمن لال کو ترکی میں دیکھ کر یہ امید ہوتی تھی کہ ایک روز پاکستان کا سفیر بھی ترکی آجائے گا۔ میں برصغیر سے دور رہنے کی وجہ سے ابھی تک ہندوؤں کی دشمنی کو جوان کو پاکستان سے تھی، سمجھ نہ سکتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہوجانے اور انگریزوں کے بیچ میں سے نکل جانے پر ہندو اور مسلمان برصغیر میں بالکل امن وامان سے رہ سکیں گے۔ لیکن اس کے بعد لاکھوں مسلمانوں کے بے سروسامانی کی حالت میں ہندستان سے پاکستان کو ہجرت کرنے کی خبریں آنے لگیں۔ اسی ذیل میں ہمارے سب رشتہ دار بڑی مصیبتیں جھیلتے ہوئے لاہور اور گوجرانوالہ وغیرہ پہنچے۔ ان جانخراش خبروں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں میری جو امیدیں تھیں ان سب پر پانی پھر گیا۔

شاہ خانم ثریا ملکہ سابقہ افغانستان کا ہمارے گھر آنا

انہی دنوں میں ہماری زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ شاہ خانم ثریا ملکہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان جو ۱۹۴۸ء میں اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے روم سے استانبول آئیں تھیں، ہمارے کوشک (بنگلہ) میں تشریف لائیں جہاں ہم گرمی کا موسم گزارا کرتے تھے، اور جو ترکی کے ایشیائی حصہ میں استانبول کے محلہ (چفتہ حوض) میں واقع تھا۔ اس وقت جو فوٹو ہم نے ان کے ساتھ لیا تھا وہ یہاں درج ہے۔ (۴۵)

آزادی کے بعد میرا وطن کا پہلا سفر

1915ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک ۳۴ سال کی جلاوطنی کے بعد میرے لئے اب امید پیدا ہوگئی تھی کہ اپنے زادبوم جاکر کم از کم اپنے باقی ماندہ رشتہ داروں اور عزیزوں کو تو اس زندگی میں ایک دفعہ دیکھ لوں گا۔ اس لئے میں نے ۱۹۴۹ء میں فیصلہ کیا کہ خانم کے ساتھ برصغیر کا سفر کروں۔

خانم کے بھائی پروفیسر مظفر شوقی بیزبک ہمارے اس سفر کے طرفدار نہ تھے۔ کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں میں برصغیر جاکر وہاں ہی نہ رہ پڑوں، اور ان کی اکلوتی بہن کو ان سے جدا کردوں۔ لیکن آخر کار ہم نے ان کو راضی کرلیا کہ ہم ایک دفعہ برصغیر میں ضرور جائیں۔ اس سفر کا خرچ مجھے ایک ترکی تجارتی کمپنی نے جس کا نام تبت ایکسپورٹ کمپنی لمیٹڈ تھا، دیا تھا تاکہ میں وہاں جاکر اس کے لئے برصغیر سے کپڑے اور بوریوں کی درآمد اور ہندوستان کو ترکی تمباکو، سگریٹ اور خشک میوہ کی برآمد کے لئے راستہ نکالوں۔

دیوان چمن لال سفیر ہند نے مجھے پنڈت نہرو (آنجہانی) وزیر تعلیم ہند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) وزیر رسل ورسائل ہند مسٹر قدوائی اور جنرل سیکرٹری وزارت تعلیم مسٹر ہمایوں کبیر جیسے مشہور اشخاص کے نام تعارفی خط دیئے۔

ہم استانبول سے ۲۸/فروری ۱۹۴۹ء کو ہوائی جہاز پر دہلی کو روانہ ہوئے اور یکم مارچ کو ٹرانزیٹ مسافر کے طور پر کراچی پہنچے۔ میں اپنی زادبوم کی آزاد زمین پر قدم رکھ کر بے انتہا خوش ہوا اور میں نے خدائے لایزال کا شکر کیا کہ اس نے جیتے جی مجھے اپنے ملک کو آزاد دیکھنا نصیب کیا۔

ہم نئی دہلی میں (Western Hostel) اترے جہاں ہمارے لئے مسٹر قدوائی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ریزرویشن کرادی تھی۔ اس زمانے میں دہلی میں ہوٹلوں میں جگہ ملنا مشکل تھا اس لئے اس ریزرویشن سے ہمیں بہت زیادہ فائدہ ہوا۔

اس ہوٹل کے مسلمان نوکروں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں بھی مسلمان ہوں تو ان میں کئی ایک نے میرے پاس آکر دہلی کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا چپکے چپکے ذکر کیا، جس سے مجھے سخت رنج ہوا اور میں آہستہ آہستہ سمجھنے لگا کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی حکومت اپنے کو سیکولر حکومت کہنے کے باوجود دوسرے مذہبوں کے پیروؤں کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کرتی اور مسلمانوں کو تو اس نے خاص کر مظالم کا

تختہ مشق بنا رکھا ہے۔

نہرو سے ہماری ملاقات

۴/مارچ کو ہمیں نہرو (آنجہانی) نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ وہاں پنجاب کا اس وقت کا گورنر ترے ویدی، لیڈی مونٹ بیٹن، نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی، ٹاٹا کمپنی کا ایک بڑا حصہ دار اور دو اور ہندوستانی لیڈر بھی موجود تھے۔ کھانے کے بعد نہرو نے مختصراً میری سوانح عمری سُننا چاہی۔ جب میں نے اس کو اپنے افغانستان، رُوس اور ترکی کے حالات سنائے تو حاضرین میری زندگی کا حال سُن کر بڑا تعجب کرنے لگے۔ اس پر پنجاب کے گورنر ترے ویدی نے میرے پاس آکر مجھے کہا کہ "میں آپ کا نام نہیں سُن سکا۔ مجھے اپنا نام تو بتایئے۔" جب میں نے اس کو کہا کہ "میرا نام ظفر حسن ہے" تو وہ یہ سنتے ہی پیٹھ موڑ کر مجھ سے دور چلا گیا، اور پھر اس سارے وقت میں جب تک ہم نہرو کے گھر پر رہے اس نے ہم سے بات تک نہ کی۔

مجھے ایک دوسرا دھکا لگا اور مجھے اس کا یقین آگیا کہ ہندو کسی مسلمان کی قابل قدر کارروائیوں کا سننا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

کھانے کے بعد میں نے نہرو سے علیحدگی میں کہا کہ "ہندوستان میں کمیونزم کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے آپ کو، ترکی نے کمیونزم کو اپنے ملک میں دبانے کے لئے جو طریقے اختیار کئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگر آپ چاہیں تو اس بارے میں ترکی آپ کی مدد کر سکتا ہے۔"

اس کا اس نے یہ جواب دیا کہ "ہم ہندوستان میں ترکی کی طرح کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے کر بند کرنا نہیں چاہتے"۔

۷ مارچ کو ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ کھانے پر انکا سیکرٹری اجمل خان، یو۔ پی کے جریدہ قومی اخبار کا ایڈیٹر اور ایک دو اور اشخاص موجود تھے۔ کھانے کے بعد میں نے مولانا (مرحوم) کو بھی کمیونزم کے بارے میں وہی بات کہی جو نہرو کو کہی تھی۔ مگر انہوں نے بھی مجھے ویسا ہی جواب دیا، جیسا کہ نہرو نے دیا تھا۔

(بعد میں ۱۹۵۸ء ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کے صوبہ کیرالا میں ہند کمیونسٹ پارٹی اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی اور نہرو اور مولانا آزاد (مرحوم) نے جو اصول کمیونزم سے بچنے کے لئے اختیار کئے ہوئے تھے وہ سب کے سب بے کار ثابت ہوئے)۔

ہمارا آگرہ جانا

مَیں نے ۱۹۱۵ء سے پہلے دہلی اور اس کی مشہور عمارتیں اور سلاطین مغلیہ کی یادگاریں تو دیکھی تھیں لیکن کبھی آگرہ نہ گیا تھا اور تاج محل نہ دیکھا تھا۔ اس لئے خانم اور میں ۱۵/مارچ کو آگرہ گئے، اور رات کو مہتاب کی روشنی میں اس بے نظیر عمارت کی سیر کی جو ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب کا ایک شاندار نمونہ ہے، مگر افسوس کہ آج کل غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔

آگرے سے واپس آکر ہم ایک ہفتہ اور دہلی میں ٹھہرے۔ اس عرصہ میں ہمیں ایک روز مسٹر ہمایوں کبیر نے شام کو کھانے پر بلایا۔ یہ ایک کافی بڑی پارٹی تھی۔

ہمارا بمبئی کا سفر

۲۲/مارچ کو ہم بمبئی گئے۔ جہاں مجھے بعض کارخانہ داروں سے مل کر تبت کمپنی کے لئے سوتی کپڑے کے نمونے لینے تھے۔ ہم بمبئی میں ۲۹/مارچ تک رہے اس عرصہ میں مَیں نے کپڑے کے نمونے بھی لئے اور بصرہ کے راستے ترکی کو لوٹنے کے لئے جہاز کا ٹکٹ بھی خریدا۔

بمبئی سے دہلی واپس آکر میں نے یکم اپریل کو ترکی کے متعلق ایک لیکچر دیا۔ جلسہ کی صدارت لیبر منسٹری کے جنرل سیکرٹری مسٹر لال نے کی۔ میں نے سامعین کو جن کی تعداد ۳۰۰ سے زیادہ تھی، نئی ترکی کے حالات مفصل بتلائے۔ میں کوئی ۴۵ منٹ تک بولتا رہا۔ میں نے ترکی کے متعلق کچھ تصویریں بھی دکھلائیں۔ میری تقریر کے بعد حاضرین نے ترکی کے بارے میں کوئی آدھے گھنٹے تک مجھ سے سوال پوچھے۔

اگلے روز ہم جنرل کریاپا کمانڈر انچیف ہند سے ملنے گئے۔ اس نے ہمیں دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ لیکن ہم اس کی دعوت کو منظور نہ کر سکے۔ کیونکہ ہمارے پاس بالکل وقت نہ تھا، اور اگلے دن

مجھے ہوائی جہاز پر پاکستان جانا تھا۔ جنرل کریاپا ایک بہت روشن خیال ہندو تھا۔ کیونکہ وہ پاکستان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو بہت ہی تیار معلوم ہوتا تھا۔

دہلی میں رہتے ہوئے ہم متعدد دفعہ ترکی سفیر فواد عالی ترک گلدی بک (مرحوم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ خانم کے بھائی کے دوست تھے۔ انہوں نے کئی دفعہ ہمیں کھانے پر بلایا۔ سفیر موصوف بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ انہوں نے مختلف ملکوں کے بارے میں جہاں وہ سفیر رہ چکے تھے، کتابیں لکھی تھیں۔ وہ فارسی زبان بہت اچھی بولتے تھے۔ دہلی سے پاکستان جانے سے پہلے میں کرنال جاکر اپنے آبائی گھر اور اپنے محلہ قاضیاں کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے کہا گیا کہ "ایسا اقدام آپ کے لئے بہت خطرے کا باعث ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہندو اور سکھ جو اب اس محلے میں آباد ہیں، آپ کو مارنے پر تیار ہو جائیں گے۔" اس پر میں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس واقعہ نے تو مجھے جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کیا، اور میرے دل میں جو تھوڑی بہت امید تھی کہ پاکستان اور ہندوستان باہم صلح کے ساتھ رہیں گے اور ہندوستان میں مسلمان آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے، وہ بھی یہ باتیں سن کر بالکل خاک میں مل گئی۔

میرا پاکستان پہنچنا

میں خانم کے ساتھ ۳/اپریل کو ہوائی جہاز پر دہلی سے لاہور آیا۔ ہوائی اڈے پر ہمیں بھائی صاحب (مرحوم) اور ان کے فرزند میاں مسعود حسن صاحب ملے۔ مسعود کو میں نے پورے ۳۴ سال بعد دیکھا۔ ۱۹۱۵ء میں جب میں نے گھر چھوڑا تھا وہ چند سالہ بچہ تھا۔ اب تو انگلینڈ میں تعلیم پا کر انجینئر بن گیا تھا۔ بھائی صاحب سے میں کابل کے بعد پہلی دفعہ مل رہا تھا۔ ۱۲ سال سے ان کو بھی میں نے نہ دیکھا تھا۔ ہم باہم گلے ملے اور میں خوشی کے آنسو نہ روک سکا۔ مسعود میاں کے گھر پر ہمشیرہ صاحبہ (مرحومہ) سے ملا۔ انہوں نے ایک سال سے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک خدا ان کو مجھ سے نہ ملائے وہ مرتے دم تک ہر روز روزہ رکھیں گی۔ ۳۴ سال بعد اس طرح پر ملنے سے ہم دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہاں میں اپنی بھتیجی سعیدہ بیگم سے ملا جو میرے وطن چھوڑنے کے بعد پیدا ہوئی تھی اور اب ڈاکٹر بن چکی تھی۔ مسعود میاں کی اہلیہ سلیمہ بیگم نے ہمارے لئے ایک کمرہ تیار کیا تھا جہاں ہمیں ۲۲ دن تک مہمان رکھا۔ اس عرصہ میں میرے رشتہ دار جو آس پاس کے شہروں اور قصبوں میں آباد ہو گئے تھے، مجھے ملنے کے لئے آئے۔

۹/اپریل ۱۹۴۹ء کو میں خانم کے ساتھ پوسٹ آفس گیا۔ اتفاق سے وہاں رحمت علی زکریا صاحب کو جو میرے ساتھ ہجرت کرنے والے دوستوں میں سے تھے، کھڑا پایا۔ ان سے کوئی ۲۵ سال بعد ملا تھا۔ ہم دونوں کو اس حسن اتفاق پر تعجب ہوا۔ ہم باہم گلے ملے اور ایک دوسرے کو مختصراً اپنے حالات بتانے لگے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے فرانس میں شادی کر لی ہے اور بال بچوں والے ہیں۔ کچھ مدت ہوئی کہ پاکستان آئے تھے تاکہ اپنے ملک کی کوئی خدمت کریں اور اپنے تجربے سے اس کو فائدہ پہنچائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوئی عہدہ یا کام ایسا نہ دیا گیا جس کی ان کو توقع تھی۔ اس لئے وہ بہت مایوس معلوم ہوتے تھے۔ بعد میں مَیں نے سنا کہ وہ پھر فرانس چلے گئے۔

ہمارا لاہور میں قیام

لاہور میں رہتے ہوئے ہمیں معلوم ہوا کہ میاں بشیر احمد صاحب حکومت پاکستان کی طرف سے ترکی میں سفیر مقرر ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے مجھ سے ترکی کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور جتنی معلومات اس بارے میں ہم سے لے سکتے تھے، لیتے رہے۔ انہوں نے اس کے لئے ایک روز کافی نہ سمجھا، اس لئے اگلے روز مجھے پھر بلایا اور دو گھنٹے تک سوال کرتے رہے۔

اس کے بعد میں ۱۹ اپریل کو عبدالرحمٰن آذر صاحب سے ملا۔ وہ اس وقت نارتھ ویسٹرن ریلوے کے اسسٹنٹ منیجر تھے۔ ان کے والد خان صاحب محمد الٰہی ہمارے ہندوستان سے ہجرت کرنے کے وقت (جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھا جاچکا ہے) ہری پور ہزارہ میں ریلوے انسپکٹر تھے اور انہوں نے ہمیں ایک رات اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ آذر صاحب کے گھر پر ان کے چچا مولوی فضل الٰہی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ۱۹۱۵ء میں ہجرت پر آمادہ کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ ان سے مل کر مجھے ازحد خوشی ہوئی۔ وہ سن رسیدہ ہونے کے باوجود جہاد کشمیر میں بھی حصہ لے چکے تھے۔

میرے لاہور کے قیام کے دوران میں مجھے بھائی صاحب مرحوم نے لاہور کے اہل علم اور ارباب قلم سے ملایا۔ اس ذیل میں چند ایک گارڈن پارٹیاں بھی ہوئیں۔ لاہور میں رہتے ہوئے میں پروفیسر محمد شفیع صاحب (مرحوم) سے ملا۔ وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ایڈیشن تیار کرنے پر پنجاب

یونیورسٹی کی طرف سے مقرر تھے۔ ان سے اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترکی نسخہ کے بارے میں بعد میں میری بہت خط و کتابت ہوئی۔ میں غلام رسول مہر صاحب سے بھی ملا تھا۔

ہمارا کراچی پہنچنا

ہم ۲۱/اپریل کو ترکی جانے کے لئے لاہور سے کراچی آئے۔ یہاں ہم فتح محمد شیفتہ صاحب کے ہاں جو بھائی صاحب مرحوم کے بہت عزیز اور پرانے دوست تھے، مہمان رہے۔ انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

ہم ۲۳/اپریل کو حیدر آباد سندھ گئے، جہاں ہمیں میری بھتیجی ڈاکٹر سعیدہ بیگم نے مہمان رکھا۔ یہاں ہمیں ۲۸ فروری کو ترکی چھوڑنے کے بعد پہلی دفعہ ریڈیو انقرہ کے سننے کا موقع ملا۔ اتنے روز کے بعد ترکی کے متعلق ترکی زبان میں اور ترکی ریڈیو سے خبریں سن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔

ہم حیدر آباد سے پھر واپس کراچی آئے۔ مجھے نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) وزیر اعظم پاکستان سے جو کرنال کے امیروں میں سے تھے اور اس لئے میرے ہم شہر سمجھے جاتے تھے، ملنے کی بہت آرزو تھی، لیکن وہ ان دنوں کراچی سے باہر کہیں لیاقت علی نہرو پیکٹ کی تیاری میں مصروف تھے۔

۲۶ اپریل کو یونیورسٹی ہال میں پروفیسر عبدالحلیم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کی صدارت میں میری تقریر کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں مَیں نے دہلی کی طرح ترکی کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ بعد میں حاضرین نے ترکی کے متعلق مجھ سے بہت سے سوالات پوچھے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس جلسے میں جہاں ترکی جیسے اسلامی ملک کے بارے میں تقریر ہونے والی تھی دہلی والے جلسے کی نسبت حاضرین کی تعداد بہت کم تھی۔

کراچی میں بھی لاہور کی طرح میرے، بہت سے پرانے دوستوں نے اور ایسے اصحاب نے جو مجھے غائبانہ جانتے تھے، دعوتیں اور گارڈن پارٹیاں دیں۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ سہ پہر کی چائے اور شام کے کھانے کے لئے کئی کئی جگہ پر جانا پڑا۔ مثلاً فریئرز ہال کے باغ میں جو چائے میرے پرانے وفادار رفیق سفر مولوی عزیز احمد صاحب برادر زادہ قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی (مرحوم) اور میرے کابل اور روس کے زمانے کے دوست عبدالوارث بٹ صاحب نے دی تھی، اس میں ہم زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اور یادگار کے طور پر ایک فوٹو گراف

لے کر وہاں سے ایک اور دوست کے ہاں چائے پر گئے تھے۔ اس زمانے کے ترکی سفیر یحییٰ کمال بے آتلی بک (مرحوم) جو ترکی کے ملک الشعراء مانے جاتے تھے، کراچی میں نہ ہونے کی وجہ سے سفارت خانہ کے فرسٹ سیکرٹری نے ایک دن ہمیں کھانے پر بلایا۔ لیکن ہم اس سے پہلے ایک اور جگہ کھانے پر جانے کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس لئے ان کی دعوت کو منظور نہ کر سکے۔

اس سلسلہ میں شعیب قریشی صاحب (مرحوم) جو ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہلال احمر طبی مشن کے ساتھ ترکی آئے تھے، اور بعد میں عراق میں پاکستانی سفیر بھی بنے تھے، کی دعوت قابل ذکر ہے۔ اس دعوت میں ان کی بیگم جو مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) کی صاحب زادی ہیں، پردہ کرنے کی وجہ سے کھانے کی میز پر نہ بیٹھی تھیں۔ حالانکہ میری خانم اور ایک پاکستانی بیگم جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، دعوت میں شریک تھیں۔

شعیب قریشی صاحب مرحوم کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ انہوں نے ترکی فوجی ترانہ جو کریمیا کی جنگ کے زمانے میں ترکی میں زبان زد عام تھا اور انہوں نے ۱۹۱۲ء میں ترکی میں سنا تھا، ۳۷ سال کے بعد ہمیں بڑی خوش الحانی سے پڑھ کر سنایا۔ حالانکہ میں ترکی قومی ترانہ کو جو میں نے کیڈٹ کالج میں سیکھا تھا، ان کی طرح اچھی لے میں نہ پڑھ سکا۔

ہماری ترکی کو روانگی

۲۸/اپریل کو ہم نے پاکستان کی پیاری سرزمین کو خیرباد کہا اور جہاز پر سوار ہو کر بصرہ کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک طرف عزیز و اقربا سے جدائی کی تلخی تھی اور دوسری طرف یہ سوال ہمارے ذہن میں بار بار آتا تھا کہ خدا جانے پھر پاکستان میں آنا نصیب ہو گا یا نہیں۔ اگر نصیب میں پھر آنا ہوا بھی اور دانہ پانی پھر مجھے برصغیر میں کھینچ کر لے بھی گیا تو خدا جانے اپنے عزیزوں میں سے کتنوں کو زندہ حالت میں پاؤں گا!

اٹھائیسواں باب

ترکی واپس آکر پاک ترک روابط کے لئے میری خدمات

ہم بحرین، کویت اور آبادان ہوتے ہوئے ۵/ مئی کو بصرہ میں اترے اور اسی دن ریل پر سوار ہو کر بغداد روانہ ہوگئے۔ اگلے روز بغداد پہنچ کر ہم فندق سمیرامس (فندق کے معنی عربی میں ہوٹل کے ہیں) میں اترے۔ اس زمانے میں یہ یہاں کا بہترین ہوٹل تھا لیکن ترکی کے اچھے ہوٹلوں کے مقابلے میں بہت معمولی سا معلوم ہوتا تھا۔ یہاں ترکی سفیر احمد بنیل باطی بک نے (جو احمد مختار بک مرحوم سابق سفیر ترکی مقیم ماسکو کے جن کا ذکر اس سے پہلے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں آچکا ہے، داماد تھے) ہماری بہت خاطر تواضع کی۔ اسی طرح افغانی سفیر یحییٰ خان نے جس کو ہم کابل سے جانتے تھے، ہمیں کھانے پر بلایا۔ ہمیں بغداد کے مشہور سیٹھ اور سگریٹ اور اونی کپڑے کی فیکٹریوں کے مالک سلیمان فتاح بک نے جو ہمارا استانبول سے واقف تھا، بغداد کی سیر کرائی اور اپنے کارخانے دکھلائے اور دعوتیں دیں۔

ہم بغداد سے ۹ مئی کو ریل پر سوار ہو کر موصل اور حلب کے راستہ ترکی کی سرزمین میں داخل ہوئے اور ۱۳ مئی کو بخیر استانبول پہنچ کر اپنے عزیزوں سے ملے۔

ہمارا ترک پاکستانی کلچر سوسائٹی کی شاخ استانبول کی بنیاد ڈالنا

برصغیر سے واپس آنے کے بعد ہم نے ترکی اور پاکستان کی باہمی دوستی کو ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی بنائی لیکن افسوس ہے کہ بعض جاہ پرست

ممبروں کی وجہ سے یہ بیل سر نہ چڑھ سکی۔ اس کے کچھ دن بعد میاں بشیر احمد صاحب پاکستانی سفیر کی حیثیت سے انقرہ پہنچے اور کچھ مدت کے بعد وہاں سے استانبول آئے۔ اس پر ہم نے بعض دوستوں کو ترغیب دے کرے اگست ۱۹۵۱ء کو ترک، پاکستان کلچرل سوسائٹی کی جو انقرہ میں سفیر موصوف اور محمد یعقوب ہاشمی صاحب پریس اٹیچی پاکستان کی کوشش سے قائم ہوئی تھی، ایک شاخ استانبول میں کھولی۔ اس میں استانبول یونیورسٹی کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر اور استانبول کے بعض مشاہیر شریک تھے۔ اس کے پریذیڈنٹ استانبول یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر کاظم اسماعیل گور قان بک اور جنرل سیکرٹری میں چنا گیا۔ میں اس کے بعد سالہا سال اس عہدے پر فائز رہا اور دو سال سوسائٹی کا وائس پریذیڈنٹ رہا۔

پاکستان کے جو مشاہیر اور حکومت کے رکن وقتاً فوقتاً استانبول آتے جاتے رہے ان کا سوسائٹی کی طرف سے پرجوش خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہز ایکسیلنسی غلام محمد خان (مرحوم) گورنر جنرل پاکستان، چوہدری خلیق الزمان صاحب سابق سفیر پاکستان در انڈونیشیا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ (مرحوم) وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ جو فوٹو سوسائٹی کے ممبروں نے میری جنرل سیکرٹری شپ کے زمانے میں لئے تھے وہ آخر میں درج کئے جاتے ہیں۔ (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹)

انقرہ میں تو یہ سوسائٹی اتنی نہیں پھلی پھولی جتنا کہ استانبول میں ہر دلعزیز ہوئی۔ شریف الحسن صاحب پریس اٹیچی پاکستان کی ان تھک کوششوں سے اب اس کی استانبول کی شاخ اتنی کامیاب ہو گئی ہے کہ ہر مہینے ایک مرتبہ پاکستان کے بارے میں یہاں لیکچر دیا جاتا ہے۔ اور پاکستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ (کچھ عرصے سے سوسائٹی کی یہ سرگرمیاں سرد پڑی ہیں) (۱۹۸۸

ترکی سفیر کے ساتھ کراچی کو میرے بطور کونسلر جانے کی تجویز

۱۹۵۰ء میں ہمارے سفیر بنیل باطی بک مرحوم بغداد سے کراچی منتقل کئے گئے۔ انہوں نے کراچی جانے سے پہلے وزارت خارجہ ترکی سے اس کی منظوری لی کہ وہ مجھے بطور کونسلر (مستشار) سفارت اپنے رکھ لیں۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے صرف اس خیال سے کہ میں برصغیر

میں پیدا ہوا تھا، پاکستانی گورنمنٹ سے پوچھا کہ میرے بطور مستشار سفارت ترکی پاکستان کو آنے پر اس کو کوئی اعتراض ہے یا نہیں۔ ڈپلومیٹک اصول کے بموجب اس قسم کے استفسار کی ضرورت نہ تھی کیونکہ صرف سفیر کی تقرری کے بارے میں غیر ملکی حکومت سے منظوری لی جات ہے۔ لیکن بنیل بک (مرحوم) نے میری خصوصی پوزیشن کا خیال رکھ کر صرف برائے نزاکت پاکستانی گورنمنٹ سے ایسا استفسار کیا تھا۔ پاکستانی گورنمنٹ نے میرے بارے میں اپنے سفیر متعینہ ترکی میاں بشیر احمد صاحب سے پوچھا۔ میاں صاحب نے جو بڑے وہمی مزاج واقع ہوئے ہیں میرے بارے میں گورنمنٹ کو یہ لکھا کہ میں ہندوستان کا طرفدار ہوں۔ چونکہ دیوان چمن لال سفیر ہند کو میرے ایک دور کے رشتہ دار نے ترکی سے غلہ خریدنے میں مدد دی تھی۔ اس پر پاکستانی گورنمنٹ نے میری تقرری منظور نہ کی اور میں کراچی میں ترکی سفارت کا مستشار نہ بن سکا۔

مجھے جب کچھ عرصہ بعد میاں صاحب کی اس مہربانی کا پتہ لگا تو میں نے ان سے اس کا سبب پوچھا۔ اس پر وہ بہت کھسیانہ ہوئے۔ کیونکہ وہ ترکی میں ایک سال رہ کر بخوبی دیکھ چکے تھے کہ میں پاکستان کے مفاد کے لئے کام کر رہا ہوں اور میرا ہندوستان کا طرفدار ہونا ناممکن ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے جواب دیا کہ "مجھ سے اس وقت غلطی ہوئی۔ لیکن اب اگر پھر ترکی سفیر ہماری حکومت سے آپ کے لئے منظوری مانگے تو میں ضرور آپ کی سفارش کر دوں گا۔"

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

لیکن میں نے اس کے بعد کوئی ایسی کوشش کرانا مناسب نہ سمجھا۔

استانبول میں میرے بطور آنریری قونصل پاکستان مقرر کئے جانے کی تجویز

پاکستان کے مشاہیر میں سے چوہدری ظفر اللہ خان بھی جو اس وقت وزیر خارجہ تھے، ۱۹۵۰ء میں استانبول آئے تھے۔ میں ان سے بھی ملا اور ان کو یہاں کے ارباب علم و دانش سے ملایا۔ وہ گورنمنٹ کالج کے تعلیم یافتہ اور مجھ سے چار سال سینئر تھے۔ وہ اس سال جب میں کالج میں داخل ہوا اسٹیٹ سکالرشپ لے کر انگلینڈ جا چکے تھے۔ اس لئے میں وہاں ان سے نہ مل سکا۔ لیکن پروفیسر سردار محمد خان ایم۔ ایس سی کے ذریعہ میرا ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ میں نے سردار محمد صاحب کے ذریعے کوشش کی تھی کہ وہ چوہدری صاحب سے کہہ کر مجھے استانبول

میں پاکستان کا آنریری قونصل مقرر کرا دیں۔ جب چوہدری صاحب یہاں آئے تو ان سے اس بارے میں بات ہوئی اور وہ اس تجویز سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے دفتر وغیرہ کے اخراجات کا تخمینہ مانگا۔ ان کے پاکستان جانے پر میں نے ان کو یہ تخمینہ بھیج دیا اور یہ بھی لکھا کہ میں پاکستانی حکومت سے اس کام کے لئے تنخواہ یا کسی قسم کی ذاتی اور مالی مدد نہیں لوں گا۔ کچھ عرصہ بعد آغا ہلالی صاحب کے دستخط سے مجھے ایک جواب ملا کہ "فی الحال پاکستانی حکومت قونصل گری کے دفتر کے اخراجات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ اس منفی جواب میں بھی میاں بشیر احمد صاحب کی رائے کا کوئی دخل تھا یا نہیں۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر میں تفصیل سے لکھوں گا، انہوں نے میرا نام پاکستان کی بلیک لسٹ میں لکھوا دیا تھا، اور میرا پاکستان میں داخلہ بند کرا دیا تھا۔ اس کارروائی کا پتہ ایک واقعہ کی وجہ سے مجھے چار برس بعد چلا۔

میرا معلمی سے پنشن یاب ہونا

۱۹۵۱ء کے آخر میں ترکی سٹاف کالج کے نصاب سے غیر ملکی زبانوں کی تعلیم ختم کر دی گئی۔ اس لئے وہاں انگریزی کا پڑھایا جانا موقوف ہو گیا اور مجھے ملٹری ہائی سکول میں بطور معلم انگریزی مقرر کر دیا گیا۔ یہ سکول شہر سے باہر اور دور ہے۔ وہاں آنے جانے کے لئے آمدورفت کے ذرائع کم ہیں جس سے مجھے وہاں آنے جانے میں کافی مشکل ہوتی تھی اور راستہ میں تین گھنٹے لگ جایا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے وہاں سے ایک ماہ بعد استعفیٰ دے دیا اور پنشن لے کر معلمی کے فرائض سے بھی سبکدوش ہو گیا۔

میری بیماری

جون ۱۹۵۳ء میں ترکی معمار وصفی اگرلی (مرحوم) نے جس نے قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار اور اس کے ساتھ بنائے جانے والے کتب خانہ اور مدرسہ کی پلین اور ڈھانچہ (موڈل) بنانے کا ٹھیکہ لیا تھا، کراچی جانے اور مجھے بطور مددگار اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا۔ راجہ غضنفر علی خان (مرحوم) نے جو اس وقت ترکی میں پاکستان کے سفیر تھے، مجھے اپنی ذمہ داری پر اور کراچی سے پوچھے بغیر ویزا دے دیا (حالانکہ جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا

جائے گا، وہ جانتے تھے کہ میں پاکستان کی بلیک لسٹ میں داخل ہوں)۔ میرے سفر کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ مجھے ۱۵/جون ۱۹۵۳ء عارضہ قلب ہوا۔ مجھے ڈاکٹر پروفیسر مظفر شوقی بیزبک (مرحوم) نے جو امراض قلب کے بھی حاذق حکیم تھے اپنے زیر علاج لیا اور ایک ہفتہ بعد مجھے اپنے بنگلے میں لے گئے جو ایک خوبصورت باغ کے اندر استانبول کے صحت افزا حصہ میں جس کا نام چفتہ حوض ہے، واقع ہے۔ میں کوئی دو ماہ صاحب فراش رہا، اور جب اس عرصہ کے بعد بستر سے اٹھنے کے قابل ہوا تو مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ دو قدم بھی چل سکوں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے کو پھر چلنے کا عادی کیا، لیکن سیڑھیاں چڑھنا میرے لئے اس وقت ناممکن تھا۔

جنرل محمد ایوب خان اور سکندر مرزا کا ہمارے گھر آنا

اس بیماری سے ذرا افاقہ پانے پر میں اپنے کو چلنے پھرنے کا عادی بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے سفارت خانہ پاکستان سے جنرل محمد ایوب خان کمانڈر انچیف افواج پاکستان اور اسکندر مرزا سیکرٹری آف ڈیفنس کے انقرہ آنے اور وہاں سے استانبول پہنچنے کی خبر ملی۔ میں نے پاکستان کے پریس اتاچی مسٹر ارشد الزمان سے کہا کہ وہ ان اصحاب سے میری طرف سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے ہاں چائے پر تشریف لائیں۔ ان اصحاب نے ۲۰/ستمبر ۱۹۵۳ء کو ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمانا منظور کر لیا۔ میں ان کے خیر مقدم کے لئے گھر سے باہر نکل کر آہستہ آہستہ باغ کے دروازے تک پہنچا۔ ان سے ملنے کے لئے ہم نے اپنے کمانڈر انچیف جنرل نور الدین بارنسل پاشا اور ترکی سفیر نبیل باطی بک کو جو چھٹی پر کراچی سے استانبول آئے ہوئے تھے مع ان کی بیگمات کے دعوت دی۔ میری خانم نے ان مہمانوں کی ان کی پوزیشن کے مطابق خاطر تواضع کی پوری پوری کوشش کی۔ افسوس ہے کہ ان دنوں پروفیسر مظفر شوقی بیزبک (مرحوم) استانبول میں نہ تھے کیونکہ وہ طبی تحقیق کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ اس دعوت میں ہمارے محترم پاکستانی مہمانوں نے ہمارے کمانڈر انچیف جنرل نور الدین بارنسل پاشا سے ترکی اور پاکستان کے باہمی سمجھوتے کے لئے مفصل گفتگو کی، میں ان کی ترجمانی کرتا رہا۔ آج جو ترکی اور پاکستان کے درمیان سیاسی اور فوجی اتحاد موجود ہے اس کی داغ بیل ہمارے ہی بنگلے میں پڑی تھی۔ اس بنگلہ کا ایک فوٹو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ (۵۰) (۵۱)

میری بھتیجی ڈاکٹر سعیدہ بیگم کا استانبول آنا

جب میری بیماری کی خبر میرے رشتہ داروں نے پاکستان میں سنی تو ان میں سے میری بھتیجی ڈاکٹر سعیدہ بیگم ۲۵/ ستمبر ۱۹۵۳ء کو میری بیمار پرسی کے لئے استانبول آئیں اور تقریباً ایک ماہ ہمارے پاس ٹھہریں۔ اس عرصہ میں ہم نے ان کو استانبول کے مختلف شفاخانے، سینی ٹوریم اور بکٹیریولوجی کے مرکز دکھلائے۔ وزارت تعلیم کے باغ میں جو فوٹو باش طبیب ڈاکٹر ذکی کوسہ اوغلی بک کے ساتھ ہم نے کھنچوایا تھا وہ یہاں درج ہے۔ (۵۲)

ترکی حکومت کی مجھے پاکستان بھیجنے کی تجویز

۱۵/ نومبر کو مجھے ترکی گورنمنٹ کی طرف سے اس ترکی فوجی مشن کے ساتھ جو پاکستان کے فوجی مینوورز دیکھنے کو راولپنڈی جا رہا تھا، مقرر کیا گیا۔ میں اس سفر کی ساری تیاریاں کر کے انقرہ سے استانبول لوٹا تاکہ دو روز بعد اس مشن کے ساتھ کراچی روانہ ہوں۔ مگر اسی دن ترکی وزارت جنگ سے مجھے حکم ملا کہ "آپ کا پاکستان جانا موقوف ہو گیا ہے۔" مجھے اس پر بہت تعجب ہوا اور اس کے ساتھ ہی مایوسی ہوئی۔ میں نے اس کی وجہ میاں امین الدین مرحوم سفیر پاکستان متعینہ انقرہ سے دریافت کی۔ لیکن انہوں نے مجھے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

مجھے کوئی دو ماہ بعد ترکی جنرل ہیڈ کوارٹرز سے پتہ لگا کہ میرا نام پاکستان کی بلیک لسٹ میں داخل ہونے کی وجہ سے مجھے پاکستان جانے سے روک دیا گیا تھا۔ اس پر میں فوراً تاڑ گیا کہ یہ بھی میاں بشیر احمد صاحب کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ ایں ہم اندر بلائے غم ہائے دیگر۔ میرا خیال ہے کہ راجہ غضنفر علی خان کی طرح امین الدین صاحب نے تو مجھے اپنی ذمہ داری پر پاکستان جانے کا انقرہ میں ویزا دے دیا تھا۔ لیکن جب مشن کے ممبروں کے نام انہوں نے اپنی حکومت کو بذریعہ تار بتائے ہوں گے تو گورنمنٹ پاکستان نے مجھے پاکستان آنے سے روک دیا ہو گا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میاں امین الدین صاحب چھٹی پر پاکستان گئے۔ انہوں نے میری ان خدمات کا ذکر جو میں ترکی میں پاکستان کے لئے کر رہا تھا اپنی گورنمنٹ سے کر کے میرا نام بلیک لسٹ سے نکلوا دیا اور مجھے سفارت خانہ کے ذریعے سرکاری طور پر خبر دے دی کہ میرے

پاکستان جانے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔

صدر سکندر مرزا کا ترکی آنا

۱۹۵۶ء میں پاکستان میں جمہوریت قائم ہو گئی اور جنرل اسکندر مرزا اس کے پہلے صدر چنے گئے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں استانبول کو سرکاری طور پر آئے۔ میں ان سے ترک، پاکستان کلچرل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ملا۔ قصر بیلربیی (Beylerbeyi) میں جو دعوت صدر جمہوریت ترکی نے ان کو دی تھی میں اس میں بھی مدعو تھا۔ وہاں جنرل محمد ایوب خان سے میں اور خانم پھر ملے اور انہوں نے میرے مرض دل کے بارے میں پوچھا اور مجھے تندرست دیکھ کر اظہار خوشی کیا۔

میرا دوسری مرتبہ پاکستان جانا

پاکستان میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد ۱۹۵۸ء میں جمہوریت کی تیسری سالگرہ پر ترکی کیڈٹ کالج سے ایک Contingent (دستہ) کو جنیزری بینڈ کے ساتھ پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس تقریب پر ترکی فضائیہ کا ایک دستہ بھی ترکی سے پاکستان کو پرواز کر کے گیا۔ مجھے یہ Contingent کے ساتھ مقرر کیا گیا۔ میں اور کیڈٹس کا دستہ ۱۹/ مارچ کو ترنی ہوائی جہازوں پر دیار بکر، موصل، بغداد، دہرین کے راستے چار دن میں کراچی پہنچا۔ اس تقریب میں بغداد پیکٹ کے ممبر عراق اور ایران کے فوجی دستے بھی شریک ہوئے تھے۔ ہمارے Contingent دستے کے لیڈر اور جنیزری بینڈ کے بینڈ ماسٹر وغیرہ کو دوپہر سے پہلے پریذیڈنٹ جنرل سکندر مرزا نے باریابی دی۔ شام کو سب وفود کو پریذیڈنٹ ہاؤس میں دعوت دی گئی۔ میں نے اس ساری تقریب کے دوران میں اپنی ڈیلی گیشن کی ترجمانی کا فرض ادا کیا۔

۲۳/ مارچ ۱۹۵۸ء کو جو فوجی مارچ پاسٹ ہوا تھا، اس میں ترکی جنیزری بینڈ نے بھی حصہ لیا۔ اس وقت کا ایک گروپ فوٹو آخر میں درج کیا جاتا ہے۔ (۵۳)

جنیزری بینڈ نے شام کو کراچی کی سڑکوں پر بھی مارچ کیا اور تلوار اور ڈھال

کے ساتھ فوجی کرتب دکھلائے۔ کراچی کے باشندوں نے ان کا بڑے جوش وخروش سے استقبال کیا اور ایک جسم غفیر نے ان کے فوجی ڈانس کو تالیاں بجا بجا کر سراہا۔ اس فوجی ڈانس کی ایک تصویر بھی آخر میں درج کی جاتی ہے۔ (۵۴)

کراچی میں چار روز رہنے کے بعد ہمارا (Contingent) لاہور گیا ۔ وہاں ہمارے دستے کو گورنر مغربی پاکستان نے دعوتیں دیں۔ جنیزری بینڈ نے وہاں بھی تلوار اور ڈھال کے کرتب دکھلائے۔ میں لاہور میں پھر اپنے بھائی صاحب (مرحوم)، اپنے بھتیجے مسعود میاں اور بھتیجی ڈاکٹر سعیدہ بیگم سے نو سال کے بعد ملا۔

ہم یکم اپریل کو کراچی سے اپنے فوجی ہوائی جہازوں پر سوار ہوئے اور ۴/اپریل کو انقرہ پہنچے۔

ترکی، عراق اور ایرانی دستوں اور فوجی ہوائی جہازوں کا جمہوریہ پاکستان آنے سے ہندوستان جتنا مرعوب ہوا ہو گا، اس کا اندازہ پاکستانی قارئین مجھ سے زیادہ اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔ اسلامی ملکوں کے اتحاد کا ایسا نظارہ تاریخ میں پہلی مرتبہ دیکھا گیا تھا جس سے یہ امید ہوتی تھی کہ آئندہ ان ملکوں میں اتحاد اتفاق اور بھی بڑھے گا۔ مگر افسوس ہے بغداد پیکٹ پرنس عبداللہ (مرحوم) اور جنرل نوری سعید پاشا (مرحوم) کی غلطیوں کے باعث ٹوٹ گیا۔

پاکستان میں ۱۹۵۸ء کا انقلاب

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان میں بطور صدر مملکت حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ اس پر یہاں ترکی میں پاکستان کے ہم سب خیر خواہوں کو بہت خوشی ہوئی اور ہمیں یہ امید لگی کہ اس کے بعد پاکستان میں ایک مضبوط ادارہ قائم ہو جائے گا۔

اس موقع پر جو مبارک بادی کا خط میں نے بہ حیثیت جنرل سیکرٹری ترک پاکستان کلچرل سوسائٹی کے صدر موصوف کو بھیجا اور جو جواب ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے مجھے ملا تھا

ان کے عکس آخر میں یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ (۵۵) (۵۶)

ترکی خواتین کی صدر محمد ایوب خان کو مبارکبادی

جب ترک، پاکستان کلچرل سوسائٹی کی شاخ استانبول کی خواتین ممبروں کو یہ خبر ملی کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان کے نئے دستور اساسی میں عورتوں کو بھی پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا حق دیا ہے تو ان کو بے حد خوشی ہوئی۔ ان کی طرف سے میری خانم نے جو اس سوسائٹی کی شاخ استانبول کی بنیاد ڈالنے والی خواتین میں سے ہیں، صدر موصوف کو ایک مبارکبادی کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں جو خط ان کے پرائیویٹ سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے خانم کو بھیجا تھا، اس کا عکس آخر میں درج کیا جاتا ہے۔ (۵۶ الف)

پروفیسر ڈاکٹر مظفر شوقی یزبک کی وفات کا سانحہ

۱۶/فروری ۱۹۵۹ء کو ہمیں ہمارے عزیز پروفیسر ڈاکٹر مظفر شوقی یزبک کی وفات حسرت آیات کا سانحہ پیش آیا، جس کی وجہ سے آج تک ہمارے دل خون کے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ خانم کو تو اپنے اکلوتے بھائی کی موت کی وجہ سے ہارٹ اٹیک ہوا جس کی وجہ سے وہ ۲۰ دن صاحب فراش رہی۔ اس کو آج تک بھی اس بیماری سے افاقہ نہیں ہوا ہے۔

مظفر شوقی یزبک استانبول میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر بنے اور پہلی جنگ عظیم میں ترکی فوج میں خدمت پر لگائے گئے۔ جنگ کے خاتمہ پر استانبول کے دار الفنون (یونیورسٹی کو اس زمانے میں ترکی میں دار الفنون کہا جاتا تھا) میں ان کی تقرری ہوئی۔ وہ پانچ سال کے بعد سکالر شپ لے کر طبی تحقیق اور تدقیق (یعنی میڈیکل ریسرچ) کے لئے فرانس گئے۔ وہاں انہوں نے ذیابیطس کے مرض کے معالجہ کے نئے اصول سیکھے اور ۱۹۲۷ء میں ترکی آکر ان اصولوں کو یہاں پہلی دفعہ جاری کیا۔ ان کو اس مرض کے معالجہ میں ید طولیٰ حاصل ہونے کی وجہ سے وہ ترکی وزیر اعظم (سابق) عصمت این اونی پاشا کے، جن کو ذیابیطس کا مرض تھا، طبیب خاص مقرر ہوئے۔ ذیابیطس کے متعلق انہوں نے بہت سے مقالے فرانسیسی اور

انگریزی میڈیکل جرنلز میں شائع کرائے۔ اس پر فرانسیسی حکومت نے ان کی قدر دانی کے لئے ان کو (Officer of the FRENCH Legion of Honours) کا تمغہ دیا۔ وہ ۱۹۴۲ء میں امراض داخلیہ کے طبیب حاذق ہونے کی وجہ سے استانبول یونیورسٹی کے پروفیسر بنے اور ۱۹۵۴ء میں امراض سینہ کے شفاخانہ کے باش طبیب مقرر ہوئے۔ وہ ہر سال طبی تدقیق کے لئے یورپ جاکر وہاں کے شفاخانوں کو دیکھا کرتے تھے. اور اس طرح پر اپنے کو علم طب کی نئی نئی ترقیات سے واقف کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے ذیابیطس (وا... من اور مختلف امراض کی علامات (Syndrom) کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں۔

ان کی پریکٹس بڑی وسیع اور آمدنی کافی سے زیادہ تھی جس سے وہ آرام کی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ نادار بچوں کو وظیفہ دے کر پڑھاتے تھے اور اپنی اکلوتی بہن مکرم خانم کو بھی مالی مدد دیتے تھے۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت بڑا تھا جس سے ان کے دسترخوان پر پرانے ترکی پاشاؤں کی طرح ہمیشہ بہت سے مہمان موجود ہوتے تھے۔

وہ عمر بھر کنوارے رہے۔ ان کو ۱۹۳۷ء میں ہارٹ اٹیک ہوا لیکن شفایاب ہو گئے اور احتیاط سے زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ۱۹ سال تندرست رہے۔ مگر ۱۹۵۶ء میں ان کو پھر ہارٹ اٹیک ہوا جس سے ان کو دو سال کافی تکلیف رہی۔ اس کے بعد وہ معالجہ کے لئے سوئٹزرلینڈ اور فرانس گئے لیکن ۱۶/فروری ۱۹۵۹ء کو پیرس میں فوت ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

ان کا جنازہ ہوائی جہاز کے ذریعہ استانبول لایا گیا، اور جنازہ کی نماز کے بعد استانبول کے یونیورسٹی ہال میں لے جایا گیا۔ جہاں ان کے دوستوں اور طالب علموں نے ان کے لئے آخری دفعہ اظہار تعظیم کیا۔ ان کو (زنجیرلی قویو) کے قبرستان کے احاطہ نمبر ۹ میں مزار نمبر ۳۷۵ کے اندر دفن کیا گیا (میں نے ان کے پہلو میں مزار نمبر ۳۷۶ خانم کے لئے اور مزار نمبر ۳۷۷ اپنے لئے خریدا)۔ ☆

انہوں نے اپنی جائیداد میں سے تقریباً چار لاکھ لیرے (۲ لیرے = ایک روپیہ) کی قیمت کا ایک گھر، اس کا فرنیچر، باغ اور زمین اپنی نرس کو جس نے ان کی پندرہ سال خدمت اور تیمار داری کی تھی، دیدی تھی۔ باقی جائیداد جس کی قیمت دس لاکھ لیرے سے زیادہ

☆ مزار نمبر ۳۷۶ میں خانم مرحومہ ۱۹۸۲ء میں اور مزار نمبر ۳۷۷ میں آپ بیتی کے مؤلف ظفر حسن ایبک مرحوم ۱۹۸۹ء میں ابدی نیند سو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون (مرتب)

تھی، اپنی اکلوتی بہن مکرم خانم کے لئے چھوڑ دی۔ (۵۷) (۵۸)

ہم دونوں کے بے اولاد ہونے کی وجہ سے میری خانم نے وصیت کر دی کہ یہ سب جائیداد ہم دونوں کی وفات کے بعد دارالعجزہ (Pauper's Home) واقع استانبول کو دیدی جائے، تاکہ نادار یتیم بچوں، بے کس بوڑھے مرد اور عورتوں کی مدد کے لئے خرچ کی جائے۔

لیڈی عبدالقادر صاحبہ کا ہمارے ہاں مہمان ہونا

پاکستان کی مایہ ناز خواتین میں سے لیڈی عبدالقادر صاحبہ ۱۹۶۰ء میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے ورلڈ ویمن کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے استانبول آئیں۔ اس موقع پر ایک روز انہوں نے ہمارے غریب خانہ پر بھی چائے کے لئے قدم رنجہ فرمایا۔

اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں پھر ایک ایسی ہی تقریب پر انقرہ آئیں۔ انہوں نے ترکوں کے سوشل حالات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے استانبول میں ایک ترکی خاندان کے ہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والی خواتین میں سے ایک نے اس بارے میں ہم سے پوچھا۔ ہم نے اس کے جواب میں کہا کہ "اگر لیڈی عبدالقادر صاحبہ ہمارے ہاں ٹھہرنا منظور فرماویں تو ہمارے لئے تو بہت باعث عزت ہوگا"۔

اس پر جب وہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انقرہ سے استانبول آئیں تو ہمارے ہاں اتریں اور کوئی ایک ہفتہ رہیں، وہ ایک بڑی شریف، سنجیدہ مزاج، تجربہ کار اور بہت قابل خاتون تھیں۔ ہمارے ہاں رہتے ہوئے خانم اور میں ان کو (باوجود ان کی سن رسیدگی کے) ہر روز باقاعدہ کچھ مضمون لکھ کر کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے ہوئے دیکھتے اور ان کی بلند ہمتی کی داد دیا کرتے تھے۔ پاکستان کی قوم اپنی ایسی کارکن خواتین کی وجہ سے جتنا فخر کرے کم ہے۔

میری اخبار نویسی

۱۹۵۱ء میں سٹاف کالج اور ملٹری ہائی سکول سے علیحدہ ہونے کے بعد میں نے محض اپنا شوق

پورا کرنے کو اخبار نویسی شروع کی۔ اس سے میرا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ پاکستان کی پبلسٹی کروں اور پاکستان کے متعلق مسائل پر آرٹیکل لکھ کر ترکی پبلک کو وہاں کے حالات بتایا کروں۔

چنانچہ میں نے روزنامہ "جمہوریت" روزنامہ "خدمت" ہفتہ وار رسالہ "حریت" اور ته دوغو (شرق وسطی) اور "پاکستان پوستہ ی" (پاکستان پریس اٹیچی کا ماہ نامہ تھا) میں قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی زندگی، علامہ اقبال مرحوم کی سوانح اور ان کی شاعری اور فلسفہ، ہزایکسیلنسی فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان کی خدمات، مسئلہ کشمیر، ہند پاک اختلافات، پاک افغان تعلقات، پاکستان کی خارجی سیاست، پاکستان کی صنعتی ترقیات پر آج تک جو آرٹیکل لکھے ہیں، وہ غالباً ترکی کے سارے اخبار نویسوں کے تحریر کردہ مقالات، متعلقہ پاکستان کے مجموعے سے زیادہ ہوں گے۔

پاکستان کو میرا تیسرا سفر

میری ان کوششوں کے صلے میں سفارت پاکستان نے اپنے پریس اٹیچی شریف الحسن صاحب کی تجویز پر مجھے سٹیٹ گیسٹ (سرکاری مہمان) کی حیثیت سے پندرہ روز پاکستان کی سیر کے لئے ۱۴/اپریل ۱۹۶۳ء کو کراچی بھیجا۔

میرے اس سفر کا انتظام بہت باقاعدہ کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں مَیں مشرقی پاکستان بھی گیا اور وہاں جو ترقیات ہو رہی ہیں ان کو بذات خود دیکھا۔ لاہور آ کر پھر پانچ سال بعد اپنے عزیزوں سے ملا۔ اس وقت جو فوٹو ہم نے لیا تھا۔ وہ اس کتاب کے آخر میں درج ہے۔ (۵۹)

علامہ اقبال مرحوم کی برسی

۲۱/اپریل ۱۹۶۳ء کو علامہ اقبال مرحوم کی وفات کی پچیسویں برسی تھی۔ اس موقع پر پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ترکی کی طرف سے پروفیسر ملیحہ انبارجی اوغلی خانم جو فارسی ادبیات کی بڑی عالم ہیں، اس جلسہ میں شریک تھیں اور دوسرے دن اس جلسہ کی صدر بھی بنی تھیں۔ میں بھی اس جلسہ میں شامل ہوا۔ وہاں میں نے لیڈی عبدالقادر (مرحومہ) کو

دیکھا۔ انہوں نے مجھے شام کو کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے ان کے گھر پر ترکی کے قدرتی نظاروں کی سلائیڈز جو میں اپنے ساتھ استانبول سے لے گیا تھا، دکھلائیں۔

حکیم نیّر واسطی صاحب صدر پاک ترکی کلچرل سوسائٹی سے میری ملاقات

حکیم نیّر واسطی صاحب نے اس موقع پر پروفیسر ملیحہ انبارجی اوغلی خانم کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ انہوں نے مجھے بھی اس تقریب پر مدعو کیا۔ حکیم صاحب موصوف نے اپنی کوششوں سے خود بہ خود ترکی زبان بولنے میں کافی ملکہ پیدا کر لیا تھا اور وہ اس سوسائٹی کی صدارت کے فرائض کامیابی سے ادا کرتے رہے۔

انہوں نے اس موقع پر اپنے مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے سلاطین مغلیہ کے زمانے کے کلاسیک ڈانس کا مظاہرہ پیش کرایا۔ جس سے حاضرین بہت خوش ہوئے۔ میں نے یہاں بھی ترکی قدرتی مناظر کی سلائیڈز مہمانوں کو دکھلائیں۔

بیگم وزیر احمد صاحبہ کا سکول

لاہور میں مجھے ایک اسکول دکھلایا گیا جو بیگم وزیر احمد صاحبہ نے اپنے خرچ پر ان پاکستانی بچوں اور بچیوں کے لئے جو پاکستان کے قیام کے وقت بے کس اور لاوارث رہ گئی تھیں، بنایا تھا۔ بیگم وزیر احمد صاحبہ لاہور کی ایک معزز خاتون ہیں جنہوں نے اپنی زندگی قوم کے غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر کے نوجوان خواتین کے لئے ایک بہت اچھی نظیر قائم کی ہے۔ اب یہ سکول انجمن خواتین پاکستان کی سرپرستی میں ہے۔ اس میں میرے سکول کو دیکھنے کے دن ۲۰۸ یتیم بچے اور بچیاں زیر تعلیم تھیں جن کو دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ دستکاریاں بھی سکھلائی جا رہی تھیں۔

صدر جمہوریہ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے ملاقات

میں لاہور سے راولپنڈی گیا۔ جہاں مجھے ۲۵/اپریل کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر

جمہوریہ پاکستان نے باریابی بخشا تھی۔ صبح کو میں پریذیڈنٹ ہاؤس گیا۔ مشرقی پاکستان کے ایک وزیر صاحب ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ اس لئے مجھے وہاں پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں انہوں نے اور اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے حضرات نے ترکی میں رسم الخط بدل جانے اور اس کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں مجھ سے سوالات پوچھنا شروع کئے۔ میں نے ان کو وہی جواب اس سلسلہ میں دیئے جو میں نے اس کتاب کے اٹھارویں باب میں "ترکی رسم الخط بدلنے کی وجوہ" کے عنوان سے مفصل لکھ چکا ہوں۔ میں یہاں ان جوابات کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے بعد ہماری جو گفتگو اردو اور بنگالی حروف کے مسئلہ پر ہوئی، اس کا خلاصہ یہاں دینا فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

میں نے ان کو کہا کہ پاکستان میں نہ صرف وہ مشکلات موجود ہیں جن کی وجہ سے ترکی نے اپنا رسم الخط بدلا، بلکہ ایک بہت بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ بنگالی اور اردو جو پاکستان کی قومی زبانیں مانی جاتی ہیں، وہ بالکل علیحدہ علیحدہ حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے پانی اور روٹی جیسے مشترک الفاظ اور احمدؐ، محمدؐ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ جیسے مبارک نام اگر اردو حرفوں میں لکھے جائیں تو بنگالی عوام ان کو نہیں پڑھ سکتے اور اگر بنگالی حروف میں ان کو لکھا جائے تو مغربی پاکستان کے عوام ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے ان الفاظ کو بھی نہیں پڑھ سکتے جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ اسی وجہ سے آج پاکستانی حکومت ڈاک کے ٹکٹوں اور بنک کے نوٹوں پر اردو اور بنگالی اور رومن حروف میں ان کی قیمت اور پاکستان کا لفظ لکھنے پر مجبور ہے۔ اسٹیشنوں کے نام بھی اسی طرح تین قسم کے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔

میں نے ان کو یہ بھی کہا کہ آج پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مذہب کے سوا اور کوئی مشترکہ رابطہ نہیں ہے۔ حالانکہ قومی وحدت کے لئے ایک واحد زبان کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں زبان کی وحدت کا تو اس وقت امکان نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور کینیڈا میں بھی زبان کا مسئلہ موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی، اطالوی اور جرمن زبانیں سرکاری زبانیں مانی جاتی ہیں۔ کینیڈا میں فرانسیسی بولنے والے اپنی زبان کے لئے انگریزی کی مانند مساوی حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ملک اپنی زبانوں کو لکھنے کیلئے کم از کم مشترک حروف تو استعمال کرتے ہیں، اور یہ حروف رومن حروف ہیں۔ پاکستان میں بھی اسی طرح دونوں بازوؤں کے لوگوں کو

ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک کرنے اور اس طرح پر ملک میں ایک واحد قومیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو اور بنگالی دونوں ایک ہی قسم کے حرفوں میں لکھی جائیں۔ لیکن اس وقت نہ بنگالی اس پر تیار ہیں کہ اردو حروف کو قبول کر لیں اور نہ مغربی پاکستان کے لوگ اس پر راضی ہیں کہ بنگالی حروف کو اپنا لیں۔ اگر بنگالی اور اردو کا رومن حروف میں لکھنا منظور ہو جائے جیسا کہ ہمارے زمانے میں ابتدائی سکولوں میں رومن حروف کا سیکھنا ضروری تھا، تو کم از کم اس سے یہ فائدہ تو ہو گا کہ پاکستان کے سب لوگ مشترک الفاظ تو بآسانی پڑھ سکیں گے، اور آگے چل کر یہ امید ہو سکتی ہے کہ ان دونوں زبانوں کے ملاپ سے ایک مشترک قومی زبان پیدا ہو جائے۔

میری باتوں کو سن کر حاضرین نے یہ اعتراض کیا کہ رومن حرفوں کے جاری ہونے کے بعد پاکستان کے لوگ بھی ترکی کے باشندوں کی طرح اپنی پرانی کتابوں کو نہ پڑھ سکیں گے۔ اس کا میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ ابتدائی تعلیم مغربی پاکستان میں اردو زبان میں اردو حرفوں میں اور مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان میں اور بنگلا حرفوں میں دی جائے جس سے بچے اپنے اپنے حروف کو بخوبی سیکھ لیں اور اپنی پرانی کتابوں کو اپنی اپنی زبان میں بہ آسانی اور اچھی طرح پڑھ سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مغربی اور مشرقی پاکستان کے پرائمری سکولوں میں رومن حروف بھی سکھلائے جائیں جیسا کہ ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ہمارے زمانے میں چوتھی اور پانچویں جماعتوں میں ہمیں پڑھائے جاتے تھے۔ مڈل سکولوں میں مغربی پاکستان میں بنگالی زبان اور بنگلہ حروف اور مشرقی پاکستان میں اردو زبان اور اردو حروف لازماً سکھلائے جائیں۔ لیکن باقی سارے سبق رومن حرفوں میں لکھے جائیں۔ سرکاری دفتروں میں سب کارروائی آہستہ آہستہ رومن حرفوں میں کی جائے۔ ڈاک کے ٹکٹوں اور بنک کے نوٹوں پر بنگالی اور اردو الفاظ صرف رومن حروف میں لکھے جائیں۔ اسٹیشنوں کے نام صرف رومن حرفوں میں ہو۔ اس طرح پر ہر پاکستانی رومن حرفوں کے ساتھ ساتھ اپنے صوبہ کی زبان کے حروف بھی لکھ سکے گا۔ لہٰذا اپنی پرانی کتابوں کو بہ آسانی پڑھ سکے گا اور رومن حرفوں کے سیکھنے کی وجہ سے الجبرے، کیمسٹری، فزکس کے فارمولوں کو بھی بآسانی پڑھ سکے گا۔ اخبارات ٹیلی پرنٹ کے اصول پر چھپنے لگیں گے۔ باہر سے خبریں بآسانی ٹیلکس (Talex) کے ذریعہ پہنچا کریں گی۔ موسم کی خبریں جیسے کہ اب ہوائی جہازوں کو دی جاتی ہیں اسی طرح بآسانی بین الاقوامی پیمانہ پر پہنچتی رہیں

گی۔ (Typewriting) کی موجودہ انگریزی حرفوں والی مشینیں چند ایک حروف مثلاً ڑ ڈ۔ ٹ وغیرہ کے اضافہ کے بعد موجودہ صورت میں بہ آسانی پاکستانی زبانوں کے لکھنے کے لئے استعمال ہو سکیں گی۔

میرے اس جواب کو دفتر میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بہت معقول خیال کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پاکستان میں ایک رسم الخط قبول کرنے کے لئے کیا ہو رہا ہے۔ میں نے صدر جمہوریت کے پرائیوٹ سیکرٹری کے دفتر میں کوئی آدھا گھنٹہ ان باتوں میں گزارا۔

اس کے بعد مجھے صدر صاحب کے کمرے میں بھیجا گیا۔ یہاں مارشل محمد ایوب خان نے مجھے باریابی بخشی۔ میں نے ان کی خدمت میں استانبول کی یادگار کے طور پر کرسٹل گلاس کی ایک رنگین شکر دانی جو ترکی کے کارخانہ شیشہ سازی واقع (پاشاباغچہ) میں بنائی گئی تھی، پیش کی۔ صدر موصوف نے میرے اس غریبانہ تحفے کو بہت خوشی سے قبول فرمایا۔ اس موقع پر جو فوٹو لیا گیا تھا وہ پاکستان کے سب اخبارات میں ان الفاظ میں چھپا تھا۔

"ترکی کے روزنامہ "جمہوریت" کے خصوصی نامہ نگار مسٹر ظفر حسن ایبک ایوان صدر میں صدر محمد ایوب خان کو ترکی میں بنی ہوئی ایک خوبصورت رنگین شکر دانی پیش کر رہے ہیں"۔ (٦٠)

میں صدر موصوف سے اس سے پہلے کئی دفعہ جب وہ ترکی آئے تھے، ملا تھا۔ جس سے ہمارے درمیان ایسے تعلقات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنیاد پر میں ان کی خدمت میں اپنے خیالات ذرا بے تکلفی سے عرض کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے مجھ سے مشرقی پاکستان کے حالات کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ "وہاں اب بہت ترقی ہو گئی لیکن اس کے باوجود بھی مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملک کے دونوں حصوں میں آپ کی ہر دلعزیزی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے اس بارے میں کچھ تدبیریں کرنا ضروری ہیں"۔

اس پر انہوں نے جواب دیا: "ملک کے دونوں حصوں کے دو گورنر ہیں۔ ان کی کیبنٹ اور اسمبلیاں ہیں۔ جن کا فرض ہے کہ لوگوں کی شکایات کو دور کریں۔ قوم کی ہر ضرورت کے پورا ہو جانے کی امید صرف مجھ سے تو نہیں رکھنی چاہئے؟"

میں ان کے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوا لیکن میں نے خاموشی اختیار کر لی اور ان سے رخصت ہو گیا۔ میں اس سفر سے ۲ مئی ۱۹۶۳ء کو استانبول واپس آیا۔ یہاں آ کر میں نے

اپنے سفر کے حالات روزنامہ "جمہوریت" اور ماہانہ (اورتہ دوغو) میں لکھے۔

مجھے ۱۹٦۷ء میں ترکی میں پاکستان کی پبلسٹی (Publicity) کرنے یعنی ترکی میں پاکستان کے حالات نشر کرنے کے سلسلہ میں حکومت پاکستان نے (ستارہ خدمت) دیا۔ میں نے جو تصویر اس موقع پر اپنی اہلیہ مکرم خانم کے ساتھ کھنچوائی تھی یہ ایوارڈ (award) یعنی تمغہ میرے گلے میں نظر آتا ہے۔ (۱)

صدر محمد ایوب خان کو میرا متنبہ کرنا

میں یہاں کے اخبارات سے اور پاکستانی جرائد سے جو مجھے یہاں وقتاً فوقتاً مل جایا کرتے تھے، پاکستان کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا۔ جس سے مجھے اس کا افسوس ہوتا تھا کہ ملک کی سیاسی فضا دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر میں نے ۲۱/دسمبر ۱۹٦۸ء کو حکومت کے برخلاف لوگوں میں بے چینی اور ملک میں مظاہرے اور فسادات شروع ہونے کی وجہ سے صدر موصوف کو اپنے پرانے تعلقات کی بنیاد پر چھ صفحات پر مشتمل ایک خط بھیجا جس میں ان شکایات اور بدعنوانیوں کا ذکر کیا جن کے بارے میں مجھے اخبارات سے پتہ چلا تھا۔ میں اس خط کی نقل یہاں درج کرنے کی بجائے صرف اس کا خلاصہ ذیل میں لکھتا ہوں۔ میں نے صدر موصوف کو اس خط میں عرض کیا کہ "آپ کے اور آپ کی حکومت کے برخلاف جو شکایات میرے کانوں تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) ملک میں پریس کو آزادی نہیں ہے۔

(۲) حکومت کے ہر ادارے میں رشوت ستانی بڑھتی جا رہی ہے۔

(۳) ملک کی ساری دولت کوئی بیس بائیس خاندانوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے ان خاندانوں میں آپ کے بیٹے گوہر ایوب خان اور آپ کے داماد اورنگزیب خان کے خاندان بھی شامل ہیں۔

(۴) ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی وجہ سے اچھے لوگ انتخابات میں حصہ لینے سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

(۵) گوہر ایوب خان آپ کی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آپ کا جانشین بلکہ پاکستان کا

بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

(۶) پچھلے مہینے مظاہرہ کرنیوالوں پر پولیس اور فوج نے گولی چلائی جس سے بہت سے لوگ مرے۔ اس سے قوم میں آپ کی حکومت کے برخلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

(۷) مخالف پارٹیوں کو دبایا جارہا ہے اور ان کے لیڈروں کو بغیر مقدمہ کے قید میں ڈالا جارہا ہے۔

ملک کی حالت کو سدھارنے کے لئے میں نے صدر محمد ایوب خان کی خدمت میں ترکی اور دوسرے ملکوں کی تاریخ سے جو سبق حاصل کئے تھے، ان کی بنیاد پر مندرجہ ذیل تجویزیں پیش کیں:۔

(۱) پریس کو حکومت کی کارروائیوں پر معقول طور پر نکتہ چینی کی آزادی دی جائے۔ ترکی میں اخبارات کھلم کھلا گورنمنٹ پر نکتہ چینی کر کے اس کی غلطیوں کو واضح کرتے رہتے ہیں۔

(۲) رشوت ستانی کے سدباب کے لئے حکومت کے کارندوں کو معقول تنخواہ دی جائے۔ اس کے لئے مالداروں پر ایک نیا ٹیکس لگایا جائے۔ ترکی میں ملازمین کی تنخواہیں اب بہت بڑھادی گئی ہیں، اور اس کے لئے نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں۔

(۳) ملک میں (Progressive Tax System) (یعنی جو زیادہ کمائے وہ زیادہ ٹیکس دے) جاری کیا جائے۔ ترکی میں مالداروں پر ان کی کمائی کے ۶۰ فیصد کے برابر اور امریکہ میں ۹۰ فیصدی کے برابر ٹیکس لگا ہوا ہے۔

(۴) ملک میں اس سے پہلے کارخانے والوں کو (Tax Holiday) یعنی ٹیکس سے معافی دے کر پاکستان میں پنپنے کا موقع دیا گیا تھا۔ اب کارخانہ والوں کو چاہئے کہ وہ ملک کے اخراجات کا بوجھ اٹھائیں۔ ان پر (Progrssive Tax) لگنا چاہئے۔

(۵) (Basic Democracies) کا سسٹم ہٹا کر لوگوں کو براہ راست پارلیمنٹ کے ممبروں کا انتخاب کرنے کا حق دیا جائے۔

(۶) مال داروں کو، خاص کر آپ اپنے فرزند اور داماد کو مجبور کریں کہ وہ ملک سے حاصل کردہ دولت ملک کے فائدے کے لئے خرچ کریں اور جیسا کہ امریکہ میں ہے Ford Foundation اور Rockfeller Centre کی طرح ادارہ وقف قائم کر کے

عوام کی مدد پر اپنا روپیہ خرچ کریں۔

(۷) پولیس مظاہرہ کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لئے ان پر گولی نہ چلائے۔ آنسو گیس کے بم ان پر پھینک کر ان کو منتشر کرنے کی کوشش کرے۔

ترکی میں پولیس نے ۱۹۶۰ء میں مظاہرے کرنے والے طالب علموں پر گولی چلائی تھی، جس سے چند ایک طالب علم زخمی ہو گئے تھے اور ایک مارا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدنان مندرس کی حکومت کے برخلاف سخت نفرت پھیلی، اور آخر کار اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔

(۸) مخالف لیڈروں کو بغیر مقدمہ چلائے قید میں نہ ڈالا جائے۔ ان کے ساتھ انصاف اور نرمی کا سلوک کیا جائے۔ آخر وہ بھی تو وطن پرست ہیں۔

(۹) آپ کو قطعی طور پر اعلان کر دینا چاہئے کہ آپ ۱۹۷۰ء میں صدارت کے لئے امیدوار نہ بنیں گے، اور اس کے بعد آپ ایک فرد ملت کے طور پر ملک کی خدمت کے لئے تیار ہوں گے۔

میرا یہ خط صدر موصوف کو ملا تھا۔ انہوں نے اس کو پڑھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا وعدہ کیا تھا، جیسا کہ ان کے ڈپٹی سیکرٹری مسٹر دلاور حسن کے مندرجہ ذیل خط سے معلوم ہوتا ہے۔

پریذیڈنٹ ہاؤس راولپنڈی

مورخہ ۲۸/جنوری ۱۹۶۹ء نمبر ایف ۲۰۳۔ پریس/جی/۱۱/۶۸

محترم ایبک صاحب

السلام علیکم! آپ کا خط مورخہ ۲۱/دسمبر ۶۸ء جناب صدر پاکستان نے ملاحظہ فرمالیا ہے۔ اس خط میں مندرج نیک خیالات اور مفید مشورات کے صاحب صدر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

والسلام

(دلاور حسن)

ڈپٹی سیکرٹری

محترم جناب ظفر حسن ایبک صاحب
جمہوریت جادہ سی
ہواپالاس نمبر ۱۵۵/۳
الماداغ۔ شیشلی
استنبول (ترکی)

لیکن مشیت ایزدی اور خداوند کریم کی مصلحتیں کچھ اور ہی تھیں!

میرا موجودہ شغل

مَیں نے ۱۹۶۹ء میں (Regional Co-operation Development) R.C.D. کی (Cultural Institute) کے لئے Conversation Guide کے نام سے ایک کتاب تیار کی جس کے ذریعے، ترکی، ایرانی اور پاکستانی سیاح جب وہ ایک دوسرے کے ملک میں جائیں، تو اپنی روز مرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انگریزی، ترکی اور فارسی زبانوں میں بات چیت کر سکیں۔ یہ کتاب تہران میں چھپی ہے۔

اس کے بعد میں نے اسی، انسٹیٹیوٹ کے لئے ایک ترکی اردو جیبی لغت تیار کی جو اب لاہور میں زیرِ طبع ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اردو ترکی جیبی لغت اور ایک گرامر بھی لکھوں تاکہ جو پاکستانی ترکی سیکھنا چاہیں یا جو ترک اردو پڑھنے کا ارادہ کریں، ان کو مدد ملے۔ ☆

☆ ترکی اردو لغات وزارت تعلیم پاکستان کی سرپرستی میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد طبع کر چکا ہے مگر مرحوم ظفر حسن کی زندگی میں اس کی اشاعت نہ ہو سکی اور نہ وہ اسے طبع شدہ شکل میں دیکھ سکے۔ اردو ترکی لغات کا مسودہ R.C.D کی تحویل میں لاپتہ ہو گیا۔ اب اس مسودہ کی نقل مقتدرہ قومی زبان کے پاس حالت انتظار میں ہے۔ ترک طلبہ کے لئے ظفر حسن مرحوم نے اردو گرائمر بھی لکھی تھی۔ اس کا مسودہ بھی آر۔ سی۔ ڈی کی تحویل میں تھا۔ اس ادارے کے تعطل کے ساتھ یہ مسودات بھی دفن ہو گئے (مرتب)

میں اب بھی اپنی سن رسیدگی کے باوجود پاکستانی مسائل پر وقتاً فوقتاً ترکی اخبارات میں مقالات لکھتا رہتا ہوں اور جب تک میرے بدن میں جان اور ہاتھ میں سکت ہے، میرا قلم پاکستان کی خدمت کے لے وقف رہے گا۔

ومن اللہ التوفیق

میں اپنی سوانح عمری کو علامہ اقبال کے ان دعائیہ اشعار پر ختم کرتا ہوں:۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

ظفر حسن ایبک
استانبول
(۱۹۶۹ء)

تصاویر و دستاویزات



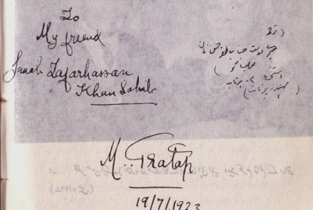
۱- ظفر حسن ایبک (ستارہ خدمت لگائے ہوئے اپنی اہلیہ امینہ مکرم خانم کے ساتھ (۱۹۶۷ء میں)

Conversational Guide (Cultural Institute) R.C.D.

یہ ترکی اردو لغات وزارت تعلیم پاکستان کی سرپرستی میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد طبع کر چکا ہے مگر مرحوم ظفر حسن کی زندگی میں اس کی اشاعت نہ ہو سکی اور نہ وہ اسے طبع شدہ شکل میں دیکھ سکے۔ اردو ترکی لغات کا مسودہ R.C.D. کی تحویل میں لاپتہ ہو گیا۔ اب اس مسودہ کی نقل مقتدرہ قومی زبان کے پاس حالت انتظار میں ہے۔ ترک طلبہ کے لیے ظفر حسن مرحوم نے اردو گرامر بھی لکھی تھی۔ اس کا مسودہ بھی آر۔ سی۔ ڈی کی تحویل میں تھا۔ اس ادارے کے ختم ہونے کے ساتھ یہ مسودات بھی دفن ہو گئے۔ (مرتب)



۲۔ کابل، افغانستان میں ہندوستانی مشن کے ارکان (۱۹۱۶ء)



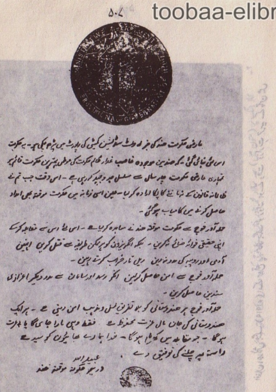
To
My friend
Janab Zafarhassan
Khan Sahib

(مہندر پرتاپ)

M. Pratap

19/7/1923.

۳۔ مذکورہ بالا تصویر کی پشت پر، راجا مہندر پرتاپ (صدر موقتہ حکومت ہند) کے دستخط اور پیش کش ظفر حسن کو



عارضی حکومت ہند کی خبر رولٹ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ حکومت اس لئے بنائی گئی۔ کہ ہند میں موجودہ غاصب غدار کی ام حکومت کی جگہ بہترین حکومت قائم ہو ہماری عارضی حکومت چار سال سے مسلسل جد وجہد کر رہی ہے۔ اس وقت جب تم نے ظالمانہ قانون کے زمانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ عین اسی زمانہ میں حکومت موقتہ بھی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

حملہ آور فوج سے حکومت موقتہ ہند نے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس لئے اس سے مقابلہ کر کے اپنی حقیقی قوت ضائع نہ کریں۔ بلکہ انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ سے قتل کریں انہیں آدمی اور روپیہ کی مدد نہ دیں ریل تار خراب کرتے رہیں۔

حملہ آور فوج سے امن حاصل کریں اگر رسد اور سامان سے مدد دیں اعزازی سندیں حاصل کریں۔

حملہ آور فوج ہر ہندوستانی کو بلا تفریق نسل و مذہب امن دیتی ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کی جان مال عزت محفوظ ہے۔ فقط وہی مارا جائے گا یا غارت ہوگا۔ جو مقابلہ میں کھڑا ہوگا۔ خدا ہمارے بھائیوں کو سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔

عبیداللہ
وزیر حکومت موقتہ ہند

چٹھی جو مولانا عبیداللہ سندھی کی طرف سے اہل ہند کے نام جاری کی گئی

۴۔ کابل میں حکومت موقتہ ہند کا اعلان، وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی کے دستخطوں سے (۱۹۱۹ء)



۵- افغان، برٹش جنگ (۱۹۱۹ء) کے موقع پر، محاذ جنگ کو روانہ ہوتے وقت وزارتِ حربیہ کے چمن میں

۶- محاذ جنگ پر (ٹل میں) سپہ سالار محمد نادر خان اپنے فوجی کمان داروں کے ساتھ (مئی ۱۹۱۹ء)





۷۔ محاذ جنگ پر، سپہ سالار محمد نادر خان اپنے ساتھی رضاکاروں کے ساتھ (مئی ۱۹۱۹ء)

۸۔ جنگ کے اختتام پر (گردیز میں) سپہ سالار محمد نادر خان اپنے برادران سردار شاہ محمود اور سردار شاہ ولی خان کے ساتھ





۹۔ وزیر بحر ترکیہ جمال پاشا، مولانا عبید اللہ سندھی اور رفقا کے ہمراہ (کابل، دسمبر ۱۹۲۰ء)



۱۰۔ وزیر بحر ترکیہ جمال پاشا (افغانی لباس میں)



۱۱- ظفر حسن (قیام افغانستان کے دوران، وزارت حربیہ میں
محمد نادر خان کے معتمد کی حیثیت سے)



۱۲- خوشی محمد اور اس کی ترک یوگوسلاوی بیوی فاطمہ



۱۲- الف- خوشی محمد کی بیٹی یاسمین۔



۱۳- ظفر حسن، ڈاکٹر نورُ محمد اور خُوشی محمد کے ساتھ (ماسکو، مئی ۱۹۲۳ء)



۱۲- عزیز احمد، مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ (استانبول، جولائی ۱۹۲۳ء)



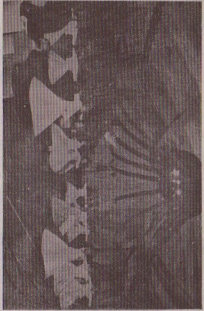
۱۵۔ ظفر حسن: ماسکو کی آخری یادگار تصویر (۱۹۲۴ء)



۱۶۔ عبدالرحمٰن ریاض بابر (استانبول میں، ۱۹۲۶ء)



۱۷۔ عبدالرحمٰن پشاوری (استانبول میں، ۱۹۲۱ء)



۱۸- "ملا نور الدین وزیرستانی پٹھان کی خانقاہ (آقسرائے، استانبول) درویشوں کا رقص



۱۹- تیجا سنگھ آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ (استانبول، ۱۹۲۴ء)



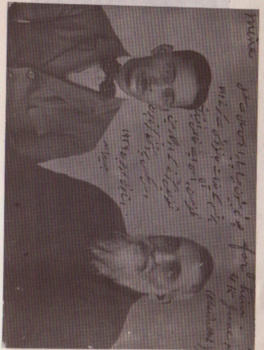
۲۰- عزیز احمد، ظفر حسن اور تیجا سنگھ آزاد (استانبول، ۱۹۲۵ء)



۲۱- اسد فواد بک (استانبول)



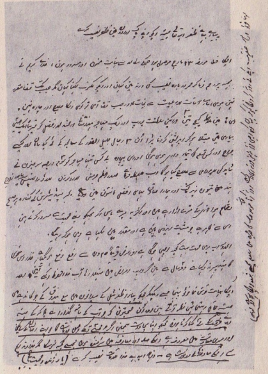
۲۳۔ تیجا سنگھ آزاد (داڑھی اور کیس صفاچٹ)



۲۲۔ ظفر حسن مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ (استنبول میں، ۱۹۳۶ء) مولانا کی تحریر اور دستخطوں کے ساتھ



۲۵- ظفر حسن ایبک، ترکی فوج میں کمیشن ملنے کے موقع پر (استانبول، ۱۹۳۰ء کیم مئی)



Menton

۳۰ مارچ 1925

۲۴- ظفر حسن کے نام جنرل محمد نادر خاں کا مکتوب (فرانس سے)



۲۶۔ ظفر حسن ایبک اپنے ایک رفیق فوجی ترکنعان قوجاتورک کے ساتھ آباس کیمپ میں (اگست ۱۹۳۰ء)



۲۷۔ امینہ مکرم خانم (نکاح سے پہلے، ۱۹۳۲ء)



(۲۸) امینہ مکرم خانم (نکاح کے بعد ۱۹۳۲ء)



۲۹۔ کیڈٹ کالج کابل میں توپچیوں کا امتحان (۱۵/اگست ۱۹۳۴ء)



۳۰۔ کابل (افغانستان) میں ظفر حسن کے گھر پہ ترکوں کی ایک محفل (۱۹۳۷ء)



۳۱۔ سردار شاہ محمود (وزیر حربیہ افغانستان) ظفر حسن آیبک کے گھر پر۔



۳۲۔ افغانی وزارتِ خارجیہ (کابل) کے چمن میں



۳۳۔ میجر سعد الدین اور ظفر حسن ایبک مع خانم مکرم (چیکوسلاواکیہ ۱۹۳۶ء)



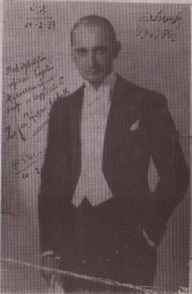
۳۴۔ افغانی مشن کے ارکان افغان مہمانوں کے ساتھ (چیکو سلاواکیہ، ستمبر ۱۹۳۶ء)



۳۵۔ وزیر حربیہ افغانستان شاہ محمود کے ساتھ، برونو۔ چیکو سلاواکیہ میں (۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء)



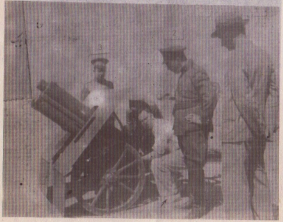
۳۶۔ ظفر حسن اور اقبال شیدائی مع خانمہا (پیرس. ۴/ستمبر ۱۹۳۶ء)



۳۷۔ ظفر حسن ایبک (سربراہ افغانی مشن)، چیکو سلاواکیہ سے آخری فوٹو (۱۰/فروری ۱۹۳۷ء)



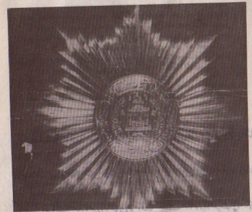
۳۸۔ اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ سکوڈا فیکٹری کی ساختہ توپوں اور سامان جنگ کا معائنہ کر رہے ہیں (کابل



۳۹۔ جنرل سردار علی شاہ سکوڈا فیکٹری کی بنائی ہوئی توپ کے بارے میں مستری سے معلومات لے رہے ہیں۔



۴۰۔ کابل کی ایک یادگار تصویر۔ بچھڑے ہوئے عزیز بائیس سال کی مفارقت کے بعد ملتے ہیں (۱۵/ نومبر ۱۹۶۳ء)



۴۱۔ تمغۂ استور جو اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ کی طرف سے ظفر حسن آیبک کو عطا ہوا۔

۱۱۸۱

المتوکل علی اللہ

محمد ظاہر

بفضلِ الٰہی پادشاہِ مملکتِ افغانستان

بتقدیر خدمات صادقانہ ومساعی کہ از عزتمند ظفر حسن خان سرعلم توپچی مکتب حربیہ بمشاہدہ
رسیدہ مشارالیہ را باعطای نشان ذیشان (استور درجہ سوم) قرین افتخار فرمودہ. وفرمان ہذا
کہ مصدقِ خدمات وامتیاز نامبردہ بہ نشان موصوف است از حضور اعلیحضرت پادشاہی ما
برایش اعطا واحسان شد

بتاریخ پنجم برج میزان ۱۳۱۶ امضا شد

اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ کی طرف سے ظفر حسن کو عطا شدہ تمغہ (استور) کا شاہی فرمان

۴۲- تمغۂ استور کے ساتھ فرمانِ شاہی۔

T. C.
KÂBİL BÜYÜK ELÇİLİĞİ

Kâbil, 30 eylül 1937.

No. 109
No. 33
Tarife : 42

Afganistan Hükûmeti Harbiye Vezareti tarafından Türkiye Cumhuriyeti Millî Müdafaa Vekâletine yazılan 5 mizan 1316 şemsî (28.9.1937) tarih ve 183 No.lı Farsça mektubun tercemesidir .

Türkiye Cumhuriyeti
Millî Müdafaa Vekâletine

Türkiye Cumhuriyeti Ordusu Subaylarından Topçu Teğmen Bay Zafer Hasan ; 4 ikinci teşrin 1933 tarihli konturatla Ordumuz hizmetine alınmış ve Kâbil'e muvasalatında Afgan Mektebi harbiyesi şahanesi Topçu Baş muallimliğine tayin olunmuştu.

Bay Zafer Hasan ; Harbiye mektebimizde iki buçuk yıl süren bu vazifesini ciddiyetle yaptığı gibi bir Sahra bataryasile bir Dağ bataryası efradını da yetiştirmekde gayret ve liyakat göstermiştir.

Hükûmetimiz yeni toplar mübayaasına karar verdiği zaman Bay Zafer Hasan tesellüm ve muayene heyeti Reisi sifatile Çekoslovakya'ya gönderilmiş ve bu vazifeyi de arzumuza göre ifa eylemiştir .

Çekoslovakya'dan Kâbil'e avdetinde gerek yeni toplarımızın tarifname-talimname ve atış cedvellerinin tertib ve tabında ve gerekse Topçu sınfının talim ve terbiye programının tedvininde ve Topçu zabitlerile küçük zabitlerinin yetiştirilmesinde çok çalışmış ders atışlarile muharebe atışlarını da yapdırmıştır .

Kendisile olan konturatımız bitmiştir. İyi hizmetlerinden memnun kaldığımızı bu mektubumuzla dost ve kardeş Türkiye Cumhuriyeti devletinin Millî Müdafaa Vekâletine beyan eder ; Mumaileyhe muvaffakiyetler temennisi ile Cumhuriyet Hükûmetinin terakki ve tealisinin hergün artmasını kalben dileriz .

İmza : Afgan Harbiye Veziri
Şah Mahmud Han

İlişik Farsça mektubun tercemesidir. Pul olmadığından tasdik muamelesi pulsuz yapılmış Beş Kuruş harcı alınmıştır.

TÜRKİYE CUMHURİYETİ
KÂBİL

ظفر حسن ایبک کی خدمات کے متعلق سردار شاہ محمود خان وزیر جنگ افغانستان
کی طرف سے وزارت جنگ ترکی کو ارسال کردہ خط کا ترکی ترجمہ

۴۳- وزیر حربیہ افغانستان سردار شاہ محمود کا مکتوب وزارت حربیہ ترکی کو (ترکی ترجمہ)



۴۶- چودھری خلیق الزمان کے ساتھ (استانبول ۱۲/ستمبر ۱۹۵۹ء)



۴۴- کیپٹن ظفر حسن آیبک ترکی فوج سے سبکدوش ہونے کے وقت (انقرہ ۱۴/جولائی ۱۹۴۶ء)



۴۵- شاہ خانم ثریا (سابق ملکہ افغانستان) ظفر حسن کے بنگلے کے باغیچے میں (استانبول ۱۹۴۸ء)



۴۷۔ سردار محمد ابراہیم (صدر آزاد کشمیر) ترک اکابر کے ساتھ (استنبول ۵/فروری ۱۹۵۰ء)



۴۸۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کے ساتھ (۳۰/نومبر ۱۹۵۳ء)



۴۹۔ محمد علی بوگرا (وزیر اعظم پاکستان) کو استقبالیہ ایڈریس (۹/جون ۱۹۵۴ء)



۵۰۔ ظفر حسن ایبک کا بنگلہ جہاں ترکی اور پاکستان کے کمانڈر انچیف نے ملاقات کی (۲۰/ستمبر ۱۹۵۳ء)



۵۱۔ گفتگو کا ایک منظر، ظفر حسن ایبک ترکی کمانڈر انچیف سے بات کر رہے ہیں۔



۵۳۔ یوم جمہوریہ پاکستان کے موقع پر ترکی جنیزری بینڈ کراچی میں مارچ پاسٹ کر رہا ہے (۲۳/مارچ ۱۹۵۸ء)



۵۲۔ ظفر حسن کی بھتیجی ڈاکٹر سعیدہ، وزارت معارف ترکیہ کے سینی ٹوریم میں
(۴/اکتوبر ۱۹۵۳ء)

Istanbul.

30.10.1958

To H.E. Gen.M.Ayub Khan,
President,
Islamic Republic of Pakistan,
Karachi.

Revered Sir,

From the innermost depths of our hearts, Mrs.Zafer and myself sincerely congratulate Your Excellency on the propitious occasion of your taking over the duties of the President of the Islamic Republic of Pakistan.

We most humbly pray to God to crown with success your intentions, which we all know are the noblest and which you have all along harboured in your kind and loving heart for the good and welfare of the Pakistani people.

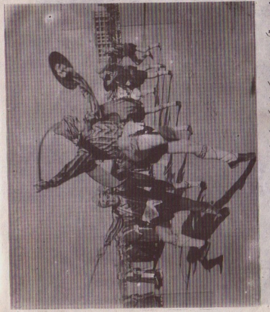
I shall consider myself very fortunate and blessed if I can be of any service to Your Excellency and to the country of my birth.

Believe me to be
Sir,
Your best well-wisher

Z. H. Aybek

Zafer Hasan Aybek
General Secretary,
Turco-Pakistan Cultural
Society, Istanbul.

۵۵۔ ظفر حسن ایبک کا مکتوب صدر محمد ایوب خان کے نام۔



۵۶۔ ترکی جنیسری بینڈ کے ارکان کراچی کی سڑکوں پر تلوار اور ڈھال کے فوجی کرتب دکھا رہے ہیں۔

No. D. 4398 - Pres/62

By Diplomatic Bag

From: Q.U.Shahab, Esq.,
SQA., CSP.,
Secretary to the President.

PRESIDENT'S HOUSE
~~KARACHI~~
Rawalpindi.

19th March, 1962.

Dear Madam,

I am desired by President Ayub Khan to thank you for your letter of January 22, 1962, conveying your felicitations on the conferment of full political rights on the women of Pakistan under the new Constitution.

The President appreciates your sentiments and has asked me to convey his best greetings to you and also to Beyire Isik.

Yours truly,

(Q.U.Shahab)

Mukerrem Zafer Aybek,
Turco-Pakistan Cultural Society,
Istanbul Branch,
Istanbul (Turkey)

ان کو بھیجے ہوئے پیغام تہنیت کا جواب۔

۵۶ الف قدرت اللہ شہاب کی طرف سے امینہ مکرم آیبک کے مکتوب کا جواب۔

PRESIDENT'S HOUSE
KARACHI

No.F.3(4)-Pres/58.

6th November 1958.

Dear Mr. Zafer,

The President has received your letter and has directed me to thank you for the congratulations offered by you.

Yours sincerely,

(Q.U. Shahab)
Secretary to the President.

Zafer Hasan Aybek, Esq.,
General Secretary,
Turco-Pakistan Cultural Society,

۵۶۔ صدر مملکت کی طرف سے قدرت اللہ شہاب (سیکرٹری) کا جواب۔



۵۷۔ ڈاکٹر مظفر شوقی میریک (۱۹۳۲ء میں) اپنی بہن امینہ مکرم اور ظفر حسن کی شادی کے موقع پر۔



۵۸۔ ایک خاندان کے تین ارکان جو موت کے بعد بھی اسی ترتیب سے زنجیر لی قوپو، استانبول کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔



۵۹۔ ظفر حسن ایبک لاہور میں اپنے عزیزوں کے ساتھ (۲۴/اپریل ۱۹۶۳ء)



۶۰- ظفر حسن ایبک ترکی کی بنی ہوئی رنگین شکروانی صدر محمد ایوب خاں کو پیش کر رہے ہیں (۲۵/اپریل ۱۹۶۳ء)



۶۱- اکتوبر ۱۹۸۸ء ظفر حسن ایبک، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، نیاز احمد، افضل احمد کے ساتھ۔



۶۲۔ ظفر حسن ایبک کی تُربت۔ زنجیرلی قویو قبرستان، استانبول۔ ترکی۔

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی ،سفرنامے ،لغات،

اردوادب، آپ بیتی ،نقدوتجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com